عصری اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی کے اہداف ومقاصد

عہدِ رسالت وخلافت راشدہ کی روشنی میں تحقیقی جائزہ

(تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی علوم اسلامیہ)

۱۴۳۲ھ/2011ء

مقالہ نگار

محمد عبدالرحمٰن

رول نمبر 04-05

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد عبداللہ

ایسوسی ایٹ پروفیسر

ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

Ph: 042-99231232
Fax: 042-99230856

DEPARTMENT OF ISLAMIC STUDIES
UNIVERSITY OF THE PUNJAB
Quaid-i-Azam Campus, Lahore
E-mail: chairman@is.pu.edu.pk

Ref. No. D/1028/IS

Dated 23-8-11

TO WHOM IT MAY CONCERN

It is certified that Muhammad Abdur Rehman is a regular student, session 2004 in Department of Islamic Studies and he has completed his thesis Titled:

عصری اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی کے اہداف و مقاصد
عہد رسالت و خلافت راشدہ کی روشنی میں تحقیقی جائزہ

under my supervision for the award of PhD degree. Muhammad Abdur Rehman is eligible for submission of thesis under the rules & regulations of the Department as well as of the University regarding PhD. The material used by his is orignal and he has shown creativeness in his work. The thesis presents work done by the candidate.

Dr. Muhammad Abdullah

Supervisor

DECLARATION CERTIFICATE

The thesis which is being submitted for the degree of PhD in the University of the Punjab does not contain any material which has been submitted for the award of PhD degree in any university and, to the best of my knowledge and belief, neither does this thesis contain any material published or written previously by another person, except when due reference is made to the source in the text of the thesis.

Muhammad Abdur Rehman
PhD 05-04
Department of Islamic Studies,
University of The Punjab, Lahore

انتساب!

لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ

والدہ، والد مرحوم اور اساتذہ کرام

کے نام

جن کی شب و روز توجہ، تربیت، تعلیم

اور

دعاؤں کے سہارے

میرے علمی سفر

کا آغاز ہوا۔

اظہار تشکر

کسی کے احسانات کا شکر ادا نہ کرنا علمی و اخلاقی خیانت ہے۔ زبان دانی کی فصاحت و بلاغت کے باوجود کسی بھی انسانی زبان میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اظہار تشکر کے تمام تر جذبات کی عکاسی الفاظ کے روپ میں کر سکے۔

صد ہا شکر ہے اس ذات بابرکات کا جس نے مجھے مسلمان بنایا اور اپنے محبوب مصطفیٰ ﷺ کا امتی بنایا، فکر و شعور اور سمع و بصر کے ساتھ دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ فرمایا، ناقص علم کے باوجود قوت بیان دی اور اس علمی کاوش کو بروئے کار لانے میں میرا حامی و ناصر رہا۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ (ابراہیم ۱۴: ۷)

”اگر تم شکر کرو گے تو تم کو زیادہ (نعمت) دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو (یہ سمجھ رکھو کہ) میرا عذاب بڑا سخت ہے۔“

ایک شخص علم و فکر کی جتنی بھی منزلیں طے کرے پھر بھی اس کی فکر و سوچ کے بہت سے گوشے تشنہ ہی رہتے ہیں اور اس کی فکر کو راہنمائی کی ضرورت رہتی ہے اور جہاں تک میرا معاملہ ہے، مجھے کبھی بھی اپنے بارے میں نہ تو علمی ثقاہت کا زعم ہوا ہے اور نہ ہی اپنی رائے کو حرف آخر سمجھنے اور اس پر ڈٹ جانے کا خبط ذہن پر سوار ہوا ہے۔ میں ہمیشہ ہر صاحب علم و فکر اور نظر و دانش کے دستر خوانِ حکمت و دانائی سے خوشہ چینی کا طالب رہا ہوں۔

نگران مقالہ ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب بذات خود تحقیقی و علمی ذوق کی حامل شخصیت اور درجہ علم کے لحاظ سے نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اس علمی کاوش کو بحسن و خوبی سرانجام دینے میں، اپنی قیمتی معروفیات کے باوجود میری بہترین راہنمائی فرمائی اور دورانِ تحقیق میری بھرپور حوصلہ افزائی کی جس سے میرے اندر محنت و لگن اور عمدہ تحقیق کا مزید شوق اجاگر ہوا۔

ادارہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب کے تمام اساتذہ کرام خاص طور پر ڈاکٹر شبیر احمد منصوری صاحب، ڈاکٹر ممتاز احمد سالک صاحب اور ڈاکٹر سعد صدیقی صاحب کا انتہائی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے اس تحقیقی و تدقیقی کام میں میرا حوصلہ بڑھایا اور رہنمائی فرمائی۔ شیخ زید اسلامک سنٹر کے تمام اساتذہ کرام جن میں ڈاکٹر اعجاز صاحب، ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب اور ڈاکٹر مفتی عبدالباسط صاحب شکریہ کے مستحق ہیں جن کی علمی رہنمائی ہر مشکل مرحلے پر مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔

ناسپاسی ہوگی اگر ڈین فیکلٹی اور چیئرمین ہذا ادارہ علوم اسلامیہ پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کی وجہ سے علمی ماحول میسر رہا۔ ان تمام اساتذہ کرام کے عالمانہ مشوروں اور خراج دلانہ حوصلہ افزائی کی بدولت تحریر و تحقیق کی کٹھن راہیں میرے لیے سہل ہوتی چلی گئیں۔

دیگر شخصیات جنہوں نے گاہے بگاہے مقالے کی تیاری کے مختلف مراحل میں میری مدد اور حوصلہ افزائی فرمائی ان میں مرحوم ڈاکٹر

خالد علوی صاحب (م ۲۰۰۸ء لاہور)، مرحوم ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب (م ۲۰۱۰ء اسلام آباد)، ڈاکٹر محمد الغزالی صاحب (ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد)، ڈاکٹر یوسف فاروقی صاحب (شریعہ اکیڈمی اسلام آباد)، پروفیسر مظفر مرزا صاحب، سید شبیر صاحب (نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن لاہور)، مولانا تقی عثمانی صاحب (دارالعلوم کراچی)، مولانا عزیز الرحمن صاحب (دارالعلوم کراچی)، مولانا عبدالمالک صاحب (جامعہ منصورہ)، مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب (اکوڑہ خٹک نوشہرہ) اور مفتی عظمت اللہ صاحب (دارالعلوم خوشاب) شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب اساتذہ کی علمی صلاحیتوں کو مزید پرنور کرے اور ہمیں ان کی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کے مزید مواقع فراہم کرے۔

میرے رفقائے کار میں ڈاکٹر مبشر حسین صاحب، ضیاء الرحمن صاحب، قاضی فرقان صاحب، طاہر ایوب صاحب اور تمام لائبریریوں کے عملہ کا جن میں فیاض صاحب، عتیق الرحمن صاحب، ارشد صاحب اور جہانگیر شامل ہیں۔ میں ان تمام حضرات کا شکرگزار ہوں جنھوں نے مقالہ کی تیاری میں میری مدد اور رہنمائی فرمائی۔ اس مقالہ کی کمپوزنگ کے سلسلہ میں عادل شہزاد اور عبدالرحمن انور کا احسان مند ہوں جنھوں نے انتہائی محنت اور توجہ سے اس ذمہ داری کو سرانجام دیا۔

والدین کی دعائیں اور شفقت جو ہمیشہ مجھ پر سایہ فگن رہیں یہ مقالہ انھی کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہے۔ میں ان تمام شخصیات کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین!

مقالہ ہذا کی تیاری کے لیے جن کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں ادارہ علوم اسلامیہ لائبریری، شیخ زاید اسلامک سینٹر لائبریری، جامعہ پنجاب لاہور مین لائبریری، شعبہ سیاسیات و شعبہ معاشیات لائبریری جامعہ پنجاب لاہور، منہاج لائبریری لاہور، منصورہ لائبریری لاہور، نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن لائبریری، ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، شریعہ اکیڈمی لائبریری، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد مین لائبریری، قائداعظم یونیورسٹی لائبریری، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی لائبریری، نیشنل لائبریری اسلام آباد اور وزارت داخلہ لائبریری اسلام آباد بھی شامل ہیں۔

نام

محمد عبدالرحمن

مقدمہ

اسلام نے جہاں انسان کی مادی اور جسمانی ضروریات کا سامان کیا ہے وہاں اس کی روحانی واخلاقی اور تمدنی ضروریات کا بھی بدرجہ اتم اہتمام کیا ہے۔ اسلام زندگی کا نہایت مکمل ومنظم ضابطہ اور دستور ہے۔ حیات انسانی کا کوئی گوشہ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، قومی ہو یا بین الاقوامی، معاشی ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا تمدنی، اسلام کی تعلیمات سے محروم نہیں۔

اسلام ایک ایسا دستور العمل ہے جو دنیا میں ایک متوازن اور متناسب معاشرتی نظام کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ یہ نظام اخوت، مساوات اور انصاف کے زریں اصولوں پر مبنی ہے۔ اسلام انفرادی مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے اور اجتماعیت کے لیے بھی راہیں ہموار کرتا ہے۔ مزید وہ ملی مقاصد کے مقابلہ میں ذاتی مفادات کی بیخ کنی کر کے انسان میں خدمتِ خلق کا احساس پیدا کرتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی بعثت جزیرۃ العرب میں انسانی تاریخ کا عظیم انقلاب تھی۔ ایک ایسا روحانی، ذہنی، قلبی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی انقلاب جس نے اعلیٰ وادنیٰ کے معیار، عزت وذلت کے معنی اور کامیابی وناکامی کے مفاہیم بدل ڈالے۔ جس نے انسانی آزادی اور حریت فکر کو اعلیٰ ترین بلندیوں سے ہمکنار کیا اور انسانی حقوق کو ناقابل پامال تقدیس وتحریم عطا کی۔ جس نے غلامی، جبر واستبداد اور استحصال کی ہر شکل اور ہر انداز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور انسانی مساوات، معاشی انصاف، سماجی عدل اور اخلاقی پاکیزگی کے ذریعے ایسی معاشرتی ہم آہنگی پیدا کی کہ کشیدگی، چپقلش اور بے چینی کے تمام تر اسباب کا قلع قمع ہو گیا۔

نبی رحمتؐ نے جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ منورہ میں ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اس کے خدوخال، حدود وشرائط، ذمہ داریاں اور اس کے تقاضے فراہم کیے جو اسلامی قانون سیاسی وانتظامی کے اجزاء تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اشاعت اسلام، توسیع مملکت، استحکام سلطنت، مخلوق خدا کے واسطے سامان عافیت کے مہیا کرنے اور مفسدین کے فساد اور ظلم وستم کے سد باب کے لیے ایسی فعال اور مؤثر حکمت عملی اختیار فرمائی جو امور داخلہ یا داخلی نظم ونسق سے موسوم کی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے اس نظام کی عالمگیر بنیادیں تشکیل دیں، اور اس کے اہم شعبے اور اصول بیان کیے، بعد ازاں اسے اسلامی نظام حکومت میں ایک اساسی عامل اور بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہوئی۔ نبی اعظم کی ہمہ گیر اور جامع شخصیت نے اپنے حسن تدبیر وانتظام سے طرز حکومت میں ایسی تبدیلیاں کیں جن کے سبب روئے زمین پر ایک ایسی مثالی ریاست قائم ہوئی جو رہتی دنیا تک بنی نوع انسان کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایک غیر مسلم مصنف باسورتھ کے بقول:

''آپؐ مذہب کے ساتھ ساتھ ریاست کے سربراہ بھی تھے۔ اگر کسی انسان کو حکومت کرنے کا خدائی حق نصیب ہوا ہے تو وہ محمدؐ تھے۔ اگرچہ انہیں اقتدار مطلق حاصل تھا مگر اس کے سبب ظاہری اشکال اور مادی سہارے مفقود تھے۔ ایسا مثالی معاشرہ جس کی تعریف دشمن بھی کرتے ہیں، اس عظیم شخصیت کا مرہون منت ہے جسے قرآن نے خاتم النبیین کہا ہے۔''

(Helen, Heming way, benton, Encylopaedia Britannica, oxford university press London, 1968, Vol:27, P 378)

پھر چونکہ سلسلۂ نبوت عنقریب ختم ہونے والا تھا لیکن انسانوں نے تا قیامت پیدا ہوتے رہنا تھا لہٰذا یہ پہنچانے کا کام امت مسلمہ کا فرض منصبی قرار دے دیا۔ یاد رہے کہ پہنچانا محض دعوت وتبلیغ ہی سے نہ تھا، شہادت سے بھی تھا یعنی وعظ ونصیحت اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت پر مبنی نظام عدل وقسط یا نظام خلافت کو اس طور پر قائم ودائم رکھنا تھا کہ اس کا وجود دنیا میں عملاً بطور گواہی موجود ہوتا۔

قرآن کریم تمام انسانوں کو صلاحیت اور اخلاقی برتری کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے یکساں قرار دیتا ہے وہ جماعت سازی اور معاملات کے فیصلہ کرنے میں مشاورت کو لازم قرار دیتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد معاملات حیات کے فیصلوں میں شرکت کر سکیں۔ اسلام نہ موروثی حکومت کو جائز سمجھتا ہے اور نہ ایسے سیاسی نظام کو تسلیم کرتا ہے جو جابرانہ قوانین اور قوت کے استعمال سے اللہ کے بندوں پر قابض ہو جائے۔ اسلام صرف شورائیت پر مبنی انتخابی سیاست یعنی خلافت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے قیام کی جدوجہد کو اہل ایمان پر فرض قرار دیتا ہے۔

خلافت وہ عادلانہ، متوازن اور افراط وتفریط سے پاک نظام ہے جو ایک طرف خلیفہ کو پوری امت کا سربراہ بناتا ہے تو دوسری طرف اسے مسلمانوں کا خادم قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیام ودوام خلافت کسی قوم، گروہ یا طبقے کی ضرورت ہی نہیں نوع انسان کی فلاح وبہبود کا مسئلہ ہے۔ یہ قائم ہوگی تو انسانیت کی گاڑی بطریق احسن رواں دواں رہے گی ورنہ دنیا والے مصائب وآلام کی دلدل میں پھنستے ہی چلے جائیں گے۔

ہمارے تمام مسائل کا حل صرف اور صرف قیام خلافت میں ہے۔ اس لیے مسلمانانِ عالم کے حکمرانوں کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ ایک مثالی اسلامی ریاست قائم کریں۔ اس کی تشکیل اور بناوٹ کے لیے مدینہ کی اولین اسلامی ریاست اور سلطنت خلافت راشدہ کے داخلی اور خارجی امور کو بطور مثال سامنے رکھیں۔ اسی میں امت مسلمہ کی بقا مضمر ہے۔

انتخاب موضوع کے اسباب

موضوع زیر بحث کے ضمن میں اگر پہلے سے موجود تحقیقی اور علمی مواد کا جائزہ لیا جائے تو اس موضوع پر بھی تصانیف کا ذخیرہ موجود ہے۔ متقدمین ومتاخرین کی اسلامی ریاست وسیاست کے عنوان پر کتب موجود ہیں جو عصر حاضر کی زمانی ومکانی تبدیلیوں اور سیاسی نظام کی ہمہ جہت ضروریات اور تقاضوں کو موثر انداز میں پورا نہیں کرتیں۔ تاہم بعض فقہاء اور محققین نے اس موضوع پر جزوایا جبا بحث کی ہے، جن میں تیسری صدی ہجری کے امام ابن قتیبہؒ، پانچویں صدی ہجری کے نظام الملک طوسی، ابوالحسن علی الماوردی، امام غزالیؒ، علامہ ابن خلدون، ساتویں صدی ہجری کے نامور سیاست دان امام ابن تیمیہؒ، ان کے شاگرد امام ابن القیمؒ، بیسویں صدی کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، علامہ اسدؒ اور اکیسویں صدی کے ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ، ڈاکٹر خالد علویؒ، ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ، ڈاکٹر اسرار احمدؒ ہیں، جنھوں نے علمی وفکری چیلنجوں کا اپنے اپنے انداز میں جائزہ لیا اور اپنی بصیرت کے مطابق مسلم امہ کے لیے بہترین لائحہ عمل کی نشاندہی کی۔ جن کا تعلق عصر حاضر کے گھمبیر مسائل اور عوام الناس کی فلاح وبہبود سے ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر جدید اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی کے تناظر میں تحقیقی مطالعہ کی اشد ضرورت پیش آئی تاکہ اس کے امثال و نظائر کو پیش نظر رکھتے ہوئے آج کی جدید اسلامی مملکت میں اسلام کا نظام رائج کیا جا سکے کیونکہ اسلامی دنیا میں کہیں بھی مستقبل پر نظر رکھنے والا ترقی پسند، روشن خیال، عادلانہ، منصفانہ، فلاحی معاشرہ نظر نہیں آتا جس کی تشکیل کے لیے ہمارا تجزیہ کیا گیا، ہمیں علم عطا ہوا اور دانائی سکھائی گئی۔

مندرجہ بالا گفتگو کے تحت اس موضوع کی اہمیت مزید واضح ہوتی ہے کہ اس پر شرح وبسط کے ساتھ تحقیق کی جائے اور اس کے مخفی گوشوں کو منصۂ شہود پر لایا جائے، اس کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں:

(i) اسلامی مملکت سے مراد قرآن وسنت اور تعامل صحابہ کی روشنی میں مطلوب ایک ایسی مملکت ہے جو اپنے اندر الہامی اور آفاقی پروگرام

رکھتی ہو۔

(ii موضوع کا منظم، تحقیقی اور مربوط مطالعہ اس انداز سے کرنا کہ اسلامی مملکت کے خدوخال اور عوامل حقیقی مقاصد کی صورت میں سامنے آسکیں اور وہ اپنا عالمگیر کردار دنیا کے سامنے پیش کر سکے جس سے عصر حاضر کی مسلم ریاستوں کو رہنمائی کے لیے واضح نصب العین میسر آسکے۔

(iii عہد نبوی ﷺ اور خلافتِ راشدہ کی اسلامی مملکت کا دورِ جدید کی اسلامی مملکت کے ساتھ موازنہ کرنا تاکہ معلوم ہو سکے کہ حقیقی اسلامی ریاست کا وجود کہیں پر ہے بھی یا نہیں۔

اس مقالہ میں انہی ضرورتوں کے تحت تحقیق کی گئی ہے اور عصری اسلامی مملکت کے سامنے ایسا لائحہ عمل رکھا گیا ہے جسے مدنظر رکھ کر وہ حقیقی اسلامی ریاست کا ثبوت دے۔

اسلوب تحقیق

مقالہ ہٰذا ''عصری اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی کے اہداف و مقاصد، عہد رسالت و خلافت راشدہ کی روشنی میں تحقیقی جائزہ'' میں آغاز تا آخر تحقیقی، اطلاقی، تجزیاتی اور تقابلی انداز تحقیق اختیار کیا گیا ہے۔ جدید فکری رجحانات سے تقابل کیا گیا ہے۔ بے جا طوالت، تکرار مضامین اور غیر ضروری بحث سے اجتناب کیا گیا ہے۔

مقالہ میں گہری فکر اور پس منظر کو واضح کرنے کے لیے امکانی حد تک بنیادی مصادر سے رجوع کیا گیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتے ہوئے قرآن، کتب تفسیر، احادیث نبویہ، شروحات نبویہ، کتب سیرت النبیؐ، کتب خلفائے راشدین، انگریزی کتب، رسائل و جرائد اور اخبارات سے استشہاد و استدلال پیش کیا گیا ہے۔

مقالہ ہٰذا کو تحریر کرنے میں درج ذیل امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

☆ ہر صفحہ کے آخر میں کتب کے حوالہ جات فٹ نوٹ کی صورت میں مرتب کیے گئے ہیں۔ مزید برآں ضروری وضاحت بھی فٹ نوٹ میں ہی دے دی گئی ہے۔

☆ پہلی دفعہ کتاب کا حوالہ لکھنے کے لیے پہلے مصنف کا نام، کتاب کا نام، مطبعہ، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد نمبر اور پھر صفحہ نمبر درج کیا گیا ہے۔

☆ مصنفین کے نام کا مشہور و معروف جزو پہلے لکھا گیا ہے۔

☆ مقالہ میں کسی بھی کتاب کے حوالہ کے لیے پہلی بار اس کا پورا حوالہ دیا گیا ہے، بعد ازاں صرف کتاب کا نام، جلد نمبر اور صفحہ نمبر پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

☆ عربی اور انگریزی عبارات کا اکثر مقامات پر ترجمہ لکھا گیا ہے، مگر بعض مقامات پر طوالت کے اندیشہ سے مفہوم پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

☆ متصل حوالہ آنے پر پہلی بار کتاب کا نام درج ہے جبکہ دوبارہ آنے کی صورت میں ''ایضاً'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ انگریزی کتب میں مذکورہ صورت میں "Ibid" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور اگر صفحہ نمبر مختلف ہے تو اس کا نمبر دیا گیا ہے۔

☆ متن میں اقتباس کو واوین '' '' میں درج کیا گیا ہے۔

☆ حاشیہ میں اقتباس کو ''واوین'' میں لکھا گیا ہے اور اس کے خاتمہ پر قوسین (   ) میں اس کا ماخذ دیا گیا ہے۔

☆ جہاں ایک ہی بیان یا دعوے کے ایک سے زائد حوالے آئے ہیں تو سب کو یک سطر میں لایا گیا ہے اور درمیان میں سیمی کولن (؛) لگایا گیا ہے۔

☆ بنیادی ماخذ کے تمام حوالے عربی کتب سے دیئے گئے ہیں اور جن کتب کے اردو تراجم موجود ہیں، ان سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے، اگر روایت کا تعلق محض واقعاتی بیان سے تھا، تو ویسے ہی لے لیا گیا ہے لیکن جہاں کہیں اہم تصوریات بطور اصول بیان ہوا ہے اس کے ترجمے کو اصل عربی متن کے ساتھ رکھ کر جانچا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ایسا ترجمہ کیا جائے جو عبارت کے مفہوم کو زیادہ بہتر انداز میں واضح کر سکے۔

☆ چند روایات میں جن کی اصل کتاب تک رسائی نہیں ہو سکی قابل اعتماد ضمنی ماخذ کا حوالہ بھی موجود ہے۔

☆ آیت مبارکہ کا حوالہ۔ سورت کا نام، سورت کا نمبر اور آیت نمبر درج کیا گیا ہے اور اسے ﴿ ﴾ یوں لکھا گیا ہے۔

☆ حدیث کا حوالہ۔ حدیث مبارکہ کی کتاب کا نام، باب کا نام اور حدیث نمبر لکھا گیا ہے۔ حدیث مبارکہ کا متن عبارت کی صورت میں درج ہے۔

☆ رسالہ کا حوالہ: مصنف کا نام، مضمون کا نام، رسالہ کا نام، مقام اشاعت، جلد، شمارہ، تاریخ اشاعت اور صفحہ، جب دوبارہ حوالہ دیا گیا ہے تو پھر مصنف کا نام، مضمون کا نام، رسالہ کا نام، حوالہ مذکور، صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔

☆ اردو اور انگریزی اخبار کا حوالہ: اخبار کا نام، مقام اشاعت اور تاریخ اشاعت درج کی گئی ہے۔

☆ ویب سائٹ کا حوالہ: مصنف کا نام، مضمون کا نام اور اس کے بعد ویب سائٹ کا مکمل پتہ دیا گیا ہے جبکہ مصادر و مراجع میں صرف ویب سائٹ کا نام دیا گیا ہے۔

☆ اشاریہ۔ آخر میں اشاریہ مرتب کیا گیا ہے، جس میں آیات، احادیث، اصطلاحات، اعلام اور اماکن کی فہرستیں حروف ہجائیہ کے اعتبار سے تیار کی گئی ہیں۔

☆ مقالہ کے آخر میں تمام کتابیات (جن سے استفادہ کیا گیا ہے) کا حوالہ مصادر کے عنوان کے تحت حروف تہجی کی ترتیب سے کیا گیا ہے۔

☆ مصادر و مراجع کا تحریری انداز بدل کر لکھا گیا ہے۔ مثلاً عربی کتب کے لیے "عربی ٹیکسٹ"، اردو کتب کے لیے "نوری نستعلیق" اور انگریزی کتب کے لیے "Italic" کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

مقالہ ہذا کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس کا ذیل میں اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

باب اول میں داخلہ پالیسی کا معنی و مفہوم اور ریاست میں اس کی ضرورت و اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ مثالی داخلہ پالیسی کے خدوخال میں اسلامی نقطۂ نگاہ کا مغربی نقطۂ نگاہ سے تقابل کیا گیا ہے کہ کون سا نقطۂ نگاہ عصر حاضر کے تقاضوں میں اپنی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

باب دوم میں اسلامی ریاست کی جداگانہ نوعیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ دیگر ریاستوں سے مختلف حیثیت کی حامل ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایجابی، فلاحی اور دینی ریاست ہے۔ بعد ازاں اسلامی ریاست کے جداگانہ مقاصد میں اہم نکات زیر بحث لائے گئے ہیں۔

باب سوم میں داخلہ پالیسی کے حوالے سے اعضائے ریاست کے دائرہ کار، دائرہ اختیار اور ان کے باہمی تعلق کو شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں داخلہ پالیسی کے استحکام کیلئے مرکز اور صوبوں کے تعلقات کی نوعیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

باب چہارم میں داخلہ پالیسی کے ایجابی پہلوؤں پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس ضمن میں ایسی مؤثر حکمت عملی بیان کی گئی ہے جو ریاست کی بنیادوں کو استوار کرتی ہو۔

باب پنجم میں داخلہ پالیسی کے سلبی پہلو نمایاں کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ ان کی موجودگی میں ریاست عدم استحکام کا شکار ہو جاتی ہے، لہٰذا ان پہلوؤں کے تدارک کے لیے عمال حکومت کا کردار بڑا ناگزیر ہے بشرطیکہ نگرانی واحتساب کا عمل جاری وساری ہو۔

باب ششم میں داخلہ پالیسی کے عصری مسائل اور تقاضوں کا حل ٹھوس دلائل اور تجاویز وسفارشات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم کس طرح ان مسائل سے نبرد آزما ہو کر داخلہ پالیسی کے اہم شعبوں اور اصولوں کو مضبوط کر سکتے ہیں۔

میں نے اسے مقدس کام سمجھ کر خلوص، ذمہ داری اور دیانت داری سے سرانجام دینے کی کوشش کی ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے اجر اور دوسروں کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنائے گا۔

اگرچہ موضوع کے حوالے سے مواد کو جمع کرنے اور اسے احسن انداز میں مرتب کرنے کی بے حد کوشش کی گئی ہے۔ کتب کی تلاش، مواد کی تحقیق، سکالر اور علماء سے رابطے، موضوع بنانے اور مواد کو مرتب کرنے میں بھرپور سعی وکاوش کی گئی ہے اور موضوع کا مکمل احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے جو محنت وکاوش کی گئی ہے، امید واثق ہے کہ وہ رائیگاں نہیں جائے گی اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے۔ (آمین)

وما توفیقی الا باللہ

فہرست مضامین

باب سوم: داخلہ پالیسی کے حوالے سے اعضائے ریاست کا باہم تعلق

فصل اول: انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے دائرہ کار اور دائرہ اختیار

باب چہارم: اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی کے ایجابی پہلو

فصل اول: قیام عدل اور بنیادی حقوق کے حوالے سے پالیسی

باب اول

داخلہ پالیسی، تعارف وخدوخال

فصل اول: داخلہ پالیسی کا معنی و مفہوم اور ضرورت واہمیت

فصل دوم: مثالی داخلہ پالیسی کے خدوخال

داخلہ پالیسی.........تعارف

حکومت کے کاموں میں ایک نہایت اہم کام پالیسی بنانا ہے۔ انتظامیہ کا بیشتر وقت انہی پالیسیوں پر عمل درآمد کروانے پر صرف ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک نہایت سادہ اور آسان سی بات معلوم ہوتی ہے کہ عوام کے رہن سہن کے اصول وضوابط، ان کی روزمرہ ضروریات کی تکمیل اور ان کے ذریعہ معاش کے طریقوں کو ان کے منتخب نمائندوں کے ذریعے حکومتی پالیسیوں کے قالب میں ڈھالنا۔ مگر حقیقت میں یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ امر ہے۔

ایک اصولی اور نظریاتی ریاست داخلی امور میں اپنے بنیادی اصول وضوابط اور تصورات ونظریات پر کاربند رہنے کی پابند ہوتی ہے۔ یہی اس کی داخلہ پالیسی ہے جو اس کے ضمیر کی عکاس اور عزائم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

داخلہ پالیسی کے اہم مقاصد میں علاقائی امن، معاشی وسماجی بہبود اور ملکی سرحدوں کا تحفظ شامل ہے۔

داخلہ پالیسی کا معنی ومفہوم

اردو لغت میں "پالیسی" کے لئے حکمت عملی اور تدبیر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربی میں اس کے لئے خُطّۃٌ، حِکْمَۃٌ، تَدْبِیْرٌ، سِیَاسَۃٌ، مَوْقِفٌ، نظامٌ اور حُسْنُ الْاِدَارَۃِ کے الفاظ آئے ہیں۔

علامہ وحید الزمان کیرانوی رحمہ اللہ "پالیسی" کے معنی ومفہوم میں لکھتے ہیں:

سیاست، ملکی معاملات کے تدبیر وانتظام، معاملات کی نگہداشت، حکمت عملی، تدبیر، اصول جہان بانی اور اصول حکمرانی ہے۔[۱]

علامہ ابن اثیر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"القیام علی الشیء بما یصالحه"[۲]

کسی عمل کے لئے ایسی تدابیر اختیار کرنا جن سے اس کی اصلاح ہو جائے۔

تھامس برک لینڈ (Thomas Birkland) پالیسی کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

"Policy as a statement by Govenment of what it intends to do or not to do, such as a law, regulation, ruling, decision, or order, or a combination of these".(3)

پالیسی حکومت کا ایک ایسا لائحہ عمل ہے جس میں وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا قصد کرتی ہے جیسا کہ قانون، ضابطہ، فیصلہ، حکم یا ان سب کا امتزاج ہے۔

۱۔ القاموس الجدید، بذیل مادہ (سوس)

۲۔ ابن اثیر، الجزری، ابو السعادات، مبارک بن محمد، النهایة فی غریب الحدیث والأثر، طبع اسماعیلی، ایران، ۱۲۸۵ھ، ۴۲۱/۲

(3) *Birkland, Thomas A, An Introduction to the policy process. Theories, Concepts, and Models of public policy making, publisher, M E, Sharpe, Inc, Armonk, New York, . 1984, P-203*

آکسفورڈ ڈکشنری میں پالیسی کی بڑی جامع و واضح تعریف کی گئی ہے۔

"An organized and established system or form of government or administration (of a state or city) a constitution, Polity". (1)

ایک منظم و مضبوط نظام یا حکومتی ہیئت یا انتظامیہ (ریاست یا شہر کی) ایک آئین یا نظام حکومت ہے۔

گویا بامقصد کام کو پالیسی کہا جاتا ہے، پالیسی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک خارجہ پالیسی اور دوسری داخلہ پالیسی ہوتی ہے۔ خارجہ پالیسی سے مراد کسی ملک کا ہمسایہ اور دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرنا اور انہیں فروغ دینا ہے۔ کسی ریاست کی خارجہ پالیسی، اس کی تاریخ، جغرافیہ، محل وقوع، سیاسیات یا اس کے قومی مفاد کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے۔ جب کہ داخلہ پالیسی سے مراد کسی ملک میں عوام کی معاشی اور سماجی ضروریات کی تکمیل، امن وامان کا قیام اور فلاح و بہبود کو فروغ دینا ہے۔ جس کے لئے حکومت ایسے قوانین، فیصلے اور منصوبے تشکیل دیتی ہے جو ملک میں براہ راست نافذ ہوتے ہیں۔

متقدمین میں سے الفارابی نے داخلی امور کے لئے سیاست مدن، کا لفظ استعمال کیا ہے جب کہ متاخرین نے اس کے لئے نظم و نسق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

عہد جدید میں داخلہ پالیسی کے لئے سیاسة داخلیة اور داخلیة کی اصطلاحات مشہور و معروف ہیں۔

قدیم و جدید انگریزی ڈکشنری اور انسائیکلوپیڈیا میں داخلہ پالیسی کی Internal، Interior، Domestic اور Stratigic کے الفاظ کے طور پر لیا گیا ہے۔

اگر ان تمام الفاظ کا تجزیہ کیا جائے تو سب کا معنی و مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے اندرونی و داخلی امور کو استحکام بخشنا اور برقرار رکھنا ہے۔ گویا ملک کی حدود میں حکومت کی طرف سے قائم کئے گئے اصول و ضوابط کا نام داخلہ پالیسی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"Domestic policy, also known as public policy, presents decisions, laws, and programs made by the government which are directly related to issues in the country". (2)

داخلہ پالیسی کو عوامی پالیسی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ملکی معاملات سے بلاواسطہ تعلق رکھنے والے فیصلے، قوانین اور پروگرام پیش کرتی ہے۔

"Policies related to a country's internal affairs". (3)

پالیسیاں ملک کے اندرونی معاملات سے متعلق ہوتی ہیں۔

---

(1) *The Oxford English Dictionary, Vol: X11, P-26*

(2) *http://en.wikipedia.org/wiki/domesticpolicy*

(3) *http://alaskapublicrecordsearch.org/511*

تھامس برک لینڈ (Thomas Birkland) عوامی پالیسی کو حکومت کی ذمہ داری قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں.

"Public policy is, in general, what the government, acting on our behalf, chooses to do or not to do". (1)

عوامی پالیسی عموماً ہماری جانب سے حکومت کے منتخب کردہ اوامر و نواہی ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوا کہ داخلہ پالیسی درحقیقت عوام الناس کی فلاح و بہبود، ترقی و خوشحالی، امن وامان اور انصاف کو بروئے کار لانے کا نام ہے۔

داخلہ پالیسی کی ضرورت واہمیت:

انسانی ترقی اور نشوونما کے لیے بہتر ماحول ایک بنیادی ضرورت ہے۔ بہتر ماحول کی فراہمی کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے عوام کی سوچ اور امنگوں کے مطابق ایسی داخلہ پالیسیاں تشکیل دی جائیں جن میں جبر کا ماحول پیدا کئے بغیر ذاتی احساس کی بناء پر بھلائی کے فروغ اور برائی کا راستہ روکنے کو یقینی بنایا جائے اور افراد معاشرہ میں خدا خوفی، دیانت داری، قانون پسندی اور رواداری کی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔ انسانی حقوق کی پاسداری اور مرد و خواتین کے مابین توازن کی بنیاد پر کردار کا تعین ہو تا کہ ہر فرد کی استعداد کار میں اضافہ اور صلاحیتوں کا بہتر سے بہتر استعمال ممکن ہو۔

ریاست کے داخلی نظم ونسق میں جو چیز سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انتظام کے تمام ادارے ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ الگ ہوں۔ معاشرے کی ترقی اور استحکام کے لیے سب سے اہم دلیل یہی چیز ہے۔ تمام امور سے متعلقہ ادارات اور صیغے جتنے زیادہ منظم اور ترقی یافتہ ہوں ریاست و معاشرہ بھی اتنا ہی متمدن اور مستحکم ہوگا۔

داخلی نظم ونسق افراد معاشرہ کے باہمی تعلقات کی تنظیم ہے جس میں سب کے مفاد کی ضمانت ہے اور اس کے علاوہ شرعی نصوص وضوابط ہیں جن سے اسلام کا سیاسی نظام تشکیل پاتا ہے اور علاقوں کا امن اور لوگوں کا سکون یقینی ہو جاتا ہے۔ ریاست کی حدود کے اندر ہر قسم کے انتظامات داخلی نظم ونسق میں شامل ہیں۔ ان انتظامات کا تعلق براہ راست عوام الناس کے ساتھ ہوتا ہے اور ان کی انجام دہی کے لئے عوامی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں۔ ریاست کی داخلی حدود میں امن وامان کے قیام کی ذمہ داری ابتدائی طور پر انتظامیہ کے صیغۂ پولیس کے ذمہ ہوتی ہے۔

نظم ونسق کی تقسیم کے بارے میں پرفنر (Pnffner) لکھتے ہیں کہ.

Public policy emanated in law, provides the frame work with in which public administration works, as a result the activities of great departments, agencies regulatory commisions and officials are circumscribed by legal implications".(2)

عوامی پالیسی جو قانون سے مسترشح ہے ایک ڈھانچہ فراہم کرتی ہے، جس کے اندر نظمیہ عامہ کام کرتی ہے۔ نتیجۃً یہ قانونی مضمرات

---

(1) *An Introduction to the policy process, P-203*

(2) *Prifiner T M and Robert V Presthus, Public Administration, The Ronald Press, Company, New York, 1960, P-4*

بڑے محکموں، اداروں، انضباطی کمشنوں اور سرکاری اہلکاروں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔
دائرہ کار کے اعتبار سے انتظامیہ ان تمام امور کو سرانجام دیتی ہے جو حکومت کی سول ایجنسیوں (محکمے) کے دائرہ عمل میں شامل ہیں۔ اس طرح یہ مملکت کے سیاسی امور کی تکمیل میں معاون ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ میں مرکزی نظام نہ تھا اور آپ ﷺ کی اس وقت متعدد فوری سیاسی ضرورتیں حسب ذیل تھیں۔

i۔ اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین
ii۔ مہاجرین مکہ کے توطن اور گزر بسر کا انتظام
iii۔ شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ
iv۔ شہر کی سیاسی تنظیم و فوجی مدافعت کا اہتمام
v۔ قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچائے گئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ[1]

ان اغراض و مقاصد کے لئے نبی کریم ﷺ نے مدینہ آنے کے چند ماہ بعد ہی ایک دستاویز مرتب فرمائی جس کا مقصد شہر مدینہ کو پہلی دفعہ ''شہری مملکت'' قرار دینا اور اس کا انتظام و دستور مرتب کرنا تھا''[2]

اس دستاویز کے ذریعے جسے ڈاکٹر حمید اللہ فرض اور عمل قرار دیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ کی شہری ریاست کو ایک مستحکم نظم سیاست دیا اور اس کے لئے خارجی مسائل سے نمٹنے کے لئے بنیاد قائم کی۔[3]

بحیثیت حکمران و سیاست دان آپ ﷺ نے امور داخلہ میں خصوصی توجہ امن و استحکام اور اخلاقی تربیت پر دی اور ان امور کو جس سلیقے سے ملحوظ خاطر رکھا وہ سیاسی تدبر و فراست کا بین ثبوت ہیں۔

داخلہ پالیسی ریاست کے مفادات کا تحفظ، لوگوں کے مابین ثقافت، مذہب اور عقیدہ کی بنیاد پر رونما ہونے والے اختلافات کا خاتمہ کرتی ہے اور مفاد عامہ کو فروغ دیتی ہے:

"A nation's form of government largely determines how its domestic policy is formed and implemented. Under authoritarian government, a ruling group may pursue its domestic policy goals without the input or consent of the people being governed. But in democratic societies, the will of the people has a much greater influence. (4)

ایک قوم کی ہیئت حکومت بڑی حد تک تعین کرتی ہے کہ اس کی داخلہ پالیسی کیسے بنائی گئی ہے؟ اور اس پر عمل درآمد کیسے ہوا ہے؟ آمرانہ حکومت کے تحت حکمران طبقہ اپنی داخلہ پالیسی کے مقاصد پر لوگوں کی رائے اور نتائج سے قطع نظر پیروی کرتا ہے۔ لیکن جمہوری معاشروں میں عوامی رائے کہیں زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔

---

1. حمید اللہ، ڈاکٹر، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، مطبع اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۸۲
2. ابن سعد، محمد بن منیع، الطبقات الکبری، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۶، ۲۹/۲
3. عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، ص ۸۲

(4) http://en.wikipedia.org/wiki/domesticpolicey

پالیسی کو صحیح طور پر تشکیل دینے کے لئے اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ہر پہلو کو سمجھنا ایک اہم مقصد ہے تا کہ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ اس کو کیسے بنایا جائے اور پھر اس کے کیا نتائج اخذ ہوں گے۔

اس ضمن میں تھامس برک لینڈ (Thomas Birkland) لکھتے ہیں

"Since we usually think of individual policies as statements of the things the government does intend to do, it is useful to consider how these policies are written down and codified. After all, if policies were not made public in some way, it would be very diffcult to discern the government's intent in enacting the policy. and it would be difficult for those affected by the policy. the people we call the targets of policies.. to understand what government expects of them " (1)

چونکہ عموماً انفرادی پالیسیوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حکومت کے کاموں کی توضیح ہے جن کو وہ کرنے کا ارادہ کرتی ہے۔ یہ غور کرنا مفید ہے کہ یہ پالیسیاں کیسے تحریر ومدون ہوئی ہیں۔ اگر پالیسیاں کسی وجہ سے عوام میں مقبول نہیں تو ان کے وضع کرنے میں حکومتی ارادوں کو بھانپ لینا مشکل ہو جاتا ہے (اور پھر متاثرین پالیسی کے لیے دشوار ہوگا) کہ وہ سمجھ سکیں کہ (وہ لوگ جن کو ہم ان پالیسیوں کے اہداف ومقاصد کہتے ہیں) حکومت ان سے کیا امید رکھتی ہے۔

فتحی الدریني رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"تعهد الأمر بما يصلحه أحكام ونظم وقوانين تعالج به شوؤن المسلمين من الناحية الدستورية، والمالية والمدنية، والأمنية، وجميع نواحي الحيوة الداخلية، والخارجية"[2]

ایک کام کی ذمہ داری ایسے طریقے سے سنبھالنا کہ اس سے کام کی اصلاح ہو جائے یعنی یہ ان احکام، نظم اور قوانین سے عبارت ہے جن کے توسط سے مسلمانوں کے کام کی اصلاح ہوتی ہے، قانون، مال، شہریت، امن اور زندگی کے تمام جہات سے چاہے خارجی ہوں یا داخلی۔

عوام الناس کے کاموں کی اصلاح کے لئے حکومت اہداف ومقاصد معلوم کرتی ہے اور ان کے حالات کی اصلاح کے لئے لازمی تدبیر اختیار کرتی ہے۔

قاضی عبدالنبی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"علم بمصالح جماعة متشاركة في المدينة ليتعاونوا وعلى مصالح الأبدان وبقاء نوع الانسان فان للقوم أن يعاملوا النبي والحاكم والسلطان كذا. وللنبي والحاكم والسلطان أن يعامل كل

---

(1) *An Introduction to the policy process, P-204*

۲۔ الدريني، فتحي، محمد عثمان، من أصول الفكر السياسي الاسلامي، طبع مؤسسة الرسالة، بيروت، س-ن، ص ۱۹۳

منهم قومه رعيته ورعايته كلها"[1]

جماعت اور ریاست کی مشترکہ مصالح کا علم اس لئے حاصل کرنا کہ ایک دوسرے کے بدنی مصالح پر تعاون اور نوع انسانی کی بقا ہو سکے پس بلاشبہ قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیامبر، حاکم اور بادشاہ سے اچھا سلوک کرے اور اسی طرح پیامبر، حاکم اور بادشاہ اپنی قوم سے اچھا معاملہ رکھیں اور اس کی مصلحت کا خاص خیال رکھیں۔

پالیسی بنانے کے لئے اہل تر اور مفید شخص کو ترجیح دینا، شرعی مقاصد کو یقینی بنانے کے لئے اسلامی شریعت میں ضمانت شمار ہوتی ہے اور ان ضمانتوں میں سے ہے، جن کی شریعت نے تاکید کی ہے۔

یحزکل ڈرار(Yehezkel Drod)داخلہ پالیسی کو تشکیل دینے میں پالیسی سازوں کی تربیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"The required performance of rulers and their relative importance depend on situations. However, a core function of all rulers is to fulfill a major and often critical role in decision making and in particular grand-policy crafting."(2)

حکمرانوں کی مطلوبہ کارکردگی اور ان کی متعلقہ اہمیت حالات پر منحصر ہوتی ہے تاہم تمام حکمرانوں کا سب سے اہم کام فیصلہ سازی اور خصوصاً بڑی پالیسی تشکیل دینے میں بڑا اہم اور اکثر اوقات سنجیدہ کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔

داخلہ پالیسی کی بنیادیں دراصل ملک کے سیاسی ڈھانچے میں دور رس ہوتی ہیں۔ یہ پالیسی بے شمار گروہوں اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے گروہوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ بہت سے ذاتی مفادات رکھنے والے طبقے اسے مرتب کرنے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

کسی مملکت کی داخلہ پالیسی کی بدولت ہی حکمران اور اس کے وزراء کے کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر وزراء دلجمعی اور خلوص نیت سے کام کریں اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں تو بہتر پالیسیوں کی تشکیل کوئی بڑا مسئلہ نہ ہو۔ لیکن ایسا نہ کرنے کی وجہ سے ایک اچھا حکمران بھی پالیسی بنانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ تاہم پالیسی ساز حکمران کی کارکردگی کو بڑھانے کے لیے اقدامات کرنا اشد ضروری ہے۔

وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ نئی پالیسیاں مرتب کرنا اور انتظامیہ کے مختلف اداروں میں بنیادی تبدیلیاں لانا ضروری ہے تاکہ انہیں اندرونی طور پر منظم کر کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔

---

١ ۔ قاضی، عبد النبی، دستور العلماء أو جامع العلوم في اصطلاحات الفنون، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، ٢٠٠٠م، ٢، ١٤٠

(2) *An Introduction to the Policy Process, P-80*

مثالی داخلہ پالیسی کے خدوخال ـــــ اسلامی نقطۂ نگاہ

حاکم کی ذمہ داریوں کو شریعت نے اللہ کی حاکمیت، اس کی وفاداری اور اس کی مکمل سیادت کے دائرے میں محدود کر دیا ہے۔ ان ذمہ داریوں میں عوام کو ضروریات زندگی بہم پہنچانا، حکومت و سیاست میں رعایا کو شریک کرنا، منصفانہ نظام معیشت قائم کرنا، ملکی و ملی ترقی کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہنا اور نظام اخلاق کو بلند کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ حکمران خواہ کتنا ہی بااختیار ہو ان ذمہ داریوں کو تنہا سرانجام نہیں دے سکتا۔ ان کو بروئے کار لانے کے لئے ایک منظم مشینری کی ضرورت ہوتی ہے جو ریاست میں مثالی پالیسیوں کو اس کی سرپرستی میں مرتب کرے۔

نظام حکمرانی کا اصل مقصد اداراتی ڈھانچوں میں فیصلہ سازی کے طریقوں کو منظم و مربوط کرنا اور انہیں پالیسیوں میں تبدیل کرنا ہے اور ان کے نفاذ کے لئے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ دراصل حکومت ''اقتدار'' ہے اور حکمران اس کی عملی شکل ہے جو عوام الناس کی خدمت کے لیے پالیسیوں کو روبہ عمل لاتا ہے۔

حکمرانی ایک عظیم اور نازک منصب ہے اس کی ذمہ داریاں انتہائی بھاری ہیں اس پر متمکن فرد کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کماحقہٗ احساس کرے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے ریاست کی مضبوطی، حکومت کے بھرم، ساکھ کی بقا اور اپنی پالیسیوں کے تسلسل کے لیے وصیت کی کہ

''آپ رضی اللہ عنہ کے عمال کو ایک سال تک اپنے عہدوں اور علاقوں میں بحال رکھا جائے''[1]

اس لئے ضروری ہے کہ حکمران کا انتخاب ذہانت، قابلیت، تخلیقی سوچ اور اخلاق کی بنیاد پر کیا جائے۔ وہ قانون اور اصول کا سخت پابند ہو تاکہ وہ فرائض کو بخوبی سرانجام دے سکے۔

امام ابوالحسن الماوردی نے حاکم کے فرائض میں خاص طور پر اُن عوامل کا تذکرہ کیا ہے جو کسی علاقے یا شہر کے داخلی استحکام میں بڑے سودمند ثابت ہوتے ہیں۔

> "تنفيذ الأحكام بين المتشاجرين وقطع الخصام بين المتنازعين حتى تعم النصفة، ولا يتعدى ظالم ولا يضعف مظلوم، حماية البيضة والذب عن الحريم ليتصرف الناس في المعايش وينتشروا في الأسفار آمنين من تغرير بنفس أو مال.... أن يباشر بنفسه مشارفة الامور وتصفح الأحوال، لينهض بسياسة الأمة وحراسة الملة، ولا يعول على التفويض تشاغلاً بلذة أو عبادة، فقد يخون الأمين ويغش الناصح"[2]

حاکم جھگڑا کرنے والوں میں احکام شرعیہ کے مطابق فیصلہ کرکے مخاصمتیں دور کرے اور عدل و انصاف کے ساتھ اس طرح حکمرانی کرے کہ کوئی طاقتور کسی کمزور پر زیادتی اور ظلم نہ کر سکے۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کرے اور ایسی حالت میں امن برقرار رکھے تاکہ لوگ آرام و سکون سے اپنے کاروبار میں مصروف رہیں اور سفروں میں نفس اور مال کو بچانے کے لیے امن کو برقرار رکھے۔ تمام امور سلطنت کی نگرانی کرے اور جملہ حالات و واقعات سے باخبر رہے ۔ اس لیے امت کی تدبیر اور ملی خدمات کے لیے اپنے آپ کو بیدار رکھے۔ یہ نہ ہو کہ خود عیش و عشرت میں پڑ جائے یا عبادت میں مصروف ہو جائے اور اپنے فرائض اور ذمہ داریاں دوسروں کے حوالے کر دے۔ اس لیے کہ ایسے حالات میں تو دیانت دار بھی خائن ہو جاتا ہے اور وفادار کی نیت بھی خراب ہو جاتی ہے۔

۱۔ الطبقات الکبری، ۳/۳۵۹

۲۔ ماوردی، ابوالحسن، علی، الاحکام السلطانیۃ فی الولایات الدینیۃ، شرکۃ دار الارقم بن أبی ارقم، بیروت، لبنان، س ن، ص ۷۶

اسلامی مملکت کی قیادت ایسے لوگوں کے سپرد کرنی چاہیے جو بیک وقت دینی اور سیاسی قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں تاکہ مملکت کے تمام ذرائع اور وسائل مقاصدِ دینی کی تکمیل میں صرف ہو سکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ شخصیات علم و فضل، تقویٰ و دیانت میں ممتاز ہونے کے ساتھ ساتھ مملکت کے نظم و نسق کو چلانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں اور انہیں عوام کی تائید و حمایت بھی حاصل ہو۔

اسلامی حکومت میں داخلی امن و نظم کا کام امورِ داخلہ سے متعلق ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں سب سے پہلے امورِ داخلہ کی طرف توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں اپنی حکمتِ عملی کی بنیاد حسب ذیل امور پر رکھی۔

۱۔ مدینہ طیبہ کو نظمِ مملکت کا مرکز قرار دیا اور داخلی نظام کے تمام شعبوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔

۲۔ یہود (بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع) مدینہ کے اطراف میں قلعہ بند مکانوں اور برجوں میں بود و باش رکھتے تھے۔ دولت مند تھے، بااثر تھے اور جنگ کا ساز و سامان رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے معاہدہ کیا "انہیں مذہبی آزادی حاصل رہے گی اور وہ زمانہ امن میں مسلمانوں کے حلیف اور زمانہ جنگ میں رفیق متصور ہوں گے"[۱]

چنانچہ اس معاہدہ سے آغاز کار میں معاملاتِ داخلہ کی تنظیم میں کافی مدد ملی۔

۳۔ مدینہ طیبہ پر اکثر بیرونی حملہ کا خطرہ پیدا ہوتا تھا، آنحضرت ﷺ ایسے مواقع پر فوج کی کمان کے لئے خود باہر تشریف لے جاتے تھے اور اپنی عدم موجودگی میں مدینہ کا داخلی انتظام اپنے نائب الحکومت کے سپرد کر دیتے تھے اس قسم کے نائب ہر ایک غزوہ کے موقع پر مقرر کئے جاتے تھے[۲]

مسلمانوں کی ریاست کا تاریخی ارتقاء رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ ریاست پر ہی ہوا تھا اور آپ ﷺ نے اپنے زمانہ میں جن انتظامی ادارت کی بنیاد ڈالی تھی، بعد میں ان ہی کو مزید ترقی دے کر ایک متنوع اور وسیع نظام کی صورت میں ڈھال دیا گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں داخلی امور کے سلسلہ میں جو اقدامات کئے ان میں عوامی رائے کو ضروری خیال کیا۔ کیونکہ آپ کا طرزِ حکمرانی شخصی نہ تھا بلکہ جمہوری تھا لیکن ایسی جمہوریت نہ تھی جو عصر حاضر میں ہے۔

پروفیسر مسعود الحسن رقمطراز ہیں:

> "In the polity that Hadrat Abubakr administered the will of the people was paramount, but it was subject to divine will, As such the polity was neither theocracy nor democracy in the sense in which the west understands these terms". (3)

حضرت ابوبکرؓ کے نظامِ حکومت میں لوگوں کی رائے مقتدر تھی۔ لیکن یہ رضائے الٰہی کے تابع تھی۔ اس حیثیت سے یہ نظام حکومت نہ تو ملائیت تھا اور نہ ہی جمہوریت پر مبنی تھا ان مفاہیم میں جو کہ مغرب ان اصطلاحات سے لیتا ہے۔

۱۔ طبری، محمد ابن جریر، تاریخ الامم والملوک، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷ء، ۱۶، ۲

۲۔ تاریخ کی کتب میں اس نوع کی ترپن (۵۳) مہمات کا تذکرہ ملتا ہے (تاریخ الامم والملوک، ۳، ۱۷۱)

(3) *Masudul Hassan, Professor, Hadrat Abubakr, Published, Islamic Publications Ltd, Lahore, 1984, P-209*

حضرت عمرؓ کا تصور یہ تھا کہ اسلامی اصول وروایات کی پاسداری کرتے ہوئے نئے تقاضوں کے مطابق پالیسیاں بنائی جائیں اور انہیں انتظامی امور کا جزو بدن بنایا جائے۔ آپؓ کی پالیسیاں اسلام کا طرۂ امتیاز اور بعد میں آنے والے خلفاء کے لئے روشن قندیل بن گئیں۔ عوام کو آپؓ کی پالیسیوں پر اس قدر بھرپور اعتماد تھا کہ اس میں ذرا برابر تبدیلی بھی گوارا نہیں کرتے تھے کیونکہ آپؓ کی تمام پالیسیاں عوامی فلاح و بہبود اور رفاہ عامہ کا شاہکار تھیں۔ آپؓ ایسے نئے نئے ذرائع اور طریقے تلاش کرتے رہتے تھے جن سے عظیم مقصد حاصل ہو سکے۔

امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مشاورت سے نئے خلیفہ کا فیصلہ کرنے لگے تو انہوں نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں سے یہ وعدہ لیا کہ کتاب اللہ اور سنت نبوی ﷺ کے بعد دونوں خلفاء کے طریقے پر چلیں گے"۔[۱]

جب حضرت علیؓ (دارالخلافہ تبدیل کرکے) کوفہ میں آئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ میں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ حضرت عمرؓ کے نافذ کردہ قوانین کو منسوخ کروں۔"[۲]

نظام حکومت کے داخلی امور کے بارے میں رہنمائی عہد نبوی ﷺ اور عہد خلفائے راشدین سے ملتی ہے جنہوں نے بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں پالیسیوں کو مرتب و منظم کیا ہے۔

ڈاکٹر مصلح الدین اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

"The best state is that which is dominated by philosophers, men of reason and intellect, who can very well control and manage, the affairs of state". (3)

بہترین ریاست وہ ہے جس کی حکمرانی فلاسفر کریں جو سمجھ بوجھ اور عقل و دانش کے مالک ہوں اور وہ ریاست کے معاملات کو بہتر طور پر منظم و مربوط کر سکتے ہوں۔

اسلام ایک منظم معاشرہ کا قیام چاہتا ہے جہاں ایک مستقل حکومت ہو، حاکم بھی ہوں، محکوم بھی اور ہر ایک کے حقوق و فرائض متعین ہوں اور دائرہ کار واضح ہو۔ چنانچہ جب ہم قرآن و سنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں امور ملکی کی تنظیم و تنسیق اور حکومتی ذمہ داریوں کی ادائیگی جیسے بنیادی سیاسی اصول پوری طرح روشن نظر آتے ہیں جن کی روشنی میں کسی ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کیا جا سکتا ہے۔

چالیس برس کے مختصر عرصہ میں مسلمانوں نے دو قوی سلطنتوں (ایران و روم) کو فتح کر لیا۔ ریاست کے وسیع تر ہونے کی وجہ سے حکمرانی کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا۔ ایک سلطنت میں، ریاست کی بڑھتی ہوئی وسعت کے باوجود حکمرانوں میں ایسی انفرادی خوبیاں موجود تھیں جو قبل از بعثت نہ دیکھی گئی ہوں۔ افراد معاشرہ کے لئے احکام اور ہدایات نافذ کرنا تو آسان ہے لیکن ایک حکمران کا محاسبہ یہ ہے کہ وہ

۱۔　تاریخ الأمم والملوك، ۲۳۸/٤

۲۔　ابو عبید، القاسم بن سلام، کتاب الأموال، دار الفکر الطباعة والنشر، القاهرة، ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۰

(3)　Islamic and its political system, P-6

ان ہدایات کو دوسروں کی بہ نسبت خود پر کتنا سختی سے لاگو کرتا ہے۔

تقی الدین النبھانی اسلامی ریاست کی داخلہ پالیسی کے اصول وضوابط کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

"The Domestic policy of the Islamic state is to execute the rules of Islam internally. The Islamic state would implement these rules in the land which were under its jurisdiction It organized and supervised relationships and transactions, implemented the hudud, carried out punishments, enforced high morals, ensured the performance of the Islamic rituals and acts of worship, as well as looking after the citizens, affairs according to the rules of Islam".(1)

اسلامی ریاست کی داخلہ پالیسی گویا اسلام کے قوانین کا اندرونی طور پر نفاذ ہے۔ اسلامی ریاست ان قوانین کو اس خطہ میں نافذ کرے گی جس پر اس کے حاکمانہ اختیارات ہوں گے۔ داخلہ پالیسی معاملات، تعلقات، حدود کا نفاذ، سزاؤں کا تقرر، اعلیٰ اخلاق کی تقلید، اسلامی رسومات اور عبادتوں کے طور طریقوں کو یقینی بنانے کا انتظام وانصرام کرتی ہے۔ مزید برآں یہ شہریوں کی دیکھ بھال اور اسلام کے قوانین کے مطابق معاملات کو منظم کرتی ہے اور ان کی نگرانی کرتی ہے۔

اسلامی ریاست میں دراصل انتظامیہ ہی حکومت کی مشینری کو چلاتی ہے، اس لئے وہی قومی پالیسی وضع کرتی ہے اور اس کا مناسب طور پر نفاذ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظامیہ کے اداروں پر عوام کا اعتماد ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب حکومت عوام کو یہ باور کروا سکے کہ سب شہریوں سے یکساں سلوک روا رکھا جائے گا۔

برنٹ (Barnett) اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

"The care of government the Prime Minister and cabinet ministers formulates policy that will be presented to Parliament for enactment into law. The civil service adminsters government policy into effect. The armed forces and police protect the government from internal or external threat." (2)

حکومت کی کابینہ یعنی وزیراعظم اور وزراء پالیسی تشکیل دیتے ہیں جو کہ پارلیمنٹ میں قانون کے طور پر قانون سازی کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ محکمہ خدمات حکومت کی پالیسی کو موثر طریقہ سے منظم کرتا ہے۔ محکمۂ دفاع اور پولیس اندرونی اور بیرونی خطرات سے حکومت کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔

(1) *Nabhani, Taqiuddin, The Islamic State, Al.Khailafah Publications, 56 Gloucester Road, London, 1998, P-134*

(2) *Barnett, Hilaire, Under standing public law, publisher, cavendish taylor and francis Group London, New York, 2010, P-24*

مقننہ قانون سازی کے علاوہ بالواسطہ طور پر انتظامی پالیسی کی تشکیل میں بھی موثر کردار ادا کرتی ہے اور اکثریت رائے سے فیصلہ کرتی ہے۔ انتظامیہ ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی حالات سے مقننہ کو آگاہ رکھتی ہے تاکہ پالیسیوں کو وضع اور اس میں ضروری ترامیم کرنے میں آسانی رہے کیونکہ اسلامی مملکت کی پالیسی جامد اور غیر متبدل نہیں ہوتی۔ تاہم صدارتی نظام میں علیحدگی اختیارات کے اصول کے باعث مجالس قانون ساز کو انتظامی امور میں زیادہ عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔

انسائیکلوپیڈیا میں ریاست کی داخلہ پالیسی کے شعبہ جات کو یوں زیر بحث لایا گیا ہے:

> "Domestic policy is the set of laws and regulations that a government establishes with in a nation's borders..... Domestic policy covers a wide range of areas, including business, education, energy, health care, law enforcement, money and taxes, natural resoursces, social welfare, and personal rights and freedoms. Domestic policy decisions usually reflect a nations's history and experience, its social and economic conditions, the needs and priorities of its people, and the nature of its government". (1)

داخلہ پالیسی اصول وضوابط کا مجموعہ ہے جو حکومت ایک قوم کی حدود میں قائم کرتی ہے۔ داخلہ پالیسی شعبہ جات کے ایک وسیع دائرہ پر محیط ہوتی ہے۔ جس میں کاروبار، تعلیم، توانائی، حفظان صحت، قانون کا اطلاق، رقوم، ٹیکس، قدرتی ذرائع کا استعمال، سماجی بہبود، انفرادی حقوق اور آزادی شامل ہے۔ داخلہ پالیسی کے فیصلے عموماً قوم کی تاریخ، تجربات، اس کے سماجی و معاشی حالات، عوام کی ضروریات و ترجیحات اور حکومت کی نوعیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

دنیا کے تمام ممالک تقریباً اسی نوع کی داخلہ پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں کیونکہ تمام حکومتیں اپنے شہریوں کے لئے تعلیم، قانون، امن وامان، معاشی وسماجی حاجات اور دیگر بنیادی خدمات مہیا کرنے کی خواہش مند ہیں۔ تاہم مخصوص منازل اور مقاصد کی داخلہ پالیسی ہر قوم کی ضروریات اور اہلیت پر منحصر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مستحکم جمہوری ممالک اپنے داخلی منصوبوں پر کثیر رقوم خرچ کرتے ہیں جب کہ پسماندہ ممالک حفظان صحت اور تعلیم جیسے اہم شعبہ جات کے لئے کثیر ذرائع وقف کرنے سے قاصر ہیں۔

داخلہ پالیسی کے بارے میں لوگوں کے خیالات مختلف النوع ہوتے ہیں بعض افراد پالیسیوں میں آئے روز تبدیلیوں کے حق میں نہیں ہوتے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس سے نئے مسائل جنم لیتے ہیں جب کہ قابل افراد دیگر شعبہ جات میں بہتری لانے اور عوام الناس کی مدد کرنے کے حوالے سے حکومت کو متحرک رکھتے ہیں۔

ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

عمدہ پالیسی، اختیارات رکھنے والے افراد میں خصوصاً اسلامی ریاست کا سربراہ مرتب کرتا ہے۔۲

(1) http://en.wikipedia.org/wiki/domesticpolicy

۲۔ ابن تیمیہ، تقی الدین، احمد، الحسبۃ فی الاسلام، جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی، الصالحیۃ، الکویت، ۱۹۹۸م، ص ۲٤

راڈ ہیگو (Rod Hague) کہتے ہیں:

"The members of executive elects via plitical means, which makes policy, where as bureaucracy put policy in to effect" (1)

انتظامیہ کے کارکنان سیاسی ذرائع سے منتخب ہوتے ہیں جو پالیسی بناتے ہیں اور بیوروکریسی اس کو عمل میں لاتی ہے۔

انتظامیہ کا اہم کام یہ ہوتا ہے کہ تمام اہم امور کے بارے میں بنیادی پالیسیاں وضع کرے اور سرکاری ملازمین کی وسیع مشینری کی نگرانی کرے جو انتظامی امور کو مستعدی سے سرانجام دینے کے لئے ضروری ہے۔ یہاں اسے مربوط اور قابو میں رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

G.W.Choudhury اس تناظر میں لکھتے ہیں:

"The very success of democracy depends on the fact to what extent executive members are committed to give the practical shape to the policies For this purpose, they have great powers in their hand".(2)

جمہوریت کی کامیابی اس حقیقت پر مبنی ہے کہ کارکنانِ انتظامیہ کس حد تک ان پالیسیوں کو عملی شکل دینے کے لئے پُرعزم ہیں۔ اس مقصد کے لئے اُن کے پاس وسیع اختیارات ہیں۔

یقیناً انتظامیہ کا اہم مقصد عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے پالیسیاں بنانا ہے۔ وہ ریاست کے دفاع، صحت، تعلیم، صنعت و حرفت، سول سروسز اور عدل وانصاف وغیرہ میں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

ذیل میں داخلہ پالیسی کے ان اہم شعبہ جات کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے جو کسی بھی ریاست کے استحکام کے لئے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں:

تعلیم و تبلیغ

پیغمبری تصور میں تعلیم و تبلیغ کا مقصد نسل انسانی کی ذاتی، ذہنی، روحانی، اخلاقی اور جذباتی نشوونما ہے۔ یہ علم وعقل کی ترقی، تربیت، قابل خواہش اور قابل قدر اخلاق اور روحانی خوبیوں کے ترکیہ کا مجموعہ ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد جانوروں کے رویے اور جبلتوں کو قرآنی تعلیمات کے مطابق تبدیل کر کے روئے زمین پر انسانی زندگی کے مقصد کا حصول ہے۔

اسلامی ریاست کے تمام شعبوں میں سب سے اہم شعبہ تعلیم ہے کیونکہ تعلیم نبوت کے اولین مقاصد میں سے ہے۔

آپ ﷺ اپنے دور میں بھی تعلیم کو ہر (Massive scale) پر دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ اس مقصد کے لئے صحابہ کرامؓ کی جماعتیں باہر دیہاتوں میں بھیجا کرتے تھے یہ لوگ دن کو لکڑیاں چن کر اپنی معاشی ضروریات پوری کرتے

---

(1) *Rod Hague, Martin Hurrop, Comparative Government and Politic, An Introduction, Macmilan Press Ltd, London, 1998, P-204*

(2) *Choudhury, G W, Constitutional Develpment, Longman Group (Ltd) Lahore, 1962, P-248*

اور رات کو لوگوں کو دین کی تعلیم دیا کرتے تھے[1]

مختلف علاقہ جات میں مقرر والیان اور گورنروں کے ذمہ یہ لگا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں لوگوں کی تعلیم کا انتظام کریں۔

ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ:

"حضرت معاذ بن جبلؓ کو انہی ہدایات کے ساتھ یمن بھیجا گیا تھا جن کے ماتحت حضرت عمروؓ بن حزم کو تعلیم کا انسپکٹر جنرل بنا کر بھیجا گیا وہ ہر گاؤں میں تعلیم کا انتظام کرتے"[2]

اسی طرح دیگر علاقوں میں کیا گیا۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ دینی اعتبار سے نہایت اہم اور بامقصد ذمہ داری پر فائز ہوتی ہے۔ اس کے لیے نظریاتی طور پر پختہ اور باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ دین کی تعلیم واشاعت کا اہتمام کرے اور ایسا طریق کار اور نظام قائم کرے جس سے لوگ دین کا علم حاصل کریں اور کتاب وسنت کے احکام سے آگاہ ہوں۔

اس ضمن میں مورخ مسعودی لکھتے ہیں کہ:

"حضرت عمرؓ نے عمار بن یاسرؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا، عثمان بن حنیفؓ کو محصولات اور عبداللہ بن مسعودؓ کو بیت المال کی ذمہ داری سونپی اور ان تینوں کو حکم دیا کہ وہ اہل کوفہ کو قرآن کی کم از کم ایک آیت کا درس دیا کریں"[3]

ہر شعبے کے افسران کو درسِ قرآن دینے کا حکم یہ ظاہر کرتا ہے کہ بلاتخصیص تمام حکومتی عہدیداروں کی بنیادی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی ترویج واشاعت کو اولیت دیں۔[4]

تعلیمی حکمت عملی اسلامی فکر اور سیرت وکردار کو تشکیل دیتی ہے۔ اس لئے نصاب میں تمام مضامین انہیں اصولوں سے وابستہ ہونے چاہییں۔ ان اصول وضوابط کے مطالعہ سے اجتناب کیا جائے جو اسلامی نقطۂ نظر کے منافی ہوں۔

اس ضمن میں تقی الدین النبھانی لکھتے ہیں:

"The goal of education is to produce the Islamic personality and to provide people with different disciplines of knowledge and sciences connected with life's affairs Teaching methods are established to fulfill this goal and to prevent any departure from this goal. At the level of higher education, these disciplines can be studied as a particular form of learning, provided that this does not lead to any

---

۱۔ الجامع الصحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ ذات الرجیع، رقم الحدیث: ۴۰۹۰

۲۔ حمید اللہ، ڈاکٹر محمد، خطبات بہاولپور، طابع وناشر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۴

۳۔ مسعودی، ابوالحسن، علی بن الحسن، مروج الذھب ومعدن الجواہر، طبع البھیۃ المصریۃ، الجامعۃ الازھر، ۱۳۴۶ھ، ۳۷۰/۲

۴۔ شعبہ تعلیم وتبلیغ کے بارے میں مزید وضاحت باب دوم کی فصل اول (اسلامی ریاست کے ذیل میں آئے گی)

departure from the educational policy and its goal. (1)

تعلیم کا مقصد اسلامی شخصیت کی تعمیر ہے۔ عوام الناس کو زندگی کے معاملات سے مختلف علوم اور سائنس کا علم دینا ہے۔ طریقہ ہائے تدریس اس مقصد کی تکمیل کے لئے وضع کیے جاتے ہیں۔ تیز انحراف سے روکا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیمی سطح پر ان مضامین کا خاص طور پر تعلم کے انداز میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس میں حکمت عملی اور مقصد سے انحراف نہ ہو۔

انسانی ترقی اور نشوونما کے لئے بہتر ماحول اور تعلیم بنیادی ضرورتیں ہیں۔ تعلیم کا نظام ملی اقدار، قومی اہداف اور سماجی و معاشی حکمت عملی سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام تعلیم تمام منصوبوں اور قومی پالیسیوں میں اہم کردار کرتا ہے۔

تعلیم کے سلسلہ میں ایک خاص حکمت عملی وضع کی جاتی ہے جسے عملی جامہ پہنانے کے لئے یہی شعبہ مناسب تدابیر اختیار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا کام یہ بھی ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف صوبوں کے درمیان تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کرے اس طرح تمام ملک میں ایک خاص طرز تعلیم کے تحت تعلیم و تربیت کا کام جاری رہتا ہے۔

صحت عامہ

شعبہ صحت حکومت کا ایک کلیدی ادارہ ہے جس کی ذمہ داری شہریوں کو صحت مند ماحول فراہم کرنا ہے کیونکہ کسی بھی ملک میں صحت اور صفائی سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ جس کے تحت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ سڑکوں، گلیوں، محلوں اور شہروں میں غلاظت اس طرح جمع نہ ہو جائے کہ وہ صحت اور ماحول کے لئے خطرہ بن جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر علاقے کی سطح پر شعبہ صحت کو منظم و مربوط کیا جاتا ہے۔ اس پالیسی کو موثر بنانے کے لئے ایسے تعلیم یافتہ اور اہل فکر و دانش کی ضرورت ہے جو قومی وسائل کو بروئے کار لا کر عوامی صحت کو یقینی بنائیں۔

آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے حفظانِ صحت کے جو اصول وضع کیے اور متعدی امراض کے خلاف جو مدافعتی تدابیر بیان فرمائیں، وہ آج بھی طب جدید کے ماہرین کے لئے حیرت و استعجاب کا باعث ہیں۔

رسول کریم ﷺ نے گھر اور ماحول کو صاف رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ شہری صفائی کے اس معاملے کو حضور ﷺ نے نظر انداز نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے جہاں صفائی کو نصف ایمان قرار دیا وہاں اس کے لئے عملی اقدامات بھی فرمائے۔

آپ ﷺ نے مسجد نبوی کی صفائی کے لئے حبشہ کی رہنے والی ام محجن نامی ایک عورت کو مقرر فرمایا۔[۲]

عربوں میں عام طور پر یہ دستور تھا کہ لوگ سایہ دار درختوں کے نیچے بول و براز کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ماحولیاتی آلودگی کے باعث اس عمل کو سخت ناپسند فرمایا اور اسے گندگی پھیلنے اور جلب لعنت کا ذریعہ قرار دیا اور فرمایا

"اتقوا الاعنین قالوا وما الاعنان یا رسول اللہ ﷺ قال والذی یتحلی فی طریق الناس او ظلھم"[۳]

---

(1) *The Islamic State, P-272*

۲۔ الجامع الصحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کنس المسجد، رقم الحدیث، ٤٤٦

۳۔ سنن ابن ماجۃ، کتاب الطھارۃ، باب النھی عن البول فی الماء الراکد، رقم الحدیث، ۳۴۳

اسی طرح آپ ﷺ نے پانی کے تالابوں اور جھیلوں میں بول و براز کرنے سے بھی منع فرمایا کیونکہ یہ پانی کی بے حرمتی کے ساتھ حفظانِ صحت کے اصولوں کے بھی خلاف ہے، ارشاد فرمایا:

"لا یبولن احدکم فی الماء الدائم ولا یغتسل فیہ من الجنابۃ"[1]

رسول پاک ﷺ کی جانب سے دی جانے والی صحت و صفائی کی تعلیم نے بیماری کو کم سے کم کر دیا تھا[2] اس کے باوجود جو لوگ بیمار ہوتے تھے ان کا علاج کرانے پر زور دیا گیا اور ان کے لئے مسجد نبوی میں شفاخانہ کا انتظام کیا گیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب الخیمۃ للمرضیٰ فی المسجد قائم کر کے یہ واضح کیا ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ہسپتال کے قیام کو بھی اپنی اولین توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے لئے مسجد نبوی کے صحن میں خیمہ نصب کیا، جہاں مریضوں کا علاج ہوتا ہے[3]

اسلامی حکومت میں علاج معالجے کی ذمہ داری کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے ہوسکتا ہے جس میں آپؓ نے فرمایا:

"لو ترکت عنز جرباء الی جانب ساقیۃ لم تدھن لخشیت ان اسال عنھا یوم القیامۃ"[4]

اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشی بکری اس حالت میں چھوڑ دی جائے کہ اسے (علاج کے طور پر) تیل کی مالش نہ کی جاسکے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اسکے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔

اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں حضرت عمرؓ جانوروں کے علاج کو اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے تو انسانوں کے علاج تو بطریق اولیٰ اپنی ذمہ داری قرار دیتے تھے۔

اے ایس کوہلی (A.S.Khol) مساوات کے حصول میں صحت کی خدمات کے کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"In the field of curative services some of the state Hospitals have built up specialised sophisticated services comparable with facilities available in some of the advanced countries for cardiac diseases, cancer and neurological, nephrological disorders". (5)

اس ضرورت کے پیش نظر چند ترقی یافتہ ممالک میں میسر سہولت کی طرح کچھ ریاستوں میں بھی قابل علاج خدمات سرانجام دینے کے لئے ہسپتال قائم کئے گئے ہیں جن میں دل، دماغ، گردے اور سرطان وغیرہ جیسی بیماریوں کا مخصوص طریقے سے علاج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سنن أبی داؤد، رقم الحدیث، ۲۵

۲۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے "ما انزل اللہ داء الا انزل لہ شفاء" ایسی کوئی بیماری نہیں جس کی اللہ تعالیٰ نے دوا پیدا نہ کی ہو۔ (الجامع الصحیح البخاری، کتاب الطب، باب ما انزل اللہ داء الا انزل اللہ شفاء، رقم الحدیث: ۵۶۷۸

۳۔ الجامع الصحیح البخاری، کتاب الصلوۃ، باب الخیمۃ للمرضی فی المسجد، رقم الحدیث ۴۶۳

۴۔ غزالی، ابو حامد، محمد بن محمد، تبر المسبوک، طبع مکتبۃ الکلیات الازہریۃ القاھرہ، س ن، ص ۱۷

(5) Kohli, A.S, Sharma, S.R, Encyclopedia of Social Welfare and Administration, published J L Kumar for Anmol Publication Pvt Ltd, New Delhi, 1996, Vol.1, P-188

علاوہ ازیں انسائیکلوپیڈیا آف سوشل ویلفیر کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ

"In considering the role which health services may play in the achievement of equality of opportunity, it would not be overstating the position to say that, in the absence of appropriate health services readily available to all who require them urgently, equal opportunity for citizens cannot be said to exist. It is increasingly accepted, in all parts of the world, that the creation of health services must be regarded as a fundamental component of any plan for development."(1)

یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ معقول صحت کی خدمات کی عدم موجودگی میں ہر فرد یہ مطالبہ کرتا ہے کہ یہ خدمات اس کو حسب منشائی افزور میسر ہوں لیکن ان کے لئے مساوی مواقع فراہم نہیں ہو سکتے۔ دنیا کے تمام حصوں میں اس بات کو تسلیم کیا جا چکا ہے کہ صحت کی خدمات ہر قسم کے ترقیاتی منصوبہ میں ایک بنیادی مرکب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

صحت پر سرمایہ لگانا گویا حیات انسانی کی بہتر نشوونما کرنا ہے۔ کیونکہ شعبہ صحت ترسیل خوراک، صاف پانی کی فراہمی، ماحولیاتی صفائی، حفظان صحت، بہبود زچہ و بچہ اور مریضوں کے علاج سے متعلقہ حکمت عملی اختیار کرتا ہے۔ صحت کے بغیر روزگار کے حصول، تعلیمی کمزوریاں، آبادی پر قابو اور بنیادی انسانی ضروریات کی ترقی جیسے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔

عوام کی تندرستی اور قوت کارکردگی بڑھانے کے لئے حکومت کو ان کی صحت کی مناسب دیکھ بھال کرنی چاہیے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہسپتالوں، سیرگاہوں کی تعمیر اور صاف پانی کی بہم رسائی کا انتظام کرنا چاہیے۔ علاج کی آسانیاں مہیا کرنا اور بیماریوں کی روک تھام کی تدابیر اختیار کرنا بھی کچھ اہم کام نہیں ہے اس کے لئے ریاست کو نہ صرف شفاخانے اور ہسپتال قائم کرنے ہوں گے بلکہ نئے تقاضوں کی روشنی میں علم طب اور فن جراحت کو بھی ترقی دینا ہوگا اس کے لئے ایسے طبی اداروں کا قیام بھی درکار ہوگی جہاں مختلف طریقہ ہائے علاج کی تعلیم و تجربہ کی سہولتیں فراہم ہوں۔

سماجی فلاح و بہبود

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جس کے اصول اس قدر جامع، عام فہم اور ہمہ گیر ہیں کہ جن کا اطلاق ہر قسم کے حالات میں کیا جا سکتا ہے۔ معاشرہ کے صحت مندانہ قیام کے لئے اسلام نے حریت، مساوات، نفع رسانی اور رواداری کے اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ چونکہ افراد کے مابین تعاون، ہمدردی اور باہمی محبت و خیر خواہی کا جذبہ معاشرہ میں سیاسی استحکام، معاشرتی امن و سکون اور معاشی ترقی کے لئے از حد ضروری ہوتا ہے۔

سماجی فلاح و بہبود میں ترقی کے لئے ہر شہری کو بلا امتیاز تعلیم، صحت، صفائی، خوراک جیسی بنیادی سہولیات فراہم ہوں تا کہ انسانی استعداد کار میں اضافہ، نادار اور ضرورت مند خواتین و حضرات کے لئے سوشل سیکورٹی کے شفاف ہمہ گیر نظام اور پاکیزہ ماحول کی فراہمی کو یقینی

(1) *Encyclppaedia of Social Welfare, Vol:6, P-77*

بنایا جا سکے۔ خصوصی توجہ کے حامل افراد اور علاقہ جات کے لئے ایسی حکمت عملی ہو جس کی مدد سے یہ قومی زندگی میں زیادہ نمایاں کردار ادا کرنے کے قابل بن جائیں۔

ڈاکٹر افضل الرحمن اسلامی ریاست میں سماجی حکمت عملی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> This is another distinguishing feature of the consitution of the Islamic State. It guarantees and provides a livelihood to all its citizens irrespective of caste, creed or colour. No one is left destitute or helpless in the state and all are well looked after by the state. This is the legal as well as moral responsibility of the state.(1)

اسلامی ریاست کے آئین کی ایک انفرادی خوبی ہے کہ اپنے تمام شہریوں کو بلا لحاظ رنگ، نسل یا ذات ذریعۂ معاش مہیا کرنے کی ضمانت دیتا ہے اس لیے ریاست میں کوئی بھی بے یار و مددگار یا محروم نہیں رہتا اور سب کی عمدہ طور پر دیکھ بھال ہوتی ہے۔ یہ ریاست کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے۔

ابن حزم کے نزدیک داخلی امور کے انتظامات کو درست رکھنے کی ذمہ داری خلیفہ پر ہے تاکہ عوام الناس کی سماجی و معاشی حالت بہتر رہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''خلیفہ بذات خود معاملات کی نگرانی کرے اور احوال کی تحقیق و چھان بین بھی کرے تاکہ قوم کے لئے درست پالیسی اور صحیح حفاظت کا اہتمام کیا جا سکے''۔ ۲

ہر شہری کی حفاظت اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ کسی گناہ یا کسی قانونی حق کے بغیر اس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے۔ تاکہ ہر فرد اپنے دین، جان، عقل، نسل اور مال کے بارے میں ہر لحاظ سے مامون و محفوظ ہو۔ ہر شہری کا حق ہے کہ اس کی دیکھ بھال ہو مساویانہ برتاؤ ہو اور اجارہ داری ہر سطح پر ممنوع ہو۔

حضرت عمرؓ کو عام انسان کی خوشحالی کا جتنا احساس تھا اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا:

> ''واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر والی وہ ہے جس کی رعایا خوشحال اور امن کے ساتھ ہو اور سب سے بدبخت والی وہ ہے جس کی رعایا بدحال اور پریشان حال ہو تجھ کو کجی سے بچنا چاہیے تاکہ تیرے ماتحت افسر بھی ظلم و کجی نہ کر سکیں''۔ ۳

اسلام نے معاشرے کا جو تصور دیا ہے اگر اُسے صحیح معنوں میں قائم کیا جائے تو ایک ایسا اجتماعی نظام جنم لے گا جس میں نہ کسی کی اجارہ داری ہوگی اور نہ کوئی محتاج و مفلس رہے گا۔ ہر کس و ناکس کو مساوی حقوق ملیں گے۔

نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں کہ:

The fulfilment of the basic needs af all human beings is one of the

---

(1) *Muhammad Encyclopedia of Seerah, Vol:1, P-715*

۲۔ ابن حزم، علی بن أحمد، المحلی، دار الجيل، بيروت، لبنان، س ن، ۶، ۱۵۸

۳۔ سیوہاروی، حفظ الرحمن، اسلام کا اقتصادی نظام، ناشر ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۳

primary objectives of organized Islamic living. The principle is rooted in the islamic worldview and the nature of society and state in Islam. The needs to be fulfilled include food, clothing, shelter, medical care and education In certain cases they also include transportation, care-taking and attendance. The standard of need fulfilment should depend on the average standard of living in a society and on its economic resources "(1)

تمام نسل انسانی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا منظم اسلامی ریاست کا اولین فریضہ ہے۔ اسلام میں ریاست، معاشرہ کی نوعیت اور دنیاوی نقطۂ نظر کا ایک بنیادی اصول ہے۔ بنیادی ضروریات خوراک، لباس، رہائش، علاج معالجہ اور تعلیم سے پوری ہوتی ہے۔ مزید برآں ٹرانسپورٹ، دیکھ بھال اور تحفظ کے معاملات بھی ان میں شامل ہوتے ہیں۔ ضرورت پوری کرنے کا معیار معاشی وسائل اور معاشرہ میں رہن سہن کے اوسط معیار پر منحصر ہوتا ہے۔

بہذا عہد نبوی اور خلفائے راشدین کی یہ مستقل پالیسی رہی کہ عوام کو آزاد معاشی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔
اسلامی ریاست کی آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ غرباء اور مفلسوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے سماجی تحفظ کا نظام قائم کرے۔
اگر عہد جدید میں جب کہ پوری دنیا ضروریات زندگی کی بدولت عدم سکون اور بدامنی کا شکار ہے ایسے حالات میں ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ سماجی خدمات سرانجام دے کر انسانیت کی فلاح کے لیے کام کرے۔
اسلام ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے جس میں رعایا کو پوری طرح سماجی تحفظ اور فکر فردا سے نجات حاصل ہو اور سب سے اہم یہ کہ انہیں مستقبل کے ممکنہ خطرات سے دفاع کا سامان فراہم ہوتا کہ وہ اپنے ذرائع معاش کو ترقی دے سکیں۔

محکمہ دفاع

کسی ریاست کے دفاع کے لئے فوجی انتظامات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ فوجی انتظامات کی تشکیل کی دو اہم وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہو اور ان کے علاقے کو دشمنوں سے بچایا جا سکے اور دوسری وجہ، ظلم و کفر کی تاریکی کو دور کر کے اسلام کی مشعل کو روشن کرنا تا کہ لوگ اس کی روشنی میں راہ ہدایت پر چل سکیں۔

شہری ریاست کو اندرونی اور بیرونی خلفشار سے بچانے اور اسے استحکام بخشنے کے لئے آپ ﷺ نے مسلسل تدابیر اختیار کیں آپ ﷺ نے مدینہ شہر میں امن وامان اور داخلی استحکام کو یقینی بنایا اور ایک شہری مملکت کی بنیاد ڈالی۔

نبی کریم ﷺ نے مواخات کے علاوہ میثاق مدینہ اور دوسرے قبائل سے معاہدے کیے جن سے مخالفتوں میں کمی آئی۔ ان معاہدات کی حکمت یہ بھی تھی کہ جو شخص قبیلہ، گروہ یا خاندان مسلمان ہو وہ مدینہ یا مضافات مدینہ میں آبسے تا کہ آبادی بڑھنے سے فوجی راز بھی محفوظ ہوں۔ اس طرز عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان فوج کے لئے محفوظ رضا کاروں میں روز افزوں اضافہ ہوا اور نومسلموں کے لئے تربیت و تعلیم کا انتظام ہوا۔ ۲

(1) *Siddiqi, M.Nejatullah, Role of the state in the Economy An Islamic Perpective, Published: The Islamic Foundation, Leicester, U.K, 1996, P-34,35*

۲ علوی، ڈاکٹر، خالد، انسان کامل، ص ۳۲۵، الفیصل ناشران غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، ۲۰۰۰ء

نبی کریم ﷺ کی داخلی سیاست کا ایک اہم جزو احترام انسانیت تھا۔ آپ ﷺ نے کشت وخون سے گریز پالیسی پر عمل کیا۔ اگرچہ آپ نے دفاع اور اسلام کی سربلندی کے لئے جنگیں کیں لیکن ان کی نوعیت مختلف تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے پولیس کو بھی منظم کیا اور بطور سیاست دان آپ ﷺ کا مرکز حکومت مسجد نبوی تھی۔

صاحبزادہ ساجد الرحمٰن اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> عہد رسالت میں تمام اختیارات کا مرکز ومنبع آپ ﷺ ہی کی ذات والا صفات تھی۔ آپ ﷺ نے خود اور اپنے صحابہؓ سے بعض امور یعنی بازاروں کا گشت، اشیاء کی جانچ پڑتال، مجرموں کی گرفتاری، حبس کی سزا اور مجرموں کی گردن اڑانے وغیرہ کے معاملات سرانجام دلوائے جن کے بارے میں اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معاملات محکمہ پولیس سے متعلق ہیں۔[۱]

آپ ﷺ نے افراد رعیت میں سے ہر صاحب استطاعت پر شہر کی حفاظت کی ذمہ داری عائد کر رکھی تھی۔ وہاں کوئی مختص فوج (Standing Army) نہ تھی بلکہ لوگوں کو جہاد کے لئے بلایا جاتا اور اس مقصد کے لئے ان میں سے باصلاحیت اور جری افراد کا انتخاب پوری توجہ سے کرلیا جاتا۔

اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ فوج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرے کیونکہ سرحدوں کی حفاظت کے بغیر کوئی بھی ریاست قائم نہیں رہ سکتی۔

> جب حضرت عمرؓ نے عنان خلافت اپنے ہاتھ میں لی تو اس کے ساتھ ہی آپؓ نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مسلم فوج کو اس طرح منظم کیا جائے کہ وہ ہر لحاظ سے دشمنوں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دے سکیں۔ اس طرح مسلمانوں کا ایک کامل اور منظم عسکری نظام تشکیل پایا۔[۲]

داخلی امن وامان کسی بھی ریاست کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لئے فوج، پولیس اور عدالتی نظام قائم کیا جاتا ہے۔ امن وحفاظت کے سلسلہ میں جیل خانوں کا انتظام بھی ضروری ہے تاکہ عوام کے امن کو برباد کرنے والوں کو سزا کے طور پر الگ رکھا جائے۔

سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے رات کی چوکیداری کے لئے محکمہ قائم کیا تھا پھر حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں باقاعدہ پولیس کا نظام قائم کیا۔ اس محکمہ کے سب سے بڑے افسر کو "صاحب شرطہ" کہا جاتا تھا۔[۳]

عہد فاروقی میں بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود حضرت عمرؓ ان فرائض کو انجام دیتے رہے اور ان فرائض سے متعلق آپ نے وقتاً فوقتاً بڑی واضح ہدایات جاری فرمائی ہیں اور بعض مقامات پر ایسے اصول ملتے ہیں جو آج کے پولیس کے نظام میں ترقی یافتہ اور جدید سمجھے جاتے ہیں۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے دفاعی اور فوجی نوعیت کی مساجد کی تعمیر فرمائی جو علاقوں کی حفاظت اور امن وامان کے قیام میں اہم کردار ادا کرتی تھیں ان میں قلعے چھاؤنیاں اور بارکیں وغیرہ شامل ہیں، تیسری سول اور سرکاری نوعیت کی تھی جن میں انتظامی نوعیت کے معاملات

۱۔ صدیقی، صاحبزادہ ساجد الرحمٰن، اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل، منتظم ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۳

۲۔ تاریخ الامم والملوک، ۲۰۴/۴

۳۔ ابن القیم، الجوزیۃ، شمس الدین، محمد، الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ القاہرہ، ۱۹۵۳ء، ص ۵۴، ۵۵

کٹائے جاتے تھے۔1

جے ریسکن (G.Raskin) ریاست میں خطرات سے نمٹنے کے لئے دفاعی اور قومی سیکورٹی کو آئین سے ہم آہنگ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> A common defence system consistent with the modern constitutional democracy requires that its managers be concerned with the permanent interests of humankind. No democratic government will find such interests in a dual state system in which the constitutional form is manipulated by a national security grouping that operates in secrecy and outside the rule of law. National security policy must be openly debated, and actions in accord with that policy must be performed in the full light of public scrutiny. (2)

ایک عام دفاعی نظام جدید آئینی جمہوری نظام سے مزین اپنے منتظمین سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ انسان کے مستقل مفادات سے وابستہ رہیں۔ کوئی بھی جمہوری حکومت کسی دوسرے نظام میں ان مفادات کو حاصل نہیں کر سکتی۔ ایسا نظام جس میں چند دفاعی گروپ آئین کی شکل کو مسخ کر دیں اور خفیہ انداز سے قانون سے ماورا کام کریں لہٰذا قومی تحفظ کی پالیسی کو کھلے عام زیر بحث لانا چاہئے اور پالیسی سے متعلقہ اقدامات، عوامی چھان بین کی بھرپور روشنی میں ادا کرنے چاہیں۔

ریاستی اقتدار اور قانون کی حکمرانی کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ نسل انسانی کو تحفظ اور امن وسلامتی فراہم کرے۔

سبائن (Sabine) کا کہنا ہے کہ:

> "Security, depends upon the existence of the government having a power to keep the peace and to apply the sanctions needed to curb man's innately unsocial inclinations." (3)

''تحفظ'' کا انحصار حکومت کے وجود پر ہوتا ہے جو امن وامان مہیا کرنے کا اختیار رکھتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان کے فطری غیر سماجی رجحانات پر پابندیاں لگاتی ہے۔

۱۔ فتوح البلدان، ص ۲۹۵

(2) *Raskin, G, Marcus, The State and democracy, published in Great Britain by Routledge, New York, London, P-92*

(3) *Sabine, G H. A History of Political Theory, Published Constable Company, London, 1964, P-468*

علامہ جوینی لکھتے ہیں:

"امن و امان نہ ہو تو جان خطرے میں رہے گی اور نظم و نسق کا برا حال ہو تو مال کسی کام کا نہیں رہتا۔ شریعت امن و امان قائم رکھنے اور نظم و نسق درست رکھنے کو مقصود رکھتی ہے۔ وہ حکمرانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے"۔[1]

قرآن کریم میں نظم و نسق کی خلاف ورزی اور امن درہم برہم کرنے والوں کو تحت وعید سنائی گئی ہے اور اس کی اصلاح پر بہت زور دیا گیا ہے:

"إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ"[2]

جو لوگ اللہ اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا وہ جلاوطن کردیے جائیں یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بدتر سزا ہے۔

اسلام کا مقصد ایک عادلانہ پرامن معاشرہ قائم کرنا ہے۔ جس کے لئے وہ فتنہ و فساد کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے تاکہ افراد اپنے اصل مقاصد کے لئے یکسو ہو جائیں اور دل و جان سے ان کے حصول میں لگ جائیں۔

علامہ طاہر ابن عاشور اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"(شریعت اسلامیہ میں) قانون سازی کا عام مقصود نظام عالم کا تحفظ ہے اس طرح کہ وہ ہمیشہ اچھی حالت میں رہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی اصلاح کی جائے جو بالفعل اس پر قابو رکھتے ہیں، یعنی بنی نوع انسان"۔[3]

عصر حاضر میں انسانی جان، مال اور عزت و ناموس کا دفاع مشکل ترین مسئلہ ہے۔ انسانی حقوق کا تحفظ اور امن و امان کا قیام سربراہ ریاست کی اہم ذمہ داری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رعایا میں سے کوئی فرد ایسا نہ رہے جس کی دیکھ بھال اور ضرورت زندگی پوری نہ ہوں۔ اس کے لئے وہ ملکی دفاع کو مضبوط بناتا ہے اور ایسی پالیسیاں تشکیل دیتا ہے جس سے ملکی مفادات کا تحفظ ہو اور ملکی سالمیت و وقار پر کوئی سمجھوتہ کئے بغیر باہمی مفاہمت اور رواداری کو فروغ ملے۔

قومی دفاع کا مقصد بلاواسطہ یا بالواسطہ جارحیت کا خاتمہ ہے تاکہ ملک میں امن اور آزادی کا تحفظ ہو۔ عوام کا ذریعہ معاش مستحکم ہو، بین الاقوامی یکجہتی کو فروغ ملے، جس سے قومی تحفظ کی بنیادیں قائم ہوں گی۔

عدلیہ:

عدل و انصاف اور مساوات کو قائم رکھنے اور سرکاری ملازمین کو اپنے اختیارات کی حدود میں رکھنے کے لئے عدلیہ کا قیام ناگزیر ہے۔ ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے بہتر سے بہتر استعمال کے لئے نہ صرف جان، مال اور آبرو کے تحفظ کو یقینی بنانا ضروری ہے بلکہ انتظامی

۱۔ الجوینی، امام الحرمین، الغیاثی، غیاث الامم فی التیاث الظلم، ادارہ احیاء التراث، قطر، ۱۴۰۱ھ، ص ۲۱۲

۲۔ المائدۃ ۵:۳۳

۳۔ الطاہر، محمد بن العاشور، مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ، تونس، ۱۳۶۶ھ، ص ۶۳

اصلاحات کو عملی صورت دینے کے لئے عدالتی عمل کو شفاف اور فعال بنانے کی بھی ضرورت ہے۔[۱]

پالیسی، ریاستی امور میں اختیار کئے جانے والے دانشمندانہ طریقہ یا عمل کے نصاب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ وسیع، اطلاعات، حکومت کے تعلقات اور کاروباری اداروں کو منظم کرتی ہے۔ جس میں اطلاعات کو عوام تک پہنچانے کے لئے انتظامات کے جاتے ہیں اور تقسیم شدہ اختلاف کو حل کرکے ایک منظم طریقہ کے طور پر ظاہر کیا جاتا ہے۔

تقی الدین النبھانی لکھتے ہیں:

"The administrative policy must be based on simplicity, efficiency and promptness in taking care of the affairs of the people, and the competence of those who assume responsibility for the administration. The management of the government's affairs and the interests of the people are performed by administrations, bureaus and departments These entities perform the duties of the government and take care of the affairs of the people".(2)

انتظامی پالیسی عوام کے معاملات کی دیکھ بھال میں سادگی اور تیزی و تندہی اور ان لوگوں کی قابلیت جو انتظامیہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، کی بنیاد پر قائم ہونی چاہیے۔ حکومت کے معاملات اور رعایا کی دلچسپیوں کو انتظامیہ کے کارکن، دفاتر اور شعبہ جات منظم کرتے ہیں۔ یہ کارکنان حکومت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور عوام کے معاملات کی نگہداشت کرتے ہیں۔ بہت سے اسباب پالیسی کا تجزیہ کرنے اور اسے بنانے کے لئے موثر ہوتے ہیں۔

رچرڈ ولسن (Richard Wilson) لکھتے ہیں:

"In the way the policy was originated. Formulated and carried through it was a model of how.. modern policy should be formulated There was a project team. There were outsiders. There was published analysis and enormous consultation. There was modelling of outcomes using the latest technologies (3)

جس طرح پالیسی بنی، مرتب ہوئی اور روبہ عمل ہوئی، یہ ایک نمونہ تھا کہ کیسے جدید پالیسی مرتب کی جائے۔ ایک منصوبہ ساز جماعت تھی جس میں بیرونی لوگ بھی تھے۔ مطبوعہ تجزیہ اور زبردست مشاورت بھی کی گئی۔ جدید ترین ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے نتائج کی نمونہ سازی کی گئی۔

۱　　اس کی تفصیل مقالہ ہذا کے باب سوم کی فصل اول عدلیہ کے دائرہ کار اور دائرہ اختیار میں آئے گی۔

(2)　*The Islamic State, P-258*

(3)　*An Introduction to the policy process, P-157*

حکومت خصوصاً ان شعبہ جات میں پالیسیاں تشکیل دینے اور ان پر عمل درآمد پر زور دیتی ہے جو حکومتی کاروبار سے متعلقہ ہوتے ہیں مثلاً صحت، سماجی تحفظ، تعلیم، دفاع اور عدلیہ وغیرہ۔

ریاست کی داخلہ پالیسی کو تشکیل دینے میں کوئی بھی اسلامی حکومت خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چلے بغیر اپنے اہداف و مقاصد حاصل نہیں کر سکتی۔ جنہوں نے اپنی دانشمندانہ حکمت عملی سے معاشرے سے فتنہ و فساد اور بگاڑ کا خاتمہ کر کے اُسے امن و امان کا گہوارہ بنایا۔

مندرجہ بالا بحث سے اسلامی ریاست کی داخلہ پالیسی کا یہ روشن اصول سامنے آتا ہے کہ وہ حق کی صورت میں تعاون اور ناحق اور ظلم و زیادتی کی صورت میں عدم تعاون کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی شرعاً پابند ہے وہ انسانیت عامہ کے مفاد اور فلاح و بہبود کے لئے معاون کا کردار ادا کرتی ہے اور بنی نوع انسان کے نقصان اور ظلم و جور کے خلاف حتی المقدور کوشش بروئے کار لا کر اس کے ازالہ کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے۔

مغربی نقطۂ نگاہ

ہر نظام کے کچھ نہ کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ نظام کی تفصیلات اس کے مقاصد کے حصول کے لئے طے کی جاتی ہیں پھر ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک انتظامی مشینری تیار کی جاتی ہے اگر کسی بہترین سے بہترین نظام کے مقاصد سے ناآشنا انتظامی مشینری کو اس کے نفاذ واطلاق کی ذمہ داری سونپ دی جائے تو وہ بہترین نظام اپنے مقاصد کو کسی بھی صورت حاصل نہیں کر پائے گا۔ نظام کی کامیابی کے لئے ہمیشہ اس نظام کے مقاصد کو سمجھنے والی انتظامی مشینری بھی تیار کی جاتی ہے۔

وکی انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

> "Many domestic policy debates concern the appropriate level of government involvement in economic and social affairs. Traditionally, conservatives believe that the government should not play a major role in regulating business and managing the economy Most conservatives also believe that government action cannot solve the problems of poverty and economic inequality. Most liberals, however, support government programs that seek to provide economic security, ease human suffering, and reduce inequality. Many liberals also believe that the government should regulate businesses to ensure safe and fair working conditions and to limit environmental pollution.(1)

اکثر ممالک کی داخلہ پالیسی معاشی اور سماجی معاملات میں حکومت کی معقول سطح پر شمولیت سے متعلقہ ہوتی ہے۔ روائتی طور پر

---

(1) http //en.wikipedia.org/wiki/domestic policy

اعتدال پسند لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت کو معیشت منظم کرنے اور باقاعدہ تجارت کرنے میں اہم کردار ادا نہیں کرنا چاہیے۔ان کا تصور یہ بھی ہے کہ حکومت غربت کے مسائل اور معاشی عدم مساوات کے مسائل حل نہیں کر سکتی۔تاہم اکثر آزاد منش لوگ حکومتی منصوبوں کے لئے معاون ثابت ہوتے ہیں۔وہ معاشی تحفظ، انسانی مشکلات اور عدم مساوات میں کمی کو پورا کرنے کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ان کا خیال یہ بھی ہے کہ حکومت کو محفوظ اور عمدہ کام کے لئے حالات پیدا کرنے اور ماحولیاتی آلودگی کو کم کرنے کے لئے باقاعدہ طور پر تجارت کرنی چاہیے۔

مغربی طرز حکومت میں داخلہ پالیسی کے متعلق ثقافت، مذہب اور ذاتی عقائد کے اختلاف کی بناء پر لوگوں کے مابین تنازعہ دیا جاتا ہے۔عوامی زندگی میں مذہب کا کردار، تعلیم اور روزگار میں ثقافتی تنوع اور غیر جنسی تعلقات کے حقوق وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

مؤثر داخلہ پالیسی حکومت کی بیوروکریسی پر مشتمل ہوتی ہے جو منصوبوں اور قوانین کو عمل میں لاتی ہے۔بعض اوقات حکومتی کارندے سست روی سے کام کرتے ہیں یا عوام کے ارادوں کے مطابق پالیسیاں لاگو کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔اس صورت میں صدر مملکت خود معاملات کی نگرانی کرے اور احوال کی تحقیق و چھان بین بھی تاکہ عوام کے لئے درست پالیسی کا اہتمام کیا جا سکے۔

اہل یونان جدید فکر پیش کرنے میں اہل روم کے پیش رو تھے، اور اہل روم نے انہی افکار و خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کی۔

"Rome exemplified many characteristics of the state. Its internal power, particularly within Italy, was highly centralized. Its emphasis on the legal rights of its citizens was of great importance the size of the empire made personal participation in a polis life imposible, but a citizen could at least hope for a certain security of legal expectations. Rome's maintenance of services (courts, roads, water supplies, a postal system) administered by a trained bureaucracy pointed the way to the modern state. Finally, a genuine political rule prevailed at least before the ultimately fatal militarization of the empire. Rome did not leave vast power to groups within society.(1)

اہل روم نے ریاست کی بہت سی خوبیاں بیان کی ہیں خصوصاً اٹلی میں اس کے داخلی اختیارات کو اعلیٰ سطح پر مرکوز کیا جاتا تھا یہ اپنے شہریوں کے قانونی حقوق کو بہت اہمیت دیتے تھے۔سلطنت کی حدود میں پولیس کا وجود نا ممکن حد تک ہوتا تھا لیکن ایک شہری قانونی توقعات کے یقینی تحفظ کے لئے کم از کم امید ضرور کر سکتا تھا۔جدید ریاست میں روم کی خدمات (عدالتیں، سڑکیں، پانی کی فراہمی اور ڈاک کا نظام) کو ایک تربیت یافتہ بیوروکریسی کے نقطہ نظر سے برقرار رکھا جاتا تھا۔بالآخر سلطنت کے فوجی نظام کے خطرے کا باعث بننے سے پہلے ایک حقیقی سیاسی قانون غالب آجاتا تھا۔اہل روم معاشرے میں گروہوں کی شکل میں وسیع اقتدار نہیں رکھتے تھے۔

ازمنہ سابقہ میں ریاست کا سب سے بڑا منصب یعنی حکمرانی واقتدار ایک فرد کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو فہم و ادراک، عقل سلیم، وجدان کے نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا تھا وہ عوام کے مسائل کی تہ تک پہنچ کر ان کا حل تلاش کرتا اور وہی ریاست کا اقتدار اعلیٰ ہوتا تھا اور تمام شعبہ

(1) *Lexicon universal Encyclopedia, Lexicon Publications, New York, 1987, P-230*

جات اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز میں ہے:

"The adminstrative body was charged with the responsibility of develping a body of rules, almost a body of law, governing an area of public policy and ensurıng that these rules and their enforcement kept pace with relevant new developments and the policy mandate".(1)

منتظمہ جو کہ عوامی پالیسی کے کچھ حصے پر حکمران تھی، اُسے قوانین اور ضابطے بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی اور اس امر کو یقینی بنایا گیا کہ یہ قوانین متعلقہ نئی صورت حال اور پالیسی کے اختیار سے باہم ہم قدم ہوں۔

مغربی پالیسیوں میں معاشرے کی تعلیم وتربیت، عوامی صحت کی خدمات، معیشت کی ترقی اور مشرق وسطی میں جمہوریت کو فروغ دینا وغیرہ شامل ہیں۔ کابینہ میں ان پالیسیوں پر بحث ومباحثہ کیا جاتا ہے اور پھران کو حتمی شکل دی جاتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز میں ہے کہ

"For several centuries governments in England and the United States have been taking administrative action in such fields as public health, public safety, taxation, customs, immigration and other areas".(2)

برطانیہ اور امریکہ میں حکومتیں کئی صدیوں سے صحت عامہ، عوامی تحفظ، ٹیکس، محصولات، نقل مکانی اور دیگر شعبوں میں انتظامی کاروائیاں کرتی رہی ہیں۔

حکمرانی کا تصور دراصل شہریوں اور حکومت کے مابین گہرے تعلقات سے وابستہ ہے جو کہ عوام کی خدمت اور حفاظت کے لیے وجود میں آتی ہے۔ یہ ترقی اور خوشحالی کو منظم کرتی ہے۔ یہ غربت اور عدم مساوات کو ختم کرنے کا بھی باعث بنتی ہے۔ ریاست کی ذمہ داری، انفرادی صلاحیتوں کی تعمیر اور ذاتی اقدام کی حوصلہ افزائی کے لیے سیاسی، قانونی اور معاشی ماحول کی تخلیق کرنا ہے۔ سول سوسائٹی کا کردار، عوامی رائے کو متحرک کرنا اور عوام کو سیاسی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں حصہ دار بنانا ہے۔ مزید برآں وسائل کو بروئے کار لا کر منصوبہ جات کو موثر بنانا اور پالیسیوں کا نفاذ بھی حکومت ہی کا کام ہے۔

مغربی داخلہ پالیسی میں پانچ ادارے بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن پر عوام کی خوشحالی اور ملکی ترقی کا دارومدار ہے۔

"The Domestic policy team focuses on five key policy areas including education, health care, defence, poverty, and women's

(1) *The Encyclopedia of social Sciences, Vol 1, P-69*

(2) *Ibid*

health and rights. In pursuing significant change in these areas, team members regularly produce, policy proposals, host panel discussions to further public discourse, and work to build relationships with other organizations working in their area of concentration (1)

داخلہ پالیسی ٹیم پانچ اہم پالیسیوں کو مرکوز کرتی ہے جن میں تعلیم، تحفظ صحت، دفاع، غربت اور عورتوں کی صحت اور حقوق شامل ہیں۔ ان شعبہ جات میں اہم تبدیلی لانے کے لئے ٹیم کے ارکان باقاعدہ طور پر پالیسی بنانے کے لئے تجاویز دیتے ہیں، عوام کے مزید کاموں کے بارے میں گروہ کی شکل میں بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ اور اپنے خاص شعبہ جات میں کام کرنے والی دیگر تنظیموں کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے لیے کام کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا اداروں میں سے چند ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

صحت عامہ

عوام الناس کی صحت کو یقینی بنانے کے لئے شعبہ قومی صحت کا قیام حکومت کی قانونی ذمہ داری ہے۔ وہ عوام کی تحفظ صحت کے لئے بھرپور خدمات سرانجام دے تاکہ مختلف کاموں اور خدمات میں ان کے مسلم اداروں کو وجود میں لایا جائے۔ یہ شعبہ قومی صحت کا ایک منفرد کردار ہوتا ہے۔ معاشرے کے ہر فرد کو شعبہ صحت تک مساوی رسائی ہو ورنہ غرباء طبقہ صحت کے عدم تحفظ کی وجہ سے مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے قومی صحت کے شعبہ جات حکومت کے قومی اداروں سے مدد کی خواہش کرتے ہیں۔ ریاست انفرادی طور پر بھی شہریوں کی صحت کو یقینی بنانے کے لئے اقدامات کرتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ نے شعبہ صحت کی بہتری کے لئے گذشتہ چھ ماہ میں 4.3 ملین ڈالر کی کثیر رقم مختص کی اور ہر شہری کی صحت کی انشورنس کو یقینی بنایا تاکہ صحت عامہ کے مسائل کو حل کیا جائے۔

آئزک سٹینر (Isaac Steiner) صحت عامہ سے متعلق امریکی پالیسی کو یوں بیان کرتے ہیں

Obama plans to deal with the country's health care problems, the 45 million uninsured and the rising cost of health care, by entering into an arrangement with the major health business groups insurance companies, health and hospital corporations, pharmaceuticals industry which will force everyone who can to purchase private insurance while allowing those companies to avoid fully insuring announced that his administration and these health care industries and corporations had come up with a plan that would save two trillion dollars over the next ten years and save U.S families as much

(1) www.americanprogressaction.org

as $ 2,500 per year. This purely voluntary plan, with no government oversight, represented a first step toward the creation of a two-tier health care system.(1)

امریکی صدر اوباما نے اپنے ملک میں تحفظ صحت کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا منصوبہ بنایا ہے، ۴۵ملین افراد غیر بیمہ شدہ ہیں اور انہیں تحفظ صحت کی بڑھتی ہوئی لاگت کا سامنا ہے۔ یہ تحفظ صحت کے بڑے اداروں، بیمہ کمپنیوں، صحت و ہسپتال کی کارپوریشنوں اور ادویات سازی کے اداروں سے معاہدہ ہے۔ یہ ہر اُس شخص کو جو پرائیویٹ انشورنس خرید سکتا ہے ایسا کرنے پر مجبور کریں گے۔ مزید یہ کہ ان انشورنس کمپنیوں کو پوری انشورنس سے منکر کی اجازت بھی ہے۔ ان تحفظ صحت کے شعبہ جات اور کارپوریشنوں نے اگلے دس سال میں دو کھرب ڈالر بچانے کا منصوبہ بنایا ہے اور ہر امریکن خاندان سالانہ ۲۵۰۰ ڈالر بچائے گا۔ یہ منصوبہ مکمل طور پر رضا کارانہ ہے جسکی حکومتی نگرانی نہیں ہے۔ یہ منصوبہ دو طرفہ تحفظ صحت کے نظام کی طرف پہلا قدم ہے۔

برطانوی حکومت نے NHS (نیشنل ہیلتھ سروس) کو اپنی تحویل میں لیا ہے کہ اس کی خدمات ہر شخص کو بنیادی طور پر میسر ہوں نہ کہ معاوضہ کی صلاحیت پر۔ حکومت خواہش مند ہے کہ 'NHS Staff'' سیاسی تنظیمات سے آزاد ہوتا کہ جمہوری محاسبہ کو بڑھایا جائے اور مریضوں کو حسب ضرورت علاج کے انتخاب کا اختیار دیا جائے۔ وہ سالہا سال NHS کی سرمایہ کاری میں اضافہ کررہی ہے اور وہ NHS انتظامیہ کے بجٹ میں ۵۰ کھرب پونڈز کی کٹوتی کررہی ہے تاکہ اس سرمایہ کو ڈاکٹروں، نرسوں اور مریضوں کی مدد پر صرف کیا جائے۔ وہ مریضوں کی دیکھ بھال اور ان کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے روزینہ دیتی ہے اور انہیں اپنی منشاء کے مطابق ڈاکٹر کے انتخاب کا اختیار دیتی ہے۔ حکومت مہلک امراض میں سے سرطان، ایڈز، ایچ آئی وی، منشیات اور ہیپاٹائٹس کے لئے فنڈز فراہم کرتی ہے تاکہ تمام مریض ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق ادویات اور علاج تک بآسانی رسائی حاصل کر سکیں۔(۲)

ریاست انفراسٹرکچر کی مضبوطی اور استحکام کے لئے مالی اور تکنیکی امداد دیتی ہے اور غیر حکومتی تنظیموں کو متحرک کرتی ہے کہ وہ موثر حفاظتی منصوبوں پر کثیر رقوم خرچ کریں کیونکہ تربیت یافتہ کارکنان اور ٹیکنالوجی تک رسائی حاصل کر کے قوم کی صحت میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔ عوامی صحت کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے قومی حکومتوں اور ریاست کے مابین مضبوط تعلقات استوار ہونے چاہییں۔ قومی صحت کے شعبہ جات پالیسی کو ترقی دینے، بیماریوں کی تشخیص کرنے اور خدمات کی یقین دہانی کے لئے ناگزیر ہیں۔ کوئی دوسرا ادارہ ایسا نہیں ہے جو عوام کی صحت کو تحفظ فراہم کرے۔

ریاست میں عوامی صحت کے شعبہ جات ہی اعداد و شمار اکٹھے کرنے، عوام کو مطلع کرنے اور ساز و سامان کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ وہ صحت سے متعلقہ علوم حاصل کرنے کے لئے ان اعداد و شمار کو منظم اور تجزیہ کرتے ہیں اور نئی بصیرت اور جدت کے حصول کے لئے تحقیق میں سرگرم رہتے ہیں۔

تحفظ صحت کے لئے اصول و ضوابط کا نفاذ، عوام سے تعلقات، ان کے امراض کی تفتیش و تشخیص، وبائی اور دیگر بیماریوں پر قابو پانا اور ان سے بچاؤ کے لیے اقدامات کرنا، انہی کے دائرہ کار میں آتا ہے۔

---

(1) http://www.solidarity-us.org/obamaworkingpaper3

(2) http://www.labour.org.uk

تعلیم و تربیت

مغرب کے تعلیمی نظام میں کچھ ریاستیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اصلاحات کا نفاذ کرتی ہیں۔ حکمران طبقہ کی سفارشات کی بنیاد پر مالی وسائل کی فراہمی سے تعلیمی اداروں کے قیام کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ وہ جدید تعلیم کے فروغ کے لئے اساتذہ کے معیار کو بڑھاتے ہیں، نظم و ضبط پیدا کرتے ہیں اور امیر و غریب طلباء کے فرق کو ختم کرتے ہیں۔

برطانیہ کی تعلیمی پالیسی میں طلباء کے لئے ایسی اصلاحات کی گئی ہیں کہ انہیں دوران تعلیم کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور وہ بآسانی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے مقصد کو پالیتے ہیں اور نہ ہی والدین پر بوجھ بنتے ہیں

"No one will have to pay anything up front. Parents will not have to contribute to tuition costs and students will not pay until after they graduate. Graduates who earn nothing will pay nothing. Graduates will not pay anything back until they are earning at least E21,000. Graduates earning over E21,000 will pay back E45 less per month than they do at the moment. The poorest quarter of graduates will back less in total (1)

کسی بھی طالب علم کو پیشگی کچھ بھی ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ والدین کو ٹیوشن نہیں ادا کرنا ہوگی۔ اور طلباء گریجویٹ ہونے تک واجبات کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہوں گے۔ جو گریجویٹ کچھ کماتے نہیں ہیں کچھ بھی ادا نہیں کریں گے۔ جب تک گریجویٹ ۲۱۰۰۰ پونڈ کم از کم کما رہے ہوں واپسی ادائیگی نہیں کریں گے۔ جو گریجویٹ ۲۱۰۰۰ پونڈ کما رہے ہوں وہ موجودہ ادائیگی سے ۴۵ پونڈ ماہانہ کم ادا کریں گے۔ غریب طلباء بی۔اے پاس کرنے کا معاوضہ پوری رقم میں سے تین چوتھائی واپس کریں گے"۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تعلیمی پالیسی میں اساتذہ کی فیڈریشن اور قومی تعلیمی ایسوسی ایشن کی مہم میں ناکامی کی وجہ سے بہت سے افراد دلبرداشتہ ہوئے لیکن اس کے باوجود امریکی صدر نے تعلیم کو سماجی سطح پر آزاد اور خودمختار چھوڑ دیا ہے۔ جب کہ کوئی بھی فرد دراصل عوامی تعلیم یا اساتذہ کے اتحاد کے لئے مددگار ثابت نہیں ہو سکتا۔ عوامی تعلیم کو ناکام ہوتے ہی دیکھا گیا ہے۔ اس صورت میں بلاشبہ ماہرین تعلیم اوباما کی پالیسیوں میں معاونت کریں گے۔ اساتذہ کے باہمی اتحاد اور اعتراضات کے خاتمہ کے لئے امریکی صدر اوباما نے قومی معیار، تعلیمی اداروں کے منشور اور ان کے بجٹ کے لئے مواقع فراہم کئے ہیں۔

آئزک سٹینر (Isaac Steiner) امریکہ کی تعلیمی پالیسی کو یوں بیان کرتے ہیں:

"Despite the strong backing of the American Federation of teachers (AFT) and the National Education Association, many of whose local affiliates and members worked his compaign, Obama has taken a social liberal position on education, one that does not necessarily

(1) http://www.labour.org.uk

support traditional public education or teachers unions. with public education seen as failing, many will no doubt support his policies. Over the unions, objections, Obama has come out strongly for national standards, charter schools and merit pay. (1)

امریکن فیڈریشن آف ٹیچرز اور قومی تعلیمی انجمن کی زبردست تعلیم کے قومی مراکز یہ تجویز دیتے ہیں کہ تعلیمی نظام بنیادی طور پر جاپان یا یورپ کے طرز تعلیم پر منظم ومربوط کیا جانا چاہیے۔ان کی تعلیمی پالیسی میں دسویں درجہ کے معیاری امتحانات ہوتے ہیں اور وہ طلباء کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچنے تک تکنیکی اور فنی تعلیم سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ان کے خیال میں تعلیم کے لئے بہت سی تنظیمات ہونی چاہئیں جو بین الاقوامی سطح پر معاشی ترقی میں فعال کردار ادا کرنے کے قابل ہوں۔

امریکہ کے تعلیمی نظام میں بہتری لانے کے لئے تعلیم کے قومی مراکز یہ تجویز دیتے ہیں کہ تعلیمی نظام بنیادی طور پر جاپان یا یورپ کے طرز تعلیم پر منظم ومربوط کیا جانا چاہیے۔ان کی تعلیمی پالیسی میں دسویں درجہ کے معیاری امتحانات ہوتے ہیں اور وہ طلباء کو کالجوں اور جامعات میں پہنچنے تک تکنیکی اور فنی تعلیم سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ان کے خیال میں تعلیم کے لئے بہت سی تنظیمات ہونی چاہییں جو بین الاقوامی سطح پر معاشی ترقی میں فعال کردار ادا کرنے کے قابل ہوں۔(2)

کسی بھی ریاست کی تعلیمی پالیسی میں ایسا نصاب ہو جو کسی فرد کی ماحولیاتی، حیاتیاتی، وراثتی اور ذہنی نشوونما اور ترقی پر مبنی ہو۔ابتدائی سطح پر تعلیم کا مقصد کسی فرد کی سوچ وبچار، ان عوامل سے آگاہی اور خود اعتمادی پیدا کر کے اسے نکھارنا ہے تاکہ اس کی شخصیت اسے ترقی کے متحرک بہاؤ کی طرف لائے اور وہ معاشرے کے دیگر افراد کے لئے مثالی شہری کا کردار ادا کرے۔اس نوع کا تعلیمی نظام کسی بھی ریاست کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

سماجی تحفظ

حکومت کی بنیادی ذمہ داری سماجی تحفظ کو یقینی بنانا ہے۔اس کے لئے منظم ومربوط نظام کی ضرورت ہے جو اندرونی اور بیرونی خطرات اور سازشوں سے نمٹنے کے لئے اہم کردار ادا کرے۔دفاع کے لئے ایسی پالیسی ہو جس کی حفاظت اور نگرانی کے لئے باقاعدہ طور پر ایک کونسل موجود ہو جو اس بات کا خاص خیال رکھے کہ فوجی طاقتیں بوقت ضرورت لوگوں کی مدد کریں تاکہ وہ مامون ومحفوظ ہونے پر فخر محسوس کریں۔

قومی تحفظ اور دفاع کے ضمن میں بی بی تھیلیا لکھتے ہیں:

"National Security is the matter of guarding national values and interests from both internal and external dangers" (3)

قومی تحفظ قومی اقدار ومفادات کو اندرونی وبیرونی خطرات سے محفوظ کرتا ہے۔

برطانیہ میں سیکورٹی سسٹم کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے ایسی اصلاحات کی گئی ہیں جو اس کے ملک اور باشندوں کے لئے

(1) http.//www solidarity-us.org/obamaworkingpapre3
(2) Ibid
(3) www.deepdure.com

مفید و معاون ہوں گی:

"We have commenced a Strategic Defence and Security Review, commissioned and overseen by the National Secunty Council, with strong Treasury involvement. we will also develop and publish a new National Security Strategy. We will urgently review Control Orders, as part of a wider, review of counter terrorist legislation, measures and programmes.... we are working to rebuild the military covenant, Including by: ensuring that Service personnel's rest and recuperation leave can be maximised providing support for ex-Service personnel to study at university; providing extra support for veteran mental health needs; and reviewing the rules governing the awarding of medals. (1)

ہم نے دفاع اور تحفظ کا جائزہ لینا شروع کیا ہے۔ قومی تحفظ کی کونسل مضبوط مالی شمولیت کے ساتھ اس کی نگرانی اور احتساب کرے گی۔ ہم نئی قومی سلامتی حکمت عملی اپنائیں گے اور اسے مشتہر کریں گے۔ ہم فوری طور پر "کنٹرول آرڈر" کا جائزہ لیں گے۔ ایک وسیع تر حصے کے طور پر قانون انسداد دہشت گردی کا جائزہ لینے، پروگرام اور تدابیر اختیار کرنے کی خاطر ہم دفاعی معاہدے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ جس میں سرکاری ملازمین کے آرام اور بحالی صحت کے لئے تعطیل میں اضافہ شامل ہے۔ سابقہ سرکاری ملازمین کو یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے مدد فراہم کرنا، ذہنی نشوونما کی زیادہ سے زیادہ ضروریات فراہم کرنا اور تمغہ جات عطا کرنے کے قانون کا جائزہ لینا شامل ہے۔

کینیڈا کی قومی سطح پر دفاع کی پالیسی پورے معاشرے کو تحفظ فراہم کرنے میں سودمند کردار ادا کرتی ہے۔ درج ذیل عبارت اس موقف کی تائید کرتی ہے:

"National Security is defined as a state of affairs whereby Canadians are able to pursue their lives in an open and democratic society, compatible with the needs and legitimate aspirations of others. It includes freedom from undue fear of attack against their person, communities, sources of their prosperity, and Canadian sovereignty. It entails the preservation of the political, economic and social values respect for the rule of law, democracy, human rights, a market economy, and the environment, which are central to the quality of life in Canada".(2)

---

(1) http //www.labour org uk

(2) www.deepdure.com

قومی سلامتی کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ ایسے حالات جہاں کینیڈا کے لوگ اپنی زندگی آزادانہ جمہوری معاشرے میں گزار سکیں اور یہ ضروریات اور دوسروں کی جائز خواہشات سے ہم آہنگ ہو۔ اس میں انسانوں، طبقات، خوشحالی کے ذرائع اور کینیڈا کے اقتدار اعلیٰ پر بلاوجہ حملہ کے خوف سے چھٹکارا شامل ہے۔ نتیجتاً یہ کینیڈا میں جمہوریت، انسانی حقوق، قانون کی بالادستی مستحکم معیشت اور اعلیٰ معیار زندگی کے تحفظ کی ضامن اور مرکز ومحور ہے۔

ریاست ہی اجتماعی امور کی نگران ہوتی ہے اور ان کا تحفظ قیام ریاست کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ اس کا ہر فرد امن کا خواہش مند، خوف سے آزادی اور اپنی منشاء کے مطابق زندگی گزارنے کا حق رکھتا ہے۔ کوئی بھی ریاست تن تنہا امن قائم کرنے کی ذمہ دار نہیں ہے کیونکہ سیاسی، سماجی اور اخلاقی قوانین عالمگیر ہیں۔ ان قوانین کی تعمیل اس ریاست پر فرض ہے جو اپنے اقتدار کو بحال رکھنا اور دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے۔

ریاست کا استحکام اور عوام کی فلاح و بہبود اس کی دفاعی قوت پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کو بیرونی مدافعت کے خدشات اور دیگر عناصر کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک مضبوط نظام دفاع کا قیام ضروری ہے۔ جو ریاست کو اقتصادی بدحالی، سیاسی بدنظمی، داخلی و خارجی عدم استحکام اور اخلاقی فساد کا شکار ہونے سے بچائے ورنہ بدامنی، خون ریزی، افراتفری اور دہشت گردی روزمرہ کا معمول بن جائے گی اور امن عامہ کی ابتر صورت حال ریاست کا امن و سکون غارت کردے گی۔

اس مقصد کے حصول کے لئے جاپان نے بنیادی پالیسیاں تشکیل دی ہیں

(1) Supporting the activities of the United Nations, promoting international collaboration, and thereby, making a commitment to the realization of world peace.

(2) Stablizing the livelihood of the people, fostering patriotism, and thereby, establishing the neccessary basis for national security.

(3) Building up rational defence capabilities by steps within the limit necessary for self-defence in accordance with national strength and situation.

(4) Dealing with external aggerssion based on the security arrangements with the U.S until the United Nations will be able to fulfill its function in stopping such aggression effectively in the future.(1)

۱۔ اقوام متحدہ کی سرگرمیوں میں معاونت کرنا، بین الاقوامی اشتراک کو ترقی دینا اور پھر اس ذریعہ سے دنیا میں امن کے احساس کا عزم کرنا۔

۲۔ عوام الناس کی معاش کو استحکام بخشنا، حب وطن کو فروغ دینا اور پھر اس کے ذریعہ سے قومی سلامتی کے لئے ٹھوس بنیادیں قائم کرنا۔

۳۔ قومی صلاحیت اور صورت حال کی مطابقت سے دفاع کے لئے ضروری حدود میں رہتے ہوئے بتدریج معقول دفاعی صلاحیتیں قائم کرنا۔

---

(1) www.mod.go.jp/led-act/d-policy/dpo/htnil

۴۔امریکہ کے اشتراک سے بیرونی جارحیت کا مقابلہ کرنا تاوقتیکہ اقوام متحدہ مستقبل میں ایسی جارحیت کے مؤثر انسداد کے قابل نہ ہو جائے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قومی دفاع کے لئے معاہداتی نظام رائج ہے۔UN (اقوام متحدہ) کے علاوہ دیگر ریاستیں بھی ان معاہدات میں شامل ہوتی ہیں اس میں فوجی حکمت عملی کے تحت اگر کوئی معاہدہ نہ بھی ہو تو ایٹمی اختیاروں پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور امریکہ اپنی جرائم پیشہ فطرت کی وجہ سے دھمکیاں دینے سے گریز نہیں کرتا۔جس کی وجہ سے نہ صرف اس کا ملکی دفاع متاثر ہوتا ہے بلکہ معاشی آزادی، تجارت اور جمہوریت میں خوشحالی، امن اور انصاف بھی نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں جے راسکن (G.Raskin) لکھتے ہیں:

The United State should end its role as guarantor, policeman or guardian at the gate in favor of an international organizational structure, namely the United Nations, that would secure the peace through mediation, arbitration, economic boycott, and an international security agreement. The United States would abide by the UN Charter by refraining from making threats to the peace and would instead work with other nations to build international institutions, including economic, security, and peacekeeping agencies within the UN family. (1)

امریکہ کو اقوام متحدہ جیسے بین الاقوامی تنظیمی ڈھانچے میں محافظ، پولیس مین یا متولی کا کردار ختم کر دینا چاہیے۔اقوام متحدہ بین الاقوامی امن کو صلح کاری ثالثی، معاشی بائیکاٹ اور بین الاقوامی معاہدہ سلامتی کے ذریعے یقینی بنائے گی۔امریکہ اقوام متحدہ کے چارٹر کا پابند ہوگا۔وہ نہ صرف امن کو خطرات لاحق کرنے سے باز رہے گا بلکہ دوسری اقوام عالم سے مل کر بین الاقوامی ادارے بنائے گا جس میں معیشت، سلامتی اور قیام امن کے ادارے شامل ہیں۔

یورپ کے مختلف ممالک میں مختلف نوعیت کا سیکورٹی نظام قائم ہے۔حال ہی میں امریکہ کی وزارت داخلہ نے دفاعی حکمت عملی کی طرف خصوصی توجہ دی ہے اور قومی تحفظ کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے۔اس نے انتظامیہ کی مدد سے دفاعی حکمت عملی کو واضح طور پر بدل دیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ملکی تحفظ کو بہتر بنانے کے لئے دوسرے ممالک میں فوجی طاقت کے استعمال کو ختم کیا جائے تاکہ یہی فوج ملکی دفاع کے لئے فعال ثابت ہو۔

سماجی فلاح و بہبود

معاشرہ میں نسل انسانی کا اجتماع مناسب تنظیم اور قومی زندگی کے نظام کا مطالبہ کرتا ہے۔جس میں ایک علاقہ کے افراد اپنے مفاد اور تحفظ کے لیے باقاعدہ طور پر باہم مربوط ہوتے ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے مسلسل کوشش کی جاتی ہے۔مجموعی طور پر عزت و احترام مال اور جان کا تحفظ اسی طرح اہم ہے۔جس طرح کہ انفرادی طور پر ہے۔لیکن بااختیار لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے جہد مسلسل میں مگن رہتے ہیں اور یہ لوگ ہمیشہ کمزوروں پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔حکمرانوں میں سے کوئی بھی ایسے انصاف کا خواہش مند نہیں ہے

(1)　The state and democracy, P-92

جس میں اس کے اپنے حقوق پامال ہونے کا خدشہ ہو۔

برک لینڈ تھامس (Birkland Thomas) مختلف اقوام میں سماجی بہبود کا تصور ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

The government has never declared a right to education, or health care, or a living wage, therefore, we can assume that the implicit policy is that one cannot get these benefits as a matter of right. Some other nations do express these services and benefits as rights, which often makes for interesting and important comparisons between the United States and other countries. (1)

حکومت نے کبھی بھی تعلیم، حفظانِ صحت یا رہائشی الاؤنس کو حق قرار نہیں دیا ہے۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ دراصل پالیسی یہ ہے کہ کوئی شخص ان مفادات کو بطور حق حاصل نہیں کر سکتا۔ جبکہ کچھ دوسری اقوام ان خدمات اور مفادات کو حق قرار دیتی ہیں جن سے اکثر اوقات امریکہ اور دوسرے ممالک کے مابین ایک اہم اور دلچسپ تقابل سامنے آتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل ویلفیئر کے مقالہ نگار اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

In the U.S.A and other economically advanced countries, the function of social work is seen to be the promotion of the "social functioning" of human-beings, whether as individuals or groups or in a community, through the rallying of their own resources and a maximum utilisation of available services. Some writers have characterised social work as an institution which promotes the full and effective functioning of other institutions of society. The emphasis is on the area of inter-personal or inter-group relationships and on how to make them individually satisfying, mutually beneficial and socially fruitful. (2)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دیگر اقتصادی جدید ممالک میں سماجی کام کے شعبہ میں، اپنے جمع شدہ ذرائع اور دستیاب خدمات کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے انسان کے سماجی کام کاج کے فروغ کو دیکھا گیا ہے۔ آیا کہ وہ افراد گروہوں میں یا معاشرہ میں ہوں۔ کچھ مصنفین ایک ادارہ کے طور پر سماجی کام کی خصوصیات رکھتے ہیں جو کہ معاشرہ کے دوسرے اداروں کے کام کو مکمل اور مؤثر طریقہ فراغ دیتی ہیں۔ بین الذاتی یا بین الگروہی تعلقات کے وسعتِ عمل پر زور دیا گیا ہے اور اس بات پر کہ ان کو کیسے انفرادی طور پر تسلی بخش، باہمی طور پر فائدہ مند اور سماجی طور پر نتیجہ خیز بنانا ہے۔

(1) An Introduction to the Policy process, Theories, concepts and models of public policy making, P-203

(2) Encyclopedia of Social Welfare, Vol:01, P-175

حکومت کا خیال ہے کہ عوام ضروری نگہداشت کی مستحق ہے۔اس سے ادب واحترام اور عظمت کا برتاؤ کیا جائے۔سماجی تحفظ کے نظام میں اصلاحات کرنا بہت ضروری ہیں تا کہ عوام کی روزمرہ کی اشیاء کی قیمتوں کے بوجھ کو ہلکا کیا جائے جو وہ اور ان کے خاندان برداشت کرتے ہیں۔ سماجی بہبود کے ضمن میں برطانوی حکومت نے چند اقدامات کئے ہیں:

We will establish a commission on long-term care, to report within a year. The commission will consider a range of ideas, including both a voluntary insurance scheme to protect the assets of those who go into residential care, and a partnership scheme as proposed by Derek Wanlers, we will break down barriers between health and social care funding to incentive preventative action we will extend the greater roll-out of personal budgets to give people and their carers more control and purchasing power (1)

ہم ایک سال کے دوران طویل عرصہ کی دیکھ بھال کے لئے ایک کمیشن قائم کریں گے۔یہ کمیشن بہت سی تجاویز پر غور کرے گا جن میں نہ صرف رہائشی دیکھ بھال کے تحت آنے والے لوگوں کے اثاثہ جات کے تحفظ کے لیے یک رضا کارانہ بیمہ سکیم شامل ہے بلکہ ''ڈیرک ویلس'' کی پیش کردہ شراکتی سکیم بھی شامل ہے۔ہم احتیاطی تدابیر کے ذریعہ سرمایہ فراہم کر کے صحت اور سماجی تحفظ کو درپیش مسائل کا خاتمہ کریں گے۔ہم ذاتی سرمائے کو بروئے کار لا کر ایک اہم کردار ادا کریں گے جن سے لوگ ان کی نگہداشت کرنے والے زیادہ قوت خرید اور کنٹرول کے حامل ہو جائیں گے۔

حکومتی سطح پر شہریوں کی ضروریات اور خواہشات کو ترجیح دی جائے۔خدمت عامہ کے محکمہ کو وسعت اور ترقی دی جائے، یہ یقیناً شہریوں کے لیے امن و سکون اور خوشحالی کا باعث ہوگا۔عوامی خدمات، کسی مقصد کے حصول، شخصیت کی بہتری اور موثر ملکی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔موجودہ حالات میں ملکی ترقی اور خوشحالی کے لئے پیداواری مواقع اور عمدہ ترین حکمرانی کا ہونا بہت ضروری ہے لہذا اس کے مطابق پالیسیاں تشکیل دی جائیں۔منور اقبال لکھتے ہیں:

"Individual freedom and human dignity is supreme although subject to the axiom of responsibility This implies that decision makers, given the right to acquire capabilities and opportunities, make their own allocation decisions and bear the consequences. Society is committed to provide the necessary environment for equitable access to capabilities and opportunities as well as transparency in government. (2)

---

(1) http://www labour org uk

(2) Munawar Iqbal, Islamic Economic Institutions and the Elimination of Poverty, Published, The Islamic Foundation Book, Leicester, Uk, 2002, P-43

انفرادی آزادی اور انسانی عظمت اعلیٰ ترین صفات ہیں۔ بشرطیکہ ذمہ داری مسلمہ حقیقت پر مبنی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فیصلہ ساز، حاصل شدہ مواقع اور اہلیتوں کے پیش نظر مختص شدہ رقم کو استعمال کر سکتے ہیں لیکن اس کے نتائج انہیں خود بھگتنا ہوں گے۔ صلاحیتوں اور مواقع تک منصفانہ رسائی کے لئے ضروری ماحول اور صاف ستھری حکومت مہیا کرنا معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

بنیادی ضروریات جو لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے درکار ہوتی ہیں اس کی براہ راست ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، ان ضروریات میں سستی تعلیم، صحت، روزگار، انصاف کی فراہمی، امن وامان، زندگی کا تحفظ، ڈر اور خوف کے بغیر ماحول، خوراک کی فراہمی، نقل وحمل کی سہولیات، آمدنی اور مہنگائی کے درمیان توازن وغیرہ شامل ہیں۔ عام فرد ان تمام ضروریات میں کوئی بہت زیادہ سہولتوں کا خواہش مند نہیں ہوتا، لیکن حکومت سے اس قدر توقع ضرور رکھتا ہے کہ وہ اسے باعزت اور پروقار طریقے سے زندہ رہنے کا موقع فراہم کرے۔

اسلامی اور مغربی داخلہ پالیسی ـــــــ تقابلی مطالعہ

دنیا کے ہر طرز حکومت کی نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں جو اُسے دیگر حکومتوں سے منفرد رکھتی ہیں۔ جو حکومت جتنی زیادہ جامع خصوصیات کی حامل ہوگی اتنی ہی زیادہ وہ اپنی عوام کے لئے اچھے اثرات چھوڑے گی۔ بہت سی حکومتیں آپس میں مماثلت رکھتی ہیں لیکن ان کے درمیان جزوی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس وقت اکثر حکومتیں اندوہناک صورتحال سے دوچار ہیں۔ انہیں داخلی طور پر کئی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا سامنا ہے تو بیرونی طور پر وہ کئی سازشوں اور عسکری جارحیتوں کا شکار ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ان مملکتوں کو سیاسی پالیسیوں اور انتظامی اقدامات میں مختلف نوعیت کے مسائل درپیش ہیں۔

کسی مملکت کی ترقی واستحکام کا دارومدار اس ملک کے نظریہ سے وابستگی، اس کی معاشرتی، معاشی، سیاسی اور دفاعی صورت حال پر ہوتا ہے، اگر وہ مملکت اپنے بنیادی نظریہ اور قومی نصب العین پر قائم ہے، اندرونی اور بیرونی خلفشار سے محفوظ ہے، معاشی ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اس میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہے، عوام اور حکومت کے درمیان محبت اور اعتماد کا رشتہ قائم ہے اور وہاں کے باشندوں کی مادی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل کا پورا انتظام موجود ہے تو وہ مملکت ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، اس کی سالمیت اور استحکام کو کوئی خطرہ نہیں اور وہ اپنے قومی نصب العین سے وابستہ ہو کر ترقی وفلاح کی شاہراہ پر گامزن ہوتی اور پھلتی پھولتی ہے۔

اسلام محض ایک مذہب نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کو ایک مکمل ضابطہ حیات عطا کرتا ہے، جس میں انسانیت کے لئے ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے۔ ریاست کا مقصد اللہ اور رسول ﷺ کے دیئے گئے قرآن وسنت کے مطابق اصول وضوابط کو تشکیل دینا ہے۔

اس ضمن میں ظہیر الدین لکھتے ہیں:

> Modem systems are being changed by the man. Sometimes they are included with Islamic system and sometimes they separated them from it, but Islam always remained a permanent and unique system having no relations and connections or adoptions with other

system. Basic principle of Islamic System is totally different from other systems, as its basic principle. (1)

جدید نظاموں کو انسان تبدیل کر رہا ہے۔ بعض اوقات وہ اسلامی نظام سے باہم متماثل ہوتے ہیں اور بعض اوقات اس سے جدا ہوتے ہیں لیکن اسلام ہمیشہ مستقل اور منفرد نظام رہا ہے، جس کا کسی دوسرے نظام سے کوئی تعلق، واسطہ یا اپنائیت نہیں رہی ہے۔ اسلامی نظام کے بنیادی اصول وضوابط دوسرے نظاموں سے مجموعی طور پر مختلف ہیں جیسا کہ اس کا بنیادی اصول ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

"إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ" ۲

"حکم صرف اللہ ہی کا ہے اس نے یہ حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت مت کرو یہی سیدھا طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

جب اللہ تعالیٰ ہی اقتدار اعلیٰ اور قانون ساز ہیں تو قانون الٰہی کو زمین کے قانون کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محی الدین اسلام کے بنیادی اصولوں کو اولیت دیتے ہوئے رقمطراز ہیں

اسلامی حکومت میں سیاست کی بنیاد قرآن کے ان بنیادی اصولوں پر استوار ہوتی ہے جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ عمل میں کارآمد اور قابل عمل ہوتے ہیں۔ اس لئے آج بھی اسلامی نظریہ کو انسانی مسائل حل کرنے میں جو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے وہ کسی بھی مغربی سیاسی نظریے سے ممکن نہیں۔ ہمارا یہ ایمان اور اعتقاد ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے اختیار کردہ سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی اصول ہی اسلامی سیاست کے بنیادی مدار ہیں انہیں اصولوں پر اسلامی حکومت کی بنیاد کھڑی کی جاتی ہے۔ ۳

ہر حکومت خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، حکومت کے اصول وضوابط کی روشنی میں بنتی ہے اور بننے کے بعد بھی اصول وضوابط کی روشنی میں اپنے فرائض کو پورا کرتی ہے۔ اسلامی حکومت جس طرح کہ ایک نظریاتی حکومت ہے تو یہ الٰہی قانون کے مطابق بنے گی اور بننے کے بعد بھی الٰہی قوانین کی روشنی میں اپنے فرائض بجالائے گی۔

علامہ محمد مبارک لکھتے ہیں:

"التشريع مصدره القرآن والسنة فيما حدد فيهما، وليس الحاكم، ولا الشعب مطلق الحرية في التشريع كما يشاء بل كلاهما مقيد حسب اعتقادهما الاسلامي بما شرعه الله رسوله من شريعته" ۴

شریعت کا ماخذ قرآن وحدیث ہے۔ ان دونوں میں حدود کو بیان کیا گیا ہے اور شریعت میں حاکم اور رعیت دونوں کے لئے مطلق آزادی نہیں ہے جس طرح ان کی مرضی ہو بلکہ حاکم اور رعیت اعتقاد کے موافق مقید ہیں اور وہ اعتقاد اللہ تعالیٰ نے شریعت کی رو سے ان کو دیا ہے۔ اسلامی

---

(1) Leghari, Zaheer uddin, Concept of Islamic System of Government and Judiciary, Perspective Shari, ah, Shariah academy International Islamic University Islamabad, 1 IV, June 2003, P-24

۲۔ یوسف ۱۲: ۴۰

۳۔ قاضی، ڈاکٹر محی الدین، محمد محسن کائنات ﷺ اسلام و جدید مسائل، مطبع قاضی پنڈ قاضی، دفاتر قانون، ززرروڈ، لاہور، س۔ن، ص ۱۴۰

۴۔ مبارك، علامه، محمد، نظام الاسلام الحكم والدولة، دار الفكر، بيروت، لبنان، س۔ن، ص ۷۹

حکومت کی روح ایک امتیازی شان رکھتی ہے اور یہ اس روح کے علاوہ ہے جس پر وضعی نظاموں اور حکومتوں کی بنیاد ہے۔

مزید برآں علامہ محمد مبارک لکھتے ہیں:

"لا توصف الدولة الاسلامية لكونها دينية أو مدنية بالمعنى الغربي (الأوروبي) ذلك ان الدولة الدينية في التاريخ الأوروبي والمفهوم الغربي يحكمها رجال الدين مباشرة، أو بطريق غير مباشرة، وهم الذين ينصبون الملك ورئيس الدولة بمراسم وشعائر (طقوس) دينية خاصة"[1]

اسلامی حکومت مغربی اصطلاح کے مطابق دینی یا مدنی ہونے کے ساتھ متصف نہیں ہوتی اس لیے کہ یورپ کی تاریخ اور مغربی مفہوم میں دینی حکومت وہ ہے جس میں اہل دین بالذات یا بالواسطہ حاکم ہوں اور یہ اہل دین وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں حکومت کا رئیس یا بادشاہ خاص دینی مراسم اور طریقوں کے ساتھ مقرر کرتا ہے۔

جمہوری اور اسلامی نظام میں یہ فرق بہت واضح ہے کہ "اقتدار اعلیٰ" کے مالک عوام اپنی طاقت کا استعمال نہیں کر سکتے اور اس کے اظہار کے لیے اپنے نمائندے منتخب ومقرر کرنے کے محتاج ہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں حاکم ہے، اپنے نمائندے مقرر کرنے سے پہلے اس کی حکومت جس طرح تھی اسی طرح نمائندے مقرر کرنے کے بعد بھی رہتی ہے، اس سے اس کی فرماں روائی میں فرق نہیں آتا۔

علامہ ضیاء الدین رئیس لکھتے ہیں:

"ان سلطة الأمة في الديمقراطية الغربية مطلقة فالأمة حقا وعلى الاطلاق هي صاحبة السيادة بها والمجلس الذي تنتخبه التي تضع القانون أو تلغيه، والقرارات التي يصدرها هذا المجلس تصبح قانونا واجب النفاذ وتجب له الطاعة حتى وان جاءت مخالفة للقانون الأخلاقي او متعارضة مع المصالح الانسانية العامة فالديمقراطية الحديثة مثلا تعلن الحرب من أجل سيادة شعب على غيره أو الاستيلاء على سوق أو استعمار مكان وغيره"[2]

مغربی جمہوریت میں امت اور قوم کی حاکمیت مطلق ہوتی ہے، قوم حق پر ہو یا نہ ہو مطلقاً وہ صاحب سیادت ہوتی ہے یا وہ منتخب پارلیمنٹ جو وقت کی ضرورت کے مطابق قوانین بنائے اور اگر مصلحت ہو تو بنے قوانین کو لغو کرے اور وہ فیصلے جو یہ مجلس یا شوریٰ صادر کرے ایسے قانون بن جاتے ہیں جس کا نفاذ اور اطاعت واجب ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر چہ یہ فیصلے قانون کے ساتھ متصادم ہوں یا لوگوں کے عام مصالح کے ساتھ متعارض ہوں۔ پس نئی مغربی جمہوریت قوم کی حاکمیت کے لئے یا ایک بازار پر غلبہ پانے کے لئے یا کسی ایک جگہ کے استعمار کے لئے اعلان جنگ بھی کر سکتی ہے۔

اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے کہ اس میں خلیفہ اور حاکم مطلق العنان نہیں ہوتا بلکہ اہم امور میں اہل شوریٰ کے فیصلے کا پابند ہوتا ہے۔

علامہ عبدالقادر عودہ لکھتے ہیں:

"حكومة شورى: جعل الله الشورى من لوازم الايمان حيث جعلها صفة من الصفات اللاصقة

۱۔　ايضاً، ص ۱۴۰

۲۔　رئيس، علامه، ضياء الدين، النظريات السياسية في الاسلام، مطبوعة قاهرة، ۱۹۷۶ء، ص ۳۸۹

بالمؤمنین الممیزة لهم عن غیرهم"[۱]

اسلامی حکومت شوریٰ کی پابند ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے شوریٰ کو لوازم ایمان سے قرار دیا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے شوریٰ کو مومنین کی ان لازمی صفات میں سے بنایا ہے جن کے ذریعے مومن کافروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

مولانا حامد الانصاری لکھتے ہیں:

''جمہوری پارلیمنٹ (ایوان نمائندگان جمہور) دور جدید کے جمہوری ایوان، شاہی درباروں سے افضل ہیں۔ انہوں نے قابل تعریف طریقہ پر شخص واحد کی بادشاہی کو ختم کر کے مرضی عامہ کی نمائندگی کا حق حاصل کیا ہے لیکن یہ تمام ایوان اسلامی شوریٰ کی طرح مجرد، مفید، کارآمد اور سادہ نہیں ہیں'' [۲]

علامہ اسد اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

Some scholars view that a presidential system of government, especially the one practiced in the United States, corresponds closely to the requirements of the Islamic polity (3)

چند مفکرین کا خیال ہے کہ صدارتی نظام بالخصوص جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قائم ہے، اسلامی نظام حکومت کی جزئیات کے قریب تر ہے۔

ڈاکٹر عبید اللہ فہد نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں

The French system of presidential government would be perhaps, more close to Islamic Shura than the American one. After a thorough study of both the presidential systems, one may reach the conclusion that the Constitution of fifth Republic in France is a mixture of parliamentary and presidential systems of government and its, therefore closer to spirit of Islam (4)

صدارتی حکومت کا فرانسیسی نظام امریکہ کی بہ نسبت اسلامی شوریٰ سے زیادہ قریب ہے۔ دونوں صدارتی نظاموں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ایک فرد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ فرانس میں پانچویں جمہوریہ کا دستور حکومت کے صدارتی اور پارلیمانی نظاموں کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے اسلام کی روح سے قریب تر ہے۔

۱۔ عودہ، عبد القادر، المال والحکم فی الاسلام، دار الاندلس، بیروت، س ن، ص ۱۱۵

۲۔ الانصاری، مولانا، حامد، اسلام کا نظام حکومت، الفیصل ناشران اردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۳۱

(3) *Asad, Muhammad, The principles of state and Government in Islam, P-62*

(4) *Fahad, Dr, Abaidullah, Islamic Shura Religion, State and democracy, Seriels publications, New Delhi, India, 1987, P-331*

پارلیمانی نظام جو اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک میں رائج ہے صرف پانچ سالوں میں ایک بار عوام کے دروازے پر دستک دیتا ہے، وہ بھی کسی معاملے پر عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف اور صرف ووٹ لینے کے لئے جب کہ نظام خلافت عوام کو فیصلے کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے حکومت کا اصل اختیار عوام کے سپرد کرتا ہے۔ بلدیاتی ادارے، گورنر، جنرل اسمبلی، شوریٰ اور خلیفہ یہ تمام ادارے صرف قوانین کا نفاذ کروانے پر معمور ہیں جب کہ خلیفہ کو عدالت میں طلب کیا جا سکتا ہے اور شوریٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔

اسد کی رائے میں اسلام کا تصور حیات و کائنات اور اس کا معاشرتی و تہذیبی نظام، مغرب کے تصور و طرز حیات اور اس کی سماجی اقدار و روایات سے کہیں زیادہ پرشکوہ، پرسکون و بے اضطراب اور فطری و انسانی ہے:

> ”اسلامی معاشرہ اپنی داخلی قوت، پختگی اور سماجی تنظیم و استحکام کے اعتبار سے دیگر تمام انسانی معاشروں اور اقوام پر فوقیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات نے اسلام کے تہذیبی و معاشرتی ڈھانچے کو ٹھوس و مضبوط بنیاد فراہم کی ہے جب کہ پیغمبر ﷺ کے اسوہ حسنہ نے اس کے گرد ایک آہنی بندھن اور زنجیر کس دیا ہے چنانچہ بیرونی (اجنبی) تہذیبی و سماجی اقدار کی یورش کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کی قوت مزاحمت و مدافعت آج بھی ناقابل تسخیر ہے۔ اسلامی معاشرہ ایک ترقی پسند معاشرہ ہے جو بہت حد تک داخلی آویزشوں سے پاک اور اخوت و بھائی چارے کا علم بردار و آئینہ دار ہے“۔(۱)

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی پالیسیاں مرتب کرے کہ عوام میں دینی اقدار کو فروغ ملے۔ مذہبی و اخلاقی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر انہیں سہولت بہم پہنچائے اور ان کی زندگی کو اسلامی طرز کے مطابق ڈھالنے کے لئے تبلیغ و اشاعت کا اہتمام کرے تو دوسری جانب اس کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کرے کہ معاشرہ کا کوئی فرد بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے اور عام شہریوں کو معاشی، معاشرتی و علمی ترقی کے مواقع فراہم ہوں۔

سید مودودی لکھتے ہیں:

> "Before embarking on any proper analysis of the Islamic polity, it is essential to recognize the extensive and all encompassing nature of the religion: it does not merely present a set of personal beliefs, it presents an entire scheme of personal and communal life. Resultantly, examining the concept of governance in Islam requires a view against the background of the "whole Islamic system of life covering the economic, social, political and educational spheres of activity".(2)

---

(1) *Asad, Muhammad, Islam at the Crossroads, Publisher, Sh. Muhammad Ashraf Lahore, 6th edn, 1975, PP-2.3*

(2) *Maududi, Sayyid, Abul A'la, Islamic Law and constitution, trans, Khurshid Ahmed, Islamic publication limited Lahore, 1960, P-53*

اسلامی نظام حکومت کا مناسب تجزیہ کرنے سے پہلے مذہب کی ماہیت ونوعیت اور وسعت کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ یہ ذاتی عقائد کا ہی مجموعہ نہیں ہے بلکہ ذاتی اور فرقہ ورانہ زندگی کی ایک مکمل سکیم ہے۔ اسلام کی رو سے حکمرانی کا تصور زندگی کے مکمل اسلامی نظام یعنی معاشی، سماجی، سیاسی اور تعلیمی سرگرمی کے اختیارات کا غصب ہے۔

مغربی طرز حکومت میں پالیسیوں کو سیکولر نظام کے تحت تشکیل دیا جاتا ہے اسلئے ان کے مقاصد اسلامی پالیسیوں سے مختلف النوع ہیں جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف پبلک ایڈمنسٹریشن میں بیان کیا گیا ہے۔

"American federalism has never been static, Yet, each ebb and flow of the relative weight of the national government and the states in policy making has left the national government stronger than it was before. The rise of a national economy, the increasing technology of warfare and national defense, and the development of policy problems only subject to resolution on a large scale have all contributed to the secular increase of power in the hands of the national governments.(1)

امریکہ کی مرکزی حکومت کبھی بھی ساکن نہیں ہوئی۔ پالیسی سازی میں قومی حکومت اور ریاستوں کے باہمی تعلق کے اُتار چڑھاؤ نے قومی حکومت کو پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیا ہے۔ قومی معیشت کا عروج، جنگی تکنیک میں اضافہ، قومی دفاع اور پالیسی کی ترقی ایسے مسائل ہیں جو قومی حکومت کے اقتدار کو اعلیٰ سطح پر متحرک کر کے سیکولر کا حصہ بنتے ہیں۔

متحدہ ریاستوں میں حکومت کے وفاقی نظام کے تحت اختیارات اور ذمہ داریاں قومی حکومت اور ریاستوں کے مابین تقسیم کر دی جاتی ہیں۔ ان کا آئین اختیارات کو ریاستوں کی طرف منتقل کرتا ہے۔ ہر ریاست حکومت کے جمہوری ڈھانچے، غیر ملکی حملہ کے خلاف حفاظت اور داخلی بغاوت کی ضامن ہے۔ اس کے شہری متحدہ ریاستوں کے شہریوں کے حقوق کے ذمہ دار ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مغرب کے سماجی نظام اور اسلام کے تصور میں نہایت لطیف فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"موجودہ دور میں مغربی اقوام، اجتماعی اداروں کے ذریعہ اجتماعی ضروریات پوری کرنے کے معاملے میں بلندیوں تک جا پہنچی ہیں لیکن وہ خالص رضائے الٰہی کی خاطر، انسانی ہمدردی کے اس اونچے مقام تک نہیں پہنچ سکیں جس تک اپنے دور عروج اور شوکت میں امت مسلمہ جا پہنچی تھی۔۔۔۔ مغربی ممالک میں قائم ہونے والے اداروں سے استفادہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اسی ملک کے باشندے یا شہری ہوں یا اس علاقے میں رہتے ہوں لیکن مسلمانوں نے جو ادارے قائم کئے تھے ان کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے تھے"۔ ۲

---

(1) *Encyclopedia of public Administration and public policy, CRC press teylor and Francis Group, Printed in U.S.A, 2008, Vol:3, P-1823*

۲ السباعی، ڈاکٹر مصطفیٰ، مترجم سید معروف شاہ شیرازی، "سماجی تہذیب کے چند درخشاں پہلو"، ناشر اسلامی پبلیکیشنز لاہور، جون ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۸، ۱۸۹

اخلاقی اقدار، صرف اسلامی اقدار ہی نہیں ہیں جنہیں داخلی طور پر نسل انسانی کی دوستی کی خاطر اپنایا جائے بلکہ یہ انتظامیہ کی ذمہ داری ہے کہ ان اقدار کو ملک میں مساوی طور پر رائج کرے۔

اس سلسلہ میں عبدالرحمن احمد رقمطراز ہیں کہ:

> Subjective responsibility is based on internal or intrinsic motivation that, in turn, is the function of one's relationship with God and of some related values. The relationship in question pertains to iman (faith in God) and taqwa (awareness of God). Bothe generate a number of moral virtues that commit the individual to caring for the well-being of others. The related values, justice to and love for others, also motivate the individual to look after the welfare of others".(1)

داخلی ذمہ داری اندرونی یا ذاتی محرکات پر مبنی ہوتی ہے۔ جس میں ایک شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور کچھ متعلقہ اقدار کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ تعلق باللہ سے مراد ایمان اور تقویٰ ہیں۔ ان سے بہت سی اخلاقی اقدار اخذ کی جاتی ہیں۔ جس کے ذریعے ایک فرد دوسروں کی بہتری کے لئے کام کرتا ہے۔ اخلاقی اقدار یعنی انصاف اور دوسروں سے محبت ایسے عوامل ہیں جو اسے دوسروں کی فلاح و بہبود کی نگہداشت کے لئے متحرک رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کے بہت سے تقاضے ہیں ان میں سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کی جدوجہد کی جائے لیکن اسے انجام دے کر کوئی شخص دین کے دوسرے تقاضوں سے سبک دوش نہیں ہو جاتا۔ دین اس سے جس وقت جس تقاضے کو پورا کرنے کا مطالبہ کرے اسے پورا کرنا ہوگا۔ ؎

اسلام کے بنیادی، مذہبی و اخلاقی، تہذیبی و سماجی اور سیاسی اصول و اقدار مغربی معاشرت و طرز زندگی اور معاشرتی اقدار سے بالکل مختلف ہیں۔

محمد اسد لکھتے ہیں:

> Western civilization is chaotic and in its innermost self destructive and can thore by any doubt that modern Western society, with its loss of all spiritual convictions and of social morality... can there be any doubt that this society has entirely gone astray from the deepest

---

(1) *Ahmed, Abdul Rehmand, Administrative Responsibility: An Islamic perspective, The American Journal of Islamic social Sciences, Vol: 13.4, published the International Institute of Islamic thought in Kuala lumpur, Malaysia, P-502*

؎ جلال الدین عمری، سید، اسلام میں خدمت خلق کا تصور، طبع ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ، انڈیا، س ۔ ن، ص ۱۶

truths of life and now blindly rushes towards self-destruction? ....As things stands at present, Western civilization is about to expend the last remnats of a moral idealism, subconsciously inherited from its past. Unless it is able to replace those swiftly vanishing remnants by a new, adequate structure of Idealism, it is bound to go to the way of all other worn-out civilizations and to perish in a welter of conflicts, suffering and confusion. And there is no indication as yet that the western world is going to produce out of itself, such a new structure of idealism.(1)

کیا اس امر میں کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے کہ جدید مغربی معاشرہ کلی طور پر روحانی اذعانات (spiritual convictions) اور سماجی واجتماعی اخلاقیات سے قطعی طور پر تہی دامن ہو چکا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ مغربی معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہے اور زندگی کی ابدی سچائیوں سے بہت دور جا پڑا ہے اور خودکشی وہلاکت کی طرف بڑی تیزی سے گامزن ہے۔ اگر مغربی تہذیب اور معاشرہ اپنی سی ڈگر پر قائم رہا اور اس نے جلد اپنا رشتہ کسی روحانی ومذہبی ضابطۂ حیات اور سماجی اخلاقیات کے نظام سے نہ جوڑا تو دنیا کی دیگر تہذیبوں کی طرح یہ بھی انجام کار تباہی وبربادی سے دوچار ہو کر رہے گا۔ تاہم اس وقت تو دور دور اسکے کوئی آثار نظر نہیں آتے کہ مغربی دنیا از خود کوئی اخلاقی وروحانی نظام وضع کر سکے گی"۔

کوئی بھی معاشرہ جو اپنے بنیادی اور اساسی اصولوں کو خیر باد کہہ دیتا ہے، اخلاقی قوت سے محروم ہو جاتا ہے اور کوئی بھی معاشرہ اخلاقی قوت کے بغیر دنیا پر حکمرانی نہیں کر سکتا۔

دیگر نظام (وضع قوانین) کو معاشرے کے افراد اپنے حالات اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر تیار کرتے ہیں۔ اگر وہ نظام معاشرے کی ضروریات پوری نہ کرے اور قومی امنگوں پر پورا نہ اترے تو وہ اس نظام میں تغیر وتبدل کر دیتے ہیں اور بعض اوقات ان کی قومی امنگیں اور معاشرے کی ضروریات فطرت سے متصادم ہوتی ہیں اور بزعم باطل یہ قومی امنگیں بڑے خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔

یورپ میں کسی وقت ہم جنس پرستی، جرم قابل دست اندازی پولیس اور سات سال قید بامشقت کی متقاضی تھی لیکن آج یہ جرم قابل دست اندازی پولیس نہیں ہے انگلستان کی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کیا ہوا ہے کہ یہ اب جرم نہیں ہے اس سے محض وقت بہتر طور پر کٹتا ہے۔ [1]

مغربی معاشرہ قانون کو تبدیل کر کے نفسانی خواہشات کے مطابق بناتا رہتا ہے۔ سوسائٹی آگے آگے اور قانون اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے جب کہ اسلام کا نظام عدل خود معاشرے کو اپنے خطوط اور اساسیات پر چلاتا ہے۔

(1) *Asad, Muhammad, The Road to Mecca, Publisher, Max Reinhardt, London, 1954, P-305*

[1] نیازی، مولانا، عبدالستار خان، اسلامی عالمی نظام کی ضرورت، نوائے وقت، ۲ فروری ۱۹۹۳ء

مغرب میں بنیادی حقوق کا دائرہ صرف فرد اور ریاست کے تعلقات تک محدود ہے۔ ان حقوق کو بنیادی قرار دیا جاتا ہے جو ریاست کے وسیع اختیارات کے مقابلے میں ایک شہری کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت دفاعی اور حفاظتی ہے اور ان کا بنیادی مقصد بے اختیار شہریوں کو با اختیار حکمرانوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھنا ہے۔ جس دستور میں ان حقوق کو شامل کیا جاتا ہے۔

امریکہ کی جن ریستوں میں لوگوں کو اپنے دفاع کا موقع حاصل ہے اور مجرم کو معلوم ہے کہ عام شہری اپنے اسلحہ سے اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے، وہاں جرائم کا تناسب بہت کم ہے۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بھی فوجی تربیت دی گئی ہے اور یہ دنیا کے مہذب ممالک کے اندر عام ہے۔ سوئزر لینڈ کے اندر حاضر فوج بڑی کم ہے لیکن ہر شہری کو تربیت دی جاتی ہے۔ جرمنی، برطانیہ، فرانس، ترکی، شام ان ممالک میں ہر اہل شہری کے لئے ٹریننگ ضروری ہے۔

علامہ محمد مبارک نے داخلی امن کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے کہ:

ملک کی حفاظت، مسلمانوں کے علاقے اور ان کی حرمت کا دفاع ہے تاکہ وہ اطمینان سے زندگی بسر کریں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک امن سے سفر کریں۔ خارجی دفاع میں منع اسباب، دفع قوت اور سرحدوں کی حفاظت شامل ہیں۔ یہاں تک کہ دشمن محرمات کی بے حرمتی اور خلاف ورزی نہ کرے اور نہ ہی مسلمان یا معاہد کا خون بہائے۔ [1]

تقی الدین النبہانی لکھتے ہیں کہ:

> "The Muslim army has always been feared and respected. For centuries, Europe always held that the Muslim army could never be defeated How ever, Political maneuvers are essential, especially those which help to spread the Islamic concepts and demon strate the power of the state before resorting to armed struggle. Although jihad is the fixed method that never changes in the spreading of Islam the political maneuvers and others deliberate moves are all part of preparation, and is essential prior to actual combat. (2)

مسلمان فوج ہمیشہ بارعب اور قابل احترام رہی ہے۔ یورپ صدیوں سے اس بات کو تسلیم کر چکا ہے کہ مسلمان فوج کبھی شکست خوردہ نہیں ہو سکتی تاہم اسلامی تصورات کی اشاعت میں معاونت کرنے اور ریاستی اقتدار کے استحکام کے لئے کسی قسم کی لشکر کشی سے پہلے (دشمن سے) سیاسی گفت و شنید قائم کرنا ضروری ہیں۔ جہاد اشاعتِ اسلام کا ایک معین و مقررہ اصول ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ سیاسی مشقیں اور دوسری ضروری نقل و حرکت تیاری کا حصہ ہیں اور حقیقی مبارزت سے پہلے ضروری تصور کیے جاتے ہیں۔

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو نہ صرف اپنے اندر کے جابر اور مستبد حکمرانوں کے شر سے محفوظ رکھتی ہے، بلکہ بیرونی جارحیت سے بھی ان کا دفاع کرتی ہے۔ خواہ یہ جارحیت سامراجی استحصال کی صورت میں ظاہر ہو یا کوئی اور صورت اختیار کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

۱۔　نظام الاسلام الحکم والدولۃ، ص ۸۷

(2)　The Islamic state P-145

اسلام خود عظمت وشوکت اور قوت کا مذہب ہے اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ انسان اپنے بلند مقام سے گر کر جھوٹے اور باطل خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کرے۔

اصغر علی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

"The saudi monarch who prides himself with enforcement of Islamic shariat in his regime (and by implication claims it to be an Islamic State) has always been very close to the USA and in the fore-front to curb the movements aimed at radical socio-economic transformation in the Arab world.(1)

سعودی بادشاہ جو اپنے طرز حکومت میں اسلامی شریعت کے نفاذ پر فخر محسوس کرتا ہے (اور ایک اسلامی ریاست رکھنے کا دعویدار ہے) وہ ہمیشہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بہت قریب رہا ہے اور دنیائے عرب میں مکمل سماجی واقتصادی تبدیلی کی تحریکوں کے مقصد کو روکنے میں پیش پیش رہا ہے۔

مغرب کی سازشوں کے نتیجہ میں آج عالم اسلام منتشر ہے، وہ اپنی دفاعی ضروریت کے پیش نظر طاقتور غیر مسلم ممالک سے دفاعی معاہدے کرنے پر مجبور ہے اور وہ ان کی صفوں میں انتشار پیدا کر کے اور باہم لڑا کر ان کے وسائل کو بے دردی سے لوٹ رہا ہے۔ اگر مسلمان ممالک متحد ہو کر باہمی دفاعی معاہدے کریں اور اپنے وسائل کو اپنے دفاع پر صرف کریں تو وہ ہر قسم کے خطرات سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں اور یہ بھی بھولنا نہیں چاہیے کہ کفار مسلمانوں کے کبھی بھی ہمدرد و خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔

اسلامی ریاست نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم کے جان، مال اور عزت کے دفاع کی بھی ضمانت دیتی ہے اس کا اعتراف بذات خود غیر مسلموں نے کیا ہے۔ وہ اپنی فوج اور اسلحہ کو داخلی اور بیرونی خطرات سے ملک اور عوام الناس کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے جب کہ دیگر مغربی ممالک خصوصاً امریکہ اپنی ایٹمی طاقت کا ناجائز استعمال کر کے دیگر ممالک میں فتنہ وفساد کا سبب بنتا ہے اور اکثر مسلم ممالک ہی اس کی جارحیت کا نشانہ بنتے ہیں۔ اس سے نہ صرف عالمی امن کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ اس کا اپنا داخلی تحفظ، معاشی استحکام اور عوام کی ترقی و خوشحالی بھی متاثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں عدل وانصاف نہ ہونے کے برابر ہے۔

تعلیمی نظام کا مقصد دنیائے جدید میں مروجہ ضروریات کی تکمیل ہے جس میں روحانی وجسمانی ضروریات کی تسکین ہو اور تمام مادی ضروریات پوری ہوں تا کہ ہر فرد ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزار سکے۔ تعلیم مادی، مذہبی اور نظریاتی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے۔ موجودہ دور میں اکثر ممالک میں تعلیمی نظام ان خطوط پر استوار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا نظام بنی نوع انسان کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔

اسلام کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کی تعلیم بہت سادہ اور آسان ہے اس میں کوئی اشکال اور کوئی ایچ پیچ نہیں۔ نہ اس کا سمجھنا مشکل ہے اور نہ اس کا شعور اور نہ اس پر ایمان وایقان دشوار۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان کو جو صلاحیتیں دی گئی ہیں، وہ ان کا بھرپور استعمال کر کے اپنے گردو پیش پھیلی ہوئی حیات وکائنات کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے۔

---

(1) Engineer, Asghar Ali, Theory and Practise of the Islamic State, Publisher vanguard books Ltd, Lahore, 1985, P-7

مغربی پالیسی کے تحت تعلیم کا مقصد سرمایہ کی خدمت قرار پایا ہے۔ تعلیم کی ساری تنظیم Job Market کے لئے ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں تعلیم یافتہ انسان ایک شے ہے جس کی قیمت لگ سکتی ہے۔ ایک انسان Capital ہے جو مزید سرمایہ پیدا کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کو روزگار سے منسلک کیا گیا ہے اور (Job Market) میں تعلیم یافتہ فرد کی قیمت لگتی ہے۔ پھر عالمی سرمایہ داری نے بین الاقوامی مارکیٹ پیدا کی ہے۔ یوں مقامی اور عالمی مسابقت ہوگی اور مارکیٹ متعین کرے گی کہ کس قسم کی تعلیم مطلوب ہے۔ کون سے مضامین بہتر روزگار کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ اس طرح تعلیمی ادارے مجبور ہو جائیں گے کہ وہی مضامین پڑھائیں جو سرمایہ دارانہ نظام میں اچھی قیمت دے سکتے ہیں۔ اس طرح تعلیم کا اخلاقی وروحانی پہلو ختم ہو گیا۔ شخصیت کی تعمیر اور معاشرتی شعور کی آبیاری غیر ضروری ہو گئی۔

عالمی سرمایہ داری نے Privitization کا اصول تعلیم کے میدان تک پھیلایا ہے۔ ریاستوں پر دباؤ بڑھاتا ہے کہ پبلک سیکٹر کے تعلیمی اخراجات کم کریں۔

ڈیو ہل (Dave Hill) اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

> ''سرمایہ داروں نے تعلیم کے لئے تاجرانہ ایجنڈا تیار کیا ہے جس میں یہ بات شامل ہے کہ پرائیوٹائزیشن اور تعلیم کو مارکیٹ اکونومی کی طرز پر لانے کا بالآخر یہ نتیجہ نکلنا چاہیے کہ تعلیم پر کثیر القومی کمپنیوں اور بڑی کارپوریشنوں کا قبضہ ہو جائے۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور دوسری گلوبل تنظیمیں یورپی دنیا میں اسی ایجنڈے پر کام کر رہی ہے''۔ [1]

اس ایجنڈا کا اہم حصہ ریاست کو ایک کمپنی کی طرح چلانا ہے۔ جس کا مقصد نفع کمانا اور مزدور کا استحصال کرنا ہے اس پالیسی کے نتیجہ میں غربت میں اضافہ ہوگا، تعلیم کے مواقع کم ہوں گے اور عام آدمی کے لئے تعلیم کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ صرف سرمایہ دار ہی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

علامہ اسد نے جدید مغربی تعلیم کی نوعیت وماہیت، اس کے خصائص اور مسلم معاشرہ پر مرتب ہونے والے اس کے اثرات کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے:

> جدید مغربی نظام تعلیم، جو دراصل یورپ کے مذہبی، تہذیبی وسماجی اقدار وتصورات، اس کے تصور انسان وکائنات اور اس کے مخصوص تاریخی تجربات پر مبنی ہے، اپنی ماہیت کے اعتبار سے مذہب وروحانیت کا دشمن ہے۔ چنانچہ اس بات کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ مسلم نوجوانوں کو دی جانے والی یہ مغربی تعلیم اسلام دشمن موثرات سے پاک ہوگی۔ مغربی تعلیم لازمی طور پر مسلمانوں کی نوجوان نسل کے حاسہ دینی کو کمزور کر دیتی ہے۔ [2]

مزید برآں تقی الدین النبھانی سیکولر نظام تعلیم کے بارے میں رقمطراز ہیں

> What helped the rule of kufr to strengthen its grip over the Muslims was the fact that the colonialists had based their strategy on charging the Islamic state's education policy. They designed a new

---

(1) Hill, Dave, Neo-Liberalism, Global Capitalism and Educational change, P-42

(2) Islam at the cross roads, P-91

> educational program for the Muslims. The objective of this curriculum was to produce individuals with a western personality, i,e Someone with a capitalistic or secular out look to regulating life,s affairs. These programs including those in Islamic universities are still in force today through out all the countries of the Muslim world. as a result, we have many teachers that ensure the safety of these educational Programs (1)

مسلمانوں پر کفر کی حکمرانی کی گرفت کی محدود معاون حقیقت یہ تھی کہ سامراجی قوتوں نے اپنی حکمت عملی کی بنیاد پر اسلامی ریاست کی تعلیمی پالیسی کو یکسر تبدیل کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک نیا تعلیمی لائحہ عمل تیار کیا۔ اس نصاب تعلیم کا مقصد ہر فرد میں مغربی روح کو اجاگر کرنا تھا تاکہ ہر فرد زندگی کے روزمرہ معاملات میں سرمایہ دارانہ یا سیکولر نظام کے تحت دکھائی دے۔ اسلامی یونیورسٹیوں سمیت مسلم دنیا کے تمام ممالک میں ان منصوبوں کو روبہ عمل لایا گیا ہے۔ نتیجتاً اسلامی ممالک کے بیشتر اساتذہ نے ان تعلیمی منصوبوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے کام کیا ہے۔

الغرض مسلمان جو اپنی تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے مغرب زدہ ہو چکے ہیں۔ انہوں نے مغربی نقطۂ نظر ہی کو اپنایا ہے، وہ وہ اس پر بھرپور یقین و ایمان رکھتے ہیں۔ گویا کہ وہ غیر ملکیوں کے پرستار ہیں اور انہیں کے طرز عمل کو اپنائے ہوئے ہیں وہ مغرب کے لوگوں کی طرح اسلام اور اسلامی ثقافت سے نفرت کرتے ہیں، ان کا یقین ہے کہ اسلام اور اسلامی ثقافت ہی مسلمانوں کے زوال کا باعث بنی ہے۔ نتیجتاً مشنری مسلمانوں کو ذہنی طور پر مفلوج کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں وہ اسلام اور اسلامی ثقافت کے خلاف انہیں مسلمانوں کے ذریعہ سے محاذ آرائی کرتے ہیں۔

مولانا مودودی کے خیال میں اسلامی نظام کو جو چیز نافذ ہونے سے روک رہی ہے اور جو رجحانات اور نظریات اس کے راستے میں سدراہ ہیں ان کا اگر تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ:

> ''انہیں مسلمان ملکوں پر مغربی قوموں کے طویل سیاسی غلبہ نے پیدا کیا ہے۔ مغربی قومیں جب ہمارے ملکوں پر مسلط ہوئیں تو انہوں نے ہمارے قانون کو ہٹا کر اپنا قانون ملک میں رائج کیا۔ ہمارے نظام تعلیم کو معطل کر کے اپنا نظام تعلیم رائج کیا۔ تمام چھوٹی بڑی ملازمتوں سے ان سب کو برطرف کیا جو ہمارے تعلیمی نظام کی پیداوار تھے اور ہر ملازمت ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دی جو ان کے قائم کردہ نظام تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے تھے''۔ ؏

گویا مغربی تہذیب و تعلیم کو اختیار کرنا کسی دوسرے مذہب میں داخل ہو جانے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس طرح ایک مسلمان اپنے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے ناواقف ہو جاتا ہے اور پوری قوم سے حقیقی اسلامی روح ختم ہو جاتی ہے۔

تعلیم کا مقصد اگر انسانیت کی فلاح اور اعلیٰ انسانی قدروں کا تحفظ ہو تو ہر علم خیر ہے اور اگر مقصد مفاد پرستی اور دوسرے انسانوں کا

---

(1) The Islamic State, P-218

؏ مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا، اسلامی ریاست، ناشر اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱۵

استحصال ہو تو ہر علم سے شر اور فساد پیدا کیا جاسکتا ہے۔

آج پوری دنیا مختلف قسم کے فکری انتشار کی لپیٹ میں ہے اور یہ افکار سیاسی وفلسفی مناہج، نفع اندوزی کی پالیسی، سوشلزم و کیمونزم، خود پرستی، آزادروی، نام نہاد روشن خیالی اور اس طرح کی دیگر آزادانہ پالیسیوں پر مشتمل ہیں۔ اس فکری انتشار نے دنیا کو سوائے مشکلات و ابتلاء کے کچھ نہیں دیا۔ دنیا میں امن وامان اور استحکام اسی صورت میں ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ اگر عہد نبوی اور خلفائے راشدین کی پالیسیوں کو نافذ کیا جائے اور ان پر عمل درآمد کیا جائے۔

علامہ مبارک لکھتے ہیں:

"ان سیاسة الدولة الداخلیةفی تشریعها، ونظمها وفی تعلیمها و جمیع مؤسساتها تنبثق فی هذا الأساس الذی تقوم علیه و کذلک سیاستها الخارجیة و علاقاتها الدولیة"[1]

اسلامی حکومت کی داخلی سیاست اپنی تشریع، نظم، تعلیم اور تمام مربوط امور میں اسی اساس سے نکلتی ہے، جس پر اسلامی حکومت کا قیام ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومت کی خارجی سیاست اور دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات اور ارتباطات بھی اسی اساس سے نکلتے ہیں۔

ایک اسلامی ریاست میں جس کی بنیادی اسلامی نظریہ پر ہے، سیکولر نظریات کی ترویج، نظام شریعت سے انحراف اور تہذیب مغرب کی اندھا دھند تقلید اس ریاست اور معاشرہ کے تحفظ، بقاء وارتقاء کی قطعاً ضامن نہیں ہوسکتی۔

عصر حاضر میں مسلم ممالک کی حکومتیں سیکولر، سرمایہ دارانہ اور جمہوری نظام کے نفاذ، مغربی ممالک کے ساتھ مضبوط سیاسی تعلقات اور قومیت پرستی کی بنیاد پر تشکیل دی گئی ہیں۔

محمد سلیم لکھتے ہیں:

"The principal goal of secular states is to realize what is called "The states' interest" How ever the concept of public interest differs from Public State to state according to its political philosophy and the prevailing social and economic ideas in it".(2)

سیکولر ریاستوں کا بنیادی مقصد ریاست کا اپنا مفاد ہے۔ تاہم عوامی مفاد کا تصور کسی ریاست کے سیاسی فلسفہ اور مروجہ سماجی اور معاشی تصورات کے مطابق مختلف ریاستوں میں مختلف ہے۔

مغربی ممالک کا مطمح نظر یہ ہے کہ وہ سیکولر نظام کو اسلامی ریاستوں میں نافذ کر کے عوام کے اذہان سے اسلامی تہذیب وثقافت کی قدر و قیمت کو ختم کرے اور انہیں اپنا ذہنی غلام بنالیں۔ جب کہ سیکولر ازم کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سیکولر ازم اخلاقی پہلو سے دین اور فضیلت سے گریز، ابتری اور حقارت کا نام ہے۔

۱۔　نظام الاسلام فی الحکم والدولة، ص۱۳۸

(2)　El-Awa, Muhammad Selim, on the political system of the Islamic state, American trust publications, Indianapolis, Indiana, 1977, P-80

اس سلسلہ میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

> ”دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کے قیام کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعے سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا۔ اس جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں اللہ کے سوا نہ کسی دوسری ارضی وسماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو، اور جس میں فرمانروا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کا تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشاء سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریق حکومت، عدل وانصاف اور احکام کے حق باطل سے نہ ہو“[1]

بنی نوع انسان کے لئے اگر کوئی دائمی، ابدی، مثالی معیاری، حقیقی اور فطری، تمام زمان ومکاں کے لئے ہمہ گیر اور قابل عمل نظام ہے تو وہ اسلامی نظام ہے جس میں دین ودنیا، جسم وروح، معاش ومعاد کا لحاظ اور دنیوی واخروی صلاح وفلاح اور ترقی ونجات کی ضمانت وبشارت موجود ہے، اس کا نفاذ پورے عالم اسلام کی ضرورت بھی ہے، مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ بھی اور کسی بھی ریاست کی سالمیت اور بقا کا دارومدار اسی پر ہے۔

---

[1] ندوی، سید سلیمان، سیرت النبی ﷺ، ناشر ادارہ اسلامیات، لاہور، ستمبر ۲۰۰۲ء، ۲۴/۷

باب دوم

اسلامی ریاست کی نوعیت اور اغراض و مقاصد

فصل اول: اسلامی ریاست کی جداگانہ نوعیت

فصل دوم: اسلامی ریاست کے جداگانہ مقاصد

ریاست کا آغاز وارتقاء

عصر حاضر میں انسان چھوٹے چھوٹے گونا گوں مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ جن میں پیچیدہ اور سنگین مسائل، سیاسی، معاشرتی، معاشی، داخلی اور خارجی ہیں لیکن وہ مسائل جو ہمارے دانشوروں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کئے ہوئے ہیں وہ ہمارے معاشرتی مسائل ہیں۔ چونکہ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے اس لئے معاشرہ کا قیام اس کی فطرت کا تقاضا ہے وہ تنہائی سے گھبراتا ہے اور افراد کے ساتھ مل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر انسان کو کسی جگہ تنہا رکھا جائے سب لوازمات زندگی موجود ہوں طرح طرح کی سہولتیں مہیا ہوں پھر بھی وہ ایسی زندگی کبھی پسند نہ کرے گا اور بنی نوع انسان کے ساتھ مل کر رہنے کو ہی ترجیح دے گا۔

کائنات میں وجود آدم سے تہذیب انسانی کے ارتقاء کے جس عمل کا آغاز ہوا وہ دو نمایاں پہلوؤں سے مسلسل جاری ہے۔ ان میں سے ایک پہلو داخلی ہے جسے فطرت کہا جاتا ہے، اور دوسرا خارجی ہے جسے فرد اور معاشرہ مرتب کرتے ہیں۔ فطرت ایک مستقل ہمہ گیر، اٹل اور متعین نظام ہے جو منشائے الٰہی کے تحت کام کرتا ہے[1]

اس فطری نظام کے اندر انسانی تہذیبوں کے ارتقاء کا خارجی پہلو انسانی کاوشوں سے مزین ہے چاہے وہ انفرادی سطح پر یعنی فرد کی طرف سے ہو یا اجتماعی سطح پر یعنی معاشرے کی طرف سے، اس طرح خارجی پہلو ایک ایسی مثلث ہے جس میں تہذیبوں کا ارتقاء، فرد اور معاشرہ کے کردار کا حاصل کہا جا سکتا ہے[2]

مقدمہ ابن خلدون میں دو قسم کے قوانین کا تصور موجود ہے:

اول: قانون فطرت جس کے تحت اللہ تعالیٰ امور کائنات چلاتا ہے۔ ایک متعین ڈھانچے کی حیثیت سے ہیگل اسے عظیم منصوبہ کا نام دیتا ہے اور شاہ ولی اللہ یونانی فکر کے زیر اثر اسے مصلحت کلی اور عالم مثال سے شناخت کرتے ہیں۔[3]

دوم: قانون سماجی جس کے تحت معاشرتی امور اور افراد کے باہمی تعلقات ترتیب پاتے ہیں۔ اس کے لئے ماہرین "سیاست مدینہ"[4] اور

۱۔ مشہور یورپی مفکر ہیگل نظام فطرت کو "عظیم منصوبہ" کا نام دیتا ہے جس کے اندر مختلف عوامل وعناصر اپنا متعین کردار ادا کرتے ہیں، وہ اس بنیاد پر کائنات میں عمل ارتقاء جاری ہے۔ دیکھئے

(Hegal, G W F, Lectures on the philosophy of history, publisher: George Bell and Sons, London, 1902)

۲۔ یعنی فرد کو بنیادی اکائی کی حیثیت سے جو مشکلات درپیش ہوتی ہیں ان کا جواب وہ معاشرہ کی مدد سے دیتا ہے اس تخلیق کا عمل خارجی حوالوں سے جاری و ساری رہتا ہے۔ انسان کے لئے اجتماع اور تعاون کی ضرورت بھی شدید ہے۔ كل بني آدم لا تتم مصلحتهم لا في الدنيا ولا في الآخرة إلا بالاجتماع والتعاون والتناصر فالتعاون على جلب منافعهم والتناصر لدفع مضارهم ابن تيمية، تقي الدين، احمد، الحسبة في الإسلام جمعية احياء التراث الإسلامي الضاحية، الكويت، الطبعة الثالثة، ١٩٩٨م، ص ٥
ابنائے آدم کی دنیوی اور اخروی مفادات کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کے لئے مل جل کر ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوط نہ کریں۔ مصلحت کے حصول اور نقصان سے بچنے کے لئے ان کا مل جل کر کام کرنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا ضروری ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انسان فطری طور پر مدنیت پسند ہے۔

۳۔ شاه ولي الله دهلوي، احمد، حجة الله البالغة، دار الكتب الحديثة، بالقاهرة، مصر، س ن، ٥٢/١

۴۔ ايضاً، ص ٢٢

سیاست مدن [1] کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ قانون فطرت انسانی دسترس سے ماوری ہے البتہ قانون سماجی یا ریاست مدن براہ راست نسل انسانی سے متعلق ہے۔

معاشرہ اجتماعی زندگی کی خشت اول ہے۔ اس کا معنی مل جل کر زندگی بسر کرنا ہے۔ چنانچہ عقلاء کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ انسان کی معاشرتی زندگی مثالی ہو۔ انسانی تاریخ میں قدیم ترین عقلاء یونانی فلاسفہ کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ان سے پہلے کی تاریخ ابھی تک دنیا کو دستیاب نہیں ہو سکی ان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مثالی معاشرہ کا تصور افلاطون نے پیش کیا تھا اور اس نے اس کا نام مدینہ فاضلہ رکھا تھا [2]۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانی سماج میں ریاست و حاکمیت کا ادارہ، افراد معاشرہ کی نگرانی کرے مگر اسے ضروری مواقع اور وسائل بھی مہیا کرے۔ سماجی نظام فرد کی تربیت یوں کرے کہ وہ دیگر انسانوں کے حوالے سے ایک محتاط اور مفید طرز زندگی اپنائے تا کہ اجتماعی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی عام نہ ہو۔ عدل اور خیر خواہی اس کے مزاج کا مستقل حصہ بن جائیں۔ اس طرح وہ ایک مفید اور فیض رساں شہری بن سکے گا۔

ریاست کی ابتداء کے بارے میں مختلف اوقات میں مختلف ماہرین سیاسیات نے اپنے نظریے قائم کئے۔ کسی نے اسے ''معاہدہ عمرانی'' (Social contract) کا نتیجہ قرار دیا، اور کسی نے اسے طاقت کا مظہر گردانا، کسی نے بتدریج ترقی و ارتقاء کو اس کی موجودگی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ علاوہ ازیں دو آراء زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاست کی تخلیق خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر انسان کے ہاتھوں ہوئی۔ انسان نے انتظامی اختیارات اپنے بڑوں کو دیئے اور یوں حاکمیت کا نظام قائم ہوتا چلا گیا۔ یہ نظریہ تخلیق ربانی (Divine Theory of Origin of State) کہلاتا تھا۔ دوسرا نقطہ نظر اٹھارہویں صدی میں مقبول ہوا جس کے مطابق ریاست کا ادارہ، قدیم انسانی گروہوں کے درمیان طے پانے والے، بقائے باہمی کے ایک ''معاہدہ عمرانی'' کے تحت قائم ہوا۔

نظریہ عمرانی ایک معروف سیاسی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کو سب سے پہلے جس شخص نے منظم صورت میں لکھا وہ ابو نصر فارابی ہے۔ اس نے بڑی تفصیل سے اس نظریہ کی وضاحت کی ہے [3]۔

ابن خلدون معاشرہ اور اس کے عوامل، عناصر اور کرداروں کا تاریخی تناظر میں جس طرح جائزہ لیتا ہے اس کی مثال بعد کی فکر میں کہیں نہیں ملتی اس لئے ابن خلدون کے نظریات مطالعہ معاشریات کے لئے اساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور فرد و معاشرہ کے تعلق کے تمدنی

۱۔ فارابی، ابو نصر، محمد بن محمد، السیاسات المدنیۃ، مطبعہ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۳۴۶ھ، ص۵۴، وایضاً
اس سلسلہ میں فارابی مدینہ فاضلہ کو بدن سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں سب اعضاء و جوارح باہم تعاون سے کام کرتے ہیں ان اعضاء میں قلب عضو رئیس ہے۔ تمام اعضاء اس کے مصالح اور تقاضوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اسی طرح مدینہ فاضلہ میں بھی ایک انسان ہوتا ہے جسے عضو رئیس کا درجہ حاصل ہے۔ باقی انسان حسب مراتب اس کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح قلب کے ساتھ دوسرے اعضاء کا ارتباط ضروری ہے اسی طرح مدینہ کی ریاست مدینہ کے دوسرے اعضاء و جوارح (باکمال شہریوں) کی مدد سے جن کا شرف درجہ بدرجہ کم یا زیادہ ہے، قائم ہوتی ہے۔ (آراء اهل المدینۃ الفاضلۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۵۹ء، ص۹۹)

۲۔ یوسف کرم، تاریخ الفلسفۃ الیونانیۃ، القاہرۃ، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، الطبعۃ الخامسۃ، ۱۹۶۶ء، ص۱۰۰

۳۔ الفارابی، ابو نصر، محمد بن محمد، آراء اهل المدینۃ الفاضلۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۵۹ء، ص۹۹

پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"معاشرہ کی بقاء کیلئے نظم وتنظیم کو لازمی حیثیت حاصل ہے جس کے بغیر نہ تو معاشرے کے قیام کی وجہ بننے والی احتیاجات تکمیل پذیر ہوسکتی ہیں اور نہ معاشرہ ایک مستقل صورت اختیار کرسکتا ہے" لے

انسانی معاشرہ میں اس نظم کے ماتحت سیاست، ثقافت، سلطنت، تہذیب، تقاضائے بشریت اور انسانی تعلقات باہم مربوط و مستدل ہیں۔ البتہ جدید جمہوری فکر میں ریاست کو، انسان کا تخلیق کیا ہوا ایک ادارہ گردانا گیا ہے جو انسانی معاہدہ عمرانی (Social contract) کے تحت معرض وجود میں آیا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان نے ریاست، اپنے مقاصد کے حصول کیلئے تشکیل دی ہے۔ لہذا اس پر حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا اختیار بھی انسان ہی کو حاصل ہے۔ اقتدار اعلیٰ کے فلسفہ کی مؤثر تشریح اور عملی شکل، امریکہ کے اعلان آزادی (۱۷۷۶) اور پھر انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) کے بعد ہوئی۔

"The American Revolution (1776) brought another concept to the state i.e. the nationalism.Due to this development the sovereign authority was recognized to reside in the people (2)

امریکی انقلاب (1776) ریاست کا ایک اور تصور لے کر آیا جو کہ "قومیت" تھا۔ اس ترقی کے نتیجہ میں لوگوں کو اقتدار کی قوت حاصل ہوئی۔

اس سماجی معاہدے کا مفہوم یہ طے پایا کہ ریاست میں اصل اختیار حاکمیت، عوام کی ملکیت ہے جسے وہ ایک معاہدے کے تحت اپنی قائم کردہ حکومت کو سونپتے ہیں جو اس اختیار کا استعمال عوام ہی کی مرضی کے مطابق کرتی ہے، اس کے خواص مستقل طور پر یہ طے کردیے گئے، جو آج تک ہر صورت میں مانے اور منوائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں لکھا گیا ہے:

"Sovereignty is one, indivisible, unalienable and imprescriptible, it belongs to the nation, no group can attribute sovereignty to itself nor can an individual arrogate it to himself (3)

اقتدار اعلیٰ یکتا، ناقابل تقسیم، ناقابل انتقال اور ازلی ہوتا ہے۔ یہ قوم کی ملکیت ہوتا ہے، نہ ہی کوئی گروہ اقتدار اعلیٰ کو اپنے نام کرسکتا ہے نہ ہی کوئی فرد اسے بلاجواز اپنے ساتھ منسوب کرسکتا ہے۔

جمہوری طرز عمل کے اس پہلو کا فکری پس منظر یہ تصور ہے کہ انسان خود ہی معیار خیر وشر ہے یعنی یہ کہ وہ خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ صحیح اور

---

۱ ۔ ابن خلدون، عبد الرحمن، المقدمہ ابن خلدون، مطبعۃ لجنۃ البیان العربی، مصر، ۱۹۶۵ء، ۲/۴۲۰

(2) GianFranco Poggi, The development of the modern state, California, Stanford University Press, 1978, P

(3) Helen Hemingway benton, Encyclopedia Britannica London, 1974-1986, Vol 11, P-56

غلط، مفید اور مضر کیا ہے؟ یہ تصور دراصل قدیم یونان کے سوفسطائی فلاسفہ نے پیش کیا تھا۔
جدید ریاست کے اس مقصد کو سالٹاؤ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

"The State is only there to give individuals their Fullest opportunity of living a good life, they, not the state, being the judge of what goodness, is for them. And finaly, the authority can not come from above or from outside, it's only source is the people themselves.(1)

ریاست کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ شہریوں کو ایک اچھی زندگی کے مواقع فراہم کرے۔ اچھی اور بری زندگی کا فیصلہ لوگوں کے ہاتھ میں ہے، نہ کہ ریاست کے پاس اور پھر آخری نقطہ یہ ہے کہ حاکمیت کا اقتدار کہیں اوپر یا باہر سے نہیں آسکتا اس کا مرکز و محور لوگ خود ہوتے ہیں کوئی اور نہیں"۔

اسلامی ریاست کی جداگانہ نوعیت کا جائزہ لینے سے پہلے ریاست کا مفہوم، اصطلاحات، عناصر ترکیبی، ریاست کا تصور اور غرض و غایت کا جاننا ضروری ہے۔

ریاست کا مفہوم

انگریزی لغت میں state یا Sovereignty کے مقابلہ میں عربی، فارسی اور اردو میں ریاست کے جو عمومی معانی استعمال ہوتے ہیں، وہ سرداری، سربراہی، حکومت، مملکت اور اقتدار وغیرہ کے ہیں۔
لسانی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ:

"ریاست کا مادہ راس سے ماخوذ ہے جسکے معنی "سر" اور "اصل" کے ہیں۔ اسی سے رئیس، الرائس اور الرئیس ہے، جس کا اطلاق مرتبہ میں سب سے بلند اور اول شخص پر ہوتا ہے"۔ (۲)

انگریزی لفظ State کی لغوی تشریح میں ایک مغربی مفکر لکھتا ہے کہ

"From latin root "status" meaning to stand or status the word, state, became, estate, in German, "estat" in old French and in English "state" (3)

گویا سٹیٹ کا لفظ انگریزی زبان میں لاطینی ماخذ "status" سے آیا، جس کا معنی قیام یا مقام تھا۔ پھر یہ لفظ جرمن زبان میں "estate" بنا اور فرانسیسی زبان میں "estat" اور بالآخر انگریزی زبان میں بطور "state" منتقل ہو گیا۔

---

(1) Soltau, Roger, H, An Introduction to politics, Longman Press, London, 1968, P 2

۲۔ لسان العرب، بہ ذیل مادہ رأس

(3) Andrew, Vincent, Theories of the State, Clarendon Press, Oxford, 1976, P 16

لیکسیکن یونیورسل انسائیکلوپیڈیا میں اس لفظ کی تشریح یوں کی گئی ہے:

"The word state is ultimiately traceable to the Roman legal idea of status civilis, or "the civil condition . the use of the English term state in its specifically political sense, First became current around the 16the century in England rather later than on the continent, where the French etat and Italian stato were in use soon after 1500. The moderen term state was usually accompanied by the nation of Sovereignty." (1)

لفظ" ریاست" کا تعلق سلطنت روما کے قانونی تصور "شہری مقام یا شہری حیثیت" سے جا ملتا ہے۔ انگریزی اصطلاح میں "ریاست" کا استعمال بالخصوص سیاسی شعور کے طور پر پہلی مرتبہ تقریباً سولہویں صدی میں انگلستان میں، بعدازاں براعظم (یورپ) میں رونما ہوا۔ جہاں پر فرانسیسی لفظ "etat" اور لاطینی لفظ میں "Stato" پندرہویں صدی کے بعد سے رائج تھے۔ جدید اصطلاح "State" عصر حاضر میں خودمختار قوم کا تصور پیش کرتی ہے۔

ریاست کا جدید تصور ایک منظم اجتماعیت کا ہے کیونکہ ریاست ایک سیاسی ادارہ بھی ہے اور معاشرتی بھی۔ لہذا ریاست کی تعریف میں دونوں نقطہ نظر کالحاظ رکھنا ضروری ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مطابق ریاست کی مختصر تعریف یہ ہے:

"A Geographical delimited segment of human society united by a common obedience to a single sovereignty". (2)

انسانی معاشرہ کا محدود جغرافیائی حصہ جو ایک خودمختار حکومت کے تابع ہو۔

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ریاست کا مفہوم یہ ہے:

"A body of occupying a defined territory and organized under a sovereign government". (3)

لوگوں کا گروہ جس نے مخصوص علاقے پر قبضہ کیا ہو اور پھر وہ ایک خودمختار حکومت کے تحت منظم ہو۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ریاست کے بارے میں یہ نظریہ بیان کیا ہے:

"والاصل فی ذلک ان المدینة شخص واحد من جهة ذلک الربط مرکب من أجزاء

---

(1) Lexion universal encyclopedia, Lexicon publications, New York, 1987, P.229

(2) David L, sills, Internation Encyclopedia of Social Sicences, Cromwell oltier and McMillan Inc, New York 1968, Vol-15, P.150

(3) Simpson, J.A, Weiner, E S.C, The Oxford English Dictionary, Clarendon press Oxford, 1989. Vol-14, P.554

وھیئۃ اجتماعیۃ"[1]

"اہل مدینہ سے مراد لوگوں کی وہ جماعت ہے جو ایک ہی نظام تمدن کے تابع ہو اور باہم مل جل کر اجتماعی زندگی بسر کریں۔ اس جماعت کے افراد اگرچہ مختلف شہروں میں رہتے ہوں شخص واحد سمجھا جاتا ہے"۔

نصیر الدین طوسی اس ضمن میں رقمطراز ہیں کہ:

"ریاست اجتماع انسانی کی ایک ارتقائی شکل ہے جو گھر سے شہر اور شہر سے ریاست بنتی ہے اور آخر میں بین الاقوامیت پر جاکر ختم ہوتی ہے۔"[2]

فارابی مدینہ فاضلہ اور مدینہ غیر فاضلہ کا فرق واضح کرتے ہوئے ریاست کو ایک حکمت قرار دیتے ہیں، اور رئیس اول یعنی حکمران کو حکیم، جسکا کام ان کے نزدیک تعدیل اور امور انسانی ہے۔[3]

مدینہ فاضلہ ان کے نزدیک ریاست کبریٰ ہے اور ایسی ریاست ان کے خیال میں گویا ریاست حکمت ہے۔

ابن خلدون کہتے ہیں کہ:

"انسان کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکنے کے لئے نظام ریاست کی ضرورت ہے"۔[4]

امام غزالی نے ریاست کا تصور یوں بیان کیا ہے:

"جب شہروں اور قصبوں کی بنیاد پڑتی ہے تو بغیر کسی حاکم کے باہمی نزاعات رونما ہونا لازمی ہے اگر ہر شخص اپنے معاملات خود طے کرنے لگے تو کوئی کسی کے کام کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا۔ ان حالات میں باہمی زندگی بسر کرنے کے اصول و قیود اور ایک دوسرے کے اختیارات پر حدود خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور یہی نظام ترقی کر کے ریاست کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔"[5]

علامہ شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"فرد کی حقیقت اللہ کے بندوں کے درمیان اپنی طاقت اور استعداد کے مطابق خلیفۃ اللہ کی ہے مگر ایک فرد اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اور پھر اہل و عیال کے مصالح کی نگرانی کرے یا پھر وہ پورے قبیلے یا سب بنی نوع انسان کے مصالح کا تحفظ کر سکے اس وجہ سے اللہ نے مشترک انسانی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری اجتماع ریاست پر ڈالی جس بناء پر زمین میں ریاست کا قیام عمل میں آیا"۔[6]

مولانا حامد انصاری نے ریاست کے متعلق بعینہ وہی نظریہ بیان کیا جو نصیر الدین طوسی، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کا ہے، وہ اس ضمن

۱۔ حجۃ اللہ البالغۃ، ۱/۴۴

۲۔ الطوسی، ابوجعفر، نصیر الدین، محمد بن محمد، اخلاق ناصری، لکھنؤ، ۱۳۴۳ھ، ص ۸۲

۳۔ السیاسات المدنیۃ، ص ۵۵

۴۔ المقدمہ ابن خلدون، ۲/۴۲۲

۵۔ غزالی، ابوحامد، محمد بن محمد، احیاء علوم الدین، مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۳۹ء، ۲/۱۰۹

۶۔ شاطبی، ابواسحاق، ابراہیم، الموافقات فی اصول الشریعۃ، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۷۵ء، ۲/۱۷۷

میں رقمطراز ہیں

''ریاست سے مراد وہ رقبہ زمین ہے جہاں انسانوں کی سیاسی تنظیم ایک اجتماعی حیثیت اختیار کر لیتی ہے''۔[1]

مولانا مودودی نے اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت کی تعریف و شرائط سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ کچھ یوں ہیں

''اسلامی ریاست سے مراد وہ ریاست ہے جو حاکمیت الٰہی اور خلافت علی منہاج النبوۃ کے نظام کو اسکے تضمنات کے ساتھ قائم کرنے کی داعی ہو''۔[2]

علامہ اسد کے نزدیک اسلامی ریاست و حکومت کا قیام محض ایک سیاسی و انتظامی اور سماجی ضرورت ہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر دینی و شرعی احتیاج بھی ہے کیونکہ اسلامی معاشرے کے بہت سے مصالح کی تکمیل کے علاوہ اسلام کے بہت سے قوانین و احکام کے اجراء و نفاذ کا انحصار بھی اسی پر موقوف ہے بدیں وجہ اسلامی ریاست کا قیام امت کا اجتماعی نصب العین اور شرعی و اخلاقی ذمہ داری بن جاتی ہے۔[3] محمد اسد کا یہ نقطہ نظر سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نقطہ نظر سے بڑی حد تک مماثل و ہم آہنگ ہے۔

اصطلاحی تصورات کے اس جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست تدبیر اور اجتماع انسانی کے لئے ایک ایسی قیادت ہے جو مبنی بر اصول حکمت و فضیلت ہو اور ایک ایسی ملت (معاشرہ) کا نشوو ارتقاء ہے، جس کے افراد اللہ کے فطری قانون یعنی اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

ریاست کے عناصر ترکیبی

ریاست افراد پر مشتمل ایک ایسا ادارہ ہے جس کی تشکیل کے لئے ایک مستقل خطہ ارض کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ادارہ اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں خود مختار ہوتا ہے۔ اس کے نظام کو چلانے کے لئے حکومت کا وجود ایک لازمی امر ہے۔ جس کی طاعت ریاست کے شہریوں پر عائد ہوتی ہے۔

سیاسیات کے جدید ماہرین کی آراء میں ریاست کے بنیادی عناصر چار ہیں۔ علاقہ، آبادی، حکومت اور اقتدار اعلیٰ۔ ان اجزاء کے بغیر کسی اجتماعی انسانی کو ریاست نہیں کہا جاسکتا۔[4]

آج کل ان چاروں اصولوں پر مشتمل انسانی آبادی کو سیاسی زبان میں ایک ملک (Country) بھی کہا جاتا ہے اور ایک قوم (Nation) بھی۔ گویا کنٹری یعنی ملک کا لفظ ''سٹیٹ'' یعنی ریاست کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

لیکسین یونیورسل انسائیکلوپیڈیا کے مطابق ریاست کے عناصر ترکیبی یہ ہیں:

"The state is a political unit that possesses a territory, a population, a

---

۱۔ اسلام کا نظام حکومت، ص ۵۰

۲۔ اسلامی ریاست، ص ۲۸۵

(3) Asad, Muhammad, The Road to Mecca, Publisher Maxreinhardt, London, 1954, PP.302-303

۴۔ محفوظ عبد المنعم، ڈاکٹر، الخطیب، نعمان احمد، ڈاکٹر، مبادئ فی النظم السیاسیۃ، دار الفرقان للنشر والتوزیع، عمان، (تمن) صفحہ ۱۴۲۱، ص ۵۸

Governement, and sovereignty or independence." (1)

ریاست ایک ایسی سیاسی وحدت ہوتی ہے جو ایک علاقے، آبادی، اقتدار اعلیٰ یا خود مختار حکومت پر مشتمل ہو۔

ایک ریاست اپنے وجود پذیر ہونے کے لئے اس امر کی محتاج ہے کہ اس کو انسانی معاشرہ حاصل ہو، اس کے قبضہ میں ایک علاقہ ہو، وہ با اقتدار اور خود مختار ہو اور ایک سیاسی ادارہ (حکومت) ہو جو اس کے مقاصد اور ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔

علامہ محمد مبارک اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"تتكون كل دولة من ثلاثة عناصر: السلطة التي تدير أمورها وتتولى تنظيمها، وسياسة شؤون شعبها، و تتالف هذه من رئيس لها، وجهاز من الحكام والقضاة والموظفين، الشعبة أو الأمة التي تدير السلطة امورها، وتسوسها وترعى شؤونها، الأرض التي يسكنها ذلك الشعب، ويجرى فيها حكم تلك السلطة"۔ ۲

اول عنصر وہ قدرت اور طاقت ہے کہ ادارہ تنظیمی امور اور لوگوں کے کاموں کی اصلاح سے بنا ہو۔ دوم عنصر امت اور رعیت ہے، حاکم ان کے کاموں کی نگہبانی کرتا ہے۔ ان کی اصلاح کرتا ہے اور ان کے کاموں کو منظم کرتا ہے۔ سوم عنصر وہ علاقہ ہے جس میں لوگ رہائش پذیر ہوتے ہیں اور اس میں حاکم طبقہ کے احکامات جاری ہوتے ہیں۔

اختیارات، امت و رعیت اور علاقہ یہ وہ تین مرکزی عناصر ہیں جن کے بغیر ریاست کی ہیئت مکمل نہیں ہو سکتی۔ ریاست کے قیام کے لئے ایسی طاقت کا وجود ضروری ہے جس میں اختیارات ایک فرد کے پاس ہوں اور دیگر افراد اس کے تابع ہوں۔ ان افراد کے لئے ایک ایسے خطۂ ارضی کا ہونا ضروری ہے جو طبعی ذخائر مختلف قسم کی اشیاء اور مواصلاتی رابطوں سے منسلک ہو اور حکومت پر ایسے علاقہ کی حفاظت لازم ہو۔

مصطلحاتِ ریاست

ماہرین سیاسیات کے نزدیک ریاست کی جو اصطلاحات مروج اور متداول ہیں، وہ درج ذیل ہیں۔

ا۔ سیاست

سیاست بروزن امارت ساس یسوس سے مصدر کا صیغہ ہے اس باب کا مصدر سوس بھی آتا ہے۔ سیاست اور سوس کے اسی معنی ہیں "اصلاح کرنا، سنوارنا اور انتظام کرنے کے ہیں"۔ اس لغوی مفہوم کی مناسبت سے یہ دونوں ریاست و حکومت اور تدبیر مملکت کے معنوں میں بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ حکومت اور ریاست کا مقصد بھی عوام کی حالت سنوارنا اور اصلاح کرنا ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

"والسياسة القيام على الشئ بما يصلحه والسياسة فعل السائس ورجل ساس من قوم ساسة وسواس... والسوس الرياسة يقال ساسوهم سوسا" ۳

(1) *Lexicon Universal Encyclopedia, P-228*

۲۔ نظام الاسلام الحكم والدولة، ص۵۸

۳۔ لسان العرب، بہ ذیل مادہ سوس

سیاست کسی چیز کی اصلاح کے لئے کمربستہ اور کھڑے ہو جانے کو کہا جاتا ہے اور سیاست ایک مدبر اور قائد کا کام ہے اور سوس کے معنی ہیں ریاست اور حکومت کا نظم ونسق چلانا۔

عربی کے لفظ سیاست کے مقابلے میں انگریزی لفظ Politics استعمال ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح یونانی زبان کے Polis سے لی گئی ہے جو کہ قدیم یونان میں، شہری ریاست کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اسی بنیاد پر ارسطو نے اسے اپنی مشہور کتاب کے نام کے لئے منتخب کیا۔(1) ماہر سیاسیات، مالناؤ کے مطابق یہ لفظ اجتماعی ذمہ داری کے تصور اور احساس کے ساتھ وابستہ ہے:

"Politics is the concern of everybody with any sense of responsibility."(2)

گویا سیاست اس حکمت عملی کا نام ہے جو انسانی معاشرے کو منظم کرنے، اس کو سنوارنے اور نیابتِ الٰہی میں ریاست کا نظم ونسق چلانے کے لئے درکار ہے۔

خلافت

لفظ خلافت خلف سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں پچھلی جانب یا بعد میں آنے والی نسل۔

ابن منظور اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"الخلافة الامارة وهى الخليفى وانه لخليفة بين الخلافة والخليفى وفى حديث عمرؓ لولا الخليفى لاذنت وقال غيره الخليفة السلطان الاعظم" ۳

خلافت کے معنی امارت اور خلیفی کے بھی یہی معنی ہیں۔ عرب کہتے ہیں فلاں شخص خلیفہ ہے یعنی اس کی حکومت ایک مکمل حقیقت ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا اگر خلیفی یعنی حکومت کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو میں خود اذان دیتا۔ بعض دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ خلیفہ ہر حکمران کو نہیں بلکہ بڑے حکمران کو کہا جاتا ہے۔

مولانا مودودی خلافت کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے اور یہ دونوں لفظ نظام عالم میں انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین پر فرمانروا مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں بلکہ تفویض کردہ ہے (Delegated) لہٰذا اللہ نے اس کے اختیارات مفوضہ (Delegated Power) کو امانت سے تعبیر کیا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیارات مفوضہ کو استعمال کرتا ہے، اسے خلیفہ (Vicegerent) کہا ہے۔ اس تشریح کے مطابق خلیفہ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔" ۴

امام ابوالحسن ماوردی رحمہ اللہ نے خلافت کے لئے امامت، اور سیاست کے الفاظ استعمال کئے ہیں:

---

(1)　*Encyclopedia Britannica, Vol-25, P.*

(2)　*An Introduction to Politics, P.2*

۳۔　لسان العرب، بہ ذیل مادہ خلف

۴۔　مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، طبع مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۱ء، ۳/۳۶

"الامامة موضوعة لخلافة النبوة فی حراسة الدین وسیاسة الدنیا"[1]

امامت (اسلامی حکومت) نبی ﷺ کی نیابت دین اسلام کی حفاظت کرنے اور ریاست کا نظم و نسق چلانے اور اس کی اصلاح کرنے میں بنائی جاتی ہے۔

"امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے ولایت اور امانت کی اصطلاح میں استعمال کیا ہے۔

"فان الولایة لها رکنان: القوة والامانة"[2]

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لئے استعمال ہوئی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ حکومت ہوتی ہے جو خلافت کے اداروں کی تنفیذ کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھئے کہ جو فرق State اور Government کے درمیان ہے وہی فرق خلافت اور امامت و امارت کے درمیان ہے۔[3]

حاکمیت بمعنی (حکومت)

حاکمیت اور اقتدار کے لئے کہیں حکم اور امر کے الفاظ اور کہیں سلطان اور ملک کے الفاظ آئے ہیں۔ لفظ سلطان اور ملک میں تو ریاست اور اس کے اقتدار اعلیٰ کا مفہوم بیک وقت شامل ہے جسے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔

ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

"الحکومة: مصدر حکم، واسم من تحکم، بمعنی فصل الخصومة"[4]

حکومت، حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی فیصلہ و فرمان اور حکمت و دانش کے ہیں۔

ابراہیم الصحیان حکومت کی تعریف میں یوں رقمطراز ہیں:

"الحکومة عبارة عن السلطات الثلاث هی: السلطة التشریعیة، والسلطة التنفیذیة، السلطة القضائیة"[5]

حکومت تین قسم کی حاکمیت پر مشتمل ہے۔

حاکمیت تشریعیہ (قانونی اور آئینی حکومت) حاکمیت تنفیذیہ (قانون اور دیگر احکام کی منفذ حکومت)، حاکمیت قضائیہ (قیام عدل کی حکومت)

حکومت وہ آلہ ہے جس کے توسط سے حکمران کے احکام رعایا تک پہنچتے ہیں اور عمل میں لائے جاتے ہیں گویا حکومت، حاکم اور رعایا کے مابین ایک واسطہ کا نام ہے۔

سیاست شرعیہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا اختیار اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ انسان کو نہیں کیونکہ انسان خالق نہیں

۱۔ ماوردی، ابو الحسن، علی، الاحکام السلطانیة فی الولایات الدینیة، مصطفی الحلبی، مصر، ۱۹۷۳ء، ص۵

۲۔ ابن تیمیہ، تقی الدین، ابو العباس، احمد، السیاسة الشرعیة فی اصلاح الراعی والرعیة، جمعیة احیاء التراث، الاسلامی، الطبعة الثالثة، ۱۹۹۸ء، ص۱۱

۳۔ اصلاحی، امین احسن، مولانا، اسلامی ریاست، مطبع گنج شکر پرنٹرز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۱۶

۴۔ لسان العرب، بذیل مادہ حکم

۵۔ الصحیان، عبد الرحمن ابراہیم، الادارہ فی الاسلام الفکر والتطبیق، دار الشرق جدہ، ۱۹۸۶ء، ص۱۷۳

مخلوق ہے اور مالک نہیں نائب اور امین ہے۔

ملوکیت (استبدادی بادشاہت)

نظام ہائے سیاست میں سب سے زیادہ مروج اور قدیم نظریہ ملوکیت اور بادشاہت ہے۔ یہ وہ حکومت ہے جس میں ایک شہنشاہ ہوتا ہے جو اپنے خاص دائرہ عمل سے باہر نکل کر بہت سی قوموں اور ملکوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیتا ہے، بادشاہ قوم پر اور شہنشاہ اقوام پر حکومت کرتا ہے۔

علامہ ابن خلدون اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"وان الملک الطبیعی هو حمل الکافة علی مقتضی الغرض والشهوة"[۱]

استبدادی بادشاہت وہ ہے جو لوگوں کو بادشاہ کی ذاتی اغراض اور خواہشات پوری کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

گویا ملوکیت کے نظام میں بادشاہ کا ہر حکم، منا(ئے) خداوندی ہے، پوری قوم اور سارا قومی خزانہ اس کی ذاتی ملکیت تصور ہوتا ہے۔ وہ تنقید سے بالاتر سمجھا جاتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔

جمہوریت

جمہوریت بنیادی طور پر سیاست کے ایک حصے یعنی حکومت کی تنظیم اور طریق کار سے منسلک ہے۔ عربی لغت کے ماہرین کی آراء سے واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت لفظ جمہور سے بنا ہے۔ جس کا بنیادی مادہ جمہر ہے جس کے معنی کسی چیز کا مجموعہ ہے۔

ابن منظور لغوی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لفظ جب قوم کے ساتھ آئے تو اس سے مراد اس قوم کی اکثریت ہوتا ہے۔

"جمهرت القوم اذا جمعتهم وجمهرت الشئی اذا جمعة..... وجمهور کل شیء معظمه وجمهور الناس جلهم"[۲]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی چیز کا اکثریت میں پایا جانا اور اس کا دوسری چیزوں سے ممتاز اور نمایاں ہونا ہے۔ جمہور الناس سے مراد لوگوں کے ممتاز اور نمایاں افراد یا ان کی اکثریت ہے۔

مولانا گوہر الرحمٰن اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں

''اسلامی ریاست کا سربراہ جمہور الناس یا ان کے نمائندوں (اہل الحل والعقد) کا منتخب کردہ اور معتمد علیہ ہونا ضروری ہے اور اس لحاظ سے اسلامی نظام حکومت بھی جمہوری اور شورائی نظام ہے''۔[۳]

مسلم ماہرین سیاسیات کے نزدیک جمہوریت (Democracy) دراصل بادشاہت اور پاپائیت کے ردعمل میں آئی۔ لوگ جب بادشاہ کی سیاسی بربریت اور پوپ کے مذہبی استبداد سے تنگ آگئے تو انہوں نے بے لگام آزادی کا راستہ اختیار کر لیا اور اسی جمہوریت کو آزادی کی نعمت عظمیٰ سمجھ بیٹھے۔

۱۔ المقدمة ابن خلدون، ۲/۶۸۸

۲۔ لسان العرب، به ذیل مادہ جمہر

۳۔ گوہر الرحمٰن، مولانا، اسلامی سیاست، مطبوعہ ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور، مئی ۲۰۰۲، ص ۷۶

ڈیماکریسی کی لغوی تشریح کرتے ہوئے جیمز لکھتے ہیں کہ:

"The word democracy is derived from two Greek roots, Demos... the people and Krates... authority, and in its political sense, democracy means Government by the people... The many . as contrasted with government by the one.. the monarch, the dictator... or by the few...".(1)

ڈیموکریسی کا لفظ اپنی اصل کے لحاظ سے یونانی زبان کے الفاظ "ڈیماس" (یعنی لوگ) اور "کراتیس" (یعنی حاکمیت) سے ماخوذ ہے۔ گویا سیاست میں جمہوریت سے مراد ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں بادشاہت، آمریت اور اشرافیہ کے بالعکس لوگ خود حاکم ہوں۔
رہا یہ سوال کہ یہ لفظ سیاسی اصطلاح کے طور پر کب سے اور کیسے مستعمل ہوا؟ اس کے جواب میں مذکورہ مصنف رقمطراز ہے۔

"The word came into English Usage in the seventeenth century to denote the direct democracy, the kind of government that existed in Athens and other Greek city-states". (2)

یہ لفظ انگریزی زبان میں سترہویں صدی میں استعمال ہونے لگا جہاں پر اس کا مفہوم "براہ راست جمہوریت" تھا۔ جو ایتھنز اور یونان کی دوسری شہری ریاستوں میں رائج تھی۔
اسی بنیاد پر قدیم و جدید سیاسی مفکرین نے اسے عوام کی حاکمیت یعنی عوام الناس کی مرضی کے تابع حکومت قرار دیا ہے۔ گویا ایک جمہوری طرزِ حکومت میں قوم کے تمام اجتماعی فیصلے عوام الناس کی خواہشات کے مطابق اور ان کی مرضی کے تابع ہونا ضروری ہیں۔
قرآن وسنت اور اسلامی تاریخ سے، جمہوریت کے اس تصور کے حق میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ قرآن نے اکثریت کی حکمرانی کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اکثریت کے بے سوچے سمجھے رویے کو بطور اصول تمدن اپنانے سے سختی سے روک دیا ہے۔
قرآن حکیم میں آتا ہے:

"وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ" ٣

"اور اے محمد ﷺ اگر آپ زمین کے باشندوں کی اکثریت کی بات مانیں تو یہ آپ ﷺ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں"۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے حکمرانوں، بادشاہوں اور سربراہوں کا ذکر صیغۂ واحد میں خلیفہ، امام، ملک اور حکم کے الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں، کثرت کی حکمرانی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔
اس اعتبار سے اسلامی نظام سیاست میں "ریاست" ایک اصولی اور نظریاتی حیثیت رکھتی ہے اس کی بنیاد نہ رنگ ونسل پر اور نہ ہی

(1) *James Macgregor, Jack Waller, Government by the people, New York 1953, P-33; The New Encyclopedia Britanica, Vol.4, P.5*

(2) *Ibid, P.34*

٣۔ الانعام ٦: ١١٦

ملک وملت پر ہے اور نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ ہی محض سیاسی الحاق اس کی اصل بنیاد ہے بلکہ یہ اسلامی نظریہ حیات کی علمبردار،اس کی تابع اور اس کو قائم کرنے والی ہے۔

اس نوعیت کے اعتبار سے یہ ریاست دیگر ریاستوں سے ممتاز اور جدا ہے۔ یہ مزاجاً نہ آمریت ہے نہ جمہوریت بلکہ جداگانہ حیثیت کی حامل ہے۔

امام ابن تیمیہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"قالو احب اتخاذ الامارة دینا وقربة یتقرب بها الی الله ۔ وان انفرد السلطان عن الدین، او الدین، عن السلطان فسدت احوال الناس"[۱]

ریاست کا مقصد تقرب الٰہی اور اقامت دین ہے اگر سلطنت وحی کی رہنمائی سے محروم ہو یا خود دین حکومت کی پشت پناہی سے عاری ہو تو لوگوں کے احوال فاسد ہو جائیں گے۔

مظہر الدین صدیقی لکھتے ہیں:

''اسلام میں ریاست اور مذہبی امور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں میں امتیاز اس وقت سے اٹھ گیا جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لی اور آئندہ آنے والے نظام کا تعین ہوا''[۲]

''ریاست کے پیچھے اسلام کا ایک خاص نظام فکر کارفرما ہے۔اشتراکیت کی طرح یہ بھی نئی ریاست کی پالیسی اور دستور وضع کرتا ہے۔''[۳]

گویا قانون الٰہی کو عالم میں نافذ کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اقتدار کی ضرورت ہے اسلامی ریاست سیکولر جمہوریت عوام کی حاکمیت پر یقین نہیں رکھتی بلکہ اس کا دارومدار خشیت الٰہی اور قوت اخوت عوام پر ہے۔لہٰذا اس کے لئے جمہوری وایجابی دینی ولاہوتی ریاست کی اصطلاح زیادہ مناسب ہے۔یہ دونوں اصطلاحیں جمہوری اور آمرانہ نظاموں کے بین بین ہیں۔

اس ریاست کے باشندے بالکل آزاد ہوتے ہیں،لیکن اللہ کے غلام حتیٰ کہ رئیس مملکت بھی قانون الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔

ابن الطقطقی کہتے ہیں کہ''اسلامی حکومت اپنی غایت،اپنی سادگی اور عمومیت کے اعتبار سے ایک مستقل وجداگانہ شے ہے،وہ ایک ایسی حکومت ہے جو عام دنیاوی حکومتوں سے بالکل الگ اور پیغمبرانہ اوصاف سے مستفید ہے۔''[۴]

اسلامی ریاست اپنی نوعیت اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام دوسری ریاستوں سے مختلف ہوتی ہے عہد حاضر کی دستوری اصطلاح میں نہ وہ جمہوری ہے نہ شخصی،(Theocratic) اور نہ ہی اشرافی (Anstorcratic) اس کے قیام کا مقصد ہے۔ دوسرے تمام نظام ہائے حکومت سے بالکل مختلف ہے،اپنی جداگانہ نوعیت کی بنیاد پر دنیا کی تمام دوسری ریاستوں سے ممتاز اور ممیّز ہے۔

زیر نظر سطور میں اسلامی ریاست کی جداگانہ نوعیت کی پیش نظر ایجابی لاہوتی اور دینی ریاست کا فرق بیان کیا جارہا ہے تاکہ اسے

۱۔ السیاسیة الشرعیة، ص ۶۲۔ ۱۲۶

۲۔ صدیقی، مظہر الدین، اسلام اینڈ تھیوکریسی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۳۱

۳۔ ایضاً، ص ۳۰

۴۔ ابن الطقطقی، محمد بن علی، الفخری فی الآداب السلطانیة والدول الاسلامیة، مطبعة الرحمانیة، مصر، ۱۹۲۷ء، ص ۹

اپنے دور کے تناظر میں رکھ کر ایک کامیاب ریاست کیلئے لائحہ عمل تجویز کیا جائے۔

ایجابی ریاست ــــــ معنی ومفہوم اوراہمیت

''ایجاب''جوب سے ہے، جس کے معنی قبول کرنا، تعمیل حکم میں لانا، نافذ کرنا اور اجابت وقبول میں گمان کی حدود تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

"علی معنی أمضی دعوة وأنفذ الی مظان الاجابة والقبول، وقال غیرہ الاصل جاب یجوب مثلا طاع یطوع"۔[1]

قرآن مجید کی آیت مبارکہ سے بھی اس لفظ کی تائید ہوتی ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾[2]

''میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے پس چاہیے کہ یہ لوگ میرا حکم مانیں اور چاہیے کہ یہ مجھ پر یقین رکھیں تاکہ یہ ٹھیک راہ پا جائیں''۔

قرآن جس ریاست کا نقشہ پیش کررہا ہے اس کا مقصد سلبی (Negative) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اس کا مدعا ومنتہا برائی کی ان تمام صورتوں کو مٹانا اور نیکی کی ان تمام شکلوں کو نافذ کرنا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شرح وبسط سے بیان کیا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾[3]

''تم بہترین اُمت ہو جسے نوع انسانی کیلئے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

اس نوعیت کی ریاست ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کرسکتی کیونکہ یہ ایجابی اور ہمہ گیر ریاست ہے۔

علامہ ابن خلدون نے سلطنت کی اقسام واصناف کو واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ

''مملکت طبعی'' سلطان کا سب کو اپنی اغراض وشہوات پر چلانے کا نام ہے اور مملکت سیاسیہ انسانی عقل کے تحت چلانے کا نام ہے تاکہ انسان دنیا کے منافع حاصل کرسکے اور اس کی مضرتوں سے بچ سکے۔

خلافت اس سے عبارت ہے کہ سب کو شرعی نقطہ نظر کے مطابق زندگی گزارنے پر آمادہ کیا جائے جس سے آخرت کی سعادت بھی نصیب ہو اور دنیا کی وہ مصلحتیں بھی بہم پہنچیں جو سعادت اخروی میں معین ومددگار ہیں:

"فقد تبین لک من ذلک معنی الخلافة. وأن الملک الطبیعی ھو حمل الکافة علی مقتضی الغرض و الشھوة، والسیاسی ھو حمل الکافة علی مقتضی النظر العقلی فی جلب المصالح

۱۔ لسان العربیہ بہ ذیل مادہ جوبُ

۲۔ البقرة ۲: ۱۸۶

۳۔ آل عمران ۳: ۱۱۰

الدنیویۃ ودفع المضار' والخلافۃ ھی حمل الکافۃ علی مقتضی النظر الشرعی فی مصالحھم الأخرویۃ والدنیویۃ الراجعۃ الیھا"[۱]

درج بالا اقسام کے لحاظ سے پہلی قسم کو "ملوکیت" دوسری قسم کو "جمہوریت" اور تیسری قسم کو ایجابی یا اسلامی جمہوریہ سے موسوم کریں گے۔

اسلامی ایجابی ریاست کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ خواص کی نہیں عامۃ المسلمین کی ریاست ہے جو روحانی واخلاقی اقدار کی زبردست حامل ہونے کی بنیاد پر ممتاز ہے۔ اس کی بنیاد شورائیت پر ہے جو مروجہ جمہوریت کا قریب ترین لفظ ہے۔

اگر امام یا حاکم مشاورت کا اہتمام کرے تو مشیران کھل کر پر خلوص رائے دیں۔ اختلاف رائے کی صورت میں ہر ایک اپنی رائے پر نظر ثانی کرے اور اسے قرآن وسنت کی روشنی میں پرکھا جائے جو رائے قرآن وسنت کے اصولوں کے قریب تر ہو اس کو قبول کیا جائے ان کا کہنا ہے کہ شوریٰ کے عمل کے دوران میں جب امام کو قرآن وسنت رسول ﷺ کی روشنی میں اجماع مسلمین سے آگاہ کیا جائے تو اس کے لئے لازم ہے ان امور کو بجالائے اور اگر وہ خلاف ورزی کرے تو عوام پر اس کی اطاعت واجب نہیں۔ گویا شہریوں پر حکومت کے کسی ایسے حکم یا قانون کی اطاعت واجب نہیں ہوتی جو شریعت کی خلاف ورزی پر مبنی ہو، بلکہ ایسی صورت میں حکومت کے لیے مسلمان رعایا کی بات ماننا لازم ہوگی۔

"فعلیہ اتباع ذلک، ولا طاعۃ لاحد فی خلاف ذلک"[۲]

قرآنی تعلیمات سنت رسول ﷺ اور صدر اسلام کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اسلام باہمی تعاون، مشاورت اور تعمیری تنقید کو اجتماعی معاملات میں بڑی اہمیت دیتا ہے اور وہ مشاورت کو مسلمانوں کی زندگی کا اہم جزو قرار دیتا ہے۔[۳]

وحی الٰہی کے باوجود رسول مقبول ﷺ سے کہتا ہے کہ آپ ﷺ مسلمانوں سے ملکی معاملات میں مشورہ لیا کریں[۴] آپ نے ملکی معاملات میں نہ صرف مسلمانوں سے مشورہ لیا بلکہ انکے مشوروں کو قبول بھی کیا۔[۵]

جہاں تک ملکی اور قومی معاملات میں لوگوں کی شمولیت کا تعلق ہے، اسلام نے عمومی اصول دے کر تفصیلات مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیں تاکہ وہ حالات کے مطابق خود طے کرسکیں۔ جہاں تک ملک کا نظم ونسق چلانے کے لئے اہلکاروں کے انتخاب کا تعلق ہے، اسلام یہ معاملہ بھی مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑتا ہے تاکہ انہیں بدلتے ہوئے حالات میں کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ البتہ قرآن پاک رہنمائی کیلئے ایک جامع اصول دیتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا﴾[۶]

۱۔ المقدمہ ابن خلدون، ۲/۶۸۸

۲۔ ابن تیمیہ، تقی الدین، احمد، منہاج السنۃ، مکتبہ خیاط، لبنان، ۱۹۶۲ء، ۱/۲۰۴

۳۔ شوریٰ ۴۲: ۳۸

۴۔ آل عمران ۳: ۱۵۹

۵۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کا نقشہ حباب بن منذر کے مشورہ پر بدل دیا گیا۔ دیکھئے تفصیلات کے لئے سیرت النبویہ لابن ہشام ۲/۲۷۶، غزوہ بدر کے اسیروں کی قسمت کا فیصلہ بھی باہمی مشاورت سے طے ہوا جس کی توثیق قرآن مجید نے بھی کی۔ (تاریخ الرسل والملوک لطبری، ص ۵۶، ۵۷) غزوہ خندق کا نقشہ ایک آزاد کردہ غلام حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز کے مطابق تیار کیا گیا۔ (سیرت النبویہ، ۳/۲۳۵)

۶۔ النساء ۴: ۵۸

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں اہل امانت (دیانتدار) لوگوں کے سپرد کرو"۔

اسلام تمام نسل انسانی کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے جو شخص بھی اسے قبول کرے، خواہ وہ کسی بھی نسل، کسی ملک، کسی قوم سے ہو، مملکت کے امور چلانے کا اہل ہے۔

قدیم وجدید سیاسی مفکرین نے موجودہ جمہوریت کو عوام کی حاکمیت (Rule of people) یعنی عوام الناس کی مرضی کے تابع قرار دیا ہے، اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ کسی ماورائی طاقت کی بجائے، اقتدار اعلیٰ کے اصل مالک عوام ہیں۔ ریاست کا وجود اس کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے نہیں کہ وہ عوام الناس کے حق اقتدار کو عملی شکل دینے کا ذریعہ بنے۔

جب کہ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ الٰہی قانون کی رو سے یہ تصور درست نہیں دراصل حاکمیت اعلیٰ کا اختیار اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ہے، انسان کا نہیں۔

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [۱]

"اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم نہیں ہے، اس نے فرمایا ہے کہ بندگی نہ کرو مگر اسی کی یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

بہر حال یہ اسلامی اقتدار اعلیٰ ہے کہ مقتدر اعلیٰ خداوند خلاق کی ذات کبریائی ہے اور حکمرانی شریعت کو حاصل ہوتی ہے۔

جمہوریت اسی وقت عمل میں آتی ہے جب عوام الناس کی اکثریت بالواسطہ یا بلاواسطہ، یا تی اقتدار میں شریک ہو۔

مائیکل سٹیورٹ لکھتے ہیں کہ:

" A Complete democracy would consult all of its citizens upon all maters . ..... it gives citizens not merely the sense of sharing in decisions, but theactual opportunity to influence its substance". (2)

ایک مکمل جمہوریت تمام معاملات میں شہریوں کے مشورہ سے چلتی ہے، یہ اپنے شہریوں کو نہ صرف اجتماعی فیصلوں میں شرکت کا احساس دیتی ہے بلکہ انہیں ان فیصلوں کی حقیقت پر اثر انداز ہونے کا حقیقی موقع بھی فراہم کرتی ہے۔

اسلامی ایجابی ریاست میں دستور عوام کی رائے سے مرتب نہیں ہوتا بلکہ حاکمیت الٰہیہ کے ذریعے تشکیل پاتا ہے اور اس کو عملی شکل حاکم وقت امت مسلمہ کے نائب کی حیثیت سے دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں امام شیبانی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ:

"الامام بمنزلة جماعة من المسلمين في استيفاء هذا الحق" [۳]

اس حق کے نفاذ میں امام (حاکم) کی حیثیت امت مسلمہ کے قائم مقام کی ہوتی ہے۔

۱۔ یوسف ۱۲: ۴۰

(2) Michael, Stwert, Modem forms of govemment, press London, 1959, P-56

۳۔ الامام لانه رجل من المسلمين والامام بمنزلة جماعة من المسلمين في استيفاء هذا الحد، (السرخسي، شمس الدين، محمد بن احمد، المبسوط، دار المعرفة، بيروت، لبنان، الطبعة الثالثة، ۱۹۷۸ء، جز ۹/ ۲۰٤)

امام سرخسی رحمہ اللہ سیر کبیر کی شرح میں لکھتے ہیں:

"فوقفنا انه لا طاعة للأمير على جنده فيما هو معصية ولا فيما كان وجه الخطا فيه بيّنا فاما فيما سوى ذلك ينبغي لهم ان يطيعوه"[1]

پس معلوم ہوا کہ لشکر پر معصیت کے بارے میں اپنے امیر کی اطاعت واجب نہیں اور نہ ایسے کام میں اطاعت واجب ہے جس میں حاکم کی غلطی بالکل واضح ہو لیکن ان کے سوا دوسرے امور میں اطاعت کرنی چاہیے۔

امام محمد رحمہ اللہ اور امام سرخسی رحمہ اللہ کی تصریحات سے خلیفہ کی اطاعت واجب ہونے کی شرعی حدود بالکل واضح ہوئیں۔ اگرچہ مندرجہ بالا احکام فوج (عسکری) کے متعلق بیان کیے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ انہیں فوج کے ساتھ مخصوص سمجھنے کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں بلکہ یہ عام اصول واحکام ہیں جن کا تعلق مملکت اسلامیہ میں رہنے والے ہر مسلمان شہری سے ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اطاعت خلیفہ یا بالفاظ دیگر حکومت اسلامیہ کی اطاعت کا عام قانون اور اصول ہے۔

ایجابی ریاست کی مستحکم بنیادیں:

اسلامی ایجابی ریاست کی اساس قوم، وطن، نسل یا نسب کے تصورات پر نہیں ہے بلکہ یہ اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ جس کا نصب العین عوام الناس کی انفرادی واجتماعی بہبود ہے اور یہ بہبود بنیادی ساز وسامان کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس میں اخروی زندگی کی فلاح بھی شامل ہے اور وہ خیر وفلاح یہ ہے کہ تمام افراد کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی کا پابند بنانا اور اخلاق اقدار سے روشناس کرانا ہے۔ درحقیقت ریاست سے احکام خداوندی کی قوت نافذ ہوتی ہے اور اس کی اطاعت اس وقت تک ضروری ہوتی ہے جب تک وہ احکام خداوندی کی اطاعت کرے۔

رسول اللہ ﷺ اس کی اس اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"الاسلام، والسلطان اخوان توامان لا يصلح واحد منهما الا بصاحبه فان الاسلام اس، والسلطان حارس، وما لا اس له يهدم، وما لا حارس له ضائع"[2]

اسلام اور عادل حاکم دونوں آپس میں جڑواں بھائی (لازم وملزوم) ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے بغیر پنپ نہیں سکتا (ایک کی بقاء دوسرے پر منحصر ہے) اور یہ اس لئے کہ اسلام حاکم عادل اور حکومت کے لیے اساس ہے۔ عادل بادشاہ اس اساس کے محافظ ہوتے ہیں۔ جس چیز کی اساس اور بنیاد نہ ہو اسے بقا نہیں اور جس کے محافظ ونگہبان نہ ہوں وہ ضائع ہونے والی ہے۔

اسلامی ریاست میں صالح حاکم مسلمانوں کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل روایت سے ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"انما الامام جنة يقاتل من ورائه، ويتقى به"[3]

۱۔ السرخسی، محمد بن احمد، شرح السير الكبير، طبعة دائرة المعارف النظامية، حيدر آباد، الطبعة الأولى، ۱۳۳۵ھ، جز ۱/۱۱٤

۲۔ الهندی، حسام الدین، علی المتقی، کنز العمال، رقم ۱٤٦۰۹، ۷/۱۰

۳۔ جامع صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب الامام جنة، رقم الحديث، ۱۷۷۲

امام ایک ڈھال اور اسلحہ کی مانند ہے کہ اس کے زیر سرپرستی جہاد ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (متوفی ۸۵۲ھ) اس حدیث مبارکہ کی تشریح میں لکھتے ہیں

"والمراد بالامام: کل قائم بامور الناس"[۱]

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

"لو کانت لي دعوة مستجابة لدعوت بها الى سلطان فان صلاحه صلاح البلاد والعباد وفي الفساده فسادهما"[۲]

مجھے یہ علم ہوتا کہ میری ایک دعا قبول ہوگی تو میں یہ دعائے مستجاب حاکم وقت کی اصلاح کے لئے مانگتا کیونکہ بادشاہ کی اصلاح و درستگی سے ملک اور باشندگان ملک کی فلاح و بہبود اور اس کے بگاڑ اور خرابی سے پورے ملک کا بگاڑ وابستہ ہے۔

مذکورہ نصوص اور محدثین کے اقوال سے حکام اور ان کی اصلاح کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اہل ایمان میں سے وہی لوگ اسلامی ریاست کی تشکیل کریں جو تقویٰ شعار اور صاحب کردار ہوں اور اللہ کی شریعت کی بالادستی اور اس کے احکام کے نفاذ کے لئے ریاست کو چلائیں۔ لہذا قرآن نے اصحاب ایمان سے خطاب کیا ہے کہ اللہ کے نائب کی حیثیت سے ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ امت مسلمہ کی تشکیل کریں اور اسلامی ریاست قائم کرکے اس کی قوت سے کام لیں اور امت کے مقاصد و اہداف کو پورا کریں۔

اس اصولی وضاحت کے بعد ایمانی ریاست کی بنیادیں جن پر اس ریاست کو قائم کیا جائے گا وہ ہمیشہ ایک ہی رہیں گی خواہ ریاست جغرافیائی یا معاشرتی لحاظ سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

۱۔ تحفظ نظریہ:

اگر کسی ریاست کا اساسی قانون اور نظام اللہ کی شریعت کے تابع ہو تو وہاں کی حکومت حکومت الٰہیہ ہے اور وہ ریاست ایمانی ریاست ہے لیکن اگر کسی ریاست کا نظام اساسی اللہ سے ، ورا، یا اس کے احکام سے متجاوز ہے تو قرآن نے اسے طاغوت قرار دیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق نظریہ اساسی کا اولین اصول یہ ہے کہ:

﴿يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ﴾[۳]

وہ پوچھتے ہیں کیا اختیارات میں ہمارا بھی حصہ ہے؟ (اے رسول ﷺ! فرما دیجئے) کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

گویا تحفظ نظریہ کے ضمن میں ایمانی ریاست حاکمیت الٰہی اور اس کے نفاذ کا حق بھی قوم رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوتا ہے اور حاکم وقت اسی بنیادی تصور پر ریاست کا ڈھانچہ مرتب کرتا ہے۔ لہذا ایمانی مملکت کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس نظریہ کا بھرپور تحفظ کیا جائے جس کی بناء پر ریاست کا وجود عمل میں آتا ہے۔

اس سلسلے میں علامہ عبدالقادر عودہؒ لکھتے ہیں:

"اذا كان الله جل شانه قد أوجب علينا ان نتحاكم الى ما أنزل على رسوله وأن نتحاكم به فقد

۱۔　ابن حجر، عسقلانی، فتح الباری، باب من يقاتل من وراء الامام ويتقى به، ۶/۱۱۶

۲۔　ابن جماعة، بدر الدين، تحرير الاحكام في تدبير اهل الاسلام، طبعة دار الثقافة قطر، س ن، ص ۵۱

۳۔　آل عمران ۳: ۱۵۴

أوجب على المسلمين أن ينصبوا عليهم حكومة تقيم فيهم أمر الله وترعاه.. والصلوة"[1]

اللہ تعالیٰ نے ہم پر لازم فرمایا ہے کہ ہم اپنے مسائل کو اس شریعت سے حل کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام پر نازل فرمائی ہے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان پر ایسی حکومت مسلط ہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت اور حفاظت کرتی ہو اور یہ احکام لوگوں پر نافذ کرتی ہو اور حکومت کے افراد حکومت کی اقامت میں شریعت کے مطابق ایسی عبادت کریں جیسا کہ نماز اور روزہ کا اہتمام کرتے ہیں۔

۲۔نفاذِ آئین

اسلامی نظام میں شریعت برتر آئین ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس نظام میں مملکت شریعت کے تابع ہوتی ہے۔ اس لیے اسلامی نظام میں مراتب اقتدار کی درجہ بندی ان دوسرے نظام ہائے سیاست و قانون سے مختلف ہوتی ہے جنہیں انسان نے وضع کیا ہے۔ اس پہلو سے قانون کی یہ درجہ بندی ایک اسلامی ایجابی ریاست کی قانونی درجہ بندی سے یکسر مختلف ہے۔ اسلامی ایجابی ریاست میں کسی قانون کے جواز کا مدار وہ اصول ہوتے ہیں جنہیں اسلامی معاشرے نے بطور عقیدہ قبول کیا ہوتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ حکم کس نے دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی فرد خلیفہ کے حکم کے خلاف اور شریعت کے حکم کے مطابق کوئی کام کرتا ہے تو اس فرد کا کام درست تصور کیا جائے گا اور حاکم کے حکم کی کوئی پروا نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ شریعت کے مخالف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

اسی لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا:

"اخطا عمر واصابت المرأة"[2]

عورت نے بات درست کی ہے اور عمر سے غلطی ہوئی ہے۔

چونکہ شرعی نظام میں بالادستی اس اصول کی ہے۔ کسی ایسے فعل میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ جس میں خالق کی نافرمانی ہوتی ہو اور قرآن مجید میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کرنے والا حاکم اپنے لیے ظلم، فسق اور کفر کا راستہ منتخب کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ... . الظّٰلِمُوْنَ .. الْفٰسِقُوْنَ﴾[3]

"اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں ــــ ظالم ہیں ــــ فاسق ہیں"۔

اسلامی ریاست کا اصل الاصول اور بنیادی کام آئین کا نفاذ ہے۔

امام محمد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"ولا يجوز الخلف فيما أخبر به رسول الله ﷺ"[4]

سربراہِ مملکت اس شریعت کو نافذ کرنے کا پابند ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔

۱۔ المال والحكم في الاسلام، ص ١٠٧

۲۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء في مهور النساء، رقم الحديث، ١١١٤

۳۔ المائدة ٥: ٤٤ تا ٤٧

۴۔ شرح السير الكبير، ١/ ٩٠

٣۔ باہمی مشاورت

اسلامی ریاست کے نظام میں اصل بنیاد شوریٰ ہے۔ اسلامی حکومت کا سربراہ شوریٰ کی جانب سے مقرر ہوگا اور تقرری کے بعد ریاست کے تمام اہم فیصلے اصحاب علم اور اہل الرائے کے مشورہ سے پاس ہونے کے بعد نافذ کئے جائیں گے۔ اس لحاظ سے حکومت شورائی طرز کی ہوگی اور اہل حل وعقد کے مشورہ سے نظم ونسق پر مامور ہوگی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾[1]

اور وہ مشورہ سے آپس کے کام کرتے ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں یہ لفظ امر حکومت کے لئے مستعمل ہے[2] لہذا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"واذا كان امراؤكم خياركم، واغنياؤكم سمحاءكم، وامور كم شورى بينكم فظهر الأرض خير لكم من بطنها"[3]

جب تمہارے حاکم تمہارے بہتر ہوں اور مالدار لوگ سخی ہوں اور تمہارے کام باہمی مشورے سے طے پاتے ہوں تو اس وقت تمہارے لئے زمین کے باہر کا حصہ اندر کے حصے سے افضل ہے (یعنی آپ کیلئے موت سے زندگی بہتر ہے)

مذکورہ حدیث مبارکہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔

١۔ صالح قیادت ٢۔ غرباء کی کفالت ٣۔ شوریٰ اور یہ تینوں ایک اسلامی ریاست کے لیے بنیادی شرائط ہیں۔

فلاحی ریاست ــــــ معنی ومفہوم اور اہمیت

فلاح فلاح سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم عام طور پر کامیابی وکامرانی بتایا جاتا ہے۔ کامیابی وکامرانی کا مفہوم ادا کرنے کے لئے اس کے علاوہ بیسیوں الفاظ موجود ہیں جیسے فوز، نجاح، ظفر وغیرہ، لیکن اہل لغت نے فلاح کی تشریح کرتے ہوئے اسی مفہوم پر اکتفا نہیں کیا، اس کی ایسی تشریح کی ہے جس سے اس کی امتیازی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔

ابن منظور افریقی رقمطراز ہیں:

"فلح، الفلح والفلاح، الفوز والنجاة والبقاء في النعيم والخير"[4]

فلاح سحری کا کھانا، چھٹکارا، فتح مندی، زندگی اور خیر کی بقاء ہے۔

١۔ الشوریٰ ٤٢: ٣٨

٢۔ سیاست اسلام کے دانشور شورائی نظام کو جمہوریت کہتے ہیں۔ یہ لفظ جمہور کثرت وغلبہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، حدیث مبارکہ میں ہے: "في جمهور من العرب" جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب، ماجاء ان الخلفاء من القریش، رقم الحدیث۔

لفظ جمہوریت کی اصطلاح جائز ہے جو خود قرآن، حدیث اور خلفاء راشدین کی شورائی اصطلاح کے عین مطابق ہے۔

جب کہ آج کل جمہوریت کا لفظ ڈیموکریسی کے لئے استعمال ہوتا ہے جو یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے تمام اصول اسلام کے منافی ہیں۔

٣۔ مشكوة المصابيح، كتاب الرقاق، باب تغير الناس، رقم الحديث: ٥٣٦٨

٤۔ لسان العرب، به ذیل ماده فلح

''امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ نے فلاح کا معنی ''کامیابی'' کیے ہیں اور یہ دو قسم دنیوی و اخروی فلاح پر ہیں۔ دنیوی فلاح ان سعادتوں کو حاصل کر لینے کا نام ہے جس سے دنیوی زندگی خوشگوار بنتی ہے۔ یعنی بقا، مال و عزت اور دولت، فلاح اخروی چار چیزوں کے حاصل ہو جانے کا نام ہے۔ بقاء بلا فنا، غنا بلا فقر، عزت بلا ذلت اور علم بلا جہل'' ۱؎

آکسفورڈ یونیورسٹی میں ویلفیئر سٹیٹ کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے کہ۔

"Statisfactory state, health and prasperity well being. State, one having national health, insurance, and other social services, work, efforts to make life worth living for employees etc."(2)

تسلی بخش حالت، مستحکم اور خوشحال ریاست وہ ہے جس میں قومی صحت بیمہ (کی رقم) کا اطمینان اور دوسری سماجی خدمات کے علاوہ ملازمین کی زندگی کو خوشحال بنایا جا سکے۔

فنک آرتھر (Fink Arther) سماجی فلاح کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ

"The term social welfare signifies the total well-being of the individual, the basic economic necessities,high standard of health, decent living conditions, equal opportunities with his fellow citizens and self-respect". (3)

سماجی فلاح وہ ہے جو ہر فرد کی کلی طور پر خوشحالی، بنیادی معاشی ضروریات، اعلیٰ طبی معیار، معقول رہن سہن کے اطوار، دوسرے شہریوں کے ساتھ یکساں مواقع اور عزت نفس فراہم کرنے کی ضامن ہو۔

بروس (Bruce) فلاحی ریاست کے سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:

"It is being realized that free and compulsory education up to modern state. The state is directly responsible for the "Moral Welfare" of the people is yet to be recognized". (4)

یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ جدید ریاست میں بنیادی تعلیم کا مفت اور لازمی انتظام اس کے پروگرام میں شامل ہے اور لوگوں کی اخلاقی فلاح کی ذمہ داری کو بھی براہ راست تسلیم کیا جاتا ہے۔

عصر حاضر میں فلاحی ریاست کا مفہوم یوں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ریاست جو شہریوں کی تمام بنیادی ضروریات کی فراہمی اور مادی فلاح و بہبود کا انتظام کرتی ہو۔ خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور صحت عامہ وغیرہ۔ سب اس کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ اس فلاحی

۱؎ ۔ مفردات القرآن، بہ ذیل مادہ فلح

(2) *Oxford dictionary, P-1457*

(3) *Fink Arther, The Field of Socialwork, London, Fifth Edition,1968, P-65*

(4) *Bruce, Maurice, The Comming of the Welfare State, Great Britian by William Clowes and Sons Ltd, London, 1968, P-02*

ریاست کے یہ عناصر اسلامی ایجابی ریاست کے نمایاں ارکان بھی ہیں۔

اس ضمن میں کوئی فرق ہے تو یہی کہ مغرب میں ان تصورات کی تاریخ زیادہ سے زیادہ تین سو سال پرانی ہے اور اس کا عملی نفاذ تو ماضی قریب کی بات ہے۔[1]

دیگر مذاہب کی طرح اسلام نے انسان کی جسمانی زندگی، اس کے تقاضوں اور اس کی مادی ضرورتوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا، یہ نہیں کیا کہ آخرت کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ترک دنیا ناگزیر ہے وہ رہبانیت کا سخت مخالف ہے، اس کے نزدیک معاشی سرگرمیاں نہ صرف جائز اور مستحسن بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری ہو جاتی ہیں۔ وہ کسب حلال کو "فریضة بعد فریضة"[2] قرار دیتا ہے۔ وہ تجارت کو "فضل اللہ"[3] اموال کو "خیر"[4] اور "التی جعل الله لکم قیاما"[5] خوراک کو "الطیبات من الرزق"[6] لباس کو "زینة الله"[7] اور رہائش کو "سکن" (سکون اور اطمینان کی جگہ)[8] سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ بیک وقت دین و دنیا دونوں کی فلاح و کامیابی اور کفالت کا ضامن ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو خوشحال اور فارغ البال دیکھنا چاہتا ہے۔ اللہ کی شان رزاقی کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ اس کی رزاقی پر یقین رکھنے والے لوگ معاشی طور پر خوشحال ہوں۔

آنحضرت ﷺ رعایا کی خوشحالی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی فرماتے رہتے تھے

"اللهم بارک لنا فی ثمرنا وبارک لنا فی مدینتنا وبارک لنا فی صاعنا وبارک لنا فی مدنا"[9]

اسلام درحقیقت خوشحالی کا ایسا نظام بروئے کار لانا چاہتا ہے جس کے سایہ میں ہر انسان کو اس کی لازمی ضرورت کے مطابق کھانے پینے، رہنے سہنے اور زندہ رہنے کا سامان میسر آئے اور جس میں پھل پھول کی بہار بھی نظر آئے۔

اسلامی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام عہد خلافت راشدہ میں مزید مستحکم ہو چکا تھا۔

اس سلسلہ میں ابن کثیر رحمہ اللہ قمطراز ہیں کہ:

"هذا وعد من الله تعالیٰ لرسوله صلوات الله وسلامه علیه بانه سیجعل امته خلفاء الأرض، أی: أئمة الناس والولاة علیهم، وبهم تصلح البلاد و تخضع لهم العباد وقد فعله تبارک وتعالیٰ"[10]

(1) The New Encycleopedia Bntannica, Pnnted in U.S.A, The Universitty of chicago, 15th edition, 1986, P-422.

۲۔ المعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۹۹۹۳

۳۔ المائدة ٥: ٢

٤۔ البقرة ٢: ٢١٥

٥۔ النساء ٤: ٥

٦۔ الاعراف ٧: ٣٢

٧۔ ایضاً

٨۔ الطلاق ٦٥: ٦

٩۔ الموطا لامام مالک، کتاب الجامع، باب الدعا للمدینة وأهلها، رقم الحدیث ١٥٩٤

١٠۔ ابن کثیر، عماد الدین، اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعة الاولیٰ، جولائی ١٩٩٨ء، ص ٩٤٨

خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے بعد ان کی امت کے ارکان کو روئے زمین کی خلافت وحکومت دی جائے گی جو دنیا میں صحیح تمدن کو پھیلائیں گے، بدامنی دور ہو کر امن قائم ہوگا، بندگان خدا ان کی حکومت کی اطاعت کریں گے یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔

اسلام جس طرح زندگی کے تمام شعبوں میں فلاح وخیر کا داعی ہے اسی طرح ریاست کی بھی فلاحی بنیادوں کو تشکیل دینے کا حکم دیتا ہے۔ عوام اور رعایا کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اور ان کی فلاح وبہبود کو ریاست کے اہم فرائض میں شامل کرتا ہے اور ایسی ہی ریاست کو فلاحی ریاست سے تعبیر کرتا ہے جو پورے معاشرے کی ترقی وخوشحالی کی ضامن ہو اور جہاں ہر شخص امن اور سکون کے ساتھ ہر قسم کے ظلم و استحصال سے محفوظ رہ کر اپنے حقوق حاصل کر سکے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اسلام کی عالمگیریت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ

> "اسلام جو عالمگیر دعوت اور ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے اور دنیائے انسانی کی صرف معاشی فلاح وصلاح کا ہی خواہش مند نہیں ہے بلکہ روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی غرض ہر قسم کی دینی ودنیوی فلاح وبہبود اور رشد وہدایت کا علمبردار ہے"۔[1]

ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری فلاح کا تصور یوں بیان کرتے ہیں کہ

> "The goal to be achieved through the realisation of the values that Govern the Islamic society has been enshrined by the Holy Quran in the concept of "Falah", i e, Welfare .. Spiritual, moral, physical, economic, Political, etc, This makes the Islamic Society a total welfare society". (2)

ان اقدار کی بدولت، جو اسلامی معاشرے کی رہنمائی کرتی ہیں، حاصل ہونے والے مقصد کو قرآن مجید میں فلاح کے تصور سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی روحانی، اخلاقی، جسمانی، معاشی اور سیاسی شعبوں کی فلاح۔ اس اسلامی معاشرہ کو مکمل فلاحی (Total Welfare Society) بناتا ہے۔

یہ فلاح واضح طور پر براہ راست فرد اور معاشرہ دونوں سے متعلق ہے۔ پھر اسلام اجتماعی فلاح (Collective Welfare) کا ایک ہمہ جہتی تصور رکھتا ہے۔ پس یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ بحیثیت خلیفۃ اللہ، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں شہریوں کے تمام حزن وخوف (بشمول معاشی) دور کرے اور اس زمین کو جنت ارضی بنادے۔

---

1. سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، مولانا، اسلام کا اقتصادی نظام، ناشر ادارہ اسلامیات لاہور، طبع اول ۱۹۸۱ء، ص ۴۳

(2) *Ansari, Fazlur Rehman, Dr. The Quranic Foundations and Structure of Muslim society, publisher, world Federation of Islamic Missions, Islamic Centre North, Nazimabad, Karachi, March, 1977, V-1, p-192*

فلاحی ریاست کی مستحکم بنیادیں

(i) اخلاقی فلاح کا حصول

انسان نہ صرف روح کا نام ہے نہ فقط جسم کا، بلکہ دونوں کے مجموعے کو انسان کہا جاتا ہے۔ اس لیے بنی نوع انسان کا ابدی اور عالمگیر دین وہی ہو سکتا ہے جو دونوں کی نشوونما اور بالیدگی کا ضامن ہو، دونوں میں محاذ آرائی کو ختم کرے اور ان میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر دے کہ دونوں ایک ہی راہ پر ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں رہیں۔

جب انسانی روح کا ربط و تعلق اللہ تعالیٰ سے بڑھتا ہے تو وہ فلاح اور نیکی سے ہمکنار ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں علامہ محمد مبارک لکھتے ہیں:

"لما كان هدف الدولة الاسلامية ليس السيادة، ولا تجميع الثروة ولا المجد العسكري، وانما هدفها تحرير الانسان من العبوديات جميعاً يربطه برابطة عليا هي الخضوع لله وحدهُ. . وانما يخضع ذلك كله للمقاييس والقيم الأخلاقية"[1]

اسلامی حکومت کا ہدف صرف حکومت کرنا نہیں اور نہ ہی صرف مال اور دولت کا جمع کرنا ہے اور نہ ہی عسکری اور نظامی قوت حاصل کرنا ہے بلکہ اسلامی حکومت کا بنیادی ہدف دنیا میں نوع انسانی کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کرنا ہے اور خضوع اور عاجزی کے ساتھ انسانوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ بنانا ہے۔ لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنا ہے اس لیے کہ اسلامی حکومت میں انسانی اور اخلاقی ہدف مقدم ہے جب کہ مذکورہ تمام (امور) اخلاقی اندازوں اور اقدار کے تابع ہے۔

اسی طرح علامہ عمر نسفی رحمہ اللہ اسلامی حکومت کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر لکھتے ہیں کہ

"والمسلمون لابدلهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم، واقامة حدودهم"[2]

مسلمانوں کے لیے ایک ایسا حاکم ضروری ہے جو ان پر احکام خداوندی نافذ کرے اور حدود قائم کرے۔

تمام مسلمانوں کے لیے عموماً اور اجتماعی و سیاسی اشخاص کے لیے خصوصاً ضروری ہے کہ خود کو پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کریں اور اپنی رعایا کو بھی اس سے مزین کریں۔ اس کے بغیر اسلامی ریاست کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتیں۔

قرآن کریم اور سنت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق و فرائض کا سارا سلسلہ ایمان اور اخلاقی اقدار سے وابستہ ہے۔ اخلاقی اقدار ایمان کا لازمہ ہیں۔ اسی لیے اسلام نے اخلاقی اصول و ضوابط کا ایک جامع نظام مرحمت فرمایا ہے۔ اخلاقیات کی تعلیم میں چند اصول ایسے ہیں جو حاکم اور رعایا کی روحانی و اخلاقی تربیت کر کے اسے صحیح جہت میں آمادہ عمل رکھتے ہیں۔

علامہ شیرزی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"ينبغي للملك المنتصب لتدبير الرعية، ان يتصف بالأوصاف الكريمة، ويتلبس بها، ويجعلها

۱۔ نظام الاسلام الحكم والدولة، ص ۱۴۳

۲۔ التفتازانی، سعد الدین، شرح العقائد النسفية، اداره احياء التراث قطر، س ن، ص ۱۱۰

له خلقا مطبوعا، ولا يهمل منها وصفا واحدا اذا بها قوام دولته، ودوام مملكته" [1]

وہ حاکم جو اپنی رعایا کی خدمت پر مقرر ہو اس کے لیے مناسب ہے کہ نیک صفات کا حامل ہو۔ نیک اخلاق کو اپنے لیے فطری اخلاق بنائے اور ان لازمی صفات میں سے ایک کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دے کیونکہ ان صفات کی بدولت بادشاہ وقت کو عروج اور حکومت کو دوام ملتا ہے۔

وہ صفات جو ہر ایک کے لیے بہت ضروری ہیں۔ وہ یہ ہیں:

عدل، عقل، شجاعت، سخاوت، نرمی، اپنے وعدے پر وفا (ایفائے عہد)، سچائی، پیار و محبت، صبر، عفو، شکر، دیانت داری، برداشت، حرام سے بچنا، وقار۔

اور عدمی صفات یہ ہیں:

ظلم، جہل، بخل، اسراف، وعدہ خلافی، دروغ گوئی، غیبت، غضب، عجب، کبر، حسد، عجلت، مزاح، مکک، مغدر (دھوکہ دینا)

مندرجہ بالا صفات حسنہ سے متصف ہونا اور صفات سیئہ سے بچنا حاکم وقت اور رعایا کے لیے ضروری ہے۔

اس بارے میں امام ماوردی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"فحق على ذى الأمرة والسلطان: أن يهتم بمراعاة أخلاقه واصلاح شيمه لأنها آلة سلطانه واس امره" [2]

حاکم اور بادشاہ پر لازم ہے کہ اپنے اخلاق و عادات کی اصلاح کا اہتمام کرے کیونکہ اس کے اخلاق و عادات اس کے غلبے کا ذریعہ اور اس کی حکومت کے لیے بنیاد ہے۔

اخلاقی فلاح کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ریاست میں اخلاقی اقدار کی حکمرانی اور ترویج ہو اور بد امنی، فساد، فحاشی و عریانی اور دیگر اخلاقی برائیوں کا انسداد ہو تا کہ عوام الناس حقیقی معنوں میں اسلام کی اصل روح سے بہرہ ور ہو۔

(ii) علمی فلاح کا حصول

حصول تعلیم انسان کا دینی فریضہ ہے۔ [3] اس اعتبار سے تعلیم کا نصب العین فرد کی ایسی تعمیر سیرت ہے جس سے وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کائنات کے لئے رحمت ثابت ہو سکے۔ اسلام ایسے افراد چاہتا ہے جو انفرادی طور پر اس عظیم مقصد کے ساتھ وابستگی رکھتے ہوں اور اجتماعی طور پر اسلامی ریاست کے اچھے شہری ثابت ہو سکیں کیونکہ وہ نظام تعلیم جس سے مقاصد ریاست پورے نہ ہوں۔ اجتماعی نظم کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔

اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے سربراہ مملکت کا "علم و تجربہ"، "نظم و نسق مملکت" کو چلانے کی صلاحیت اور "معاملہ فہم" ہونا ضروری ہے"۔ [4]

۱۔ شیروی، عبد الرحمن، المنهج المسلوك في سياسة الملوك، طبع مكتبة المنار، اردن، س۔ن، ص ۲٤۱

۲۔ الماوردی، أبو الحسن، علی بن محمد بن حبیب، نصيحة الملوك، طبع دار النهضة، بيروت، س۔ن، ص ۱۵۰

۳۔ طلب العلم فريضة على كل مسلم، سنن ابن ماجة، مقدمة، باب فضل العلماء

٤۔ احكام السلطانية، ص ۱۳، حجة الله البالغة، ۲/۱۰۱

ارسطو نے سکندر کو لکھا تھا:

"لا تثقن بحال من لم تجربه فی الولایة"[1]

اس شخص کے حال پر اعتماد نہ کرو جو منصب سنبھالنے کا تجربہ نہیں رکھتا۔

ابن خلدون کے نزدیک علم کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ اگر امام عالم نہ ہوگا اور شرعی احکام سے اس کو واقفیت نہیں ہوگی تو وہ ان کو جاری نہیں کر سکے گا۔[2]

عصر حاضر میں یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب فلاحی ریاست کا سربراہ تعلیم کی ترویج کے لئے ہمہ گیر اور مفت اہتمام کرے تا کہ لوگ زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر ملک وملت کے لیے کار گر ثابت ہوں۔

نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں اولین اسدی اقامتی جامعہ (Residential University) میں طلباء کی نہ صرف مفت تعلیم کا بندوبست کیا بلکہ ان کے طعام، لباس اور رہائش کا بھی انتظام کیا۔[3] اور اساتذہ ان کے لئے مامور کیے گئے جو دن کو انہیں وہاں لکھنے پڑھنے اور مسائل دین کی تعلیم دیتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سعید بن العاص ؓ جو خوشخط اور زمانہ جاہلیت میں بھی کاتب کی حیثیت سے مشہور تھے، انہیں وہاں لکھنا سکھاتے تھے۔

"فامره رسول الله ﷺ ان یعلم الکتاب بالمدینة و کان کاتباً محسناً"[4]

اسی طرح عبادہ ؓ بن صامت سے مروی ہے کہ انہیں رسول اکرم ﷺ نے اس بات پر مامور فرمایا کہ صفہ میں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں:

"عبادہ بن صامت فقال کان یعلم اهل الصفة القرآن"[5]

حضور ﷺ نے مختلف صوبوں میں مقرر والیان اور گورنروں کو بھی یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے علاقوں میں تعلیم کا بندوبست کریں۔ نظم تعلیم کے لیے مدینہ منورہ سے رسول اکرم ﷺ نے معاذ بن جبل کو ناظر تعلیمات بنا کر یمن اور حضرموت بھیجا جہاں وہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں دورہ کیا کرتے اور مدارس کی نگرانی و انتظام کرتے۔

"وبعث معاذ بن جبل رضی الله عنه معلما لأهل البلدین: الیمن و حضر موت"[6]

صفہ کے فارغ التحصیل صحابہ میں مبلغ اسلام، معلم، محدث، قاضی، منتظم اعلی، ماہر فن سپہ کاری اور فاتح وغیرہ شامل تھے۔

مذکورہ بالا بحث سے علمی فلاح کی اہمیت اور ضرورت آشکارا ہوتی ہے کہ اسلام تعلیم کے ذریعے (Human Capital) کی ترقی کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ جو کہ دیگر اقوام کے لیے ایک نیا تصور ہے۔ جب کہ مسلمان اس کی اہمیت سے صدیوں پہلے آشنا تھے۔ عروج

۱۔ الماوردی محمد بن یوسف، السعادة والاسعاد، طبع دار النهضة، بیروت، س ن، ص ۴۴۲

۲۔ المقدمه ابن خلدون، ۲/۶۸۸

۳۔ صفہ کی درسگاہ میں تعلیم پانے والوں کی کثیر تعداد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بعض مؤلف اہل صفہ کے چار سو طلبہ کا ذکر کرتے ہیں جو تعجب نہیں کہ ایک ہی دن کی حاضری ہو کیونکہ خود مقیم و شب باش طلبہ اسی تک ہو جاتے تھے۔ (سعد بن عبادۃ انصاری، کیلئے یک ایک رات میں اسی اہل صفہ کی ضیافت کرتے تھے۔ المسند لابن حنبل ۳/۳۷۱)

۴۔ ابن اثیر، علی بن محمد، اسد الغابة فی معرفة الصحابة، دار المعرفة، بیروت، لبنان، الطبعة الاولی، ۱۹۹۷م، ۲/ ۶۱۲

۵۔ الکتانی، عبد الحئی، التراتیب الاداریة، المطبعة الاهلیة بدرب المدسی بالرباط، ۱۳۴۶ھ، جز ۱/ ۴۰

۶۔ تاریخ الأمم والملوك، ۲/۲۴۷

اسلام کے دور میں قرطبہ، بغداد اور دوسرے بلاد اسلامیہ میں اسلامی جامعات نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے تمام شعبوں میں شاندار تحقیق و تجسس کا کام کیا جو آگے چل کر یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے علمی ورثہ کو دوبارہ اختیار کریں۔

(iii) سیاسی و سماجی فلاح کا حصول

امام غزالی رحمہ اللہ نے انسانی زندگی کے بارے میں چار اصول بتائے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

اصول لاقوام للعالم دونها وهي أربعة: الزراعة، وهي للمطعم، والحياكة، وهي للملبس، والبناء، وهي للمسكن، والسياسة، وهي للتاليف، والاجتماع، والتعاون على اسباب المعيشة، وضبطها"[1]

وہ اصول جن کے بغیر عالم کو قوام نہیں آسکتا، وہ چار ہیں:

۱۔ خوراک کی مشکل حل کرنے کے لئے زراعت

۲۔ لباس کی مشکل کے لیے کپڑے کا بننا

۳۔ سکونت کی مشکل کے لیے تعمیرات

۴۔ اور آپس میں محبت والفت اور اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کے تعاون کے لیے سیاست

اسلامی ریاست میں دین زندگی کے تمام سیاسی، سماجی، تمدنی، اخلاقی اور اقتصادی منصوبوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ دین صرف عقائد کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ زندگی کا ایسا انفرادی اور اجتماعی نظام ہے جو روح کی اصلاح اور بدن کی فلاح دونوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کیلئے اسلامی ریاست ہر پہلو میں اجتماعی ترقی کو پوری توجہ دیتی ہے تاکہ سیاسی نظام مستحکم رہے۔

اس ضمن میں علامہ محمد مبارک لکھتے ہیں:

"وذلك انها لم تقتصر في وظائفها كما سبق بيان ذلك حفظ الأمن والدفاع بل تجاوزتها الى اهداف ايجابية وتوجيهية في ميدان الاقتصاد والعلم وسائر المرافق النافعة للناس بوجه عام، وفسحت للناس ميادين النشاط في حدود أهداف الاسلام الانسانية والأخلاقية" [2]

اور یہ اس لیے کہ اسلامی حکومت اپنے وظائف میں صرف امن رکھنے اور دفاع کرنے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اسلامی حکومت اقتصادی میدان، علم اور دوسرے عام المنفعت امور میں بطریقہ عمومی ایجابی اہداف رکھتی ہے اور لوگوں کے لیے خوشحالی کے ایسے اسباب مہیا کرتی ہے جو اسلام کے اہداف انسانیہ اور اخلاقیہ کے حدود کے اندر ہوں۔

اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ رقمطراز ہیں:

"واذ وجد الخليفة واحسن السيرة في الارض وخضعت له الجابرة وانقاد له الملوك تحت نعمة واطمأنت البلاد والعباد" [3]

۱۔ احیائے علوم الدین، ۱/ ۱۲

۲۔ نظام الاسلام الحکم والدولۃ، ص ۱۴۳

۳۔ حجۃ اللہ البالغۃ، ۱/ ۹۹

ملک میں جب خلیفہ مقرر ہو جاتا ہے تو وہ اپنی عمدہ سیرت کا عملدر آمد کرتا ہے۔ سرکش لوگ اس کے فرمانبردار اور بادشاہ اس کے مطیع ہو جاتے ہیں تو اللہ کی نعمت کامل ہو جاتی ہے۔ شہر میں سکون اور لوگوں کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

انسانی معاشرہ کی مستحکم بنیادوں پر تنظیم کے لیے صرف احکام و قوانین کا نفاذ یا عدلیہ کا قیام ہی کافی نہیں بلکہ عوام الناس کی علمی و فکری معیار کو بہتر بنانا اور انسانی رویہ میں مثبت تبدیلی اور تعمیری و تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا بھی ضروری ہے۔

سیاسی فلاح کے ضمن میں یہ امر بھی ناگزیر ہے کہ لوگوں کو ان کے شہری حقوق دیے جائیں۔ اگر حکومتی سطح پر کوئی غلط کام ہو رہا ہو تو عوامی احتساب کا حق انہیں حاصل ہو اور حکومتی امور کی انجام دہی میں ان کو شریک کیا جائے۔

حضرت عمرؓ کی بصیرت اس نتیجے تک پہنچی تھی کہ عوام کی خدمت اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب سرکاری اہلکار راہ راست پر ہوں۔ اس لیے وہ سارا زور انہی کو راہ راست پر رکھنے کی پالیسی پر صرف کرتے تھے۔

اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا یہ بیان بہت اہمیت کا حامل ہے کہ:

"جب امیر خود حدود فراموشی اور ناحق کارروائیاں کرنے لگتا ہے تو پھر ماتحت بھی اسی کے نقش قدم پر چلنے لگتے ہیں" ۱؎

حکمران اگر اپنی تمام صلاحیتیں عوام کی خدمت میں صرف کرتا ہے تو وہ اس امانت سے بھی عہدہ برآ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

۱۷۔ معاشی فلاح کا حصول

معاشی فلاح کے حصول میں اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں ہمہ گیر نوعیت کی ہیں۔ یہ نہ صرف لوگوں کی بنیادی ضرورت (جیسے تعلیم، صحت، رہائش، پینے کا صاف پانی، صفائی (Sanitation) وغیرہ مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے بلکہ وہ معیشت کا نظام ان خطوط پر استوار کرتی ہے کہ معاشرہ سے استحصال اور ظلم کا خاتمہ ہو اور کوئی فرد ایسا نہ رہے جو بھوک، افلاس یا بے روزگاری کا شکار ہو۔ لہٰذا اسلامی ریاست حکومتی اور عوامی سطح پر سادہ معیار زندگی کو فروغ دینے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔

فلاحی ریاست کا اولین تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کی بنیادی ضروریات کی کفیل ہو، ہر وہ ضرورت بنیادی ضرورت کہلاتی ہے جس کی تکمیل پر کسی انسان کی زندگی کا انحصار ہو۔ انسانی ضروریات اگرچہ بے شمار ہیں تاہم قرآن نے آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ہی ان کی کم از کم تحدید کا اعلان ان الفاظ میں فرما دیا تھا:

﴿إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ﴾ ۲؎

بلا شبہ یہ تمہارا حق ہے کہ تم یہاں نہ بھوکے رہو اور نہ ننگے اور یہ کہ تم نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کی تپش اٹھاؤ۔

آنحضرت ﷺ نے بھی انسان کی بنیادی ضروریت کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا

"ليس لابن آدم حق فى سوى هذه الخصال بيت يسكنه وثوب يوارى عورته وجلف الخبز والماء" ۳؎

آدم کے بیٹے کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لئے ایک گھر ہو جس میں وہ رہ سکے، کپڑا ہو جس سے وہ اپنا جسم ڈھانپ

۱؎ بحوالہ اسلام کا نظام حکومت، ص ۱۱۳

۲؎ طٰہٰ ۲۰: ۱۱۹

۳؎ جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب منہ الخصال التی لیس لابن آدم حق فی سواھا، رقم الحدیث ۲۳۴۱

- سکے اور کھانے کے لیے روٹی اور پینے کے لیے پانی ہو۔

ملک کی خوشحالی کا اہتمام حق تعالیٰ کو کس قدر مطلوب ہے اس کا اندازہ بقول امام سرخسی رحمہ اللہ آنحضرت ﷺ کے اثر سے ہوتا ہے

"انہوں نے میرے ملکوں کو آباد کیا تو اس میں میرے بندوں نے زندگی بسر کی" [1]

آنحضرت ﷺ کو مسلمانوں کی معاشی ترقی وفلاح کس قدر مطلوب تھی اس کا اندازہ اس دعا سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ:

"اللهم انهم حفاة فاحملهم اللهم انهم عراة فاكْسُهُمْ اللهم انهم جِيَاعٌ فَأَشْبِعْهُمْ" [2]

اے اللہ! یہ لوگ پیدل ہیں انہیں سواریاں عطا کر، اے اللہ! یہ لوگ ننگے ہیں ان کو کپڑے پہنا دے، اے اللہ! یہ لوگ بھوکے ہیں ان کے پیٹ بھر دے۔

مذکورہ تصریحات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ایک اسلامی فلاحی ریاست رعایا کی خوشحالی کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کرتی ہے۔

دینی ریاست ـــــــ معنی ومفہوم اور ضرورت واہمیت

قرآن میں سب سے اہم لفظ دین ہے جو معانی کے لحاظ سے زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ جہاں یہ لفظ غیر اصطلاحی لفظی معنی میں آیا ہے وہاں جزا وسزا، نظام زندگی، نظام حکومت، فرمانبرداری وغیرہ معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے

"ومنه قولهم: يدين الرجل أمره. اى يملك، والدين: الحكم، السيرة، التدبير والدين. الملة؛ يقال اعتبارا بالطاعة والانقياد للشريعة، [3] قال الله تعالى. إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ" [4]

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اسلام صرف مذہب نہیں، دین ہے اور یہی وہ دین ہے جو اللہ کے ہاں پسندیدہ، محبوب اور بے مثال ہے اور کوئی نہیں۔

میثاق مدینہ کی دستاویز میں بھی ایک جگہ لفظ "دین" آیا ہے۔ جس میں مذہب اور حکومت کا مفہوم بیک وقت پایا جاتا ہے اور دونوں کو یکجا کر کے منظم ومرتب صورت میں اس میثاق نے ایک ریاست کی شکل دے دی۔[5]

لفظ دین کا معنی ومفہوم بیان کرنے کے بعد اب دینی ریاست کے متعلق چند تعریفات بیان کی جاتی ہیں جس سے اس کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔

حکومت وفرمانروائی کی کئی اقسام ہیں، اس کی سب سے اعلیٰ وارفع قسم وہ ہے جسے قرآن نے خلافت عظمیٰ سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہ اجتماعی ہیئت جس کا واحد نصب العین ان مقاصد کی تکمیل ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر دنیا میں تشریف لائے اور جنہیں ختم الرسل محمد ﷺ نے پورے کمال کے ساتھ عملی زندگی میں نافذ کر کے نوع بشری کے لئے قیامت تک ایک نمونہ فراہم کر دیا۔ یہ خلافت ایک ایسا نظم اجتماعی ہے، جس کی منشا، مقصد اور نوعیت کو علم سیاست کی کوئی قدیم وجدید اصطلاح کماحقہٗ بیان کرنے سے قاصر ہے۔

۱۔ المبسوط للسرخسی، ۲۳/ ۱۵

۲۔ سنن أبی داود، کتاب الجهاد، باب فی النفل للسرية تخرج من العسكر، رقم الحديث ۲۷۴۷

۳۔ تاج العروس، به ذيل ماده كَوْنَ

۴۔ آل عمران ۳: ۱۹

۵۔ عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، ص ۹۲

الماوردی کے خیال میں خلافت، امامت (مملکت) نبی کریم ﷺ کی جانشینی ہے، اس کا قیام دین کی حفاظت اور دنیاوی معاملات کے انتظام کے لیے ہوتا ہے۔ امت کے رہنما اس پر متفق ہیں کہ اس کا قیام لازمی ولابدی چیز ہے۔

"الامامة موضوعة لخلافة النبوة في حراسة الدين وسياسة الدنيا وعقدها لمن يقوم بها في الأمة واجب بالاجماع" [۱]

ابن خلدون رحمہ اللہ کے الفاظ میں مثالی ریاست "سیاست دینی" کی بناء پر معرض وجود میں آتی ہے جسے خلافت کہا جاتا ہے۔ اس کا سربراہ خلیفہ ہوتا ہے جو نبی ﷺ کا جانشین ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی تھی کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں، خلیفۃ الرسول ہوں [۲]

امام غزالی رحمہ اللہ کے خیال میں اولین درجے کی سیاست انبیاء کی ہوتی ہے جو اللہ کی ہدایت سے براہ راست فیض یاب ہوتے ہیں۔ دوسرے درجے کی سیاست خلفاء وملوک کی ہوتی ہے جو انبیاء کے سیاسی جانشین اور لوگوں میں سے بہترین اوصاف کے مالک ہوتے ہیں اس کے بعد درجہ علماء کی سیاست کا ہے جو انبیاء کے وارث ہیں، آخری درجہ معلمین اخلاق یا واعظین کی سیاست کا ہے۔

"الأولى وهي العليا سياسة الأنبياء عليهم السلام وحكمهم على الخاصة جميعا في ظاهرهم وباطنهم ..... والرابعة الوعاظ وحكمهم على بواطن العوام فقط" [۳]

دینی ریاست دنیا کی تمام دوسری ریاستوں سے مختلف ہے۔ اس کے ہر عمل کا محور ومنبع شریعت ہوتا ہے۔ ایک دینی ریاست دراصل شرعی قوانین کے لحاظ سے جبر واستبداد، قاہرانہ تسلط وتغلب، ظلم وزیادتی، زور وزبردستی، بُری خو، بشات اور منکرات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی جو بات عام سیاسی نقطۂ نگاہ سے متنفق ہو کر برائی سے خوبی کا جامہ پہن لیتی ہے وہ مذہبی دائرہ اثر میں ہروقت، ہر طرح اور ہر صورت میں بری رہتی ہے جبکہ عام سیاسی حکومتیں اللہ کی روشنی کو قبول نہیں کرتیں:

"وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُوْرًا فَمَا لَهُ مِنْ نُّوْرٍ" [۴]

(اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ) جو اللہ کی روشنی کا اکتساب نہیں کر سکتا وہ کوئی روشنی حاصل نہیں کر سکتا۔

علامہ ابن خلدون اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:

"واحكام السياسة انما تطلع على مصالح الدنيا فقط يعلمون ظاهراً من الحيوة الدنيا" [۵]

"رہے سیاسی حکومتوں کے احکام وہ دنیوی مصلحتوں کے اثر سے باہر نہیں آتے صرف دنیاوی زندگی کے تماشائی دائرہ میں نظر آتے ہیں"۔

دینی قانون کا مطمح نظر یہ ہے کہ تمام انسانی ذمہ داریوں کو خواہ وہ دنیا کے ماحول سے متعلق ہوں یا صلاح آخرت سے مذہب

۱۔　الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص۵

۲۔　المقدمۃ ابن خلدون، ۲/۶۸۹

۳۔　احیاء علوم الدین، ۱/۲۰

۴۔　النور ۲۴: ۴۰

۵۔　المقدمۃ ابن خلدون، ۲/۲۷۰

اور شریعت کے قوانین کی دفعات کے ماتحت کر دیا جائے۔[1]

ریاست کی تاسیس کامل دین کی بنیاد پر

پروردگار کی طرف سے انبیاء کی بعثت لاریب عالم انسانیت کے لیے نعمت و احسان اور دوسری مخلوق کے لیے رحمت کی نوید ہے۔ انبیاء کرام کی آمد دو طرح سے رحمت و برکت ہے۔

اوّل: ہدایت و اطاعت کا راستہ متعین کیا۔

دوم مکمل اور بے عیب نظام زندگی (اصول ہائے جہانبانی) عطا فرمائے۔ گنتی کے چند انبیاء کرام مسندِ جہانبانی پر فائز نظر آتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش عالم فانی میں۔ نبوت و رسالت بہ شکل خلافت و بادشاہت نمودار ہوئی۔[2] چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام بیک نبی و رسول اور خلیفہ و بادشاہ بھی تھے۔

بادشاہی کے ذکر کا آغاز قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ملتا ہے۔ جبکہ ایک شخص اپنے ملک کے تمام لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار چلاتا ہوا نظر آتا ہے"[3]

دینی ریاست کے بنیادی اصول جو ہمیں وحی الٰہی اور بارگاہ رسالت سے ملے، ان میں عدل و انصاف کے قیام کے لیے حضرت داؤد علیہ السلام کا نمونہ پیش نظر رکھتا ہے جن کو حق تعالیٰ نے فصل خطاب اور حکمت سے نوازا تھا۔[4]

استحکام سلطنت حصول غلبہ اور بقائے امن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے طرز حکومت کو قدوہ بناتا ہے کہ اگر کچھ دیر کے لیے ان کا وزیر، سفیر نظروں سے اوجھل ہوا تو گرفت ہو گی۔[5]

اشاعت اسلام، توسیع مملکت، استحکام سلطنت، مخلوق خدا کے واسطے سامانِ عافیت کے مہیا کرنے اور مفسدین کے فساد اور ظلم و ستم کے سدباب کے لیے حضرت ذوالقرنین کی زندگی کو لائحہ عمل بناتا ہے۔[6]

علاوہ ازیں تعمیر اخلاق اور تحسین معاشرے میں حضرت لقمان علیہ السلام کی تعلیمات کو رہنما بناتا ہے۔[7]

مذکورہ بالا تعلیمات کا منشاء یہ ہے کہ چونکہ انبیاء سلف کی سنت بھی مسلمانوں کے لئے واجب التعمیل قرار دی گئی ہے۔ اس لیے ان کے زمانہ کے احکام کا تذکرہ نہ صرف دینی ریاست کے لئے ایک پس منظر کا کام دیتا ہے بلکہ واقعتاً وہ ریاست کے خدوخال، حدود و شرائط، اس کی ذمہ داریاں اور اس کے تقاضے فراہم کرتا ہے جو اسلامی قانون سیاسی و انتظامی کے اجزاء ہیں۔ دراصل دینی ریاست کا وجود خلافت الٰہیہ کا قیام ہے، جس طرح رسول آخر الزمان ﷺ نے مدینہ میں ریاست قائم کر کے اس کی عملی تصویر انسانیت کے سامنے رکھی۔ یعنی اسلام کی ہدایت و

۱۔ اسلام کا نظام حکومت، ص ۲۶، ۲۷

۲۔ البقرۃ ۲: ۳۰، أنه اخلفكم في الارض منهم فجعلكم خلفاء بعضهم ومن ذلك قيل للسلطان الاعظم (جامع البيان عن تاويل أى القرآن ۱/۳۲۸)

۳۔ البقرۃ ۲: ۲۵۸ (نمرود کا قصہ)

۴۔ ص ۳۸: ۲۰ تا ۲۶

۵۔ النمل ۲۷: ۲۰ تا ۳۷

۶۔ الکهف ۱۸: ۹۴، ۹۵

۷۔ لقمان ۳۱: ۱۲ تا ۱۹

رہنمائی میں ایک مثالی ریاست قائم کی۔ اب مسلمانوں کی تاقیامت (پیش کی) جانے والی مملکت دراصل رسول اللہ ﷺ کی نیابت و جانشینی ہو گی جسے خلافت کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اسی سلسلہ میں واضح طور پر اہل اسلام کو ہدایت فرمائی ہے کہ

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾ [۱]

علامہ ابن کثیر اس آیت مبارکہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"هذا وعد من الله تعالى لرسوله صلوات الله وسلامه عليه بانه سيجعل امته خلفاء الارض، اى أئمة الناس والولاة عليهم، وبهم تصلح البلاد وتخضع لهم العباد" [۲]

اللہ تعالیٰ کا پیغمبر سے وعدہ ہے کہ اُن کے پیروؤں کو وہ زمین کا حکمران، لوگوں کا امام و پیشوا اور اپنے امور کا منتظم و مدبر بنائے گا انہیں سے ملکوں کی حالت درست ہو گی اور لوگ ان کی اطاعت کریں گے۔

خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے آپ ﷺ کے کارنامے حیرت انگیز ہیں۔ آپ ﷺ کی وجہ سے سیاسی دائرہ میں نئے نئے اصول، قوانین، احکام، ہدایات اور اساسی تنظیمات نے اپنا خوبصورت چہرہ دکھایا اور ان کی بناء پر قدیم فطری تصورات ایک نئے اور متوازن نظام سے آشنا ہوئے۔ [۳]

اس سلسلے میں امام ماوردی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"جب آنحضرت ﷺ اس دنیا میں مبعوث ہوئے تو اللہ کی نیابت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان پر حکومت حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو گئی۔ انکی حکومت اللہ کی حکومت ٹھہری، اور ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار پائی۔ [۴]

آنحضرت ﷺ نے اول درجہ کے عامل حکومت کی حیثیت سے انسانی معاشرہ کی تشکیل، جامعہ اسلامیہ کی تنظیم اور اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جو کارنامے سرانجام دیئے وہ مختصر اور مستند الفاظ میں مندرجہ ذیل ہیں

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ نے تین اہم کام کیے۔ سب سے پہلے مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر فرمائی۔ [۵] اس سے قبل مسجد قباء بھی تعمیر ہو چکی تھی۔ اسکے بعد آپ ﷺ نے مواخاۃ کا عمل سرانجام دیا جو مہاجرین و انصار کے مابین قائم ہوا۔ [۶] اس سے نوزائیدہ

۱۔　النور ۲۴: ۵۵

۲۔　تفسير القرآن العظيم، ص ۹۴۸

۳۔　اسلام کا نظام حکومت، ص ۹۶

۴۔　الاحكام السلطانية للماوردی، ص ۱۷

۵۔　مرکزی دینی ریاست کا مرکز مسجد نبوی تھا، جہاں ریاست کے تمام امور طے پاتے تھے۔
(عبد الله، عبد العزيز بن ادريس، المجتمع المدنية فى عهد الرسول ﷺ، طبع دار الكتب العلمية، بيروت، ۱۹۸۲ء، ص ۱۶۹)

۶۔　مواخاۃ دراصل ایک قدیم عرب ادارہ کے احیاء کا نیا انداز تھا۔ یہ ولاء کے نام سے عرب میں رائج تھا، اسلام کے بعد بھی رائج رہا۔ اس سے مراد یہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص، اگر چاہے تو اپنے قبیلے سے تعلق ختم کر کے کسی دوسرے قبیلے سے تعلق جوڑ سکتا تھا۔ اگر دوسرا قبیلہ قبول کرے تو وہ شخص پھر اس قبیلے کا فرد بن جاتا تھا۔ اس تعلق کو ولاء کہا جاتا تھا۔ (السمهودى، نور الدين، على بن احمد، وفاء الوفاء، احياء التراث العربى بيروت، ۱۳۹۳ھ، ۱: ۲۶۶)

ریاست کو یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مہاجرین کی آبادکاری کو جو اہم مسئلہ تھا، وہ حل ہوا اور امت مسلمہ کی وحدت اور یکجہتی کو فروغ ملا۔

تیسرا کام حضور ﷺ نے مدینہ منورہ کے داخلی استحکام کے لئے ایک دستاویز مرتب فرمائی جو کہ وہاں کے باشندوں کا دستور العمل قرار پایا اور میثاق مدینہ کے نام سے معروف ہوا جو ایک آئینی حکم نامے (Constitutional charter) کی سی حیثیت رکھتا تھا۔[۱]

مدینہ کی اسلامی ریاست میں نبی اکرم ﷺ انصار مدینہ، مہاجرین مکہ اور اہل کتاب و مشرکین مدینہ کے مابین قرار پانے والا معاہدہ، پہلا بین الاقوامی سیاسی معاہدہ اور دنیا کا اولین تحریری دستور ہے۔ عصر حاضر کی اسلامی ریاست کا داخلی نظم و نسق اور بیرونی دنیا سے تعلقات میں میثاق مدینہ کی حسب ذیل اہم دفعات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ۲۔ اطاعت امیر رعایا پر صرف شرعی امور میں لازم ہے۔

۳۔ اسلامی ریاست کے شہری خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، حقوق و فرائض میں مساوی ہیں۔

۴۔ غیر مسلموں کے ساتھ بہتر سیاسی و سماجی تعلقات قائم کئے جاسکتے ہیں۔

۵۔ ظلم و ناانصافی پر مبنی کوئی معاہدہ کرنا جائز نہیں ہے۔[۲]

۶۔ ریاست کا دفاع مسلم و غیر مسلم رعایا کا اجتماعی فریضہ ہے۔

۷۔ ریاست میں امن و امان کے قوانین کا نفاذ کیا جاسکتا ہے۔

ان نئے اقدامات کے ساتھ ساتھ رسول اکرم ﷺ نے ان سیاسی اداروں کو بھی برقرار رکھا جو عربوں میں پہلے سے رائج تھے اور عربوں کے باہمی معاشرتی اور سیاسی تعلقات میں بڑی اہمیت حامل تھے۔[۳]

ان دوستانہ تعلقات سے رفاع کو منظم اور مسلمانوں کو امن و سکون فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ آپ ﷺ نے مذکورہ امور کے لئے

۱۔ وكتب رسول الله ﷺ كتابا بين المهاجرين والانصار، وادع فيه يهود وعاهدهم، واقرهم على دينهم واموالهم، وشرط لهم، وشرط عليهم، (ابن هشام، ابومحمد، عبد الملك، دار الجيل، بيروت، (س ن) ۲/۱۰۶ ـ ۱۰۸)

۲۔ صیغہ عدل و قضا ایک اہم شعبہ تھا جس کی طرف آپ ﷺ نے میثاق مدینہ میں بار بار تاکید فرمائی اور آپ ﷺ کے انتظامات میں جو پہلا کام کیا گیا وہ عدل و قضا کا انتظام تھا۔

۳۔ عرفاء اور نقباء کے ذریعہ حکومت کا عام لوگوں سے تعلق برقرار رہتا تھا اور یہ نمائندے اپنے اپنے حلقہ کے لوگوں کے حالات و ضروریات سے حکومت کو باخبر رکھتے۔ محلے یا حلقے کی بنیاد پر عریف کا تقرر ہر قبیلہ میں دس دس افراد پر کیا جاتا تھا۔ جس طرح روما میں (Decunon) تو جب کہ نقیب ملکی در قومی سطح پر نمائندگی کرتا تھا (ہر سو کا سردار قائد یا نقیب کہلاتا تھا، جس کا مماثل روما میں (Centunon) ہو سکتا ہے۔
(تاريخ الرسل والملوك، ۴، ۱۸۷؛ لسان العرب به ذيل مادہ عرف، ۹، ۵۴؛ وايضاً ۱/۱۷۶۹؛ تاج العروس به ذيل مادہ نقب ۱/۴۴۹۲ وايضاً، ۶/۱۱۹۰؛ عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، ص ۷۱۔ ۷۲

نظارت۔ ابتدائی اسلامی سلطنت میں اضلاع کی تقسیم کا انتظام نہیں تھا بلکہ نظارت کا نظام رائج تھا جو چند عرافتوں پر مشتمل ہوتی تھی اس کا سربراہ ناظر کہلاتا تھا جو سرکاری افسر ہوتا تھا (یہ عہدہ موجودہ دور کے کمشنر کے عہدہ کے برابر ہوتا ہے) یہ بھی سرکاری امور کی انجام دہی کے سلسلے میں عوام کے ردعمل کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

والناظر: الحافظ ويقال للسلطان اذا بعث اميناً يستبرئ امر جماعة قرية بعث ناظراً۔ (لسان العرب به ذيل مادہ نظر)

عمالت کئی نظارتوں کو ملا کر ایک عمالت بنائی جاتی تھی۔ صوبے یا عمالت کے سربراہ کو عامل کہتے تھے اور موجودہ دور کے گورنر کی طرح عامل کا تقرر اسلامی حکومت کرتی تھی۔ (التراتيب الادارية ۱/۲۴۰، ۲۸۴)

وزراء اور انتظامی حلقے قائم کیے۔ مدینہ منورہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ اطراف کے لئے حکام کی تقرری کا انتظام کیا اور تقرر کا معیار یہ قرار پایا کہ جو اعلیٰ درجہ پر کام کی اہلیت رکھتا ہو اور حاکم رائے عامہ کے مطابق مفاد عامہ کے لئے کام کرے وہ اس کا اہل ہے۔[1]

آپ ﷺ کی حکمت عملی میں سب سے زیادہ اہمیت اشاعت اسلام پر دی گئی۔ شعبۂ تعلیم و تبلیغ کا ایک مربوط اور مسلسل انتظام تھا۔ اس کیلئے آپ ﷺ نے عبادہؓ بن صامت کو قرآن مجید اور احکام شریعت کی تعلیم پر مامور کیا اور سعید بن العاصؓ کا تقرر لکھنے پڑھنے کی تعلیم پر فرمایا۔[2] صیغۂ احتساب بھی اسی عہد میں قائم ہوا۔ یہ ایک ایسا اہم عدالتی ادارہ تھا جو اس کام کے لئے وقف تھا کہ عام سماجی اخلاق کا تحفظ، نگرانی اور دیکھ بھال کی ذمہ داریاں سرانجام دے۔[3]

معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی تربیت اور ایمان کی پختگی کے ذریعہ باہمی رضا کارانہ تعاون اور ہمدردی و احسان مندی کا خوگر بنانے کے ساتھ ساتھ معاشی خوشحالی کو کسی فرد یا جماعت تک محدود کرنے کی بجائے اجتماعی فلاح کے لئے تمام ضروری تدابیر اختیار کی گئیں۔ ان کو ایسے مؤثر انداز سے استعمال کیا گیا کہ کوئی فرد بھی اپنی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہا۔ حتیٰ کہ کسی فرد کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے، آپؐ نے فرمایا:

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہے"۔[4]

یہ معاشی انقلاب "مؤاخات" مدینہ کے نتیجے میں بپا ہوا۔ جس کے ذریعے تمام اہل ثروت انصار نے مہاجرین کو اپنے معاشی وسائل میں برابر شریک بنایا اور جلد ہی تجارت پر یہودیوں کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ اس طرح مؤاخاۃ کا عمل معاشی مسائل کو حل کرنے اور معاشی بنیادوں کو ازسرنو منظم کرنے میں بہت مفید اور مؤثر ثابت ہوا۔

آنحضرت ﷺ اسلامی مملکت کے سربراہ ہونے کے علاوہ عساکر اسلام کے سپہ سالار بھی تھے۔ آپ ﷺ نے بحیثیت سپہ سالار شعبہ حرب (دفاع) کی نت نئی صنعت گری کے استعمال سے دشمنوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔[5]

۱۔ تقریباً تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حیثیت وزیر اول کی سی تھی۔ ظاہر ہے آج کی طرح کی وزارتیں نہیں ہوتی تھیں کہ الگ الگ وزارت اور عملہ ہو۔ البتہ مختلف معاملات پر مشورہ لینے اور ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بعض صحابہ کرام متعین تھے۔
(السیرة النبویة ٤/٢٦٨، تاریخ الرسل والملوك، ٣٤٣/٢)

۲۔ صفہ ایک باقاعدہ درس گاہ تھی جہاں مقیم طلباء کے علاوہ عام شہری بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ (التراتیب الاداریة، ٤٠/١) حدثنا انس ان اولئك السبعين من الانصار قتلوا ببئر معونة، قرآنا كتابا، نحوه. (جامع صحيح للبخاري، كتاب المغازي، باب غزوة بئر معونة، رقم الحديث: ٤٠٩٠)

۳۔ الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة، ص ٢٣٧

۴۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء لا نكاح الا بولي، رقم الحديث ١١٠٢

۵۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں کچھ ہتھیار تو ذاتی ملکیت میں ہر فرد کے پاس ہوتے اور کچھ بڑے ہتھیار ریاست کی ملکیت میں ہوتے تھے اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے دو صحابیوں کو یمن سے منجنیق چلانے کا طریقہ سیکھنے اور خرید کرلانے کے لئے بھیجا۔ اس کی عام صورت یہ تھی کہ ایک بہت بڑا وزنی پتھر رسیوں اور بانسوں کے زور سے بہت قوت کے ساتھ قلعوں کی دیواریں توڑنے کے لئے دور سے پھینکا جاتا تھا تاکہ قلعہ بند دشمن کے قلعہ کی دیوار توڑ کر اندر داخل ہوا جائے۔ دوسرا اسلحہ دبابہ بھی یمن سے لایا گیا (آج کل عربی میں ٹینک کو دبابہ کہتے ہیں) لیکن اس زمانہ میں دبابہ سے مراد ایک ایسی سواری تھی جس کو لکڑی یا لوہے کی چھت کے ذریعے اوپر سے ڈھانپ دیا جاتا تھا اور اس پر کوئی ایسی چیز لگایا کرتے تھے جس پر تیر اثر انداز نہیں ہوسکتا تھا اس دور کے دبابہ کو آج کی بکتر بند گاڑی کا پیشرو کہہ سکتے ہیں۔ (السیرة النبویة ٤/٩٠، التراتیب الاداریة ١/٣٧٤، ٣٧٥)

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے سراغ رسانی کا شعبہ قائم کیا۔ اس کی دو شکلیں تھیں، ایک تو یہ جہاں بھی اسلام کے خلاف سازشیں ہو رہی ہوتیں۔ اس کے بارے میں معلومات اخذ کر کے اسلامی ریاست کو مطلع کی جاتیں۔

دوسرا بعض خاص مواقع پر خاص لوگ بھیجے جاتے تھے کہ وہ جا کر پتہ چلائیں کہ دشمن کیا کر رہا ہے؟ اور کیا سوچ رہا ہے؟ اس میں تین ذیلی شعبے تھے۔[1]

آپؐ کے عہد میں قیس بن سعدؓ اس خدمت کو سرانجام دیتے تھے۔[2]

مذکورہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے عبادات و معاملات اور حقوق اللہ و حقوق العباد کے تحفظ کے سلسلہ میں جس قدر ہدایات دی ہیں، خلفائے راشدین نے ان کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور امت کی نگہبانی انہی حدود و خطوط کے اندر فرمائی۔ اقامت اسلام کے علاوہ خلق خدا اور مفاد عامہ کے تمام احکام انہوں نے انجام دیے۔ بلاشبہ خلفاء راشدین نے دینی و دنیوی قومی و شخصی اور ملکی و سیاسی مقاصد و مصالح کی تکمیل و ترقی کے لئے اپنی وسیع ذمہ داریوں کو حتی الوسع ادا کیا۔

۱۔ تجسس: تحسس وہ ہے کہ کسی کے خلاف کوئی برائی سوچی ہو اور اس برائی کے لیے تجسس کی جائے اس کی ممانعت کی ہے۔ کسی مقصد یا ہدف کی خاطر مثبت چیز کا پتہ لگانا۔ ۳۔ تحسس جو کسی جرم کو روکنے کی خاطر اور کسی برائی کو وجود میں آنے سے پہلے پیش بندی کے لئے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کی ممانعت نہیں آئی ہے۔ (ابن قیم، شمس الدین، محمد، زاد المعاد فی هدی خیر العباد، مطبعة مؤسسة الرسالة، بیروت، ۱۹۷۹، ۱/۱۲۷)، (التراتیب الاداریة، ۱/۹۲، ۲۹۴)

۲۔ بمنزلة صاحب الشرط من الأمیر جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب قیس بن سعد بن عبادة، رقم الحدیث ۳۸۵۰

اسلامی ریاست کے جداگانہ مقاصد

اسلامی ریاست ایک صفاتی اور اصولی ریاست ہوتی اس کے قیام کا مقصد ان مقاصد کو بروئے کار لانا ہوتا ہے جو مقاصدِ دین اسلام بحیثیت ایک نظامِ زندگی، ریاست کے ادارے کے لئے مقرر کرتا ہے، اس طرح اسلامی ریاست ایک صفاتی ادارہ ہے، اگر وہ صفات اس ادارے میں موجود نہ ہوں اور وہ مقاصد جو ان صفات سے وابستہ ہیں بروئے کار نہ آئیں تو پورے ادارے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور پھر اس ادارے کو اسلامی ریاست نہیں کہہ سکتے۔

اس ضمن میں مولانا مودودی رقمطراز ہیں کہ:

''اسلامی ریاست کے قیام کا اصل مقصد، اس اصلاحی پروگرام کو مملکت کے تمام ذرائع سے عمل میں لانا ہے جو اسلام نے انسانیت کی بہتری کے لئے پیش کیا ہے۔ ... اس کی امتیازی خصوصیات جو اسے غیر مسلم ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ ان بھلائیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے جن سے اسلام انسانیت کو آراستہ کرنا چاہتا ہے اور ان برائیوں کو مٹانے اور دبانے میں ساری طاقت خرچ کر دے جن سے اسلام انسانیت کو پاک کرنا چاہتا ہے۔[1]

اسلامی ریاست اصول اور مقاصد کے اعتبار سے جداگانہ نوعیت کی علمبردار ہے۔ نئے حالات میں ان مقاصد کو ابھار کر پیش کرنا مناسب ہوگا جو ریاست کے وجود کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں

ابلاغ دین، قیام دین، دفاع دین، غلبۂ دین

ابلاغ دین ____ معنی و مفہوم

ابلاغ کا لفظ بلغ سے بنا ہے جس کے معنی پھیلانا اور پہنچانا کے ہیں۔ اسی مادہ سے لفظ تبلیغ ہے جو ابلاغ سے مترادف ہے۔[2] یہ لفظ بالخصوص دینی بات، اچھی بات، عمدہ نصیحت اور حق بات کی دعوت دوسرے تک پہنچانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

قرآن نے بلاغ کا لفظ ابلاغ کے معنی میں ہی استعمال کیا ہے

﴿فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْا أَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾[3]

اگر منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے پیغمبر کے ذمہ تو صرف پیغام کو پہنچا دینا ہے۔

ابلاغ کے اس مفہوم سے اسلامی ریاست میں ابلاغ دین کا کردار (کام) از خود متعین ہو جاتا ہے۔ ذریعہ اظہار تقریر و گفتگو یا محض اشارہ کنایہ اور آلۂ اظہار زبان ہو یا قلم وغیرہ ان سب کا مقصد خیر کو پھیلانا اور پہنچانا ہے اور ذرائع کی تبدیلی سے ان کا بنیادی مقصد بھی تبدیل نہ ہوگا۔

ابلاغ دین کے اساسی عوامل

ابلاغ دین تمام فقہائے اسلام کے نزدیک متفقہ اور مسلمہ فریضہ ہے۔ اس کا مقام تمام فرائض میں جنس اعلیٰ اور کلیۃ الکلیات ہے جو دوسرے تمام فرائض پر حاوی ہے۔ امت مسلمہ کی دنیوی و اُخروی سعادت، اسلام کی دعوت اور غلبہ و اقتدار کا انحصار ابلاغ دین پر ہے۔ حضور ﷺ کے مقصد رسالت یعنی اظہار دین کا حصول بھی اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ ابلاغ دین کا نفاذ دینی حکومت اور اقامتِ نظم دین کا ہی مرہون منت ہے۔ اس تناظر میں ابلاغ دین کے اساسی عوامل کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

1۔ اسلامی ریاست، ص ۲۱۲

2۔ لسان العرب، بہ ذیل مادۃ بلغ

3۔ المائدۃ ۵: ۹۲

(ا) بعثت انبیاء کا بنیادی فریضہ

صدق اور سچائی انبیاء کا اولین وصف ہے کیونکہ ان کی ساری باتیں، دعوے، دلائل اور احکام اگر سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیغمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے کیونکہ شریعت اور پیغمبرانہ جدوجہد کی عمارت اسی پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اسی صفت کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے معاشرے کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا کہ بندگی کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی عبادت کی جائے اور جسے انسان اپنا معبود اور حاکم سمجھے اگر انسان اللہ کی بندگی سے بغاوت کر دے تو دنیا و آخرت میں اسے تباہی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔

اس کار ابلاغ کے سلسلہ میں قرآن مجید نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [1]

اور ہم نے یقیناً ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو“۔

انبیاء کرام کا مطالبہ زندگی کے کسی ایک پہلو میں اصلاح کا نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمہ جہتی اصلاح چاہتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ انسان پوری طرح اللہ تعالیٰ کا غلام بن جائے۔ اپنے عقائد و نظریات، بندگی کے آداب، اخلاق و معاملات، تہذیب و معاشرت اور طرز حکومت و سیاست، غرض ہر کام میں اس کے احکام کے تابع ہو جائے۔ اس کوشش کا نام ابلاغ دین ہے۔ ابلاغ کے دو اہم پہلو ہیں ایک ایجابی یعنی امر بالمعروف اور دوسرا سلبی یعنی نہی عن المنکر۔

اس تناظر میں امام غزالی رحمہ اللہ انبیاء کی بعثت کا بنیادی مقصد ابلاغ دین بتاتے ہیں آپ کے خیال میں اگر اس فریضہ کی ادائیگی کوئی ریاست یا انسانی اجتماع چھوڑ دے تو انسان اور اس کے معاملات دین و دنیا برباد ہو جائیں گے۔

”ولو طوی بساطة وأهمل علمه وعمله لتعطلت النبوة و اضمحلت الديانة وعمت الفترة، وفشت الضلالة وشاعت الجهالة واستشرى الفساد، واتسع الخرق وخربت البلاد، وهلك العباد“ [2]

اگر اس کام کی بساط لپیٹ دی جائے اور اس کے علم اور عمل کو مہمل چھوڑ دیں تو نبوت بے کار اور دیانت مضمحل ہو جائے گی، سستی عام اور گمراہی تام ہو جائے گی۔ جہالت پھیلے گی اور فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا، جس سے معاشرہ تباہ اور انسان ہلاک ہو جائیں گے۔

گویا انسانی تعمیر و اصلاح کا یہ واحد راستہ ہے جس کے بغیر زندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بعثت رسل کی غرض و غایت ان الفاظ میں بتائی ہے

”فالأمر الذی بعث الله به رسوله هو الأمر بالمعروف، والنهی الذی بعثه به هو النهی عن المنكر“ [3]

۱۔ النحل ۱۶: ۳۶

۲۔ احیاء علوم الدین، ۲/ ۴۸۶

۳۔ الحسبة فی الاسلام، ص ۸

"وہ امر جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا، امر بالمعروف ہے اور جس نہی کی خاطر آپ کو بھیجا گیا، نہی عن المنکر ہے"۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کے نزدیک "اسلامی نظام سیاست دونوں دنیاؤں میں فائدہ اور نفع کے حصول کا ذریعہ ہے، انبیاء وخلفاء اپنی ذاتی اغراض ومقاصد کو حکمران نہیں بناتے ان کا نصب العین تو شریعت کا نفاذ ہوتا ہے تاکہ اللہ کی مخلوق کو دنیوی منافع بھی حاصل ہو اور آخرت کی سعادت اور کامیابی بھی نصیب ہو"۔ [1]

زیر بحث اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ فرق واضح ہوا کہ دو اصطلاحیں معروف ومنکر ہیں۔ معروف اپنے وسیع تر معنی میں ان تمام مکارم اخلاق پر مشتمل ہے، جن سے فرد اور جماعت کی زندگی سنورتی ہے اور فوز وفلاح کا موجب بنتی ہے۔ منکر سے مراد وہ رذائل ہیں جو فرد اور جماعت کی تباہی وبربادی کا سبب بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسلام نے معاشرتی زندگی کی تنظیم کیلئے ابلاغ دین کو ایک بنیادی فریضہ قرار دیا ہے، جو دعوت انبیاء کی اساس ہے۔ وہ اسے نہایت اہم اور مقدس فریضہ سمجھ کر بڑی عمدگی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔

ii۔ اسلامی ریاست کا بنیادی فریضہ

اسلامی ریاست کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ رعایا کو صحیح معنوں میں اسلام کے اصولوں اور احکامات کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کی آزادی اور مواقع مہیا کرے۔ ظاہر ہے ایسا کرنے کیلئے اختیار انہی لوگوں کو ملنا چاہیے جو خود ایماندار اور صالح کردار کے حامل ہوں تاکہ اس عظیم ذمہ داری کو نبھا سکیں۔ جس کی صراحت دائمی اور ناقابل تغیر دستور "قرآن حکیم" میں اس طرح کی گئی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ [2]

یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان کو زمین میں حکومت واقتدار دے دیا جائے تو یہ لوگ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے"۔

علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ویعنی بقوله (ان مکناهم فی الارض) ان وطنا لهم فی البلاد، فقهروا والمشرکین وغلبوهم علیها، وهم اصحاب رسول الله ﷺ .... اطاعوا الله فاقاموا الصلوٰة بحدودها (واتو الزکوٰة) یقول واعطو الزکوٰة اموالهم من جعلها الله له (وامروا بالمعروف) یقول. ودعو الناس الی توحید الله والعمل بطاعته وما یعرله أهل الایمان بالله (ونهو عن المنکر) یقول ونهوا عن الشرک بالله والعمل بمعاصیه، الذی ینکره أهل الحق والایمان بالله" [3]

"اگر ہم نے انہیں زمین میں اقتدار عطا کیا" یعنی اگر ہم نے انہیں شہروں میں بسا دیا اور انہوں نے مشرکین کا زور توڑ دیا اور ان پر غالب آگئے۔ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے اور نماز کو

۱۔ المقدمة ابن خلدون، ۲/۶۸۸

۲۔ الحج ۲۲: ۴۱

۳۔ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان عن تأویل آی القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۲۰۰۱ء، جز ۱۷، ۲۱۰

اپنے تمام حدود و آداب کے ساتھ قائم کریں گے۔ "زکوٰۃ دیں گے" یعنی یہ لوگ اللہ کے بتائے ہوئے مستحقین کو اپنے مالوں کی زکوٰۃ حوالہ کرتے رہیں گے"۔ "معروف کا حکم دیں گے" یعنی لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی اور ان اعمال کی دعوت دیں گے جو اہل ایمان کے درمیان مقبول ہیں "منکر سے منع کریں گے" یعنی اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے اور اس کی نافرمانی سے روکیں گے جسے اہل حق اور اہل ایمان ناپسند کرتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ کی رو سے جن مفسرین کے پیش نظر صرف الفاظ رہے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ اس میں اصلاً مہاجرین کے اوصاف بیان ہوئے ہیں اور جن اصحاب نے آیت کے مفہوم اور منشا کو سامنے رکھا ہے انہوں نے امت کے دیگر طبقات کو بلکہ پوری امت کو اس میں شامل سمجھا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد ضحاک کا قول بیان کیا ہے "جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ حکومت و سلطنت عطا فرمائے تو وہ اپنے اقتدار میں یہ کام سرانجام دیں جو خلفائے راشدین نے اپنے عہد میں کئے ہیں[1]

دور جدید کے مفسر علامہ احمد مصطفیٰ المراغی نے اس آیت کی تفسیر کے بعد اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"انهم هم الذين كملوا نفسهم باستحضار المعبود و التوجه اليه فى الصلوة على قدر الطاقة . ومنعوا المفاسد التى تعوق غيرهم عن الوصول الى الرقى الخلقى و الادب السامى"[2]

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نماز میں طاقت کی حد تک معبود کے استحضار اور اس کی طرف توجہ سے اپنے نفوس کی تکمیل کی ہو اور فقراء و حاجت مندوں کی مدد کر کے اپنی امتوں کے معاون ہوئے ہیں اور پھر انہوں نے اپنے علاوہ دوسروں کی بھی تکمیل کی ہو، اس طرح کہ ان میں علوم و آداب پھیلائے ہوں اور انہیں ان مفاسد سے منع کیا ہو جو اخلاقی بلندی اور اونچے ادب تک پہنچنے سے ان کو روکتے ہیں"۔

معلوم ہوا کہ تمکن فی الارض (اقتدار و حکومت) بذات خود مقصد نہیں بلکہ ایک بڑے مقصد کا ذریعہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اقتدار کو اللہ کی امانت تصور کرتے ہوئے عوام کی خدمت کرنا اور ان کی دنیاوی و اخروی فلاح کیلئے کام کرنا ہے۔ اسلامی ریاست صرف خارجی اور داخلی خطرات ہی سے عوام کو محفوظ نہیں رکھتی بلکہ وہ یہ کوشش بھی کرتی ہے کہ ان کی مادی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اخلاقی و روحانی ارتقاء بھی جاری رہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کے بقول امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نظام احتساب) اگرچہ اسلامی حکومت کا فرض ہے مگر مسلمان حکومت اس سے غفلت برتے تو اسلامی ریاست میں ہر مسلمان یہ کام کر سکتا ہے اور اسے ضرور ایسا کرنا چاہیے مگر اس وقت، جب تمام شرائط و آداب پورے ہوں۔ وہ اس کام کے پانچ مراتب کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ التعریف (بدی کا شعور) ۲۔ الوعظ بالکلام اللطیف (نرم الفاظ سے نصیحت) ۳۔ السب و التعنیف (برا بھلا کہنا) ۴۔ المنع بالقهر (زبردستی منع کرنا) ۵۔ التخویف و التهدید بالضرب (قوت کا استعمال)[3]

۱۔ قرطبی، ابو عبداللہ، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب المصریہ، قاہرہ، ۱۳۵۳ء، ۱۲/۷۳

۲۔ مراغی، احمد مصطفیٰ، تفسیر المراغی، مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، قاہرہ، ۱۹۵۳ء، ۱۷/۱۲۰

۳۔ احیاء علوم الدین، ۲/۵۰۰

ان کے خیال میں آداب اور اصول وضوابط کا استعمال حسب ضرورت اور حسب حال ترتیب کے ساتھ درجہ دار ہوگا۔

جب کہ شاہ ولی اللہ نے اسلامی ریاست کے حاکم کا بنیادی مقصد ان الفاظ میں نمایاں کیا ہے۔

"(أقول) لما كان الامام منصوبا لنوعين من المصالح الذين بهما انتظام الملة والمدن وانما بعث النبي ﷺ لأجلهما والامام نائبه"[1]

امامت کا قیام دو مقاصد کے لئے ہے اول دینی مصلحتوں کے لئے اور دوم ملت وتمدن کی تنظیم کے لئے، حضور اکرم ﷺ اسی غرض کے لئے مبعوث کئے گئے تھے اور امام آپ کی نیابت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک ایسے صاحب قوت وامارت خلیفہ کو امت مسلمہ کی ضرورت قرار دیا ہے جو تمام تر دینی واجبات کو بطریق احسن ادا کر سکے، مثلاً اجتماع میں نظم وضبط، خیر وصلاح، عدل وانصاف اور عبادات کی منظم ادائیگی اسی صورت میں ممکن ہے جب امت ایک امام کے تحت ریاست منظم کرے، اس لئے کہ یہ ابلاغ دین کا اہم حصہ ہے:

ولان الله تعالىٰ أوجب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر ولا يتم ذلك الا بقوة وامارة، وكذلك سائر ما أوجبه من الجهاد والعدل واقامة الحج والأعياد ونصر المظلوم واقامة الحدود لاتتم الا بالقوة والامارة"[2]

چونکہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب کیا ہے جو کہ قوت وامارت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا اور اسی طرح سارے واجبات جن میں جہاد، عدل، قیام حج اور عیدوں کا اہتمام، مظلوموں کی مدد، حدود اور تعزیرات کا نظام، یہ سب کچھ قوت وامارت کے بغیر ممکن نہیں۔

ابن خلدون رحمہ اللہ نے خلیفہ کے اوصاف پر زور دیا ہے "جس کا مقصد ایک اعلیٰ صفت مملکت کا قیام ہے"۔[3]

اہل علم کی جو تشریحات اوپر نقل کی گئی ہیں ان میں اسلامی ریاست کے بنیادی مقاصد اور فرائض کی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ اقتدار واختیار کی قوت جب مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے گی وہ چار بڑے مقاصد کیلئے استعمال ہوگی:

۱۔ اقامت صلوٰۃ کو معاشرہ میں تقویٰ پیدا کرنے کے لئے رائج کیا جائے۔
۲۔ زکوٰۃ کو معاشی ناہمواریاں دور کرنے کیلئے روبہ عمل میں لایا جائے۔
۳۔ ریاست کے جملہ افرادی، مادی وسائل اور تمام ذرائع کو نیکی پھیلانے کی جدوجہد میں لگا دینے کا اہتمام کیا جائے۔
۴۔ ہر ممکن ذریعہ سے اور اقتدار کی پوری قوت کے ساتھ برائی کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔

یہ چار مقاصد بھی درحقیقت ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لئے چار بنیادی ضروریات ہیں اور وہ مقصد ہے کہ ایک ایسے معاشرہ کا قیام جو روحانی اعتبار سے انتہائی بلند، معاشی لحاظ سے بہت عادلانہ، اخلاقی پہلوؤں سے نہایت اعلیٰ وارفع اور معاشرتی اعتبار سے انتہائی صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۲/ ۱۵۰
۲۔ السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، ص ۱۲۸
۳۔ المقدمہ ابن خلدون، ۲/ ۲۹۲

امت مسلمہ کا بنیادی فریضہ

ابلاغ دین درحقیقت ان اعمال کا مجموعہ ہے۔ جو تربیت وتنظیم اور تبلیغ پر مشتمل ہیں۔ یہ دونوں اعمال ایک فطری تربیت کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ پہلے پہل اللہ کے دین متین کی طرف افراد کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان افراد کی تنظیم اور تربیت کی جاتی ہے جو اس دعوت پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہوں۔ امت مسلمہ کو دعوت وتبلیغ اور تنظیم وتربیت دونوں ہی فریضے اپنے دائرے کے اندر اور باہر بھی سرانجام دینے ہیں۔ جو کام وہ اپنے دائرے کے اندر کرے گی اسے تنظیم وتربیت سے موسوم کیا جائے گا اور جو کام اپنے دائرے سے باہر انجام دے گی اسے ابلاغ دین کہیں گے۔ اس ضمن میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اگر امت اللہ کے دین کی اساس پر قائم ہے۔ خیر اور دعوت واصلاح کے لئے سرگرم عمل ہے اور اجتماعی نظام کو قرآن وسنت کے متعین کردہ اصول وقواعد پر استوار کئے ہوئے ہے، جس کے نتیجے میں تہذیب وثقافت اور اقتدار جنم لیتی ہیں تو وہ اپنی اہم اور بنیادی ذمہ داری سے کبھی بھی سبکدوش نہ ہو ورنہ ریاست کا سیاسی واجتماعی نظام ماند پڑ جائے گا۔

سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے فریضہ کو ان الفاظ میں صراحت فرمایا ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾[۱]

"تم میں سے ایک ایسی جماعت (ضرور) وجود میں آنی چاہیے کہ وہ افراد بھلائی کی طرف بلاتے ہوں، نیکی کا حکم دیتے ہوں اور برائی سے منع کرتے ہوں۔ یہی لوگ کامیابی پانے والے ہیں"۔

شہادت حق کی علمبردار اس امت مسلمہ کو خیر امہ کا خطاب عطا فرمایا گیا ہے۔ اس منصب کے ساتھ اس فرائض کو بھی بیان کردیا گیا ہے جن کی ادائیگی سے یہ امت بہترین امت قرار پائی۔ جو نیکیوں کو فروغ دے گی اور برائیوں کا قلع قمع کرے گی۔

امام رازی رحمہ اللہ اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"اعلم انه تعالى فى الايات المتقدمة عاب اهل الكتاب على شيئين احدهما انه عابهم على الكفر ... فلما انتقل منه الى مخاطبة المؤمنين امرهم او لا بالتقوى والايمان ... ولم امرهم بالسعى فى القاء الغير فى الايمان والطاعة"[۲]

اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں اہل کتاب کی دو باتوں پر مذمت کی ہے ان میں سے ایک تو اس نے ان کے کفر کی مذمت کی ہے۔۔۔ اس کے بعد اس بات پر ان کی مذمت کی ہے کہ وہ دوسروں کو کفر میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ پھر جب مسلمانوں سے خطاب کیا تو پہلے انہیں تقویٰ اور ایمان کا حکم دیا۔۔۔ اس کے بعد انہیں ہدایت کی کہ وہ دوسروں کو ایمان واطاعت کے دائرے میں لانے کی کوشش کریں۔

امت مسلمہ کو دعوت خیر پر مامور کرنے کا مطلب یہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کی بس تعریف کرتی رہے یا اس کی حقانیت پر کوئی کتاب لکھ دے۔ اس دعوت کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس کے لئے وقف نہ ہو جائے اور اپنی تمام توتیں دنیا میں اسے قائم کرنے کے لیے صرف نہ کردے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی ساری جدوجہد اسی مقصد کے لئے ہو۔

۱۔ آل عمران ۳: ۱۰۴

۲۔ رازی، فخر الدین، محمد عمر، مفاتیح الغیب، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء، ۲۱۴/۳

ایک دوسری آیت میں امت مسلمہ کا یہ ملی امتیاز اور دینی فریضہ زیادہ نمایاں طور پر بتلایا گیا ہے، ارشاد باری ہے کہ:

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ" [1]

"تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی ہدایت) کے لئے نکالا گیا ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

خیر امۃ اخرجت للناس کے بعد امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر کیا اور یہ اس لئے کہ پہلے وصف بیان کر کے پھر اس کی علت بیان کی جائے یعنی امت مسلمہ کا بہترین ہونا صرف اس وصف پر منحصر ہے کہ وہ خیر کی دعوت دیتی ہے اور شر سے روکتی ہے۔ اگر یہ وصف امتیازی اس سے جاتا رہے تو پھر وہ بہترین امت ہونے کے شرف سے محروم ہو جائے اور اس کا اصلی امتیاز بھی باقی نہ رہے۔

حضرت عمرؓ نے حج کے موقع پر مذکورہ بالا آیت پڑھی اور فرمایا:

"یاایها الناس من سره ان یکون من تلک الأمة فلیؤد شرط الله منها" [2]

اے لوگو! تم میں سے جو شخص اس "خیر امت" میں شامل ہونا چاہے تو اس کے لئے اللہ نے جو شرط رکھی ہے وہ پوری کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "خیر امت" بننے اور راہ راست پر قائم رہنے، کے لئے صرف ذاتی صفات مطلوب نہیں ہیں بلکہ اس کے لئے دوسروں کی ہدایت ورہنمائی کے اوصاف بھی ضروری ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ علماء کی طرح امت مسلمہ کو بھی اسی دعوت کا مصداق ٹھہراتے ہیں:

"اذا اکملت نفسک بعبادة الله فکمل غیرک فان شغل الانبیاء، وورثتهم من العلماء هو ان یکملوا فی انفسهم ویکملوا غیرهم" [3]

اللہ کی عبادت کے ذریعے جب تم اپنی ذات کی تکمیل کر چکو تو دوسروں کی بھی تکمیل کرو کیونکہ انبیاء اور ان کے وارث علماء کا یہ کام رہا ہے کہ وہ اپنی ذات کی بھی تکمیل کرتے ہیں اور دوسروں کی بھی۔

یہ کام اصلاً پیغمبرانہ کام ہے اور امت مسلمہ کو اسی میں پیغمبروں کی نیابت کرنی ہے اگر وہ اس کام کو چھوڑ دے تو اپنے صحیح مقام پر باقی نہیں رہ سکتی۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وقد اوجب الله علينا فعل المعروف وترک المنکر فان حب الشئی وفعله، وبغض ذلک وترکه لا یکون الا بعد العلم بهما، حتی یصح القصد الی فعل المعروف وترک المنکر" [4]

اور تحقیق اللہ نے ہم پر نیکی کا کرنا اور برائی کا چھوڑنا واجب کر دیا ہے۔ پس ان دونوں کے علم ہو جانے کے بعد اپنی پسند کی چیز یا کام کو اختیار نہیں کرنا چاہیے تاکہ نیکی کے کرنے اور برائی کے چھوڑنے کا ارادہ صحیح ہو جائے۔

ان مباحث کی روشنی میں مطلب یہ ہوا کہ یہ امت لوگوں کے لئے دنیا کی ہر قوم سے زیادہ نفع رساں ہے کیونکہ وہ ان کو صراط مستقیم پر لاتی ہے۔

۱۔ آل عمران ۳: ۱۱۰

۲۔ جامع البیان عن تأویل آی القرآن، جز ٤/٥٨

۳۔ مفاتیح الغیب للرازی، ۲/٥٧٨

٤۔ ابن تیمیه، تقی الدین، احمد، التفسیر الکبیر، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، الطبعة الاولی ١٩٨٨ء، ٥/٣٠٥

اللہ کے دین کی طرف دعوت دیتی ہے اور دائرہ اسلام میں داخل کرتی ہے۔ دعوت وتبلیغ کے عمل میں حائل رکاوٹوں کا حکمت وبصیرت سے سدباب کرتی ہے تاکہ حق کو سربلندی حاصل ہو اور باطل ملیامیٹ ہو۔

اسلامی ریاست میں امت مسلمہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ حکومت کے دست وبازو بن کر عوام الناس کی اخلاقی وروحانی، فکری ونظریاتی اور خیرو صلاح کا فریضہ سرانجام دے۔ ایک تو اس سے لوگوں میں دینی شعور بیدار ہوگا دوسرا اس سے نسلی، لسانی، گروہی اور علاقائی فرقہ وارانہ تعصبات ماند پڑ جائیں گے۔

قیام دین:

صحاح میں یہ لفظ قَامَ یَقُوْمُ سے مصدر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "امۃ قائمۃ"[1] یہ امت اپنے دین پر قائم رہے گی۔ یعنی وہ اس پر مواظبت (دوام) اختیار کرے گی اور اسی پر قائم رہے گی۔

فراء نے کہا ہے کہ قائم کا لفظ اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو اپنے دین کو مضبوطی سے تھام لے۔ قیام کا اصل معنی دین کی حفاظت اور اصلاح کرنا ہے۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ کے نزدیک "اقامت دین" سے مراد قائم رہنا، شک وشبہ میں نہ پڑنا اور نہ ہی اسے کسی حال میں چھوڑنا ہے"۔

أی اجعلوه قائما، یرید دائما مستمرا محفوظا مستقرا من غیر خلاف فیه ولا اضطراب"[3]

مولانا مودودی نے اقامت کے معنی "قائم کرنا" اور قائم رکھنا کے بیان کئے ہیں اور انبیاء علیہ السلام ان دونوں ہی کاموں پر مامور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم کریں اور جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو، وہاں اسے قائم رکھیں۔ ظاہر بات ہے کہ قائم رکھنے کی نوبت آتی ہی اس وقت ہے جب ایک چیز قائم ہو چکی ہو ورنہ پہلے اسے قائم کرنا ہوگا، پھر یہ کوشش مسلسل جاری رکھی جائے گی کہ وہ قائم رہے۔[4]

قرآن کریم کی آیت مبارکہ سے اقامت کا مفہوم مزید واضح ہوتا ہے کہ رسولوں کے بھیجنے اور ان کے ساتھ ہدایت نامہ نازل کرنے کا مقصد یہ رہا ہے کہ لوگ دین پر قائم رہیں:

﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ﴾[5]

"اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوح علیہ السلام کو دیا تھا اور جسے (اے محمد ﷺ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو، اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے

۱۔ آل عمران ۳: ۱۱۳
۲۔ تاج العروس من جواهر القاموس به ذیل ماده قوم
۳۔ الجامع لاحکام القرآن للسیوطی، جز ۱۶/۱۱
۴۔ تفہیم القرآن،۴/ ۸۷، ۸۸
۵۔ الشوریٰ ۴۲: ۱۳

جس کی طرف اے محمد ﷺ تم انہیں دعوت دے رہے ہو اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے، اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔

آیت مبارکہ کے اس جملہ میں جس دین کی اقامت کا حکم اور اس میں تفرق کی ممانعت مذکور ہے وہ وہی احکام الٰہیہ ہیں جو سب انبیاء کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں۔ انہیں میں تفرقہ و اختلاف حرام اور موجب ہلاکت امم ہے۔[1]

امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس مقام پر جس اختلاف سے منع کیا گیا ہے، وہ اصول کا اختلاف ہے (اگر دین کے کسی اصول میں اختلاف کرے تو گمراہ ہو جائے گا) کیونکہ فروعات میں اختلافات کرنا مباح ہے۔ فروعی اختلافات کے ذریعے انسان کی عبادت درست ہوتی ہے۔ مختلف حالات میں احکام مختلف ہوتے ہیں۔[2]

قیام دین اور اس کے لوازمات

قیام دین کا پہلا خصوصی لازمہ اتحاد و اتفاق اور اخوت کا جذبہ ہے کیونکہ جس امت میں اختلاف و انتشار ہو، وہ اللہ کی زمین پر اقتدار کی مستحق نہیں رہتی اور اس پر محکومیت مسلط ہو جاتی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ کے نزدیک قیام دین میں یہ بات شامل ہے کہ امت کے اندر اتحاد پیدا کرنے اور اسے اختلاف و انتشار سے بچانے کی کوشش کی جائے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"ولا تحصل هذه القدرة الا اذا حصلت الالفة والمحبة بين أهل الحق والدين، لا جرم حذرهم تعالىٰ من الفرقة والاختلاف لكي لا يصير ذلك سببا لعجزهم القيام بهذا التكليف "[3]

اور یہ قدرت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ حق پرستوں اور اہل دین کے مابین الفت و محبت ہو اس لئے اللہ نے انکو اختلاف اور پھوٹ کے خلاف متنبہ کر دیا، تاکہ اس کی وجہ سے وہ قیام دین کے فرض کی انجام دہی سے عاجز نہ رہ جائیں۔

دوسرا لازمہ اسلامی ریاست کے سربراہ پر قیام دین صرف واجب ہی نہیں ہے بلکہ فرض عین ہے۔ توجیہ یہ ہے کہ اس کے پاس غیر معمولی طاقت ہوتی ہے اور طاقت ہی کے بل بوتے پر قیام دین کا فریضہ سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"السلطان أقدر من غيرهم وعليهم من الوجوب ما ليس على غيرهم، فان مناط الوجوب هو القدرة، فيجب على كل انسان بحسب قدرته"[4]

اصحاب اقتدار (اقامت دین کی) دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طاقت رکھتے ہیں، اس لئے وہ ان پر جس حد تک واجب ہے دوسروں پر نہیں ہے۔ کیونکہ وجوب کی بنیاد قدرت ہے۔ اس لئے ہر انسان پر وہ اس کی قدرت کے لحاظ سے واجب ہوتا ہے۔

۱۔ شفیع، محمد، مفتی، معارف القرآن، طبع ادارۃ المعارف، کراچی ۱۹۹۵ء، ۷/ ۶۷۸

۲۔ جصاص، ابوبکر، احمد بن علی، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۸۵ء، ۲/ ۳۱٤

۳۔ مفاتیح الغیب، ۳/ ۳۱۲

٤۔ الحسبة في الاسلام، ص ۸

اسلامی ریاست کی غرض وغایت قیام دین ہے۔اس لئے اس کے حاکم کی یہ اہم ذمہ داری ہے کہ ریاست میں شریعت اسلامیہ کو قائم کرے،اور باطل قانون کو مٹائے کیونکہ اگر وہ اس کام کو چھوڑ دے تو ریاست بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

قیام دین کا تیسرا لازمہ یہ ہے کہ قرآن نے امت کو بھی اس ذمہ داری کا اہل قرار دیا ہے کہ وہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے عملاً اٹھ کھڑی ہو

﴿لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾[1]

''سب ایک جیسے نہیں ہیں،اہل کتاب میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے،یہ لوگ رات کے اوقات میں اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں،اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں،معروف کا حکم دیتے ہیں،منکر کو روکتے ہیں اور بھلائیوں کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں یہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں''۔

یہ وہ اہل کتاب تھے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و میثاق پر قائم رہے۔ان کے دلوں میں حق و صداقت کی تڑپ تھی۔انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو اپنایا اور لوگوں تک حق بات پہنچانے کی مقدور بھر کوشش کی پھر جب رسول اللہ کی بعثت ہوئی تو آپ ﷺ کے ساتھ شریک کار بن کر دین اسلام کی اشاعت اور قیام حق کو فروغ دینے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ظاہر ہے امت کے پہلے لوگوں کی یہ تعریف بلاوجہ نہیں تھی بلکہ اس لئے وہ تعریف کے مستحق قرار پائے کہ انہوں نے دین کی راہ میں بڑی قربانیاں دیں اور لوگوں کی اصلاح و تربیت سے بھی غافل نہیں رہے۔اگر یہ خوبیاں بعد کے کسی دور میں پائی جائیں تو بلاشبہ وہ بھی قابل تعریف ہوگا۔علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

"وان اواخر هذه الأمة اذا اقاموا الدين وتمسكوا به وصبروا على طاعة ربهم في حين ظهور الشر والفسق الهرج المعاصي والكبائر كانوا عند ذلك ايضا غرباء وزكت اعمالهم في ذلك الوقت كما زكت اعمال أوائلهم"[2]

اس امت کے پچھلے لوگ بھی اس وقت جب کہ برائی،فسق و فجور،فتنہ،معاصی اور کبائر کا ظہور ہو چکا ہو،اگر دین کو قائم رکھیں گے اور اسے مضبوطی سے پکڑے رہیں گے اور اللہ کی بندگی پر جمے رہیں گے تو وہ بھی اپنے ماحول میں اجنبی بن جائیں گے اور ان کے اعمال بھی اسی طرح اونچے اور صاف ستھرے ہو جائیں گے جس طرح ان سے پہلوں کے اعمال اونچے اور صاف ستھرے ہوئے تھے۔

حدیث مبارکہ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے:

"لا تزال طائفة من امتي قائمة بامر الله يضرهم من خذلهم او خالفهم حتى ياتي امر الله وهم ظاهرون على الناس"[3]

میری امت میں ایک ایسی جماعت برابر موجود رہے گی جو اللہ کے دین کی ذمہ داریاں اٹھانے والی ہوگی جو اس کو چھوڑ

۱۔　آل عمران ۳: ۱۱۳، ۱۱۴

۲۔　الجامع لاحکام القرآن، ۴/۱۷۶

۳۔　جامع صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب قوله لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خالفهم، رقم الحدیث: ۴۹۵۰

دے گا یا اس کی مخالفت کرے گا وہ اس کو نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی اور حال یہ ہوگا کہ یہ جماعت لوگوں پر غالب ہوگی۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جس جماعت کا ذکر ہوا ہے وہ اہل علم کی جماعت ہے: "وھم اھل العلم" [۱]

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کو زیادہ وسیع تر معنی میں بیان کیا ہے:

"ویحتمل ان تکون ھذہ الطائفة مؤلفة من انواع المؤمنین منھم شجعان ومنھم فقھاء ومنھم محدثون وغیر ذلک من انواع اھل الخیر" [۲]

"ممکن ہے کہ یہ جماعت اہل ایمان کے مختلف طبقات کے درمیان منقسم ہو۔ جن میں راہ خدا میں لڑنے والے بہادر، فقہاء، محدثین، زہاد و متقی، معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے اور ان کے علاوہ دوسرے بھلائیوں کے کرنے والے بھی ہوں"۔

اقامت دین کے فریضہ میں ہر مسلمان کی شرعی ذمہ داری ہے کہ ریاست میں احکام دین کے نفاذ کے لئے کوشش کرے۔ تاکہ وہ بھلائیاں فروغ پا سکیں جنہیں اللہ کا دین فروغ دینا چاہتا ہے اور وہ برائیاں دبیں جنہیں اللہ کا دین دبانا چاہتا ہے یہی ایک مقصد ہے جس کے لئے مملکت تشکیل دی جاتی ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قال العلماء: الأمر بالمعروف بالید علی الأمراء وباللسان علی العلماء، وبالقلب علی الضعفاء، یعنی عوام الناس" [۳]

"علماء نے کہا ہے کہ امر بالمعروف کا فرض قوت کے ذریعہ حکام کی، زبان کے ذریعہ علماء کی اور دل کے ذریعہ انجام دینا کمزوروں یعنی عوام کی ذمہ داری ہے"۔

اس عبارت میں جو اصولی بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سیاسی طاقت واقتدار کے بغیر احکام الٰہی کا اجراء، ان کی تنفیذ اور تبلیغ و اشاعت کا فریضہ ناممکن ہے۔ اس لئے ریاست کا فرض بنتا ہے کہ قوت کے ذریعہ نیکی کو پھیلائے اور برائی کو مٹائے۔

قیام دین کا چوتھا لازمہ یہ ہے کہ جو افراد دین کا علم رکھتے ہیں اور اس کی اشاعت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں تو ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ عوام الناس میں دینی شعور کو ابھاریں اور منکرات کی خرابیاں واضح کریں۔ رہے وہ افراد جو یہ کام نہیں کر سکتے تو ان کی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ نیکی سے محبت کریں اور برائی سے خوش نہ ہوں بلکہ دل سے اس کو برا جانیں۔

آپ ﷺ کی قائم کردہ ریاست کا اصل کام یہی تھا کہ دین کے پورے نظام کو قائم کرے [۴] اور اس کے اندر کوئی ایسی آمیزش نہ

۱۔ جامع صحیح للبخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی لا تزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق یقاتلون، رقم الحدیث ۷۳۱۱

۲۔ نووی، محی الدین، ابو زکریا، یحیی، شرح صحیح مسلم، مطبعة السعادة بجوار محافظة، مصر، ۱۳۲۸ھ، ۵، ۲۶۵

۳۔ الجامع لاحکام القرآن، ۴/۴۹

۴۔ ویکون الدین کلہ للہ (الانفال ۸: ۳۹) دین پورا کا پورا صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔ (یعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء) (البینة ۹۸: ۵) وہ یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اسی کیلئے خالص کرتے ہوئے۔

ہونے دے جو مسلم معاشرے میں دورنگی پیدا کرنے کا سبب بنے۔

اس آخری نکتہ کے بارے میں نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو سختی سے متنبہ فرمایا

"من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد"[۱]

"جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالے جو اس کی جنس سے نہ ہو اس کی بات مردود ہے"۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست کے حکمران کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے، دراصل یہ مطلب رکھتا ہے کہ وہ اپنے حدود واقتدار میں اللہ کی شریعت کو بے کم وکاست نافذ کرے اور پورے نظام سلطنت کو اللہ کے قانون کے تابع کرے اسی عمل کا نام ہی قیام دین ہے۔

دفاع دین ــــــ معنی ومفہوم

دفاع دفع یدفع سے مصدر ہے جس کے معنی قوت اور طاقت کو زائل کرنے اور ہٹانے کے ہیں جیسے:

"وتدافع القوم ای دفع بعضھم بعضا"[۲]

احکام السلطانیہ کے پہلے باب کے ابتدائی الفاظ یہی ہیں کہ:

"الامامۃ موضوعۃ لخلافۃ النبوۃ فی حراسۃ الدین وسیاسۃ الدنیا وعقدھا لمن یقوم بھا فی الامۃ واجب بالاجماع"[۳]

آپ کے اس قول سے مندرجہ ذیل اصول نمایاں ہوتے ہیں۔

i۔ امامت نبی کریم ﷺ کی جانشینی ہے۔

ii۔ اس کا قیام دین کی حفاظت اور دفاع ہے۔

iii۔ دنیاوی معاملات کے انتظام کے لئے ہوتا ہے۔

iv۔ امت کے رہنما اس پر متفق ہیں کہ اس کا قیام لازمی ولابدی چیز ہے۔

"طوسی کے خیال میں شرعی احکام کی عملداری اور قیام عدل، سربراہ حکومت کے لازمی اور مقدم فرائض ہیں"[۴]

علامہ ابن خلدون خلیفہ کے فرائض میں تین چیزوں کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اول 'حمایت دین'، دوم 'اقامت حدود'، سوم 'تدبیر مصالح' اس کے علاوہ کفایت (انتظامی صلاحیت) کی شرط ضروری قرار دیتے ہیں۔ کفایت وصلاحیت یہ ہے کہ امام حدود شرعیہ جاری کرنے پر جرأت والا ہو اور برائیوں کو بے دھڑک اپنی بے مثال شجاعت سے ختم کردے۔

۱۔ جامع صحیح مسلم، کتاب الأقضیۃ، باب نقض الاحکام الباطلۃ ورد محدثات الامور، رقم الحدیث ۴۴۹۲

۲۔ تاج العروس، بہ ذیل مادہ دفع

۳۔ الاحکام السلطانیہ، ص ۳

۴۔ طوسی، نظام الملک، ابو علی حسن، سیاست نامہ (سیر الملوک) (Ernest Leroux Textepersan) پیرس، ۱۸۹۱ء، ص ۵
یہ کتاب عالم اسلام کے پہلے آئین ساز وزیر، معظم نظام الملک کی مایہ ناز تصنیف ہے نظام الملک طوسی صرف ایک وزیر اعظم ہی نہیں تھا بلکہ ایک بلند پایہ مفکر، یک عدیم النظیر فلسفی، ایک فقیہ، لاثانی محسن اور بالغ النظر سیاست داں بھی تھا جس کی صدیوں پہلے لکھی ہوئی یہ بلند پایہ تصنیف آج بھی مشرق سے لے کر مغرب تک سیاست دانوں کے لئے رہنمائی کا موجب ہے یہ کتاب جہاں بانی وجہاں بینی کا نادر مرقع ہے۔

"واما الكفاية فهو أن يكون جريئا على اقامة الحدود واقتحام الحروب بصيرا بها، كفيلا بحمل الناس عليها ... قويا على معاناة السياسة، ليصح له بذلك ما جعل اليه من حماية الدين، وجهاد العدو، واقامة الأحكام و تدبير المصالح" [۱]

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد لوگوں کا ایمان اور توحید کا راستہ بتانا اور ان کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کرنا ہے۔ اس کے علاوہ رسومات باطلہ کو مٹانا اور رفع تظالم بین الناس یعنی لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو فرو کرنا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جہاد و دفاع لازمی ہے" [۲]

ڈاکٹر محمود احمد غازی دفاع دین کے سلسلہ میں سربراہ ریاست کی اولین ذمہ داری متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The state should advance the moral ideals and values and curb the moral evils and vices in pursuance of Quranic injunctions..... the state is under an obligation to take legislative and administrative steps to ensure the implementation of the precepts of Islam in this regard". (3)

ریاست کو چاہیے کہ اخلاقی تصورات اور اقدار کو بڑھائے اور اخلاقی برائیوں اور خرابیوں کو قرآنی احکامات کے مطابق کالعدم قرار دے۔۔۔۔ ریاست کا یہ بھی فرض ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی احکامات کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے قانونی اور انتظامی اقدامات کرے۔

دفاع دین کے حصول کے لئے اصول وضوابط:

اسلام ایک کامل دین ہے اور آنحضرت ﷺ نے امت کو ہر ایک طرح کی نیکی اور برائی کے بارے میں تفصیلات بتادی ہیں تو اس صورت میں سیاسی فرائض کا دائرہ سمٹ کر اس نکتے پر مرکوز ہو جاتا ہے کہ حاکم خیر کے اس نظام پر خود بھی عمل پیرا ہو اور معاشرے کو بھی اس پر لائے۔

اس سلسلے میں علامہ ابن القیم رحمہ اللہ قمطراز ہیں:

"لا سياسة الا ما وافق الشرع، فقال ابن عقيل: السياسة ما كان من الأفعال بحيث يكون الناس معه أقرب الى الصلاح وأبعد عن الفساد" [۴]

۱۔ المقدمة ابن خلدون، ج۲/۶۹۲

۲۔ حجة الله البالغة، ۲/۱۷۴

(3) Ghazi, Mahmood Ahmed, state and Legislation in Islam, Published by Shariah Academy International Islamic University, Islamabad, 1st Edition 2006, P-34,35

۴۔ ابن القيم، الجوزيه، شمس الدين، محمد بن أبي بكر، اعلام الموقعين عن رب العالمين، دار احياء التراث العربي، بيروت، لبنان، ۴/۴۶۰، ۴۶۱

سیاست وہی ہے جو شرع میں ہو، ابن عقیل نے فرمایا سیاست افعال میں ہوتی ہے، اسی سے لوگ صلاحیت حاصل کرتے ہیں اور فساد سے رکتے ہیں۔ جو حاکم تجربے اور دانائی کا، ملک نہ ہو وہ تو لوگوں کو نہ صلاحیت پر لا سکتا ہے نہ بندگانِ الٰہی میں سے فساد دور کر سکتا ہے۔

اسلامی ریاست کی دینی اعتبار سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ شرعی اصول وقوانین اور احکام وحدود کا دفاع کر کے اسے نفاذ عمل میں لائے تا کہ لوگ کتاب وسنت کے احکامات سے آگاہی حاصل کریں جیسے حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا تھا:

''اللہ کی قسم! میں اپنے افسروں کو تمہارے پاس اس لئے نہیں بھیجتا کہ تمہارے منہ پر تھپڑ ماریں اور تمہارے اموال چھین لیں میں انہیں تمہارے پاس اس لئے بھیجتا ہوں کہ وہ تمہارا دین اور تمہارے نبی ﷺ کی سنت سکھائیں۔ جس کسی کے ساتھ دین وسنت سے ہٹ کر سلوک کیا جائے، اسے چاہیے کہ اپنا معاملہ میرے سامنے پیش کرے، اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں متعلقہ افسر سے اس کا بدلہ لے کر رہوں گا''[۱]

اب رہا یہ مسئلہ کہ مملکت اور معاشرے میں اس اصول کو کس طرح بروئے کار لایا جائے تو اس ضمن میں الفارابی لکھتے ہیں:

''المدینة الفاضلة فهى التى يتعاون اهلها على بلوغ افضل الاشياء التى بها يكون وجود الانسان الحقيقى و قوامه وعيشه وحفظ حياته''[۲]

مثالی شہر وہ ہے جس کے باشندے ان بہترین اشیاء تک پہنچنے کے لئے جن کے ذریعے انسان کا وجود حقیقی، اس کا قیام وبقا، اس کی گزر اوقات اور اس کی زندگی کی حفاظت ہوتی ہے، باہم تعاون کرتے ہیں۔

الفارابی کے نزدیک اچھائیاں اور برائیاں نفس کی مختلف کیفیتوں سے عبارت ہیں اور ریاست کے اہل اقتدار کا فرض ہے کہ دین کے دفاع کے لئے نفوس کی اصلاح کرتے رہیں۔

اشاعت دین، دفاع دین کی اہم قسم ہے جسے قرآن نے ''جَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا''[۳] کہا ہے کہ ان کے ساتھ بڑا جہاد کریں اور وہ جہاد نیکی کو پھیلانا اور برائی کو روکنا ہے۔

اسلامی ریاست کی ہیئت حاکمہ میں سربراہ مملکت کی ذات اہم ترین ہوتی ہے اگرچہ یہ ذات قوت کا سرچشمہ نہیں ہوتی کیونکہ اصل قوت کا سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے مگر اسے قوت نافذہ کے مرکز کی حیثیت ضرور حاصل ہوتی ہے۔

مذکورہ اساسی اصول کے علاوہ کئی دوسرے اصول ایسے ہیں کہ اسلامی ریاست کے دینی دفاع میں ان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، اگر غور کریں تو دیگر اصول انہی اساسی اصولوں میں مضمر ہیں۔ مختصر طور پر درج ذیل ہیں

اسلامی ریاست کے مصادر تشریع کا تحفظ

ہر ریاست کے لئے دستور اساسی کا موجود ہونا لازمی ہوتا ہے جسے بنیادی قانون، آخری سند اور اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہو۔ اس بارے میں قرآن رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ اسلامی ریاست کا دستور اساسی جن بنیادی اصولوں پر قائم ہو گا وہ یہ ہے:

۱۔ ھیکل، محمد حسین، الفاروق عمر، مطبعة مصر شركة مساهمة، القاهرة، ۱۳۶۴ھ، ۲/۲۱۶

۲۔ آراء اهل المدینة الفاضلة، ص ۹۷

۳۔ الفرقان ۲۵: ۵۲

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾[1]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت مبارکہ کے مطابق مصادر تشریع کی ترتیب حسب ذیل ہے:

ا۔ قرآن مجید   ب۔ سنت مجید

ج۔ اولوالامر کا اتفاق بالاجماع یہ لوگ مسلمانوں کے ارباب حل وعقد ہیں۔

د۔ قیاس: اولوالامر میں تنازع کی صورت میں

اولوالامر اہل تفقہ و تحقیق و بصیرت سے ایک جماعت کو اس مقصد یعنی اجتہاد کے لئے پسند کریں گے اور یہ قیاس صرف تعامل کے قوانین (معاملات) میں ہوگا۔ ہر مسلمان اپنے پسندیدہ ائمہ مجتہدین، اسلاف کی پیروی میں آزاد ہوگا۔

اساسی ماخذ کی حیثیت تو قرآن وحدیث رکھتے ہیں مگر جن امور میں قرآن وحدیث ساکت ہوں تو اجتہاد کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ حضور ﷺ کی حکمت عملی میں سب سے زیادہ اہمیت دفاع دین کو حاصل تھی۔ اس کے لئے آپ ﷺ ہر وقت جانی و مالی قربانی کے لئے تیار رہتے تھے۔ علامہ عبدالحیٰ کتانی لکھتے ہیں:

"عہد نبوی ﷺ کے اختتام پر اسلامی ریاست خاصی وسعت اختیار کر گئی تھی، اور حضور اکرم ﷺ نے دینی تعلیم کی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اچھا انتظام کر لیا تھا۔ بعض بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیجے جاتے تھے اور کچھ صوبہ دار گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے تحت علاقوں کی دینی اور تعلیمی ضرورتوں کا مناسب انتظام کریں۔"[2]

حضرت ابو بکر صدیقؓ جب خلافت پر متمکن ہوتے ہیں تو مصادر شرعیہ کی تصریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"اگر میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق حکم دوں تو میری اطاعت کرنا اگر میں اس سے ہٹ جاؤں تو میری اصلاح کر دینا"[3]

ابن جوزی نے حضرت عمرؓ کا جو خطبہ نقل کیا ہے وہ انہوں نے گورنروں کو دفاع دین کے سلسلہ میں ان الفاظ میں دیا:

"اپنے فرائض انجام دو، یہ تم کو جنت الفردوس دلوائیں گے، طریق نبوی ﷺ پر قائم رہو، نئے فتنوں سے محفوظ رہو گے۔ سیکھو، جانو اور حاصل کرو اس لئے کہ بے خبری میں بے چارگی ہے۔ دین میں نئی نئی بدعتیں بے حد مکروہ ہیں، طریق نبوی ﷺ پر معتدلانہ عمل اس اجتہاد سے بہتر ہے جو گمراہی ثابت ہو"[4]

۱۔ النساء ٤ : ٥٨

۲۔ الترتیب الاداریۃ، ١/ ٦٥٨

۳۔ کتاب الاموال، ص ۱۲

٤۔ ابن جوزی، عبد الرحمن سیرت عمرؓ، مکتبہ الاسلامی، بیروت، ١٩٩٤ء، ص ١٣١

امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حدیث کی رو سے عوام الناس کی خیر خواہی چاہنا دینی امور میں سے ہے۔

"واما نصيحة عامة المسلمين وهم من عدا ولاة الأمر فارشادهم لمصالحهم فى آخرتهم ودنياهم و كف الأذى عنهم فيعلمهم ما يجهلونه من دينهم ويعينهم عليه بالقول والفعل"[1]

جہاں تک حکمرانوں کے علاوہ عام مسلمانوں کے ساتھ نصح وخیر خواہی کا سوال ہے تو اس میں یہ سبھی باتیں شامل ہیں۔ ان کی دنیا و آخرت کی مصلحتوں کی طرف ان کو متوجہ کرنا اور ان کو کسی طرح کی تکلیف پہنچانے سے باز رہنا، چنانچہ آدمی کو چاہیے کہ دین کی جو بات وہ نہ جانتے ہوں اور ان کو بتائے اور دین پر عمل کرنے کیلئے ان کو زبان اور عمل دونوں سے مدد پہنچائے"۔

اسلامی ریاست کے سربراہ مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ مصادر اسلامی کے تحفظ کو بروئے کار لاتے ہوئے عوام الناس کی تربیت پر خصوصی توجہ دے اور بعض ایسے دینی امور جن کے بارے میں فہم وادراک نہ رکھتا ہو تو اہل علم سے مشورہ کرے جو اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل ہوں اور اسلامی نظریے کا گہرا شعور رکھتے ہوں۔ اس سے ریاست کی نظریاتی و فکری سالمیت کا دفاع، عوام الناس کی شریعت سے کامل وابستگی اور اعلیٰ سطح پر اسلامی نظریے کی ترویج ہوگی۔

اسلامی عبادات میں روح کی بیداری

اسلامی ریاست میں عبادات کی اصل روح کو اجاگر کرنا حاکم کے فرائض میں ہے۔ اس ضمن میں مفکر بیورے لکھتے ہیں

"اس (ریاست) کا کام افراد کو ایک ایسا ماحول فراہم کرنا ہے، جس کے تحت وہ اپنے اللہ سے مستقل تعلق قائم کر سکیں"۔[2]

اس کا سب سے اہم ذریعہ وہ فرائض ہیں جو اللہ نے مقرر کیے ہیں۔ ایک بامقصد اسلامی اور نظریاتی مملکت کے کارندے کی حیثیت سے انتظامیہ کے ساتھ وابستہ لوگ آئینی اور اخلاقی طور پر پابند ہیں کہ خود بھی فرائض پر عمل کرتے ہوئے نظام کا دفاع کریں اور رعایا میں بھی ان فرائض کی ادائیگی کو یقینی بنائیں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے حکمران اور عوام دونوں کے حقوق وفرائض کی جامع نشان دہی کرتے ہوئے اقامت صلوٰۃ کو اولین فریضہ قرار دیا ہے،

فرائض کے اہتمام میں سب سے اہم چیز نماز ہے۔ حدیث مبارکہ میں حکمرانوں کو خاص طور پر اس کی تاکید کی گئی ہے:

"ان عمر بن الخطاب كتب الى عماله ان اهم امركم عندى الصلوٰة فمن حفظها و حافظ عليها، حفظ دينه و من ضيعها فهو لما سواها اضيع"[3]

۱۔ الدين النصيحة قلنا لمن؟ قال لله ولكتابه ولرسوله ولائمة المسلمين وعامتهم، جامع صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان أن الدين النصيحة، رقم الحديث ۹۵

(2) Al-Buraey, A. Muhammad, Administrative Development An Islamic Perspective, Publisher KPI Limited14 leicester square, London, P 302

۳۔ الموطاء، كتاب و قوت الصلوٰة، باب وقوت الصلوٰة، رقم الحديث ۷۰۶

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ "اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ"[1] کے تحت لکھتے ہیں "نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں گے" اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سارے ارکان اسلام کو قائم کریں گے" اس میں کفار کے ساتھ جہاد کرنا اوران سے جزیہ لینا بھی داخل ہے۔

"واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ اشارہ است باقامت ارکان اسلام وامروا بالمعروف شامل است احیاء علوم دین وانہوا عن المنکر شامل استجہاد کفار واخذ جزیہ را"[2]

عہد خلفائے راشدین میں اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے لئے باقاعدہ طور پر نظام رائج تھا۔ عہد صدیقی میں بعض لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو آپؓ نے قرآن کی آیت مبارکہ "انما الصدقات للفقراء"[3] کی روشنی میں کمال فہم وفراست اور بھرپور جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔

"واللہ لو منعونی عقالا کانوا یودونہ الی رسول اللہ ﷺ لقاتلتھم علی منعہ"[4]

"اللہ کی قسم جو شخص عہد رسالت میں زکوٰۃ کی مد میں ایک رسی دیا کرتا تھا اگر اس نے وہ رسی دینے سے انکار کیا تو میں اس کے خلاف جنگ کروں گا"۔

بعض صحابہ کرامؓ نے آپ کی اس رائے سے اختلاف کیا کہ توحید و رسالت کا اقرار کرنے والے کے خلاف کیوں کر جنگ کی جاسکتی ہے۔[5] لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے اور منکرین زکوٰۃ کی سرکوبی کیلئے مختلف ذرائع کو استعمال میں لاتے ہوئے زکوٰۃ وصول کرکے اسلامی ریاست کی اقتصادی حالت کو بہتر بنایا اور اسلامی عبادات کے تحفظ و دفاع میں اہم کارنامہ سرانجام دیا۔

انسداد منکرات اسلامی مستقل اقدار کا تصور دیتا ہے جو حالات و زمانہ کے مطابق تبدیل نہیں ہوتیں بلکہ قائم رہتی ہیں یہ مستقل اقدار اسلامی تہذیب کی پہچان ہیں جیسے حلال وحرام، نیکی و بدی، حیاء و بے شرمی، پاکبازی و بدکرداری، صدق و کذب، عدل وظلم، عفو درگزر اور صبر و استقامت وغیرہ۔

اسلامی ریاست ان تہذیبی واخلاقی اقدار کا تحفظ اور ان کے فروغ کیلئے ماحول کو سازگار بنائے تاکہ ان کی نشوونما ہو۔ ایک طرف نصب العین کو سامنے رکھے اور دوسری طرف حالات اور افراد کا معروضی تجزیہ کرکے حکمت عملی وضع کرے اور جہاں اخلاقی اقدار کے پامال ہونے کا اندیشہ ہو وہاں بروقت مداخلت کرکے حکومتی اختیارات کو استعمال میں لائے۔ یعنی جو اوامر سے منہ موڑتے اور منکرات سے رشتہ جوڑتے ہوں انہیں قرآنی دستور کے مطابق سزا کا مستوجب ٹھہرائے۔

۱۔ الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ (الحج ۲۲: ۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔

۲۔ شاہ ولی اللہ، احمد، ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء، مطبع صدیقی بریلی، ۱۲۸۶ھ، ۱/ ۲۳

۳۔ التوبۃ ۹: ۶۰

۴۔ جامع صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قتل من منع الزکوۃ او غیرھا من حقوق الاسلام، واھتمام الامام بشعائر الاسلام، رقم الحدیث، ۳۲ وایضاً، لو منعونی عقالا لجاھدتھم علیہ، مسکویہ، ابو علی، احمد بن محمد، تجارب الامم وتعاقب الھمم، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۳ء، ۱/ ۱۸۰

۵۔ واللہ ما ھو الا ان رایت ان اللہ قد شرح صدر ابی بکر بالقتال فعرفت انہ الحق" المسند لاحمد بن حنبل، مسند عمر بن الخطاب، رقم الحدیث: ۲۳۵

علامہ عبدالقادر عودہ نے جرائم کی بیخ کنی کے لئے جو طریقہ کار وضع کیا ہے اس میں اسلامی ریاست کے ہر فرد کے لئے طاقت کو استعمال میں لانے کا جواز ملتا ہے۔

"اذا شوهد الجاني وهو يرتكب الجناية كان لأي شخص ان يمنعه بالقوة عن ارتكاب الجريمة... وهذا ما يسمى بحق الدفاع الشرعي العام"[۱]

جب مومن اس حال میں دیکھا جائے کہ وہ جرم کا ارتکاب کر رہا ہے تو ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے جرم کے ارتکاب سے بزور روک دے اور اس کو روکنے کیلئے جو ضروری قوت درکار ہے اسے استعمال کرے۔ خواہ جرم کی نوعیت افراد کے حقوق پر زیادتی کی ہو جیسے چوری، یا جماعت کے حقوق پر زیادتی کی، جیسے شراب نوشی اور زنا۔ یہ وہ چیز ہے جسے شریعت کے عمومی دفاع کا حق کہا جاتا ہے۔

علامہ سرخسی رحمہ اللہ نے دفع منکرات کو دفاع دین کا اہم ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

"فقد سمى رسول الله ﷺ الجهاد سنام الدين وفيه امر بالمعروف ونهي عن المنكر وهو صفة هذه الأمة وفيه تعرض الأعلى الدرجات وهو الشهادة"[۲]

رسول اللہ ﷺ نے جہاد کو دین کی چوٹی کہا ہے۔ جہاد میں معروف کا حکم دیا جانا اور منکر سے منع کیا جانا ہوتا ہے اور یہ اس امت کی صفت ہے۔ پھر جہاد میں فلاح وسعادت کے سب سے اونچے درجے یعنی شہادت کے لئے بھی انسان اپنے آپ کو پیش کئے ہوتا ہے"۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو جہاد کے مفہوم میں لیا ہے جو ریاست کو دینی اعتبار سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔

"والجهاد الذى شرع بالمدينة فرع من فروع الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر وهو مقرر بمكة"[۳]

جہاد جو مدینہ میں شروع ہوا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی فروع میں سے ایک فرع ہے جب کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم مکہ ہی میں صادر ہو چکا تھا۔

شریعت اسلامیہ نے ہر فرد کو حسب استطاعت منکرات کے انسداد کے لئے اجازت فراہم کی ہے جب کہ سربراہ مملکت کا حق بدرجہ اولی ہے، اس کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"قال العلماء: الامر بالمعروف باليد على الامراء"[۴]

علماء نے کہا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض قوت کے ذریعہ انجام دینا حکام کی ذمہ داری ہے۔

۱۔　عودہ، عبد القادر، التشريع الجنائي الاسلامي دار الكاتب العربي، بيروت، س-ن، ۸۶/۱

۲۔　شرح كتاب السير الكبير، ۲۳/۱؛ وايضا، الجهاد عمود الاسلام وذروة سنامه، المسند للامام أحمد بن حنبل، حديث معاذ بن جبل، رقم الحديث: ۲۲۱۰۸

۳۔　الموافقات في اصول الشريعة، ۵۰/۳

۴۔　الجامع لاحكام القرآن، ۴۹/۴

فتنہ وفساد کا خاتمہ

شریعت امن وامان قائم رکھنے اور نظم ونسق درست رکھنے کو مقصود رکھتی ہے۔ وہ حکمران کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے کہ ریاست کی سلیمت اور داخلی استحکام کے لئے بہتر حکمت عملی اختیار کرے۔ تاکہ روئے زمین پر بسنے والے لوگ فتنہ وفساد سے محفوظ رہیں اور اگر کوئی فساد فی الارض کا موجب بنتا ہے تو اسلام نے ایسے شخص کے متعلق بڑی سخت وعید سنائی ہے:

﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ ۱

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ ودو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں میں کاٹ دیئے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں یہ ذلت ورسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بدتر سزا ہے''۔

امام الحرمین الجوینی نے لکھا ہے کہ:

''امن وامان نہ ہو تو جان خطرے میں رہے گی اور نظم ونسق کا برا حال ہو تو مال کسی کام کا نہیں رہتا'' ۲

اس صورت میں حاکم نہ صرف اپنی ذات، معاشرہ، ملک اور حکومت کے دفاع پر مجبور ہے بلکہ اسلام کے خلاف ہر فکری یلغار یا فوجی حملے کا مقابلہ کرنے کا پابند ہے۔ پھر اس دفاع کی کچھ خاص شرائط ہیں جن میں اس کی اجازت دی گئی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ ملت کے اخلاق اور نظریات کے دفاع کی خاطر

۲۔ ملت کی حریت، استقلال اور سلامتی کی حفاظت کے لئے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کیلئے ہو جائے۔

ورنہ ﴿إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ﴾ ۳

اور اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہو گا۔

عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تکمیل اس وقت لازم ہو جاتی ہے جب ظلم وستم، شر اور فساد اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔

اس ضمن میں عبدالحمید سواتی فرماتے ہیں:

''اور اطاعت صرف اللہ ہی کے لئے باقی رہے یعنی جو لوگ دین اسلام میں داخل ہونا چاہیں اسے کوئی شخص روکنے والا نہ ہو اور وہ بلا خوف وخطر دین حنیف کو اختیار کر سکیں۔ فرمایا ''فان انتھو'' اگر یہ لوگ اس قسم کی فتنہ انگیزی سے باز آجائیں دین کے راستہ میں رکاوٹ نہ بنیں، زیادتی نہ کریں۔ ''فلا عدوان الا علی الظالمین'' تو ان پر کوئی

۱۔ المائدۃ ۵: ۳۳

۲۔ غیاث الامم فی التیاث الظلم، ص ۶۰

۳۔ البقرۃ ۲: ۱۹۳، الانفال ۸: ۷۳

زیادتی نہیں ہے البتہ جو ظلم ہوگا اس کے خلاف جہاد کیا جائے گا تاکہ دنیا میں عدل وانصاف کو قائم کیا جاسکے اور فتنہ و فساد کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند کیا جاسکے"[۱]

شاہ ولی اللہ دفاع کی اصل غرض وغایت ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

"ثم أن كثيرا من الناس يغلب عليهم الشهوات الدنية والأخلاق السبعية ووساوس الشيطان في حب الرياسات ويلصق بقلوبهم رسوم آبائهم فلا يسمعون تلك الفوائد ولا يذعنون لما يأمر به النبي ﷺ ولا يتاملون في حسنة فليست الرحمة في حق اولئك أن يقصر على اثبات الحجة عليهم بل الرحمة في حقهم أن يقهر والمدخل الايمان عليهم على رغم انفسهم"[۲]

پھر بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر کمین شہوات، سبعی اخلاق، شیطانی وساوس اور ریاسات کی محبت غالب ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں ان کی آباء کی رسمیں پختہ ہوتی ہیں وہ ان فوائد کو نہیں سنتے اور نہ ہی اس پر یقین رکھتے ہیں جو حضور اکرم ﷺ حکم کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے حسن وخوبی میں غور کرتے ہیں ایسے لوگوں کے حق میں رحمت نہیں ہوتی کہ ان پر صرف دلیل قائم کردی جائے بلکہ ان کے حق میں رحمت یہی ہے کہ ان پر سختی کی جائے تاکہ ان کی مرضی کے بغیر بھی ان میں ایمان داخل ہوجائے۔

اب حاکم وقت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ریاستی استحکام کے لئے فتنہ وفساد، جنگ وجدال، بدامنی، بدنظمی اور کفروشرک کا قلع قمع کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہے کیونکہ اس میں ذراسی لغزش بھی دفاع کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔

غلبۂ دین ــــــ معنی ومفہوم

صاحب تاج العروس نے غلبہ کے معنی قدرت پانا، غالب آنا اور انتہا کو پہنچنا" بیان کئے ہیں۔ جیسے وتغلب على بلد كذا: استولى عليه قهرا" یعنی اس نے شہر پر بزور قابو پالیا اور قدرت حاصل کرلی۔[۳]

قرآن نے غلبۂ دین کی تصریح ان الفاظ میں کی ہے کہ مسلمانوں کو عروج ان کے دین کی وجہ سے ملے گا، جیسا کہ فرمان ربانی ہے۔

"اور ان کے اس دین کو تمکن (بمعنی غلبہ) عطا کرے گا جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے" تو یہ وہی بات ہے جو سورۃ المائدۃ میں آئی ہے:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾[۴]

مفردات القرآن میں "اکمال" اور "اتمام" کے مفہوم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اکمال اور تکمیل یہ ہے کہ اس چیز سے جو غرض اور مقصود تھا وہ پورا ہوگیا جب کہ اتمام یہ ہے کہ اب کسی چیز کے اس حد

۱۔ سواتی، عبد الحميد، صوفی، معالم العرفان فی دروس القرآن، ناشر مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج، گوجرانوالہ، طبع ششم، ربیع الاول ۱٤۲۰ھ، ۲۳۷/۳

۲۔ حجة الله البالغة، ۱۷۰/۲

۳۔ تاج العروس، بہ ذیل مادہ غلب

٤۔ المائدة ٥: ۳

تک پہنچ جانے کے بعد جس کے بعد اسے کسی خارجی شے کی احتیاج نہ رہے" [۱]

اس لئے اکمال دین کا حاصل یہ ہوا کہ قانون الٰہی اور احکام دین کے اس دنیا میں بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ آج پورا کر دیا گیا اور اتمام نعمت کا مطلب یہ ہوا کہ اب مسلمان کسی کے محتاج نہیں۔ ان کو خود حق تعالیٰ نے غلبہ، قوت اور اقتدار عطا فرما دیا جس کے ذریعہ وہ اس دین حق کے احکام کو جاری اور نافذ کر سکیں [۲]

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والدین تارة یضاف الی العبد، وتارة یضاف الی الرب فاضاف الدین الیھم، اذھم المختصون بھذا الدین القیم دون سائر الامم" [۳]

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں دین کی نسبت تو مسلمانوں کی طرف فرمائی گئی ہے اور نعمت کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف، وجہ یہ ہے کہ دین کا ظہور ان اعمال وافعال کے ذریعہ ہوتا ہے جو امت کے افراد کرتے ہیں۔

غلبۂ دین کے لئے طریقہ کار

حکومت اور اقتدار سے مقصود اللہ تعالیٰ کے دین کا استحکام اور احیاء ہے کہ دنیا میں کسی اور مذہب کا غلبہ اس پر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کا دین ہی غالب رہے۔ اس ضمن میں حضرت علیؓ کا فرمان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں

"دین کو اپنی حکومت کا قلعہ بنا (یعنی دین نافذ کرنے سے حکومت کی حفاظت ہوگی) اور شکر کو اپنی نعمت کا حصار بنا کیونکہ جس حکومت کو دین نے گھیرا ہوا ہو وہ مغلوب نہ ہوگی اور جس نعمت کے ساتھ شکر ہو وہ زائل نہیں ہوتی" [۴]

ہر دین کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے لئے حکومت ہو جو اس دین کے نام پر ہو (جیسے کہ اسلامی حکومت) اور وہ حکومت دین کے غلبہ کے لئے سرشار ہو۔

اس سلسلے میں امام ماوردی رحمہ اللہ لکھتے ہیں'

"فلیس دین زال سلطانہ الا بدلت احکامہ، وطمست أعلامہ لما فی السلطان من حراسة الدین، والذب عنہ ودفع الأھواء منھم ... . والسلطان جاریا علی سنن الدین وأحکامہ" [۵]

جب دین کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے تو احکام میں تبدیلی آ جاتی ہے اور علامات دین ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ حاکم کی وجہ سے دین کا تحفظ ہوتا ہے۔ دین اس کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتا اور لوگوں کی نفسانی خواہشات سے بچ نہیں سکتا۔

۱۔ مفردات القرآن، بہ ذیل مادہ کمل، تمم

۲۔ سیوطی، جلال الدین، عبد الرحمن، الدر المنثور فی التفسیر الماثور، دار الکتب العلمیہ، بیروت، س ن، الطبعة الاولیٰ، ۲۰۰۰، ۴۵۶/۲

۳۔ ابن قیم، شمس الدین، محمد تفسیر القیم، دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان، س سن، ص ۲۳۱

۴۔ الآمدی، عبد الواحد، غرر الحکم، طبع دار الندوة، بیروت، س سن، ص ۲۰۲

۵۔ ماوردی، ابوالحسن علی، ادب الدنیا والدین، دار احیاء التراث العربی، س سن، ص ۱۹، ۲۰

ان دو وجوہات کی بناء پر ایسا امام مقرر کرنا واجب ہے جو وقت کا باقدرت حاکم اور امت کا زعیم و کفیل ہوتا کہ اس کے غلبہ اور قوت کی وجہ سے دین محفوظ ہو اور اس کی سلطنت دین کے احکام کے مطابق چلے۔

اسلامی ریاست میں صالح حکمران بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دین کے غلبہ واحیاء کے لئے ان تمام وسائل اور اسباب کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا نظام کار وضع کرے، جس سے اس کی عالمگیریت اور آفاقیت ثابت ہو۔ اس نظام کار کے طریقے متعدد ہیں۔

غلبہ دین بذریعہ سرفرازی حق

اسلام دین حیات ہے، حیات کا محور معاشرہ ہے اور کوئی معاشرہ بغیر حکومت کے قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام متحدہ عالمی حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ پوری دنیا میں صرف اللہ کا دین غالب رہے۔ اس کی تائید میں قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسلام کو دنیا کے تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہو، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ﴾[1]

وہ اللہ تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس (دین حق) کو (دنیا کے) تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ وہ مشرکین کو ناگوار ہی ہو۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس آیت مبارکہ کے متعلق فرمایا ہے:

"غالب کردن سورۂ دمری است بانکہ خدا تعالیٰ غلبہ دین حق بر جمیع ادیان خواستہ وایں معنی منتظر در زمان آنحضرت ﷺ ظاہر نخواہد شد بلکہ بعد آنجناب ﷺ مجاہدات خواہد بود"[2]

"اس آیت میں اس امر کی جانب رمز و اشارہ ہے کہ اللہ تو دین اسلام کو تمام دینوں پر غالب کرنے والا ہے سو یہ درجہ حضور ﷺ کے زمانہ میں نہ پایا گیا بلکہ آپ کے بعد خلفائے راشدین کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچا۔

صاحب تفہیم القرآن رقمطراز ہیں:

"یہاں جو بات اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد محض اس دین کی تبلیغ نہ تھا بلکہ اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام نظامات زندگی پر غالب کرنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں آپ یہ دین اس لئے نہیں لائے تھے کہ زندگی کے سارے شعبوں پر غلبہ ہو تو کسی دین باطل کا اور اس کی قہرمانی کے تحت یہ دین ان حدود کے اندر سکڑ کر رہے جن میں دین غالب اسے جینے کی اجازت دے دے، بلکہ اسے آپ اس لئے لائے تھے کہ زندگی کا غالب دین یہ ہو اور دوسرا کوئی دین اگر جیئے بھی تو ان حدود کے اندر جیئے جن میں یہ اسے جینے کی اجازت دے"۔[3]

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں کہ:

۱۔ التوبۃ ۹: ۳۳؛ الفتح ۴۸: ۲۸؛ الصف ۶۱: ۹

۲۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، ۱/۲۴۷

۳۔ تفہیم القرآن، ۵/۳۶۳-۱۹۰

رسول کریم ﷺ اور سلف صالحین کے عہد مبارک میں تو اس نور کی تکمیل و اتمام کا مشاہدہ ساری دنیا کر ہی چکی ہے اور آئندہ بھی دلائل اور حقائق کے اعتبار سے ہر زمانہ میں دین اسلام مکمل دین ہے کسی معقول پسند انسان کو اس پر حرف گیری کا موقع نہیں مل سکتا، اس لئے کفار کی مخالفتوں کے باوجود یہ دین حق اپنی حجت و دلیل کے اعتبار سے ہمیشہ غالب ہے اور جب مسلمان اس دین کی پوری پیروی کریں تو ان کا ظاہری غلبہ اور حکومت و سلطنت بھی اس کے لوازم میں سے ہے۔"[1]

قرآن پاک کے اس اشارۃ النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے۔

"لا تزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم حتى ياتيهم امر الله وهم كذلك"[2]

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"لا يبقى على ظهر الارض بيت مدر و لا وبر الا ادخله الله كلمة الاسلام بعز عزيز او ذل ذليل، اما يعزهم الله فيجعلهم من اهلها او يذلهم فيدينون لها"[3]

زمین کی پشت پر نہ کوئی اینٹ گارے کا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں سے بنا ہوا کوئی خیمہ جس کے اندر اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ داخل نہ فرمادے، عزت دار کی عزت کے ساتھ یا مغلوبیت پسند کی مغلوبیت کے ساتھ۔ یا تو اللہ ان کو اس کلمہ کے ذریعہ عزت دے گا تو وہ خود اس کلمہ کے حامل بن جائیں گے یا وہ ان کو مغلوب کردے گا تو وہ اس کے مطیع اور تابع بن جائیں گے۔

راوی حدیث (حضرت مقدادؓ) کہتے ہیں تو میں نے (اپنے دل میں) کہا تب وہ بات پوری ہو جائے گی کہ "دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے۔ گویا احادیث مبارکہ کی ان پیشن گوئیوں کو سامنے رکھا جائے تو اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ کل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔

غلبہ دین بذریعہ اتحاد

اسلام نے انسانی وحدت پر زور دے کر رنگ و نسل، زبان و مذہب یا جائے پیدائش کو اونچ نیچ کی بنیاد بنانے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو ایک آدم کی اولاد قرار دیتا ہے۔ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو معاشرتی تعلقات و روابط کے صحیح، منصفانہ اور پائیدار اصول مقرر کرتا ہے اور ان کی رعایت سے ایسی فضا پیدا کرتا ہے، جس میں اتحاد و یکجہتی، اخوت و محبت، ہمدردی و ایثار کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ پھر یہ وحدت نظریہ اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کر کے غلبہ دین کو حقیقی استحکام بخشتا ہے۔ جسے قرآن حکیم میں عظیم نعمت قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ معارف القرآن ۴/۳۶۶

۲۔ مسلم، کتاب الامارة، باب قوله لا تزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق، رقم الحديث، ۴۹۵۰

۳۔ المسند لاحمد بن حنبل، کتاب مقداد بن اسود، رقم الحديث، ۲۳۸۷۵

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ ۱؎

"اور تم سب مل کر اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔"

حضور ﷺ نے ملت اسلامیہ کی تنظیم کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے اس میں بھی علاقہ یا وطن کا تصور معدوم ہے۔ آپ ﷺ نے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جس کی بنیاد ایمان اور اسلام کے ساتھ وفاداری پر رکھی گئی تھی، جہاں اس بات پر سب کا یقین کامل تھا کہ دوستی اور تحفظ صرف اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور مومنوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ ۲؎ دراصل یہی سب سے زیادہ عظیم الشان تعلق ہے، کیوں کہ یہ تعلق وحدت ایمان، وحدت فکر اور وحدت عمل کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ تمام مومن ایک دوسرے کے دوست اور محافظ ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ ان کا ایک عام فرد بھی اخوت کی اسی لڑی میں پرویا ہوا ہے۔ ۳؎

رسول اللہ قبائل کی داخلی سیاست کو سمجھتے تھے یہ قبائل اگرچہ کسی مستقل نظام حکومت کے ماتحت نہ تھے لیکن بعض علاقائی اتحادوں میں شامل ضرور تھے رسول اللہ ﷺ نے ان اتحادوں کی اہمیت کا احساس فرمایا اور اپنے سفارتی مشنوں کی روانگی کے بعد ان قبائل کے وفود کا مدینے میں استقبال کرنے کا فیصلہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے زیادہ تر وفود کا استقبال ۹ ہجری میں کیا اسی لئے اس سال کو سنۃ الوفود کا نام دیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عالمی روابط کے نتائج بہت حوصلہ افزا ثابت ہوئے۔ مختلف حکمرانوں اور قبائل کے ساتھ سفراء کے ذریعے مفید مذاکرات کے نتیجہ میں اکثریت نے اسلامی دعوت کی طرف اپنی رغبت کا اظہار کیا اور مسلمان ہو گئے انہوں نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی طرف اپنے جوابی مراسلات روانہ کئے بلکہ اپنے خلوص نیت کے اظہار کیلئے تحائف بھی بھجوائے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> "یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ بعد میں امت کے ارباب حل وعقد غلبہ دین کے لئے اسی طریقے کی پیروی کریں اور خلافت راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے اسی طریقہ پر تبلیغ عام کی اور وہ ذمہ داری ادا کی جو ان پر شہداء علی الناس کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ڈالی گئی تھی"۔ ۴؎

صلاح الدین مرحوم لکھتے ہیں:

> "تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے انذار (خبردار) کرنے کی یہ ذمہ داری ادا کی اور اپنے زمانے اور حالت کی رعایت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی حکمت عملی وضع کی اگر حکمرانوں نے اللہ کی حاکمیت کی بجائے اپنی بادشاہت قائم کرنا چاہی تو ان کے خلاف آواز اٹھائی اگر انہوں نے دین حق میں تحریف کی تو ان کے حق میں فتویٰ دینے سے انکار کیا اگر عامۃ الناس میں اصلاح کی ضرورت پیش آئی تو اس غرض کے لئے تزکیہ اور تذکیر کے پروگرام ترتیب دیئے اور اگر کہیں بھی اللہ کا دین غالب تھا اور مسلمانوں کی نااہلی اور نااتفاقی کے سبب مغلوب ہوا تو اسے دوبارہ ایک زندہ قوت بنانے کی جدوجہد کی"۔ ۵؎

۱۔ آل عمران ۳: ۱۰۳

۲۔ المنافقون ۶۳: ۸

۳۔ جامع صحیح البخاری، کتاب الصلوۃ، باب تشبیک الأصابع، رقم الحدیث، ۴۸۱

۴؎ اصلاحی، امین احسن، دعوت دین اور اس کا طریق کار، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، جہرہ، ۱۹۵۱ء، ص ۵۰

۵؎ صلاح الدین مرحوم، موجودہ سیاسی نظام اور علمائے کرام کی ذمہ داریاں، ۵-۱۶ء امت روزہ تکبیر، کراچی

غلبہ دین کے بلند مقصد کے حصول کے لئے نہ صرف حکومت کو بلکہ تمام طبقات کو ٹھوس بنیادوں پر علمی اور عملی کام کرنا ہوگا۔ یہ مقصد محض (Lipservice) سے حاصل نہیں ہوسکتا اس کے لئے ہر طبقہ پر جداگانہ نوعیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے دینی اکابرین نے ہر دور میں اسلام کا غلبہ اور شریعت کی ترویج کے لئے برسر اقتدار کو بالخصوص اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور حکومت واقتدار، جاہ ومنصب سے بے نیاز ہوکر دین کی سربلندی کیلئے کام کیا۔

غلبہ دین بذریعہ رواداری:

اسلامی مملکت کی بنیاد دعوت دین وایمان پر ہے۔ اس لئے اس کا مزاج داعیانہ اور دعوت الی اللہ اس کی روح ہے۔ اسلام کو غالب رکھنا اور اس کی دعوت کی راہ سے رکاوٹیں دور کرنا اس کا اہم فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی تکمیل کے لئے اسلام رواداری کا درس دیتا ہے اور جبر و اکراہ سے منع کرتا ہے کیونکہ اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب رواداری، حسن سلوک اور صلح وسلامتی کا داعی نہیں ہے۔ بشرط ضرورت واستطاعت تیغ وتفنگ کے ذریعہ سے بھی غلبہ دین کی کوشش کی جاتی ہے مگر رواداری جس حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ بھی رواداری کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے۔

معاشرے میں بوجہ غلبہ دین معروف کو پھیلانا، منکر سے روکنا، بدامنی کے خاتمہ اور امن وانصاف کے قیام کے لئے کام کرنا اسلامی ریاست کا شرعی فریضہ ہے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے معاشرے کے تمام طبقات کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہوجاتا ہے اور باہمی اشتراک سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس اصولی تعاون کے جواز کے بارے میں قرآن مجید کی کئی آیات سے واضح اشارات ملتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱۔　﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾[۱]

"نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہو"

۲۔　﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ﴾[۲]

"ان کے اکثر مخفی مشورے بے خیر ہیں۔ ہاں! بھلائی اس کے مشورے میں ہے جو خیرات کا نیک بات کا یا لوگوں میں صلح کرانے کا حکم کرے"۔

۳۔　﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾[۳]

"آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے"۔

قرآن نے حریت عقیدہ کی وضاحت بایں صورت کی ہے:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾[۴]

۱۔　المائدۃ ۵:۲

۲۔　النساء ۴:۱۱۴

۳۔　آل عمران ۳: ۶۴

۴۔　البقرۃ ۲: ۲۵۶

"دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں ہدایت ضلالت سے روشن ہو چکی ہے"۔

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ ۱

"اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں یہاں تک کہ وہ مومن ہو جائیں"۔

مذکورہ آیات کی شرح میں صاحب تفسیر المنار لکھتے ہیں کہ:

"لا اکراہ فی الدین" اور اس طرح کی دیگر آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دین لوگوں کے لئے ایک اختیاری ہدایت ہے جس کو آیات و بینات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور یہ کہ دین اختیار کرنے میں زبردستی ممنوع ہے۔ دعوت دین میں بنیاد یہ ہے کہ اس کو اس طرح سے واضح کرنا ہے تاکہ سیدھی راہ، کج سے اور ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو جائے۔ ۲

جہاں تک دوسروں کی دعوت دینے اور ان سے سلوک کی بات ہے، اسلام دلائل اور حسن خلوص کی شرط لگاتا ہے۔

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ ۳

"اے رسول ﷺ تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ پر دانائی اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلاؤ اور بحث و مباحثہ کرو بھی تو اس طریقہ سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو"۔

غلبہ دین کا یہ راستہ دلیل و برہان اور رواداری کا ہے، شاہ ولی اللہ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں

"وبیں مرجحات الدین القویم من انہ سھل سمح وان حدودہ واضحۃ یعرف العقل حسنھا وان لیلھا نھارھا وان منھا أنفع للجمھور" ۴

اور دین کی ترجیحات واضح کی جائیں کہ یہ آسان ہے اس میں بڑی وسعت ہے۔ اس کی حدود واضح ہیں جن کے حسن کو عقل دن کی روشنی میں دیکھ اور پرکھ سکتی ہے اور اس کے قوانین عوام کے لئے بڑے مفید ہیں۔

مندرجہ بالا قرآنی دلائل کے علاوہ سیرت طیبہ کے کئی نظائر سے بھی اس سلسلہ میں واضح و بین رہنمائی ملتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اعلیٰ وارفع مقاصد کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کرنا نہ صرف یہ کہ جائز امر ہے بلکہ مستحسن بھی ہے۔ سیرت میں اس کی اہم اور اولین مثال حلف الفضول کی ہے۔ جس میں مختلف قبائل اس بات پر متفق ہوئے کہ ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت میں ساتھ دیں گے۔

سیرت ابن ہشام میں ہے:

"فتعاقدوا و تعاھدوا علی ان لا یجدوا بمکۃ مظلوما من أھلھا وغیرھم ممن دخلھا من سائر الناس الا قاموا معہ، وکانوا علی من ظلمہ حتی ترد علیہ مظلمۃ" ۵

۱۔ یونس ۱۰: ۹۹

۲۔ رشید رضا، محمد، تفسیر القرآن الکریم بتفسیر المنار، دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، ۱۹۹۹، ۳/۳۳

۳۔ النحل ۱۶: ۱۲۵

۴۔ حجۃ اللہ البالغہ، ۲/۱۲۳

۵۔ ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، السیرۃ النبویۃ، دار الجیل، بیروت، س ن، ۱/۱۲۳

اس مشترکہ فیصلہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما احب ان لي به حمر النعم ولو دعي به في الاسلام لاجبت"[1]

میں عبداللہ بن جدعان کے مکان میں ایک ایسے حلف (حلف الفضول) میں موجود تھا جو مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ پیارا تھا اور اگر اسلام میں بھی کوئی ایسے عہد کی طرف بلائے تو میں قبول کروں گا"۔

فقہاء اسلام میں متقدمین ومتاخرین ہر دو طبقہ کے جمہور علماء اسی کے قائل ہیں ان کے نزدیک مصلحت کے تحت غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اتحاد (تعاون) کرنا جائز ہے۔[2]

غلبہ دین بذریعہ جہاد:

جہاد کا ایک خصوصی مفہوم "جنگ" اور محاربہ بھی ہے جسے قرآن کریم میں جہاد فی سبیل اللہ اور قتال کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ ہے اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے غیر مسلموں کے خلاف میدان جنگ میں صف آراء ہو کر ہتھیاروں کے ساتھ ان سے معرکہ آرائی کرنا اور قتل وقتال کے ذریعے سے کفر پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا، جس کی اہمیت وفضیلت پر قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ کی تصریحات موجود ہیں۔

"جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی (اللہ کے ہاتھ) فروخت کر چکے ہیں انہیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں اور جو کوئی اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے تو خواہ وہ قتل ہو جائے خواہ غالب آئے (ہر حال میں) ہم اسے اجر عظیم عطا فرمائیں گے"۔[3]

ڈاکٹر حسن ابراہیم اس آیت مبارکہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"عرب کے سپاہی کا اہم مقصد فتنہ وفساد، شورش اور بغاوت کو فرو کرنا، غارت گروں سے ملک کو بچانا، ارکان اسلام کا قیام اور ناموس دین کا تحفظ اور اسلامی دائرہ عمل کی توسیع تھا اور اسی کیلئے وہ اسلحہ اٹھاتا تھا"[4]

غلبہ دین اور امت مسلمہ کی بقاء کے لئے اسلامی ریاست کو بڑی جانفشانی، سرفروشی سے جہاد وقتال کے مراحل طے کرتا ہوں گے تاکہ طاغوتی طاقتیں دبی رہیں۔ قرآن کریم نے اس عمل کی ترغیب ان الفاظ میں دی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[5]

۱۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۲۔ شرح السير الكبير ۴/۱۱۴۱، الشوكاني، محمد بن علي، نيل الأوطار شرح منتقى الاخبار من احاديث سيد الاخيار، ادارة القرآن والعلوم الاسلامية، كراچی پاکستان، ۱۴۰۷ھ، ۷/۲۳۷

۳۔ النساء ۴: ۶۷

۴۔ حسن ابراہیم، ڈاکٹر، النظم الاسلامیۃ (ترجمہ مولوی علیم اللہ صدیقی) ادارۃ المعارف، ڈاک خانہ دارالعلوم کراچی، جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۲۰۰

۵۔ الصف ۶۱: ۱۰۔۱۱

"اے اہل ایمان کیا میں تمہاری رہنمائی اس تجارت کی طرف کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (پختہ) ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ، اگر تم علم (حقیقی) رکھتے ہو تو تم جان لوگے کہ یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔"

اس موقع پر امام رازی نے بڑی صراحت سے لکھا ہے کہ:

یہاں در حقیقت اس بات کی مذمت کی گئی ہے کہ یہ تمہاری بشریت ہے جس کی وجہ سے تم دنیا کی فتح و کامیابی کو اہمیت دیتے ہو مگر اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اگر اہمیت ہوتی تو اہل ایمان کو آن واحد میں فتح عطا کر دیتا اللہ کی نگاہ میں تو تمہاری آزمائش اور امتحان کو اہمیت حاصل ہے۔" [۱]

غلبہ دین کیلئے جہاد کے حکم سے کوئی مستثنیٰ نہیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے خود حضور ﷺ سے فرمایا

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ [۲]

"اے نبی ﷺ کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے"۔

دین کی حفاظت اور اس کے غلبہ و سربلندی کے لئے ان لوگوں سے جنگ کرنا ضروری ہے جو اسے مٹانا اور تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی ریاست کی ذمہ داری دنیا سے نظام باطل کو مٹا کر اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنا ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری سے اسی وقت سبکدوش ہو سکتی ہے جب وہ اپنے ہر فرد کو اس فریضہ پر آمادہ کرے کہ وہ دین کی خاطر اپنا تمام فکری و عملی سرمایہ لٹا دے حتیٰ کہ اپنے جان و مال کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کرے، اسی کا نام قرآن و حدیث کی زبان میں جہاد ہے۔

عدل اور حقوق کی بہم رسانی

ریاستی استحکام کی ایک بنیاد عدل کا قیام ہے۔ قیام عدل سے مراد ریاست میں ایسا متوازن اور عادلانہ نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر فرد، جماعت اور طبقے کے حقوق محفوظ ہوں اور ظلم و ناانصافی کے سد باب کا مؤثر انتظام ہو۔ جس ریاست میں ظلم و ناانصافی عام ہو، عوام الناس کے حقوق محفوظ نہ ہوں، ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کو تحفظ حاصل نہ ہو وہ جلد ہی تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتی ہے۔

صاحب تفسیر المنار نے عدل کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"ولا معروف اعرف من العدل ولا منكر انكر من الظلم" [۳]

عدل سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں اور ظلم سے بدتر کوئی برائی نہیں۔

ابن عربی رحمہ اللہ نے عدل کی اہمیت کے پیش نظر فرمایا ہے کہ:

"ولزوم القناعة في كل حال، ومعنى وأما العدل بينه وبين الخلق معنى بذل النصيحة" [۴]

آدمی ہر معاملے میں افراط و تفریط چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے اور تمام مخلوق سے ہمدردی و خیر خواہی کا معاملہ کرے۔

۱۔ مفاتیح الغیب، ۱۰/۳۱۷، ۵۳۱

۲۔ التوبة ۹: ۷۳؛ التحريم ٦٦: ٩

۳۔ تفسیر القرآن الحکیم المشهور بتفسير المنار، ٤/ ٣٨

٤۔ ابن عربی، ابوبکر، محمد، أحكام القرآن، ناشر دار الكتاب العربي، بيروت، لبنان، الطبعة الاولى، ۲۰۰۰ء، ۳/ ۱۱۹

اسلام میں عدل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، یہ حقوق کی بہم رسانی کا اہم ذریعہ ہے۔ جس کا اندازہ اس آیت مبارکہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

"لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ "[۱]

''ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری تاکہ انسان انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کے لئے بہت فوائد بھی ہیں"۔

علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے لیقوم الناس بالقسط کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

"ليعمل الناس بينهم بالعدل"[۲]

تاکہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے لفظ ''قسط'' کی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"والقسط والاقساط هو الانصاف وهو أن تعطى قسط غيرك كما تاخذ قسط نفسك"[۳]

قسط اور اقساط کے معنی انصاف کے ہیں، وہ یہ کہ تیرا دوسرے کو اس کا حصہ دینا اور اس سے اپنا حصہ لینا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ لفظ ''الحدید'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"والحديد اشارة الى أنهم لو تمرد و الواجب ان يحملوا عليها بالسيف"[۴]

لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ اگر لوگ تمرد اختیار کریں تو انکے خلاف تلوار کی طاقت استعمال کرنی چاہیے۔

امام ابن تیمیہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"بالقسط فى حقوق الله و حقوق خلقه و انزلنا الحديد . . . فمن عدل عن الكتاب قوّم بالحديد"[۵]

دین اسلام میں ریاست کے قیام کا مقصد صرف اور صرف حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حفاظت ہے، اللہ نے انہیں کا شعور بخشنے کے لئے قرآن کو اتارا اور نظام عدل کو نافذ کرنے کا حکم دیا تاکہ لوگ حق اور انصاف کا ساتھ دیں اور اس پر کاربند ہوں لہذا جو کتاب سے روگردانی کرے تو آہنی ہاتھ سے درست کر دیا جائے۔

صاحب معارف القرآن اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں کہ:

''قرآن کریم نے دنیا میں عدل و انصاف کرنے کے لئے دو چیزوں کو تو اصل قرار دیا، ایک کتاب، دوسرے میزان، کتاب سے حقوق کی ادائیگی اور اس میں کمی بیشی کی ممانعت کے احکام معلوم ہوتے ہیں اور میزان سے وہ حصے متعین

۱۔ الحدید ۵۷: ۲۵

۲۔ جامع البيان عن تأويل آي القرآن، جز ۲۷/۲۷۵

۳۔ مفاتيح الغيب، جز ۲۹/ ۴۷۱

۴۔ ایضاً، ص ۴۷۰

۵۔ منهاج السنة، ۱/ ۶۸، ۳۶۹

ہوتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ہیں"۔[1]

مندرجہ بالا عبارات سے یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ کی کتاب، میزان عدل اور قوت نافذہ دراصل اسلامی ریاست کے عناصر ترکیبی یا اقنوم ثلاثہ ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا گویا ریاست کے ستون کو منہدم کرنے کے مترادف ہے۔

علاوہ ازیں قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر عدل کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور انصاف قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسلام نے انصاف کو ریاست کا ایک اہم ستون گردانا ہے اور عدل کو دیگر امور مملکت پر فضیلت دی ہے اور اسے رسالت کا منصب قرار دیا ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے پہلی اسلامی ریاست میں عدل کا کس طرح عملی نفاذ فرمایا اور اس کے قیام کے لئے کیا اہتمام فرمایا، ہم یہاں چند احادیث بطور حوالہ بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"ما من امیر یلی أمر المسلمین ثم لایجتھد لھم وینصح الا لم یدخل معھم فی الجنة"۔[3]

کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھالے پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے جان نہ لڑائے اور اخلاص کے ساتھ کام نہ کرے وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے زیادہ محبوب اور اس سے قریب ہونے والا عدل پرور حکمران ہوگا، اسی طرح اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور اس سے دور بٹھایا جانے والا ظالم حکمران ہوگا"۔[4]

آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں لوگوں کے درمیان بھرپور انصاف روا رکھا اور اس فریضے کو بہ تمام و کمال انجام دیا۔ آپ ﷺ کے نافذ کردہ فیصلوں سے کسی کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں آیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی عدل کے خلاف کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے تو اس کے لئے بھی رسول اللہ ﷺ ایک ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے خود کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، آپ ﷺ نے مرض الموت میں یہ اعلان فرمایا کہ:

"اے لوگو! جس کے ذمہ کوئی حق ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس حق کو ادا کردے اور دنیا کی رسوائی کا خیال نہ کرے۔ آگاہ ہو جاؤ دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی سے بہت کم ہے۔ پھر ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ میرے تین درہم آپ کے ذمہ ہیں پھر آپ نے حضرت فضیلؓ سے فرمایا کہ اس کو تین درہم دے دو۔[5]

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے یوں بیان فرمایا

"سارے انسانوں کو اپنی نظر میں یکساں رکھو اور اپنی مجلس میں ان کے ساتھ یکساں سلوک کرو تاکہ کمزور کو تم سے

۱۔ معارف القرآن، ۲۲۲/۸

۲۔ واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (النساء ۴: ۵۸) اور جب فیصلہ لوگوں میں کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

۳۔ جامع صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلة الأمیر العادل، رقم الحدیث: ۱۴۲

۴۔ جامع ترمذی، ابواب الاحکام عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی الامام العادل، رقم الحدیث ۱۳۶۹، وأیضاً جامع صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلوۃ، رقم الحدیث: ٦٦٠

۵۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، رقم ۱۴۰۲، ج۸/ ۵۹۶

انصاف کی امید باقی نہ رہے اور معززین میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ تم ان کی خاطر دوسروں پر زیادتی کر سکتے ہو"۔ [۱]

اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہر فرد کو ظلم و تعدی سے محفوظ رکھے اور اس امر کا انتظام کرے کہ کوئی شخص غریب ہو یا امیر، بے اثر ہو یا با اثر، یکساں طور پر بغیر کوئی قیمت ادا کیے، انصاف حاصل کر سکے۔

حضرت عمرؓ نے اس حق کا اعلان بڑے بلیغ انداز میں فرمایا:

"واللہ ما فیکم اقوی عندی من الضعیف حتی اخذ له الحق ولا اضعف عندی من القوی حتی اخذ الحق منه" [۲]

خدا کی قسم! میری حکومت میں ایک بے اثر سے زیادہ کوئی با اثر نہیں ہے جب تک میں اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں اور ایک با اثر سے زیادہ بے اثر کوئی نہیں ہے جب تک میں اس سے حق وصول نہ کرلوں۔

حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد نہایت اہم ہے اور یہ بات صرف انہوں نے نہیں فرمائی ہے بلکہ ان سے پہلے کم و بیش انہی الفاظ میں یہی بات حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی بیان فرمائی تھی، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"والقوی فیکم ضعیف عندی حتی اخذ الحق منه ان شاء الله" [۳]

اور تمہارے مابین جو با اثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے اس حق کو وصول کرلوں جو اس نے غصب کر رکھا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ نے ایک مرتبہ مجمع عام میں فرمایا تھا:

اسلامی ریاست پر لوگوں کا یہ حق ہے کہ وہ اس بات کی پوری نگرانی رکھے کہ کوئی فرد غذا، لباس، رہائش اور حق زندگی سے محروم نہ ہو۔ شریعت مطہرہ نے حریت فکر و عقیدہ، عدل و مساوات، شخصی ملکیت اور امن کو ہر فرد کا بنیادی حق تسلیم کیا ہے تاکہ وہ اپنے ذاتی امور و مطالبات بغیر کسی دوسرے کی مداخلت کے اپنی آزادانہ مرضی سے طے کرے اور کسی کا اس پر جبر وا کراہ نہ ہو۔

اس ضمن میں ابونصر الفارابی رقمطراز ہیں کہ:

"العدل یکون اولا فی قسمة الخیرات المشترکة التی لاهل المدینة علی جمیعهم ثم بعد ذلک فی حفظ ما قسم علیهم وتلک الخیرات هی السلامة والاموال والکرامة والمراتب وسائر الخیرات..... واما زیادته فجور علی اهل المدینة وعسی ان یکون ایضاً جوراً علی اهل المدینة" [۴]

"عدل سب سے پہلے ان مشترک اچھی چیزوں کی تقسیم میں ہوگا جو تمام اہل شہر کے لئے ہوتی ہیں اس کے بعد جو اہل شہر پر منقسم ہوا، اس کی حفاظت سے عدل کا تعلق ہے۔ یہ اچھی اشیاء ہیں، سلامتی، مال و متاع، عزت و کرامت، درجات اور دوسری اچھی اشیاء جن میں اہل شہر شریک ہو سکتے ہیں۔ ان اچھی اشیاء میں سے اہل شہر میں سے ہر ایک کا

۱۔ ابو یوسف، یعقوب بن ابراهیم، کتاب الخراج، المطبعة السلفیة، القاهرة، الطبعة الثالثة، ۱۳۸۲ھ، ص ۱۱٦

۲۔ الفاروق عمر، لهیکل، ص ۱۰٦

۳۔ هیکل، محمد حسین، الصدیق ابی بکر، مطبعة مصر شرکة مساهمه القاهرة، ۱۳٦٤ھ، ص ٦۷

٤۔ السیاسات المدنیة، فصول المدنی، فصل ٥۸، ص ۲۹

اس کی اہلیت کے مطابق حصہ ہوتا ہے۔ اس حصے میں تو کوئی کمی یا زیادتی اس شخص پر ظلم ہے اگر اس کے حصے میں کمی ہے تو یہ اس پر ظلم ہے اور اگر اس کی اہلیت سے زیادہ اسے حصہ ملا ہے تو یہ اہل شہر پر ظلم ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے حصے میں کمی بھی اہل شہر پر ظلم ہو"۔

عدل کے قیام میں انتظامی و تنظیمی ظلم و بگاڑ کو دور کر کے ایسی فضا قائم کرتا ہے کہ کوئی فرد محرومی کا شکار نہ ہو اور ہر ایک کو اپنے حقوق محفوظ نظر آئیں۔ جان و مال، عزت و آبرو اور حریت و اختیار ہر قسم کی مداخلت سے محفوظ رہے۔ اسلام نے حقوق و فرائض میں جو عادلانہ نظام قائم کیا ہے وہ اپنی انفرادیت و افادیت کے باعث آج بھی اسی طرح پرکشش ہے جیسے چودہ سو برس پہلے تھا۔ اس اعتبار سے عدل بہت اہم ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں معاشرے کا اجتماعی وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے اور معاشرے کی حیثیت ایک جنگل کی سی ہو جاتی ہے جس میں ظلم سے وہی بچ سکتا ہے جو خود ظالم اور خونخوار ہو۔

عدل ہی معاشرے کو متوازن اور مامون زندگی کی ضمانت دے سکتا ہے۔ قرآن و سنت میں امراء و حکام کی صفات، ذمہ داریوں اور طرز عمل کے بارے میں جو تفصیلات آئی ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کو ختم کرنے اور عدل کو قائم کرنے کی کتنی فضیلت ہے۔

اس سلسلے میں امام شیزری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:

"حاکم وقت اس عمل کے لیے بیٹھے کہ ظلم و زیادتی اور حق تلفی کو معلوم کرے اور رعیت میں جن لوگوں کے درمیان میں لڑائی جھگڑا ہو اس پر غور و فکر کر کے اس نزاع کو شریعت کے موافق عدل و انصاف سے حل کرے"۔۷۶

اجتماعی زندگی میں جب حقوق و فرائض میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔ حقوق پامال ہوتے ہیں اور اجتماع کے وجود کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو ضوابط و قوانین ہی تحفظ کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ انسان کے پاس قوانین کی اصولی اور تشریحی تفاصیل کا ایک ذخیرہ موجود ہے لیکن اس کے باوجود انسانی معاشرہ ظلم و ناانصافی کا شکار اور عدل کی برکات سے محروم ہے۔ اس کی ایک وجہ تو عادلانہ قوانین کے شعور کا فقدان ہے اور دوسری وجہ ان قوانین کے درست نفاذ میں کوتاہی ہے۔

ج۔ تربیت عوام اور ملکی معاملات میں عوامی شعور کی بیداری

اسلامی ریاست اپنی نوعیت و ماہیت کے اعتبار سے دیگر ریاستوں سے بالکل جدا ہے اس کا منبع اور مصدر قرآنی نظریہ حیات ہے اور اس کی شناخت بلکہ اس کے وجود کا جواز دین و شریعت سے وابستگی ہے۔ عوام اور حکومت کے درمیان محبت اور اعتماد کا رشتہ مضبوط کرتی ہے اور عوام الناس کی مادی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل کا پورا انتظام کرتی ہے۔ ان بنیادوں پر اس کی سالمیت اور بقاء کو کوئی خطرہ نہیں بلکہ وہ اپنے قومی مقاصد سے وابستہ ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

ا۔ تربیت عوام

قرآن کریم اور سنت طیبہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم و تربیت کا سارا سلسلہ ایمان اور اخلاقی اقدار سے وابستہ ہے۔ ایمان انسان کے قلب و دماغ میں نہ صرف ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے بلکہ اس شعور کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر قول، فعل اور فکر و عمل کے لیے ذمہ دار ہے۔ جب کہ اخلاقی اخوت انسان کے طرز عمل اور طبیعت پر اثر انداز ہوتی ہے اور زندگی کے تمام معاملات کو ایمان و یقین کے مطابق ڈھال دیتی ہے۔

۷۶۔ شیزری، علامہ، عبد الرحمن، المنهج المسلوك في سياسة الملوك، طبع مكتبة المنار، اردن، س ن، ص ۲۵

اخلاقی اقدار ایمان کا لازمہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اخلاقی اصول وضوابط کا ایک جامع نظام عطا فرمایا۔ آپ ﷺ نے اخلاق حسنہ کا نہ صرف عملی ثبوت دیا بلکہ اس کی تبلیغ بھی کی۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے شاہ حبشہ کے دربار میں اس کا ذکر کیا[1] اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے قیصر روم کے سامنے اس کا اعتراف کیا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت کے لئے ایمان وعقیدہ کو پوری طرح دل ودماغ میں راسخ کیا اور تزکیہ نفس کے ذریعہ اخلاقی اقدار کو اجاگر کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر فرد اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مگن ہو گیا۔

اسلامی ریاست کا اولین مقصد انسانی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو لحاظ سے صالح اور اخلاقی فعالیت کے لئے کار آمد بنانا ہے۔ اس ہدف عالیہ کے حصول کی خاطر اخلاقی اقدار کو صحیح رُخ پر استوار کر کے خلوص نیت اور فکر سلیم کے ساتھ ادائیگی کو ممکن بنائے تاکہ ساری عوام میں کردار، اصول اور اخلاق حسنہ کی استعداد پیدا ہو کر سعادت مند معاشرے کی بنیاد پڑے اور اسی طرح کی اجتماعی برکات رکھنے والی ریاست سارے عالم کو خیر وسعادت کی طرف ''دعوت دینے والا ادارہ'' بن جائے۔

علامہ ضیاء الدین ریس لکھتے ہیں کہ:

"فدولة الاسلام يجب ان تنظر في أعمالها الى الآخرة على انها الغاية وتقوم بكل اعمال الخير التى يامر بها الدين، والتى تؤدى الى رضوان الله، وتحقق المطالب الروحية للانسان كما انها تجعل الدين أو القانون الأخلاقي المقياس الذى تقيس به أعمالها، وكل تصرفاتها"[3]

اسلامی حکومت میں لازمی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ امت کے اخروی اعمال پر نظر رکھے کیونکہ یہی غایہ اور مقصود ہے اور خیر کے وہ تمام کام کرے جو دین میں مامور بہ ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہوں اور جو انسان کے روحانی مقاصد کے حصول کا سبب ہوں جیسا کہ اسلامی حکومت دین اور اخلاقی قانون کو وہ معیار جانتی ہے جس پر حکومت کے تمام اعمال اور تصرفات قیاس ہوتے ہیں۔

اسلامی حکومت ایک اخلاقی اور انسانی حکومت ہے، اس سلسلے میں علامہ محمد مبارک لکھتے ہیں:

''اسلامی حکومت کا ہدف صرف حکومت کرنا نہیں اور نہ ہی صرف مال ودولت کا جمع کرنا ہے اور نہ ہی عسکری اور نظامی قوت حاصل کرنا ہے بلکہ اسلامی حکومت کا بنیادی ہدف دنیا میں نوع انسانی کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کرنا ہے اور خضوع وخشوع کے ساتھ انسان کا رابطہ اور تعلق اللہ تعالیٰ سے استوار کرنا ہے۔ عوام الناس کے درمیان عدل قائم کرنا ہے، اس لیے کہ اسلامی حکومت میں انسانی اور اخلاقی ہدف اقتصادی سیاسی اور عسکری اہداف پر مقدم ہے''[4]

انسان کی کامیابی کا دارومدار اخلاقی قوت پر ہے اور یہ قوت انسان میں فطرۃً موجود ہے اگر وہ اسے ضائع نہ کر بیٹھے تو اسے وقتاً فوقتاً اعتدال کی راہ دکھاتی رہتی ہے۔ قرآن اس قوت کی بات بھی کرتا ہے اور اس کے تنقیحی کردار کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱۔ جامع صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، مناقب ابى ذر، رقم الحديث: ٦٣٥٩

۲۔ جامع صحيح بخارى، باب بدء الوحى، باب كيف كان بدء الوحى الى رسول الله ﷺ، رقم الحديث ٧

۳۔ النظريات السياسية الاسلامية، ص ٣٨٣

۴۔ نظام الاسلام الحكم والدولة، ص ١٤٢

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا"[1]

"ہر نفس میں اس کی نیکی اور بدی الہام کردی ہے"۔

فطرت انسانی کے اندر موجود نیکی کا داعیہ اسے انحراف کا احساس دلاتا رہتا ہے اور راست روی پر آمادہ کرتا رہتا ہے، جس سے اس کا صحیح عقیدہ، عمدہ اخلاق اور صالح اعمال کی تعلیم وتربیت ہوتی رہتی ہے۔

مفسر قرآن محمد کرم شاہ الازہری رقمطراز ہیں کہ:

> "خلق کا اطلاق ان ہی خصائل وعادات پر ہوگا جو پختہ ہوں، جن کی جڑیں قلب وروح میں، بہت گہری ہوں، ان ہی غیر متزلزل اور پختہ صفات پر کامیاب زندگی کا محل تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ ان ہی پر اعتماد کرتے ہوئے قومی ترقی اور اصلاح کے منصوبے بنائے جاسکتے ہیں اور ان پر عمل کیا جاسکتا ہے"۔[2]

امتیازی صفات اخلاقی اقدار اور انسانی فضائل کا وہ پیمانہ ہیں جن کے ذریعے انسان اور حیوان کے درمیان فرق کیا جاتا ہے، وہ صفات علم وحکمت، اخلاص وتقویٰ، سخاوت وفیاضی، عفت وعصمت، دیانت وامانت، انفرادی واجتماعی عدل واحسان، عفو ودرگزر، رحمت و شفقت اور ایثار وقربانی وغیرہ ہیں۔ یہ امتیازی صفات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حسن وجمال پیدا کرتی ہیں اور اسے اس قابل بناتی ہیں کہ وہ اصلاح معاشرہ کے لئے مفید ہو۔

علامہ اسد اخلاقیات کی اہمیت کے پیش نظر رقمطراز ہیں کہ:

> "اسلام کے اخلاقیات (ethics) انفرادی واجتماعی اخلاقی اقدار (Morality) مثلاً عدل وانصاف، اخوت وبھائی چارے، ایثار وخیر خواہی اور حریت ومساوات کے بارے میں اس کے تصورات مغربی تہذیب کے تصورات سے قطعی طور پر امتیازی ارفع واعلیٰ ہیں۔ اسلام نے نسلی وقومی عصبیت اور منافرت کو منسوخ ومتروک قرار دے کر اخوت اور مساوات کے لئے راہ ہموار کی ہے"۔[3]

ریاست فاضلہ صرف وہ ہوسکتی ہے جو افراد معاشرہ کو دنیوی سعادت کے ساتھ ساتھ اخلاقی سعادت سے بھی روشناس کرائے تاکہ ہمہ گیر فلاح کا حصول ممکن ہو۔

سید قطب شہید نے اسلامی حکومت کے فرائض منصبی کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ:

> "معاشرے میں نبوی طریق نافذ کرنے کے لئے تمام ذرائع کی نسبت حکومت بہت اہم کردار ادا کرسکتی ہے اگر حکومت اصلاح معاشرہ میں پوری دلچسپی لے تو معاشرہ جلد اصلاح پذیر ہوگا۔ اس میں اسلامی احکام کا نفاذ بہت آسانی سے ہو جائے گا کیونکہ حکومت نے ہی تو معاشرے میں قوانین وضوابط نافذ کرنے ہوتے ہیں"۔[4]

۱۔　الشمس ۹۱: ۸

۲۔　الازہری، شاہ، محمد کرم، تعمیر اخلاق اور سیرت نبوی ﷺ، ناشر ضیاء القرآن پبلیکیشنز، س۔ن، ص ۱۲

(3)　Muhammad, Asad, Islamat the Crossroads, Lahore, Sh-Muhammad Ashraf, 6th edn, 1975, P-99

۴۔　سید قطب شہید، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ناشر الحراب حسن آباد، لاہور، اگست ۱۹۶۹ء، ص ۳۸

مولانا مودودی نے انسانی ضابطۂ اخلاق کو ایسا بنیادی تصور خیال کیا ہے جو ریاست کے سیاسی نظام کو تحفظ فراہم کرتا ہے، وہ اس تناظر میں رقمطراز ہیں۔

''ہر نظام سیاسی کے فنا و بقا، وجود اور عدم وجود، تخریب و تعمیر کی بنیاد انسانی اخلاق پر ہی رکھی جاتی ہے۔ اسلام کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ اس نے اخلاق کے وہ درجات بتائے ہیں جن کو وجود میں لا کر انسان ایک بہترین نظام تمدنی و عمرانی کی تعمیر کر سکتا ہے انہی درجات اخلاق کو وجود میں لانا اور ان کا تحفظ کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہے''۔[1]

اسلام کی بنیادی تعلیمات فرد کی اس نہج پر تربیت کرتی ہیں کہ اس میں اجتماعی شعور پروان چڑھے۔ دوسروں کے لئے اس کے اندر ہمدردی، اخوت اور تعاون کے جذبات موجزن ہوں۔ اسلام نے فرد کی تربیت کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا ہے کہ جس پر وہ عمل پیرا ہو کر اپنے ذاتی مفادات کو اجتماعی مفادات کے تابع لا سکے۔

اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ:

''لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ''[2]

تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

مسلم معاشرہ خود غرضی اور استحصال سے پاک ہوتا ہے، جہاں معاشرے کے تمام افراد زندگی کے مسائل سے نمٹنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کی مدد کرتا ہے جب تک اس کا بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے''۔[3]

دراصل اخلاقیات ایک ایسا پیمانہ ہے جس کے تحت جماعت، جماعت کی حیثیت سے اور افراد اجزائے جماعت کی حیثیت سے اجتماعی ترقی کے مراحل طے کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی اخلاقی اقدار کو اجتماعی سطح پر فروغ دینے کی ذمہ داری ریاست پر عائد کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

"Islamic state is an educationl state with an all-out moral based educational agenda . To promote educational and moral standard of its citizens is one of the basic duties of the Islamic state". (4)

اسلامی ریاست ایک تعلیمی ریاست ہے جس کا تعلیمی منشور صرف اخلاقیات پر مبنی ہوتا ہے۔ شہریوں کے تعلیمی اور اخلاقی معیار کو نشوونما دینا اسلامی ریاست کے بنیادی فرائض میں سے ایک ہے۔

۱۔ اسلامی ریاست، مودودی، ص ۴۳

۲۔ جامع صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن من خصال الایمان، رقم الحدیث ۱۷۰

۳۔ سنن ابی داود، کتاب الأدب، باب المؤاخاۃ، رقم الحدیث: ٤٨٩٣

(4) *State and Legislation in Islam, P-32*

اصلاح وتطہیر کے اس عمل میں تعلیم کا بڑا عمل دخل ہے لہٰذا یہ تعلیم اسلامی خطوط کے دائرے میں دی جائے اور تربیت کو اس سے جدا نہ رکھا جائے۔ اس طریقہ کار میں تعلیم کامل قومی شعور، اجتماعی فکر اور اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں مؤثر رہے گا۔ افراد کی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو تحفظ بہم پہنچائے گا اور ان کی بقاء کے لئے مشکل مراحل میں معاون و مددگار ہوگا۔ اس سے ایک تو افراد کا اخلاقی معیار بلند ہوگا اور دوسرا بوقت ضرورت وہ ریاست کے فرد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔

ب۔ ملکی معاملات میں عوامی شعور کی بیداری

اصلاح معاشرہ کے لئے بنیادی ہدف افراد کی اخلاقی تربیت اور کردار کی تعمیر ہے۔ اس سے باہمی اخوت ومحبت، اخلاص وہمدردی اور ایثار کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعمیر وترقی اور اصلاح کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون رہیں گے اور مختلف مراحل پر فلاح وبہبود کے کام عبادت کے طور پر سرانجام دیں گے۔ اسلامی تاریخ میں بہت سے ادارے اجتماعی اور انفرادی فلاح وبہبود کے کام انجام دیتے رہے ہیں اور انہوں نے حکومتوں کے ساتھ ساتھ بے شمار انسانی فلاح وبہبود کے کام بھی انجام دیئے ہیں۔

اس کا عملی مظاہرہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ میں نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ نے مکی دور میں زیادہ توجہ افراد کی ذاتی اصلاح، اخلاق واعمال کی درستگی اور تزکیہ نفس کی طرف فرمائی اور انہیں خوف خدا اور آخرت کی جواب دہی کا احساس دلایا[1] جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر فرد آسمان ہدایت کا درخشندہ ستارہ بن گیا[2]۔

یہ نبوی منہاج حکمران اور عوام الناس کو مشترک مقاصد کے لیے قوت اور خدمت خلق میں ایک دوسرے کا محتاج گردانتا ہے۔ ان دونوں کی منزل اور مقصد کو ایک ہی قرار دیتا ہے۔ اس طرح فرد اور مملکت میں حقوق وفرائض کا اشتراک، حاکم ومحکوم میں مقاصد ومفادات کی یکسانیت اور یکجہتی وہم آہنگی پیدا کرتا ہے پھر ریاست کا ہر ذی شعور فرائض حکومت کی بجا آوری میں معین ومددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس کی اگر یہ اخلاقی حس واقعتاً بیدار ہو جائے تو وہ مملکت کا ایک اہم رکن شمار ہوگا۔ ریاست فرد کی اس دلچسپی کو زندگی جو دوام بخشتی ہے اور ریاستی امور میں اس کے جواز کی صورت پیدا کرتی ہے۔

اس تناظر میں ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کارکنان حکومت کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے اور جب اس کی خدمات مطلوب ہوں تو ریاست کی خدمت پر اپنی ذاتی اغراض اور اپنی شخصی دلچسپیوں کو ترجیح نہ دے اور نہ اپنی کسی قابلیت وصلاحیت کو جس کی ریاست کو ضرورت ہو، اس سے دریغ رکھے۔

> "حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ محسوس کیا کہ لوگ حکومت کی ذمہ داریوں سے پہلو بچانے لگے ہیں تو آپ نے سب کو جمع کر کے ان کی ذمہ داری یاد دلائی کہ اگر آپ لوگ اس کام میں میری مدد نہیں کریں گے تو آخر میری مدد کے لیے کون لوگ آئیں گے۔ ان کی اس تقریر کے بعد سب نے اقرار کیا کہ ہم آپ کی امداد کے لیے دل وجان سے

۱۔ "لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوا عليهم آيته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة" آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعة ۶۲: ۲

۲۔ وقال رسول الله ﷺ أصحابي كالنجوم، فبأيهم اقتديتم اهتديتم. مشكوة المصابيح، باب مناقب الصحابة، الفصل الثالث، رقم الحديث: ۶۰۱۸

حاضر ہیں۔[1]

یہی خیر خواہی ہے جس کا حضرت عمرؓ نے لوگوں سے ان الفاظ میں مطالبہ فرمایا

"واعینونی علی نفسی بالامر بالمعروف والنهی عن المنکر واحضارا النصیحة فیما ولانی اللّٰه من امورکم"۔[2]

''اور میرے نفس کی کوتاہیوں کے معاملہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ سے میری ذمہ داریوں کے معاملہ میں حق خیر خواہی ادا کر کے میری مدد کرتے رہو"۔

اس احساس کی بنیاد پر صرف وہی لوگ ان ذمہ داریوں کو انجام دینے پر آمادہ ہوتے تھے جو فرض کی اہمیت کو پہچانتے تھے اور آخرت کی امید پر ایک عبادت کی حیثیت سے ان میں اپنے آپ کو کھپانے کے لیے تیار رہتے۔ اس کے بالکل برعکس یہ صورت عصر حاضر میں بمشکل ہی دکھائی دیتی ہے۔

اسلامی ریاست چونکہ شخصی، گروہی، خاندانی اور نسلی ریاست نہیں اور ہر مسلمان بحق نیابت الٰہی، امور مملکت میں شرکت کا پورا حق رکھتا ہے۔ سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا یہ حق عوامی شعور کو بیدار رکھتا ہے اور اس اصول کے ضمن میں جو امور لائق تحسین ہیں، اجمالاً ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

أ۔ اظہار رائے کی آزادی

اظہار خیال کی آزادی انسان کا فطری حق ہے کہ اس کی زبان بندی نہ ہو، اسے اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت ہو اور وہ حسب موقع دوسروں کے سامنے انہیں پیش کر سکے۔ اس سے خود بھی اسے فائدہ حاصل ہوگا اور ریاستی امور کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔

حاکم سے اختلاف کرنے، اس پر تنقید کرنے یا اس کے کسی فعل پر اس سے مؤاخذہ کرنے میں ہر فرد اخلاقی حدود کا پابند ہے، اس کی عزت نفس کا احترام کرے۔ کذب بیانی، افترا پردازی، طنز و تعریض، دشنام طرازی، بدزبانی اور بدگوئی جیسی اخلاقی خرابیوں سے اجتناب کرے۔

عہد نبوی اور خلفائے راشدین میں ہر فرد کو تنقید کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ عوام الناس اپنے اس حق کو بلا خوف و خطر استعمال میں لا سکتے تھے جس پر انہوں نے نہ تو کبھی کسی کا منہ بند کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کبھی بُرا منایا بلکہ معقول طریقہ سے جواب دینا اپنی ذمہ داری سمجھی تا کہ ملکی معاملات میں عوامی شعور بیدار رہے اور افراد جزو خاص کی حیثیت سے ریاست کے امور میں سرگرم رہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لمبی قمیص پہنی تو کسی نے اعتراض کیا کہ باقی لوگوں کی قمیص اتنی لمبی نہیں بن سکیں۔ آپؓ کی قمیص کس طرح لمبی بن گئی؟ حضرت عمرؓ کو اس اعتراض کا خود جواب دینا پڑا۔

"فالتفت عمر الی ابنه قائلا اجبه یا عبد الله، فقال عبدالله: لقد ناولته من بردی فاتم قمیصه منه. قال الرجل: أما الآن السمع والطاعة"۔[3]

۱۔ کتاب الخراج، ص ۶۵

۲۔ الفاروق عمرؓ ۲/۹۶

۳۔ ایضاً ۲/۲۱۴، ۲۱۵

ایک شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور بار بار کہتا جاتا تھا اے عمر! اللہ سے ڈر، لوگوں نے اسے ٹوکا، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"اسے مت روکو، یہ لوگ اگر ہمیں ایسی باتیں کہنا چھوڑ دیں تو پھر ان کا فائدہ ہی کیا؟ اور اگر ہم ان کی باتیں قبول نہ کریں تو ہمیں بھلائی سے عاری سمجھنا چاہیے" [1]

اسلامی مملکت میں یہ ساری روح نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کے نتیجہ میں رونما ہوئی:

"قل الحق وان کان مرّا" [2]

حق بات کہو چاہے وہ کسی کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔

مؤاخذے کا یہ حق اور اظہار رائے کی آزادی علی الاعلان حاصل تھی۔ وہ اسے رعایا کا حق تسلیم کرتے تھے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کا کھلے انداز میں اظہار کریں اور ناجائز امور پر کڑی نگاہ رکھیں۔

اس عمل میں بے پناہ حکمتیں پوشیدہ ہیں ایک یہ کہ عوام کے حکومتی معاملات میں شرکت کی صورت پیدا ہو، دوسرا یہ کہ معاملات کی اصلاح و بہتری کا سلسلہ جاری رہے، تیسرا یہ کہ حکومت کو اپنے اقدامات کا شرعی جواز ڈھونڈنے اور عوام کے سامنے اس کی وضاحت کا موقع مل جائے۔

۱۱۔ خدمت خلق کی عدم ادائیگی

اسلام اپنے ماننے والوں کو ایسی قیادت منتخب کرنے کی ہدایت کرتا ہے جو عوامی شعور کا ادراک اور ان کے مسائل حل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ جھوٹ، دغا بازی، منافقت اور وعدہ خلافی پر مبنی سیاست سے پاک ہو، دولت، اقتدار، جاہ و منصب کی حرص اور طمع سے بے نیاز اور خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہو کر میدان عمل میں اتری ہو۔

اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کا اسوہ صحیح نہج پر رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ سربراہ مملکت عوام الناس کا خیر خواہ اور حقیقی خادم قرار پائے۔

امام واقدی رحمہ اللہ نے آپ ﷺ کی عوام کے لئے ہمدردی، خیر خواہی اور خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"جب آپ ﷺ کے سامنے ہدایا، خمس، جزیہ اور مال غنیمت کا ڈھیر لگ جاتا تھا" [3] اور جب رب کریم نے آپ ﷺ کے واسطے زمین کے خزانے کھول دیئے [4] بلکہ زمین کے خزانوں کی چابیاں عنایت فرما دی تھیں پھر بھی آپ ﷺ عیش و آرام کے تمام مواقع میسر ہونے کے باوجود یہ دعا مانگ رہے ہیں:

"اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرلی فی زمرۃ المساکین" [5]

مولانا حامد الانصاری اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۶

۲۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الأداب، باب حفظ اللسان والغیبة والشتم، رقم الحدیث، ۴۸۶۶

۳۔ واقدی، محمد بن عمر، کتاب المغازی، مطبعة جامعة اکسفورد، ۱۹۶۶ء ۲/۹۴۳

۴۔ جامع صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما یحذر من زھرۃ الدنیا والتنافس فیھا، رقم الحدیث ۶۴۲۶

۵۔ سنن ابن ماجة، کتاب الزھد، باب مجالسة الفقراء، رقم الحدیث ۴۱۴۲۶ جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء ان فقراء المھاجرین یدخلون الجنة قبل اغنیائھم، رقم الحدیث: ۲۳۵۲

''آپ ﷺ نے عوام کی خدمت کو حکومت کے اوّلین قوانین میں سے ایک قانون قرار دیا۔ محنت طلب کاموں میں خود حصہ لیا اور اپنے گورنروں کو یہ ہدایت کی کہ عام شہری ناراض نہ ہونے پائیں۔ شہری مسلمان ہو یا غیر مسلم کوئی گورنر ان کے حقوق کو پامال نہیں کر سکتا''۔[1]

ڈاکٹر حمید اللہ نے نبی کریم ﷺ کی عوامی خیر خواہی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

''اپنی قوم کے ساتھ اخلاص اور خیر خواہی کا بے مثال طرز عمل آپ ﷺ نے اس وقت بھی نہ چھوڑا جب آپ دس لاکھ مربع میل کے واحد حکمران تھے''۔[2]

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے تذکرہ سے بھی عوامی خیر خواہی اور خدمت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ:

''امارت و حکومت کسی کی ذاتی صوابدید کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ اور بندوں کی ایک امانت ہے جو امیر مملکت کے پاس ہوتی ہے اور اس امانت کا حق اسی صورت میں ادا ہوگا کہ اللہ کا حکم نافذ کرے اور عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنائے''۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان بھی اس سلسلے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، وہ کہتے ہیں کہ

''حکمران کی ذمہ داری ہے کہ وہ حق امانت ادا کرے اور اگر وہ یہ حق ادا کرتا ہے تو عوام پر بھی اس کی اطاعت لازم ہو جاتی ہے''۔[4]

iii۔ حکمران پر مسئولیت کا حق

حکومت اور عوام اساس میں حاکم و محکوم کا سا نہیں بلکہ باہمی محبت اور یگانگت کا رشتہ مضبوط ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دونوں طبقے کلی طور پر اپنے فرائض سے آشنا ہوں۔

سربراہ مملکت کو یہ احساس لاحق ہو کہ حکومت و اقتدار ایک امانت ہے نہ کہ دوسروں کو غلام بنانے اور ان پر حکم چلانے کا نام ہے بلکہ یہ مسئولیت کا بڑا بوجھ ہے، جس کی طرف حضور ﷺ نے صحابہؓ کو متوجہ فرمایا

''جس بندہ کو اللہ رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی پوری پوری خیر خواہی نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا''۔[5]

نیز فرمایا:

"ما من امام يغلق بابه دون ذوي الحاجة والخلّة والمسكنة الا أغلق الله ابواب السمآء دون خلته وحاجته ومسكنته"[6]

''جو حکمران ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر دے گا''۔

۱۔ اسلام کا نظام حکومت، ص ۱۱۳

۲۔ عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، ص ۳۳۳

۳۔ حجة الله البالغة، ۲/۱۵۰

۴۔ کتاب الأموال، ص ۶

۵۔ جامع صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب من استرعی رعیة فلم ینصح، رقم الحدیث ۷۱۵۰

۶۔ جامع ترمذی، کتاب الاحکام، باب ما جآء فی امام الرعیة، رقم الحدیث ۱۳۳۲

رسول اکرم ﷺ نے حکمران طبقہ اور رعایا کے باہمی تعلق کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی ہدایت ان الفاظ میں دی ہے کہ:

"تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، جن کو تم دعا دو اور وہ تمہیں دعا دیں اور تمہارے بدترین حکمران وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور جن پر تم لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں"۔[۱]

ایک مرتبہ حضور ﷺ کو ایک عورت نے اپنے کسی کام کے بارے میں کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تم اپنے کام کے لئے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں، چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دیا۔[۲]

یہ باہمی رشتہ اس صورت میں مستحکم ہوتا ہے جب حکومت اور رعایا میں کوئی خلیج حائل نہ ہو، اور حاکم تک ایک عام آدمی کی رسائی بھی ممکن ہو۔

۱۷۔ تعیش و تنعم سے اجتناب

اسلامی ریاست کے حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ عوام کی سطح پر سادہ طرز زندگی کی حکمت عملی اختیار کرے۔ تکلفات، نمود و نمائش اور اسراف جیسی بری عادات چھوڑ کر افراد کو پستی اور پسماندگی کا شکار ہونے سے بچائے۔

حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے اپنے عہد اقتدار میں سادگی و خاکساری کی عظیم مثالیں قائم کیں:

جب حضور ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف گورنر بنا کر بھیجا تو آپ ﷺ نے انہیں عیش و عشرت اور تنعم سے بچنے کی تاکید کی:

"عن معاذ بن جبل: أن رسول الله ﷺ لما بعث به الى اليمن قال اياى والتنعم فان عباد الله ليسوا بالمتنعمين"[۳]

اسی طرح نبی رحمت ﷺ نے ایک صحابی کے مکان پر بالاخانہ کو ناپسند فرمایا

"ان رسول الله ﷺ خرج فرأى قُبَّةً مُشْرِفَةً، فقال: (ما هذه؟) قال لهٗ اصحابهٗ: هذه لفلانٍ"[۴]

مؤرخ مسعودی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سادگی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"آپ ﷺ کے کھانے میں جس قدر خشونت تھی اور جس قدر موٹا جھوٹا کھاتے تھے اس طرح لباس بھی بے حد معمولی اور عام کپڑے کا ہوتا۔ حالانکہ ذاتی آمدنی بھی حضرت ابوبکرؓ کے پاس کم نہ تھی لیکن تواضع اور سادگی پسند تھے۔ عرب کے امراء اور یمن کے بادشاہ آپ سے ملنے آتے تو بہترین حلے، منقش سنہری بوٹیوں کی چادریں، اور زرنگار تاج پہن کر آتے، یہ لوگ آپ کی سادگی اور معمولی لباس کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے اور متاثر اس قدر ہوتے کہ وہی سادگی اختیار کر لیتے"۔[۵]

ایک شخص نے حضرت عمرؓ کے معمولی کھانے کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بیت المال کا اگرچہ میں مالک ہوں مگر اس کی ملکیت

۱۔ جامع صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب خيار الائمة وشرارهم، رقم الحديث: ٤٨٠٤

۲۔ جامع صحيح مسلم، كتاب الزكوة، باب فضل النفقة والصدقة على الأقربين، رقم الحديث ٢٣١٨

۳۔ المسند لاحمد بن حنبل، مسند الانصار، حديث معاذ بن جبل، رقم الحديث: ٢٢١٦٦

۴۔ سنن ابى داؤد، كتاب الأدب، باب فى البناء، رقم الحديث: ٥٢٣٧

۵۔ مروج الذهب ومعدن الجوهر، ١/٤١٣

میری اپنی ذات کے لئے نہیں ہے۔ میری مثال ان چند مسافر رفقاء کی ہے جنہوں نے اپنے اپنے زادِ راہ کو ایک معتبر رفیق کے سپرد کیا ہے ان سب کے حسب ضرورت خرچ کرے تو کیا یہ جائز ہوگا کہ ان کے خرچ میں سے کچھ اپنے لیے بچا کر مخصوص کرے اس نے کہا نہیں اے امیر المومنین "قال کذلک مثلی و مثلھم" فرمایا بس میری اور امت مسلمہ کی مثال یہی ہے"۔[1]

سادہ طرز زندگی اختیار کرنے کے لئے سرکاری سطح پر منعقد کی جانے والی شاہانہ تقریبات بلا ضرورت اور بے مقصد سرکاری دوروں، سرکاری عمارتوں کی آرائش و تزئین اور سامان تعیش پر پابندی لگائی جائے جن پر ملکی خزانے کا بڑا حصہ خرچ ہوتا ہے اور صرف ضروری اخراجات پر روپیہ خرچ کیا جائے۔ اگر حکمران طبقہ لفظی اپیل کی بجائے عملاً سادہ طرز زندگی اختیار کریں تو یقیناً عوامی زندگی پر بھی اس کے مثبت اثرات پڑیں گے۔

۷۔ حکومتی سطح پر احتساب کا حق

"حکومت کی رائے اور پالیسی سے اختلاف کرنا ہر فرد کا قانونی حق ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ فتنہ و فساد کی حد تک نہ پہنچنے پائے کیونکہ از روئے قرآن یہ قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے"۔[2]

اختلاف و احتساب بغاوت پر مبنی نہ ہو۔ بغاوت اور خروج صرف اس وقت جائز ہے جب اصلاح احوال کی ساری تدبیریں ناکام ہو چکی ہوں۔

سربراہ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اہم ریاستی اور عالمی امور پر عوامی نمائندوں کو اعتماد میں لے۔ بحث و تمحیص کے ذریعہ ان کا نقطہ نظر معلوم کرے اور مسائل کو ذاتی پسند و ناپسند کی بجائے باہمی مشورے سے طے کرے۔ اصحاب اقتدار کو ان کی غلطیوں پر ٹوکنا اور ان کا احتساب نہ صرف ارکان شوریٰ بلکہ عام کا بھی حق ہے۔ عوام میں سے صرف وہ لوگ اس کے حق بجانب ہیں جو تقویٰ شعار، صاحب کردار، صاحب علم اور اہل الرائے ہوں۔ اس سے حاکم اور محکوم کے درمیان محبت کی فضا قائم ہوگی۔ اور رعایا اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگی۔

اس ضمن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تاریخ ساز خطبہ عصر حاضر کے حکمرانوں کے لئے رہنمائی کا ایک اہم ذریعہ ہے، جس میں آپؓ رعایا کو احتساب کا حق فراہم کرتے ہیں:

"لوگو! مجھے تم پر حکمران مقرر کیا گیا ہے، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھائی کی راہ پر چلوں تو میری مدد کرنا اور اگر برائی کی راہ پر چلوں تو مجھے پکڑ کر سیدھا کر دینا"۔[3]

حضرت عمرؓ نے خلیفہ اول ابوبکر صدیقؓ کے اسی اصول کو بنیاد بناتے ہوئے فرمایا

اللہ اس شخص پر رحم کرے جو میرے عیوب پر مجھے مطلع کرتا ہے۔

کان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یقول: رحم اللہ امرءاً أھدی الی عیوبی.[4]

"ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حق مہر کی رقم کو مقرر کرنا چاہا کہ لوگ اس میں افراط کا شکار ہو رہے ہیں۔ اسی دوران ایک

۱۔ الطبقات الکبری، ۱۴۹/۳

۲۔ البقرۃ ۲: ۲۱۷

۳۔ سیوطی، جلال الدین، عبد الرحمن، تاریخ الخلفاء، الناشر انتشارات الشریف الرضي، الطبعة الأولى، ۱٤۱۱ھ، ص ٦۹

٤۔ طرطوشي، أبو بکر محمد بن محمد، سراج الملوک، طبع المکتبة المحمودیة التجاریة، الجامع الازھر، القاھرۃ، مصر، ۱۹۳۵ء، ۱۵۰

عورت نے ٹوکا اور کہا: "ایعطینا اللہ قنطاراً و یمنعنا عمرُ؟"

کہ اللہ نے ہمیں خزانہ نہیں دیا اور عمرؓ نے اسے ہمارے لئے روک دیا"۔

عمرؓ نے اس پر دلیل مانگی تو عورت نے سورۃ النساء کی آیت مبارکہ پڑھی۔

"آیت کے سننے پر حضرت عمرؓ تھوڑی دیر خاموش رہے اور دل میں اس معاملے کو سوچا، معلوم ہوا کہ عمر سے غلطی ہوئی اور عورت نے درست کہا"۔[۱]

اسلامی حکومت کے سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ ان میں اس بات کی گہری خواہش موجود رہے کہ رعایا ان کی غلطیوں اور کمزوریوں پر ان کو ٹوکتے رہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لئے افراد کو مختلف طریقوں اور قوانین کے ذریعے دہشت زدہ کرنے کی بجائے ان پر لازم ہے کہ وہ اس کے لئے رعایا کو اکساتے رہنے کا سامان کریں۔ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کو کوئی خاص ضرورت در پیش ہو، کسی نے اس پر ظلم کیا ہو، حکومت کے کسی کارکن کے سلوک سے اس کو تکلیف پہنچی ہو یا خود حکومت کے امیر سے اس کو کوئی شکایت ہو تو اس معاملہ کو براہ راست امیر یا کسی متعلق عہدہ دار کے علم میں لائے۔

۱۔ الجامع لاحکام القرآن، ۸۹/۳، ۹۰ و ایضاً۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں تم کو مہر کی کثرت سے منع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن قرآن مجید کی آیت "وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا" (النساء ٤ : ٢٠) میرے سامنے آگئی۔
پانی پتی، ثناء اللہ، عثمانی، تفسیر مظہری، ناشر سعید ایچ ایم کمپنی، چوک کراچی، ۱۹۸۰ء، ۲/ ۵۲۳ و ایضاً، جامع ترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء فی مهور النساء، رقم الحديث: ١١١٤

باب سوم

داخلہ پالیسی کے حوالے سے اعضائے ریاست کا باہم تعلق

فصل اول: انتظامیہ مقننہ اور عدلیہ کے دائرہ کار اور دائرہ اختیار

فصل دوم: داخلی استحکام کے لئے اداروں (انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ)
کی باہمی مداخلت کے اختیارات کا جائزہ

فصل سوم: مرکز اور صوبوں کے تعلقات کی نوعیت

اعضائے ریاست ____ تاریخی پس منظر

ہر مملکت اپنے دستوری ڈھانچے کی بنیاد تین اجزاء پر رکھتی ہے۔ جن میں مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ شامل ہیں۔ قرونِ اوائل سے ہی ان تینوں شعبوں کا ڈھانچہ موجود تھا۔ لیکن اس کی شکل منفرد اور مخصوص تھی۔ چنانچہ عاملہ (انتظامیہ) کی شکل خلافت کے ادارہ کی صورت میں قائم تھی۔ جب کہ خلیفہ کی معاونت کے لئے مشاورت کا ادارہ قائم تھا۔ یہ ادارہ جدید کابینہ اور مجلس قانون سازوں کا متبادل تھا۔ اسی عہد میں عدلیہ کا محکمہ بھی قائم کیا گیا تھا تاہم ان اداروں کو ان کی روایتی شکل کے حوالے سے جدید اداروں سے مکمل طور پر مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن بعض پہلوؤں کے اعتبار سے ان کے مابین مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:

"In the early middle ages, Judicial functions were not separated from the legislature or Executive ones, all Govt. "(1)

پہلے ادوار میں عدالتی شعبے تمام حکومتوں میں مقننہ یا انتظامیہ سے علیحدہ نہ تھے۔

Aegidious نے رائل حکومت کا اپنے طریقے سے ایک متاثر کن تجزیہ اختیار کیا۔ جس کے عناصر یہ تھے۔

"The state must be ruled acording to just laws and these the Prince Enacts, the senate devises and Judiciary. "(2)

ریاست میں منصفانہ قوانین کے مطابق حکمرانی ہو اور ان شاہی قوانین میں سینٹ کی تجویز اور عدلیہ شامل ہے۔

Aegidious نے ریاست کے متعلق بتایا ہے کہ ریاست میں قانون کے ذریعے حکومت کی جاتی ہے اور اس کے لیے اس نے Prince Enacts کا لفظ استعمال کیا ہے اور Senate کے لفظ کو Executive انتظامیہ سے موسوم کیا ہے۔ اس طرح اس نے ریاست کے تین ستونوں میں مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کا ذکر کیا ہے۔

ارسطو نے چوتھی صدی قبل مسیح میں غالباً پہلی دفعہ، عام قوانین اور ریاست کے آئین و دستور کا فرق واضح کیا اس کے مطابق آئین ریاست کے مختلف اداروں کی تنظیم اور ان کے باہمی ربط کے قواعد اور دائرہ کردار کے اصول کا مجموعہ ہوتا ہے۔[3]

مائیکل ہڈسن عرب کے قدیم طرزِ حکومت کے متعلق لکھتے ہیں

The ideal Arab monarchy, perfectly legitimized, entirely congruent with the values of the traditional political culture, would be an Islamic theocracy governed by the ablest leader of a tribe tracing its lineage to the prophet. The ruler would be guided by the substantive ethic of Islam and by the patriarchal consultative procedures of tribal decision-making. The ruler's authority would rest not only on this

---

(1) Encyclopedia Britannica P-641

(2) Dunning, William, Archibald, A History of Political Theories, Ancient, Mediaeval, Macmillan, Company London, 1930, P-210

(3) Aristotles, Politics (Translated by Benjamine Jowett), Press Clarendon Oxford University, London, 1948, Book-II, P-54

coercive power but in the respect of his people for a leader on the right path (the Sunna) By this legitmate behavior alone, he would earn the deference of his people and thus acquire authority.(1)

عرب کے تصور ملوکیت میں قانون سازی مکمل طور پر روایتی سیاسی ثقافت کی اقدار کے موافق تھی۔ جس میں اسلامی حکومت میں حکم قبیلہ کا پیغمبری شجرۂ نسب رکھنے والا قابل ترین (حکمران) فرد حکمرانی کرتا تھا۔ وہ اسلام کے بنیادی ضابطۂ اخلاق اور بزرگوں کے مشورتی طریقوں سے رہنمائی حاصل کرتا تھا۔ اُس کا اختیار نہ صرف جابرانہ ہوتا بلکہ وہ صراطِ مستقیم (سنت) پر رہنمائی کے لئے اپنے لوگوں کا احترام بھی کرتا تھا۔ قانون سازی کے اِس رویہ کی وجہ سے وہ عوام سے عزت واحترام اور اسی طرح کے دیگر اختیارات حاصل کر لیتا تھا۔

قرآن کریم نے قدیم بادشاہوں کے ذکر میں ایسے ادارے یا مجلس کو ملأ قوم، کے نام سے یاد کیا ہے اور آج کے دور میں یہی ادارہ پارلیمنٹ کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر منیر العجلانی نے ان اداروں کی تاریخی حیثیت کو یوں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں

كان الناس اول الامر يحلّون خصوماتهم بطريقة التحكيم التى عرفوها فى الجاهلية وكانوا بالخيار بين القبول بقضاء الحكم اوَرَفضه حتىٰ ان بعضهم احتكم الى رسول الله صلى الله عليه وسلم نفسه ولم يرض بحكمه[۲] فنزلت هذه الآية ﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾[۳]

شروع شروع میں لوگ اپنے جھگڑوں کا فیصلہ پنچایت کے طریقہ سے کرتے تھے جو انہوں نے زمانہ جاہلیت ہی سے سیکھ رکھا تھا، اور پنچایت کا فیصلہ ماننے یا رد کرنے میں وہ آزاد تھے، یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے اپنا مقدمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے راضی نہ ہوا، چنانچہ یہ آیت طیبہ نازل ہوئی۔ قسم ہے آپ کے پروردگار کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرا دیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی حکومت کے بارے میں قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ

"ومن معجزاته الباهرة ما جمع الله له من المعارف والعلوم، وخصه من الاطلاع علىٰ جميع مصالح الدّنيا والدّين، ومعرفته بأمور الشّريعة، وقوانين دينه، وسياسة عباده، ومصالح أمته." [۴]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری معجزات میں سے یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام علوم ومعارف جمع

(1) Hudson, Michael, Legitimacy in Arab Politics, Press Oxford University London, 1977, P-167

۲۔ العجلانی، دکتور، منیر، عبقرية الاسلام فى عهدالحكم، جامعة دمشق، س ن۔

۳۔ النساء۴:۶۵

۴۔ عیاض، قاضی، شهاب الدين، احمد، الشفاء، الناشر المكتبة السلفية، س ن، ۲/۲۸۹

کئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین و دنیا کے تمام مصالح کے علم کے ساتھ خاص کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے کاموں، شریعت، دین کے قوانین اور لوگوں کی سیاست کی معرفت دی۔

اس ضمن میں سید ناصر لکھتے ہیں:

"During the early Islamic days, the prophet Muhammad (PBUH) who was noted for his piety, honesty and integrity throughout Arabia, served as the supreme judge of Muslims." (1)

اسلام کے ابتدائی دنوں میں حضرت محمد ﷺ اپنی پرہیزگاری، ایمانداری اور دیانت داری میں پورے عرب میں معروف شخصیت تھی۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے اعلیٰ جج کی حیثیت سے کام کیا۔

مزید برآں سید محمد ناصر عہد فاروقی کے نظام حکومت میں شعبہ عدلیہ کے متعلق لکھتے ہیں

"The second caliph of Islam is particularly known for his partial justice. Justice during his reign was administered by Qazis who were appointed by caliph and were free from the control of the governors."(2)

اسلام کے خلیفہ ثانی خاص طور پر اپنے جانبدارانہ انصاف کی وجہ سے معروف تھے۔ آپؓ کے عہد حکومت میں عدلیہ کا انتظام قاضی چلاتے تھے۔ جن کو خلیفہ مقرر کرتا تھا اور وہ گورنروں کے تسلط سے آزاد ہوتے تھے۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے بعد کے دور میں اسلام میں قانون سازی کی روایت کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ رہی کہ یہ کام ریاستی عمل دخل سے باہر نجی و خانگی طور پر علماء و فقہاء کے ہاتھوں انجام پایا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں:

"قانون سازی حکومت و ریاست کا اجارہ (monopoly) نہیں رہی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فقہاء پوری آزادی کے ساتھ قانون کی ترقی میں مشغول رہے، قانون سازی صرف حکومت کی پارلیمنٹ تک محدود نہیں رہی ورنہ اسلامی قانون کی ترقی اس طرح نہیں ہو سکتی تھی جس طرح عمل میں آئی۔"(3)

انیسویں صدی میں اکثر مسلم ممالک پر مغربی استعماری طاقتوں کے تسلط سے مسلمانوں کے روایتی قانونی ڈھانچے میں دور رس تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ استعماری قوتوں نے اپنے مقبوضات میں قانونی و عدالتی نظام کو از سرِ نو تشکیل و ترتیب دیا، چنانچہ شخصی قوانین کے علاوہ زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل طور پر مغربی قوانین رائج ہو گئے۔(4)

---

(1) Nasir, Syed, Mohammad, Islam its concept and History, Mansoor Book Lahore, 1985, P-150

(2) Ibid

(3) خطبات بہاولپور، ص۱۴۷

(4) J.N.D. Anderson, Islamic Law in the Modern World, Stevens Sons, London, 1959, PP. 17-21.

بیسویں صدی کے ربع اول کے اختتام پر خلافت کی تنسیخ اور ترک سیکولر جمہوریہ کے قیام کے بعد تو اسلامی قانون و شریعت کو ریاست سے بے دخل کر کے اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں مغربی قوانین بنا لئے گئے۔(۱)

بعد ازاں مصر، شام، لبنان، عراق، مراکش وغیرہ دیگر ممالک میں بھی مغربی طرز کے قانونی ضابطے درآمد کر کے نافذ کیے گئے۔(۲)

اس نئی صورت حال میں مسلمانوں کے روایتی قانونی نظام میں بھی بعض اہم تبدیلیاں آئیں۔ ایک بڑی اہم تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ ریاستی و حکومتی عمل دخل سے آزاد نجی قانون سازی کی بجائے ریاستی اور عدالتی قانون کا آغاز ہوا، جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی قانون کے بننے اور اس کے نافذ العمل ہونے کے لیے ریاست کی باقاعدہ منظوری ہوگی۔ یہ منظوری قانون ساز اداروں کے ذریعے حاصل ہوتی تھی۔

حکومت و اقتدار ایک وحدت ہے جس کا مظہر یہ تینوں اعضاء ہیں۔ ان تینوں کے مخصوص شعبوں میں وظائف ہیں لیکن یہ تمام شعبے ایک دوسرے سے منسلک اور مربوط ہیں۔ یہ اعلیٰ ترین حکومتی اعضاء نہ ایک دوسرے کے ماتحت ہیں نہ ایک دوسرے کے عمل دخل سے کلی طور پر آزاد، ان تینوں کے مابین تصادم و تعارض نہیں بلکہ تعاون و تلازم ہے۔

انتظامیہ کا دائرہ کار اور دائرہ اختیار:

انتظامیہ کا معنی و مفہوم:

حکومت کا اہم صیغہ (Organ) عاملہ یا انتظامیہ (Executive) ہے۔ اس کا کام ملک میں قوانین کا نفاذ کرنا اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

ڈاکٹر ثروت بدوی انتظامیہ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

"یقصد بالسلطة التنفیذیة فی الدولة المعاصرة، الهیئة الحاکمة التی تقوم بتنفیذ القوانین وتسییر الادارة والمرافق العامة." (۳)

عصری حکومت میں تسلط قائم کرنے کا ارادہ کرنا یعنی حکومت کا ڈھانچہ وہ ہے جو قوانین کا نفاذ کرے، اداروں کو چلائے اور عام لوگوں کے مصالح کا خیال رکھے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں انتظامیہ سے مراد یہ ہے کہ:

"Connected with government, governmental agencies and actions."(4)

اس ضمن میں انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار لکھتے ہیں۔

"Administration is to "Carry out" or "execute" or "implement" policy decisions, or to coordinate activity in order to accomplish some common purpose, or simply to achieve cooperation in the pursuit of

---

(1) Niyazi Berkes, The Development of Secularism in Turkey, Montreal. McGill University, 1964, (Chaps 4-8 and 12-17)

۲۔ محمصانی، فلسفہ شریعت اسلام (مترجمہ مولوی محمد احمد رضوی) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۹۳-۱۱۳۔

۳۔ بدوی، ڈاکٹر، ثروت، النظم السیاسیة، طبع دار النهضة العربیة، س ن، ص ۱۵

(4) Oxford Advanced Learner's Dictionary, P 672.

a shared goal."(1)

انتظامیہ سے مراد پالیسی فیصلوں کی تعمیل کرنا یا تکمیل کرنا یا عمل درآمد کرنا یا چند مشترک مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی سرگرمی کو مربوط کرنا یا محض باہمی مقصد کے حصول کے لئے تعاون حاصل کرنا ہے۔

پروفیسر ایچ۔ جے لاسکی لکھتے ہیں:

"حکومت کے انتظامی شعبے کو انتظامیہ (Executive) یا عاملہ کہتے ہیں اس کا کام مقننہ یا شوریٰ کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ کرنا ہے۔"۲

مندرجہ بالا آراء سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انتظامیہ حکومت کی عوامی پالیسیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ عوام سے متعلقہ منصوبوں، عوامی مسائل اور عوام کے معاملات و ضروریات پر مشتمل اصول و ضوابط اور پالیسیوں پر عاملہ کے ذریعے ہی عملدرآمد کیا جاتا ہے۔ وسیع معنی میں انتظامیہ کا کام حکومتی امور کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے سرانجام دینا ہے جس میں حکومت کے کسی شعبے کی تخصیص نہیں اور محدود معنی میں نظریہ کسی انتظامیہ شعبے کے دائرہ کار کو ظاہر کرتی ہے۔

انتظامیہ کی ضرورت و اہمیت:

نظم مملکت میں وزراء کی وہی اہمیت ہے جو جسم انسانی میں اعضاء و جوارح کی ہے۔ جس طرح جسم انسانی ان اعضاء کے بغیر کام نہیں کر سکتا اسی طرح سربراہ ریاست بھی وزراء اور انصار و اعوان کے بغیر حکومت کا نظم و نسق نہیں چلا سکتا۔ سربراہ مملکت حکومت میں امت کا مقرر کردہ نائب ہوتا ہے وہ حکومتی ذمہ داریوں کا بوجھ اکیلا نہیں اٹھا سکتا اس لئے ضروری ہے کہ وہ حکومتی معاملات میں ایسے مسلمانوں کا انتخاب کرے جو عادل اور نیک ہوں۔ حکومتی معاملات اور نفاذ شریعت کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکیں اور ملکی معاملات میں سربراہ مملکت کا ہاتھ بٹا سکیں۔

اس سلسلہ میں علامہ ظاہر قاسمی لکھتے ہیں کہ:

"لا يُسْتَطَاعُ السُّلْطَانُ إِلَّا بِالْوُزَرَاءِ وَالْأَعْوَانِ وَلَا تَنْفَعُ الْوُزَرَاءُ إِلَّا بِالمودة وَالنَّصِيْحَةِ "۳

وزراء اور اعوان کے بغیر حکومت کا نظم و نسق نہیں چلایا جا سکتا اور وزراء محبت اور خیر خواہی کے بغیر حکمران کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

مزید برآں لکھتے ہیں:

"حکمران کے ہم نشین مجلس کی زینت ہوتے ہیں اور رعایا کی زبان ہوتے ہیں۔"۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں انتظامیہ سربراہ مملکت کی مددگار کی حیثیت سے سامنے آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومتی معاملات میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کو بطور معاون منتخب کیا اور مملکت کے اہم امور میں آپ صلی اللہ علیہ ان سے مدد لیتے۔

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ:

"وَزِيْرَایَ مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ فَأَبُوْبَكْرٍ و عمر."۵

---

(1) Sius, L, David, International Encyclopedia of the Social Sciences, The Macmillan Company and the Free press, America, 1968, Vol-1, P-61

(2) Lasku, Harold, J, A Grammer of politics, George Allen and Unwin Ltd. London, 1967, P 356

۳۔ قاسمی، ظافر، نظام الحكم في الشريعة والتاريخ، دار النفائس، بيروت، س۔ن، ص ٤٢٢

۴۔ ایضاً

۵۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، مناقب ابی بکر، رقم الحدیث ٣٦٨٠

یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انتظامیہ تھی مگر یہ حضرات وزارت کے موجودہ تصور کی طرح وزیر نہیں تھے جیسا کہ ہر وزیر کا ایک متعین شعبہ ہوتا ہے مگر یہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار تھے کیونکہ لفظ وزیر کے معنی مددگار کے ہیں۔

انتظامی معاملات میں مختلف علاقوں کی ضروریات مختلف ہو سکتی ہیں۔ خاص قبائلی معاشرے میں اگر کچھ چیزیں قابل عمل ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ ایک شہری علاقے میں بھی قابل عمل ہوں لیکن اصول اور کلیات ایسے ہونے چاہئیں جو دونوں جگہ یکساں طور پر قابل عمل ہوں۔

گلیڈن لکھتے ہیں:

"Administration is essentially a matter of human relationships. Its primary concern is with persons rather than with things. Things can be arranged, used or manipulated through human agency but not administered."(1)

انتظامیہ لازماً انسانی تعلقات کا معاملہ ہے۔ اس کا بنیادی مقصد چیزوں کی بجائے افراد سے وابستہ ہے کسی انسانی ایجنسی کے ذریعے سے چیزوں کو ترتیب تو دیا جا سکتا ہے، استعمال میں لایا جا سکتا ہے یا خوش اسلوبی سے کرایا جا سکتا ہے لیکن منظم نہیں کیا جا سکتا۔

سید محمد حیدر کے خیال میں انتظامیہ کا کردار، انتظامی امور کے ہر پہلو میں مداخلت کی بنیاد پر مرکزی حیثیت رکھتا ہے

"The role of Executive is central in the administrative process for the executive is involved in all aspects of administration."(2)

انتظامیہ کا کردار، انتظامی امور میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انتظامیہ نظم و نسق کے ہر پہلو میں شامل ہوتی ہے۔

انتظامیہ اپنی اہمیت کی بناء پر ملک کی ترقی اور استحکام میں سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ مجلس شوریٰ قوانین بناتی ہے۔ دستوری قوانین کے علاوہ جتنے بھی قوانین بنائے جاتے ہیں وہ بھی انتظامیہ ہی کی مستعدی کا مظہر ہوتے ہیں۔ سربراہ ریاست عوامی ضروریات و مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے شوریٰ میں قانون سازی کے لیے تجاویز پیش کرتا ہے اور جو عوامی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں ان کے عملی نفاذ کا اہم فریضہ بھی انتظامیہ ہی انجام دیتی ہے۔ منتظم اعلیٰ کے ساتھ ساتھ پورا انتظامی ڈھانچہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

انتظامیہ کا دائرہ کار اور دائرہ اختیار:

اسلامی مملکت میں حکومت کا ماخذ شریعت ہے بلکہ حکومت محض شریعت کا نمائندہ اور اس کی خادم و پاسبان ہے۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو اسے قوی اور وسیع الاختیار ہونا چاہیے تاکہ شریعت سے جس قدر فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ان کی پوری طرح کفیل ہو۔ حکومت کیسی ہی نیک نیت اور قوم کی بہی خواہ کیوں نہ ہو۔ اگر قوت و اقتدار نہیں رکھتی تو زمین شور کی مثل ہے جس میں کوئی پھل نہیں۔ اسلامی ملک میں حکومت کے پاس لازمی طور پر تمام ایسے اخلاقی، مادی اور تمدنی وسائل مہیا ہونے چاہئیں جو اس کے خاطر خواہ اور دیرپا کام کرنے کے لیے درکار ہیں۔ وگرنہ اسلامی مملکت مختلف قسم کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل سے دوچار ہو جائے گی۔

علامہ اسد کے نزدیک اسلامی ریاست میں تمام حاکمانہ وظائف و اختیارات امیر کو حاصل ہونے چاہئیں اور وہیں مجلس شوریٰ کے

(1) Gladden, E.N., The Essentials of Pulbic Administration, Staples Press Limited, London, 1966, P 21.

(2) Haider, S.M, Administrative Responsibility, Publisher West Pakistan Academy for village Development, Peshawer, 1961, P-20

روبرو اور مجلس کے ذریعے سے عوام کے روبرو کاروبار مملکت کے لیے جواب دہ ہوگا اسد کی رائے میں امیر امور مملکت میں اپنی معاونت کی غرض سے وزراء کو بھی مقرر کرسکتا ہے ابتہ ان وزراء کی حیثیت امیر کے انتظامی معاونین یا سیکرٹریوں کی ہونی چاہیے۔ جنہیں وہ اپنی صواب دید کی بناء پر مقرر کرے اور وہ اسی کے سامنے جواب دہ ہیں۔۱

انتظامیہ میں میں سب سے اہم عہدہ سربراہ مملکت کا ہے۔ اسلامی ریاست میں انتظامیہ کے سربراہ کو باقی سربراہان مملکت کے مقابلے میں کچھ اختیاری اختیارات حاصل ہوتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ سربراہ انتظامیہ بالکل جداگانہ نوعیت کے فرائض و اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر مصلح الدین رقمطراز ہیں کہ

"The executive needs no clarification as it is concerned with the carrying out of the law of God which is complete in itself and punishments are well defined. In case there is any difficulty the Rule of Necessity may be invoked."(2)

انتظامی تقاضے اس طرح واضح نہیں ہیں جیسے اللہ کے قانون کی تعمیل میں فکرمند ہونا۔ جو کہ فی نفسہ مکمل ہے اور سزائیں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ اس معاملہ میں کوئی بھی مشکل "اصول ضرورت" کو پورا کرسکتی ہے۔

سربراہ کے اختیارات اس کے عہدے کے حوالے سے نہیں ہوتے بلکہ تفویض ہوتے ہیں وہ اللہ کا نائب اور تمام لوگوں کے اختیارات کا امین ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کے سامنے بھی جواب دہ ہے اور عوام بھی اس کا مواخذہ کرنے کا مکمل اختیار رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں امام ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ:

"لما في طباع العقلاء من التسليم لزعيم يمنعهم من التظالم و التخاصم، ولو لا الولاة لكانوا فوضى مهملين، وهمجاً مضاعين." ۳

اہل خرد فطری طور پر اپنے معاملات و مسائل ایسے سربراہ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے پر ظلم سے روکے اور ان کے تنازعات میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اگر کسی معاشرے میں اس طرح با اختیار افراد متعین نہ کیے جائیں تو معاشرہ ابتری اور انارکی کا شکار ہوجائے گا۔

مزید برآں ابن خلدون انتظامیہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"وله على كلّ حال مراتب خادمة و وظائف تابعة تتعين خططا وتتوزع على رجال الدولة وظائف فيقوم بذلك أمر الملك ويحسن قيامه بسلطانه." ۴

حکومت کا کام انجام دینے کے لیے ذیلی مناصب اور صیغے ہوتے ہیں اور مختلف کام اراکین حکومت پر بٹے ہوئے ہوتے ہیں جس سے خلیفہ اپنے فرائض سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہو پاتا ہے۔

اسلام ریاست کے عمل اور نظریاتی پھیلاؤ کے حق میں ہے تاکہ مملکت کی اجتماعی زندگی کو برقرار رکھنے اور فرد کی شخصیت کو فروغ دینے کی

۱۔　اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول، ص ۲۷

(2)　Muslehuddin, Dr., Muhammad, Islam and its Political System, Publisher, Dr Muslehuddin, Islamic Trust International Islamic University Islamabad, 1988, P-67

۳۔　الاحكام السلطانية، ص ٦٣

۴۔　المقدمة ابن خلدون، ۲/ ١٠٢

خاطر ہر ضروری عمل کے لیے ایک ضروری ادارہ باقاعدہ طریقہ سے متوازن دیا جائے۔ جس کے ذریعے وہ عمل بے کم و کاست جاری رہے۔

مذکورہ تینوں کاموں کو سرانجام دینے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ انتظامیہ ہی اہم کردار ادا کرتی ہے جہاں تک پہلے کام کا تعلق ہے یعنی پالیسی سازی، تو اس بارے میں اگرچہ دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک کے مطابق یہ صرف اور صرف سیاستدانوں کا کام ہے۔ دوسرا یہ کہ سیاست اور انتظامیہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے۔(1)

سید حیدر انتظامیہ کے اہم عناصر کو یوں بیان کرتے ہیں:

"The function of the executive in every social set up are control, management, supervision and administration. Three functions are exercised not merely by high officials in an organization but by all those who are in positions of control of what over degree." (2)

ہر اعلیٰ معاشرے میں انتظامیہ کے کام، نظم و نسق، انتظام و انصرام، دیکھ بھال اور ضبط کرنا ہے۔ یہ تینوں شعبہ جات ایک تنظیم میں نہ صرف اعلیٰ دفتری کام سرانجام دیتے ہیں بلکہ وہ تمام اعلیٰ درجہ کے ضبط کا اختیار رکھتے ہیں۔

انتظامی ڈھانچے میں ملک کی مرکزی حکومت، صوبائی حکومتوں اور علاقائی و مقامی ادارات کے علاوہ عوامی بلدیات بھی شامل ہیں جن پر حکومت کا خاصا کنٹرول ہوتا ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انتظامیہ کو وسیع انسانی اور مادی ذرائع درکار ہوتے ہیں۔ جن کو منظم کر کے مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا مملکت کے تمام مادی وسائل کو ممکنہ صورت میں بروئے کار لانا اور افرادی قوت کو استعمال کر کے ملکی ضروریات اور ترقی و استحکام کے لیے قابل عمل بنانا انتظامیہ کا دائرہ کار ہے۔ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو حکومت کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرنے کے علاوہ اس کے اداروں کے منتظمین کے ان اختیارات کا تعین بھی کرتی ہے جن کے تحت حکومت کی طاقت استعمال کی جا سکتی ہے:

"The prime minister is assisted by the Federal Cabinet, a council of ministers whose members are appointed by the president on the advice of the prime minister. Thge Federal Cabinet comprises the ministers, ministers of state, and advisers. As of early 1994, there were thirty-three ministerial portfolios; commerce; communications; culture; defence; defence production education; environment, finance and economic affairs; food and agriculture; foreign affairs; health; housing; information and broadcasting, interior; Kashimiri affairs; and Northern Areas; law and justice; local government, ministry affairs, narcotics control, parliamentary affaris; petroleum and natural resources production, palnning and development; railways, religious affairs, science and technology; social welfare; special education; sports; state and frontier regions; tourism; water

---

(1) Goel, S.L, Advanced Public Administration, Sterling Publishers, New Delhi, 1974.

(2) Administrative Responsibility, P-20

and power; women's development; and youth affairs".(1)

وزیراعظم کا تقرر مرکزی کابینہ کرتی ہے۔ جو وزراء کی کونسل ہے جس کے ارکان کو وزیراعظم کے مشورہ پر صدر منتخب کرتا ہے۔ مرکزی کابینہ میں وزراء، ریاستی وزراء اور مشیر شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۹۳ء کے اوائل میں ۳۳ وزراء تھے جن میں تجارت، مواصلات، ثقافت، دفاعی انتظامات تعلیم، ماحول، مالیاتی ومعاشیاتی معاملات　سماجی بہبود، خصوصی تعلیم، ریاستی اور سرحدی علاقے اور محکمۂ احتساب وگرانی وغیرہ ہیں۔

ان محکمہ جات کی تعداد مخصوص نہیں بلکہ انتظامی ضروریات کے مطابق نئے محکمے قائم کیے جاسکتے ہیں یا سابقہ محکمہ جات کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے یا حالات کے اعتبار سے ان میں ضروری تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔

پاکستان کے دستور میں انتظامیہ کو حکومت کا کام چلانے کے لیے ضرورت سے زیادہ اختیارات تفویض کیے گئے ہیں۔ عوامی انتظامیہ تمام کاروبار حکومت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مملکت کے تمام انتظامی امور اسی کی نگرانی میں طے پاتے ہیں۔

دستور کے آرٹیکل ۹۰ کی دفعہ (۱) میں ہے کہ،

''وفاق کا عاملانہ اختیار صدر کو حاصل ہوگا اور وہ اسے یا تو براہ راست خود یا اپنے ماتحت افسروں کے ذریعے دستور کے بموجب استعمال کرے گا۔''(۲)

اس آرٹیکل کے احکام ترمیم کے بعد بالکل بدل گئے ہیں۔ ترمیم کا مقصد صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کرنا اور ایک مضبوط وفاق کی بنیاد رکھنا ہے۔ ترمیم سے پہلے اس آرٹیکل کے مطابق وفاق کے عاملانہ اختیارات وفاقی حکومت کو حاصل تھے۔ جنہیں وہ صدر کے نام پر استعمال کرتی تھی۔ ترمیم کے بعد اب کہا گیا ہے کہ وفاقی عاملانہ اختیار کا استعمال صدر کرے گا اور وہ یہ اختیار اپنے افسران کے ذریعے کرے گا یا خود استعمال کرے گا۔

آئین کے آرٹیکل ۹۱ کی شق (۱) میں ہے کہ

''صدر کو اس کے کارہائے منصبی کی انجام دہی میں مدد اور مشورہ دینے کے لیے وزراء کی ایک کابینہ ہوگی جس کا سربراہ وزیراعظم ہوگا۔''(۳)

گویا حکومت کے اندرونی اور بیرونی معاملات کی ذمہ داری انتظامیہ کے سر ہے وہ اسے یقینی بنانے کے لیے مختلف قسم کے اقدامات کرتی ہے۔

"The government has to ensure and maintain internal peace and order. The executive has also to conduct external relations, make treaties with foreign states, declare war and conclude peace, mobilize troops, proclaim emergency when required, re-value or devalue currency, fix prices of essential commodities and perform other activities relating to

(1) www.en.wikipedia.politics of pakistan, P-5

(2) Abdul Ghaffar, Mian, The constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1973, Publisher Imran Law Book House, Lahore, P-64

(3) Ibid, P-65

the well-being of the people of the state".(1)

حکومت داخلی امن وامان اور قانون کو برقرار رکھتی ہے اور انہیں یقینی بناتی ہے۔ انتظامیہ، غیر ملکی ریاستوں سے معاہدات، اعلان جنگ ،قیام امن، وفود کا نظم وضبط، ہنگامی صورت حال کا اعلان جب مطلوب ہو، کرنسی کا اتار چڑھاؤ، ضروری اشیاء کی قیمتوں کا تعین اور ریاست کی عوام کی فلاح و بہبود سے متعلقہ دوسری سرگرمیاں انجام دیتی ہے۔

مسلم مفکر البیورے حضرت عمرؓ کی انتظامی پالیسیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"The moral as well as the administrative lesson from his incident might also account for the fact that balanced development and growth of all regions was a state policy under Umar's administration."(2)

حضرت عمرؓ کے عہد میں اخلاقیات کے ساتھ ساتھ انتظامی امور کی حیثیت یہ تھی کہ ان کے نظم ونسق کے تحت ایک ریاست کی پالیسی میں تمام علاقے متوازن ترقی وخوشحالی کا باعث تھے۔

حضرت عمرؓ نے ایک ایسا نظام تشکیل دیا جو ایسی وسیع وعریض سلطنت کی ضروریات کا کفیل تھا۔ آپؓ نے انتظامیہ کو اس ہمہ گیر کام کے لیے جس طرح سرگرم عمل کیا اور جس طرح اپنی سوچ بوجھ اور انتظامی آلات کے ذریعے اسے فروغ دیا وہ عصر حاضر کی انتظامیہ کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپؓ نے جن معاملات میں عوام کو گواہ بنایا ہے وہ آپؓ کی انتظامی حکمت عملی کا شاہکار ہے۔

عصر حاضر کے جمہوری نظام حکومت میں انتظامیہ کے امور کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ تاکہ اختیارات کے بے جا استعمال کی غلطیوں کا ازالہ ہو اور ارباب نظم کو امور مملکت میں ان کی ذاتی رائے پر نہ چھوڑا جائے بلکہ لازم ہے کہ وہ پوری ملت کے مسلمہ نمائندوں کے مشورہ سے حکومت کا کاروبار چلائیں۔ پالیسیوں کی تعمیل اور ان کے اصول وضوابط کا خیال رکھیں۔

حکومتی ڈھانچہ کے اعتبار سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رائج صدارتی نظام، پارلیمانی طرز حکومت کے مقابلہ میں اسلام کے سیاسی نظام سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

اسد کی رائے میں ایسے مسلم ممالک کہ جن میں معتد بہ قابل لحاظ تعداد غیر مسلموں کی موجود ہے ان ممالک میں صدارتی نظام حکومت کا قیام زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسد کے الفاظ میں:

"The mere fact that there are considerable Non-Muslim minorities in most of the Muslim countries should, therefore, tip the balance in favour of the so-called presidential system of government."(3)

صدارتی نظام کے بمقابلے میں محمد اسد برطانوی نمونے کے پارلیمانی نظام کو اسلامی تصور وقیادت کے خلاف گردانتے ہیں ان کی رائے میں اسلامی ریاست میں سربراہ حکومت و سربراہ ریاست کے دوگونہ وظائف واختیارات امیر کی ذات اور منصب میں جمع ہوتے ہیں۔ جب کہ پارلیمانی نظام میں اس باب میں ایک ثنویت پائی جاتی ہے۔ وہاں حکومت کے اختیارات وزیراعظم اور اس کی مجلس وزراء (کابینہ) کے

---

(1) www.egyankosh.ac.in organs of government, P-8

(2) Al-Buraey, Mohammad Ali, Administration development an Islamic Perspective KPI Limited, London 1985, P-248

(3) Principles of State, P-63

پاس ہوتے ہیں۔ جب کہ صدر مملکت یا آئینی بادشاہ اور ملکہ کی حیثیت محض رسمی ونمائشی ہوتی ہے۔[۱]

جب کہ اسلامی قانون سیاست اور طریق حکومت کی رو سے حکومت اور مملکت کا سربراہ الگ الگ وزیراعظم اور صدر کے بجائے ایک ہی شخص کو ہونا چاہیے۔[۲]

حکومت کے ڈھانچے سے متعلق محمد اسد نے جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے اس میں مولانا مفتی محمد شفیع بھی ان کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھی حکومت کے مروجہ طریقوں میں سے صدارتی طرز حکومت اسلام کے مزاج اور اصول سے قریب تر ہے۔ کیونکہ از روئے قرآن حکیم (ص ۳۸:۲۶) حکم وفیصلہ کی ذمہ داری خلیفہ وقت (امیر المومنین) پر ڈالی گئی ہے۔ جب کہ پارلیمانی طرز حکومت میں امیر مملکت پر ایسی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ یہ صرف صدارتی طرز حکومت ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں از روئے قرآن (النساء ۴: ۵۹) اسلامی ریاست کے اولو الامر کا مسلم ہونا شرط ہے۔ اور موجودہ دنیا میں اس شرط پر عمل صدارتی طرز حکومت میں بآسانی ہو سکتا ہے۔ جس میں ولایت امر اور اقتدار اصلی صدر مملکت کا ہوتا ہے اس میں مسلمان ہونے کی شرط عملاً سہل ہے اس کے برعکس پارلیمانی نظام میں اصل اقتدار صرف پارلیمان کا ہوتا ہے اور پوری پارلیمان میں کسی غیر مسلم کو شامل نہ کرنا عملاً دشوار ہے اس لئے بھی صدارتی طرز حکومت اصول اسلام سے قریب تر ہے۔[۳]

پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل بھی، خلافت راشدہ کے نظام سے استدلال واستشہاد کرتے ہوئے، صدارتی طرز حکومت کو بہ نسبت پارلیمانی نظام کے اسلام سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ قرار دے چکی ہے۔[۴]

پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق کے دور حکومت میں نظام حکومت کے بارے میں تجاویز وسفارشات کی تیاری کے لیے مولانا ظفر احمد انصاری کی سربراہی میں قائم کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ میں صدارتی نظامِ حکومت کو اسلام کے نظام حکومت سے زیادہ موافق وہم آہنگ قرار دیا ہے۔[۵]

جبکہ پارلیمانی اور صدارتی نظام کا موازنہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ۔

> "In a parliamentary system, the majority party (or a coalition of parties willing to govern together) in the legislature forms the executive branch of the government, headed by a prime minister. The legislative and executive branches are not entirely distinct from one another in a parlimentary system, since th prime minister and

---

(1) Principles of State, P-63

[۲] محمد صادق قریشی، اسلامی طرز حکومت کے بارے میں علامہ اسد کے مشورے، نوائے وقت میگزین، ۲۶ اگست ۱۹۸۳ء، ص ۹

[۳] مولانا مفتی محمد شفیع، دستور قرآنی، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۸

[۴] اسلامی نظریاتی کونسل، سالانہ رپورٹ ۸۲-۱۹۸۱ء، (اسلام آباد: اسلامی نظریاتی کونسل، ۱۹۸۳ء) ص ۳۱۵، ۳۳۶-۱۰؛ اسلامی نظریاتی کونسل، اسلامی نظام حکومت کے بارے میں دستوری سفارشات (اسلام آباد: اسلامی نظریاتی کونسل، ۱۹۸۳ء) ص ۸

[۵] انصاری، مولانا ظفر احمد (مرتب)، نظام حکومت کے بارے میں انصاری کمیشن کی رپورٹ، اسلام آباد: حکومت پاکستان، ۱۹۸۳ء

members of the cabinet are drawn from the parliament; even so, the prime minister is the national leader.

In a presidential system, by contrast, the president usually is elected separately from the members of the legislature. Both the president and the legislature have their own power bases and political constituencies, which serve to check and balanc each other."(1)

پارلیمانی نظام میں مقننہ میں اکثریتی پارٹی (حکومت بنانے کی غرض سے مقننہ میں اکثریت حاصل کرنے کے لئے باہمی اشتراک و اتحاد) حکومت کے انتظامی ادارے کو تشکیل دیتی ہے۔ جس کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ پارلیمانی نظام میں مقننہ اور انتظامیہ کے شعبے مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ وزیراعظم اور کابینہ کے ارکان کا تقرر پارلیمنٹ ہی کرتی ہے جب کہ وزیراعظم قومی قائد ہوتا ہے۔ صدارتی نظام اس کے بالکل برعکس ہے، اس میں مقننہ کے ارکان عموماً صدر کو علیحدہ طور پر منتخب کرتے ہیں۔ صدر اور مقننہ، دونوں کے علیحدہ علیحدہ بنیادی، سیاسی اور آئینی اختیارات ہوتے ہیں جن میں وہ ایک دوسرے کے امور کا محاسبہ کرتے ہیں۔

آئین میں ارکان پارلیمنٹ، پارٹی ڈسپلن کی وجہ سے رائے دہی اختیار کرنے پر مجبور ہیں جو کابینہ درحقیقت وزیراعظم نے اختیار کرنی ہوتی ہے۔

برطانیہ جیسے جمہوری ملک میں "کابینہ کی آمریت" کا مسئلہ سب اہل علم کے سامنے واضح ہے۔ ہر جمہوری ملک میں کابینہ کی آمریت کی وجہ سے انتظامیہ کی ملکی خزانے پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ سرکاری افسران کے اخراجات اور ان کے بے جا تکلفات و مراعات پر ملکی خزانے کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ سربراہوں کی طرف سے اپنی پسند کے لوگوں کو انعام و اکرام کا سلسلہ جاری رہتا ہے نہ کبھی پارلیمنٹ پوچھتی ہے اور نہ ہی سربراہوں کا ضمیر ملامت کرتا ہے۔

عصر حاضر کی اسلامی مملکت کے مسائل کو حل کرنے کے لیے، اسلامی تعلیمات ہی یقیناً رشد و ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ وہی انتظامیہ حقیقی معنوں میں کامیابی سے ہمکنار ہو کر ایک مضبوط اور ترقی پسند مملکت کا خواب شرمندۂ تعبیر کر سکتی ہے جس میں عوام کے سماجی معاشی اور سیاسی مسائل کا بہتر حل موجود ہو اور ہر مسئلے کو ترجیحی بنیادوں پر حل کیا جائے۔

مقننہ کا دائرہ کار اور دائرہ اختیار:

اسلامی ریاست کے عناصر میں مقننہ یا مجلس قانون سب سے اہم ہے۔ ہر حکومت کو قوانین اور قواعد و ضوابط بنانے پڑتے ہیں تاکہ وہ شہریوں اور عمال کے لیے ایسی راہیں متعین کر دے جن پر چل کر رعایا اور ریاست کے فلاحی کام انجام دے سکے۔ دستور کے بغیر کسی حکومت کا نظم و نسق چل ہی نہیں سکتا۔

مقننہ کا معنی و مفہوم:

قانون کی لغت میں تشریع لفظ (Legislation) کے مترادف ہے اور اصل میں یہ لفظ (Lexlatum) سے ہے۔ لاطینی لفظ ہے، جو دو الفاظ سے مرکب ہے۔ (Lex) یعنی قانون، اور (Latum) یعنی بنانے والا۔ پس ان دونوں کا معنی یہ ہوا کہ وضع کیے گئے قانون پر عمل کر

(1) www america gov_engagingtheworld, Three Pillars of Government, U.S. Department of State Publication

کے سلطنت کو چلایا جائے۔

"وأما التشريع في لغة القانون فترادفه كلمة (Legislation) و أصل هذه الكلمة هو (Lexlatum) وهي كلمة لاتينية مركبة من لفظين. (Lex) أي: القانون، و (Latum) أي: الواضع، فيكون معناهما معا. القانون الموضوع عن طريق السلطة المختصة بسن القوانين "[۱]

علامہ نعمان سامرائی اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ:

"یہ وہ بااختیار ادارہ ہے جو ضروری قواعد کے صادر کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور ریاست کی حدود میں اہل وطن اور دوسروں کی سرگرمیوں کو منضبط کرتا ہے۔"[۲]

اس پر قانون سازی کے اختیار کا اطلاق ہوتا ہے۔[۳]

مظہر الحق نے مقننہ کی تعریف یوں کی ہے کہ:

"The bodies of people who make the laws are called "legislature" means proposing of law, the chief function of every legislature is to make laws."(4)

لوگوں کا ایسا گروہ جو قوانین بناتا ہے، انہیں قانون ساز کہا جاتا ہے۔ مقننہ کا معنی قانون تجویز کرنا ہے اور ہر قانون ساز کا بنیادی مقصد قوانین کی تشکیل ہے۔

"The one name of the legislature is parliament. The name parliament is derived from the French mean to talk/speak."(5)

قانون سازی ہی کا ایک نام پارلیمنٹ ہے۔ لفظ پارلیمنٹ فرانسیسی زبان سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب بات کرنا یا بولنا ہے۔

"Parliment is part of the birth right of every citizen, mirror of people's mind and guardian for their liberities".(6)

پارلیمنٹ ہر شہری کے بنیادی حق کا ایک حصہ ہے۔ لوگوں کے ذہن کا آئینہ دار اور ان کی آزادیوں کا محافظ ہے۔

دراصل سیاسی نظام میں قانون ساز ادارہ مقننہ ہے۔ جدید نظام ہائے میں مقننہ پارلیمنٹ کے نام سے موسوم ہے۔ کسی بھی ریاست کے حکومتی ڈھانچے میں مقننہ سب سے اہم عضو ہے۔ مجلس قانون ساز کا اہم کام قوانین تشکیل دینا ہے اور وہ اپنی قانون سازی کی خوبی سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ عام طور پر مقننہ کسی قوم کا عکس ہوتی ہے کیونکہ اس میں عموی طور پر عوام الناس کی رائے بھی شامل ہوتی ہے۔

۱۔ القاضی، ڈاکٹر، مختار، أصول قانون، دار الکتب العلمية، بیروت، س ن، ص ۱۲۶

۲۔ السامرائی، نعمان، النظام السیاسی فی الاسلام، طبع دار الفرقان، بیروت، س ن، ص ۱۳۳

۳۔ نظام الاسلام الحکم والدولة، ص ۸۲

(4) Mazher ul haq. Theory and Practice, Publisher Bookland, Lahore, 2003, P-293

(5) Ilbert, Sir, Courtenay, Parliament Its history, constitution and Practice, Publisher Williams and Norgate, 1952, P-7

(6) Gorden, Startheran. Our Parliament, Millbank (Ltd), London, 1952, P-13

مقننہ کی ضرورت واہمیت:

معاشرہ اپنے اہداف ومقاصد تک پہنچنے کے لیے قانون کا محتاج ہے۔ کیونکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں ہر وقت تغیر وتبدیلی ہوتا رہتا ہے اور ہر زمانہ کی شرائط مختلف ہوتی ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ کچھ لوگ ان پر تبادلہ خیال اور غور وفکر کر کے مناسب قوانین وضع کریں۔ قوت مقننہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کے بنائے گئے قوانین معتبر اور واجب الاجراء ہیں۔ قوانین کے معتبر اور رسمی ہونے کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کلی قوانین کو خاص موقع ومحل کی مناسبت سے نافذ کیا جائے تاکہ اس سے لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو روشن کیا جاسکے۔

امت مسلمہ کی تاسیس کے آغاز سے ہی اجتماعی وریاستی معاملات میں فیصلہ سازی کے عمل میں شوریٰ کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور خلفائے راشدین کے تعامل سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شوریٰ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کے معاملات میں صحابہ سے مشورہ کیا ان میں سیاسی وانتظامی، جنگی، اقتصادی اور سماجی ہر قسم کے امور ومعاملات داخل ہیں۔[1]

علامہ اسد خلفائے راشدین کے نقطہ نظر سے شوریٰ کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

خلفائے راشدین اسلامی مملکت کے انتظام کے ساتھ ساتھ قانون سازی اور دیگر اجتماعی معاملات کی بابت شوریٰ کے عمل میں براہ راست حصہ لیتے رہے۔ وہ بوقت ضرورت شوریٰ کے اجلاس طلب کرتے اور نت نئے پیش آمدہ قانونی وانتظامی اور ملکی مسائل کو اس کے سامنے پیش کرتے اور بوقت ضرورت ان کے بارے میں مجلس شوریٰ کے سامنے اپنا نقطہ نظر بھی بیان کرتے۔ اس اعتبار سے ان خلفاء کی حیثیت سربراہ حکومت کے ساتھ مجلس شوریٰ کے قائد اور اس کے سربراہ (صدر) کی بھی ہوتی تھی۔[2]

عہد خلفائے راشدین میں بھی انتظام ملکی، قانون سازی اور پالیسی امور کے علاوہ سماجی واقتصادی معاملات کہ جن کے بارے میں کتاب وسنت میں سکوت اختیار کیا گیا ہے یا ان کے متعلق صرف رہنما اصول بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، شوریٰ ہی کے ذریعے سے انجام پاتے تھے۔ بدیں وجہ خلافت راشدہ کو شورائی وجمہوری خلافت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔[3]

اسلامی سیاسی نظام میں اصل طاقت قانون کو حاصل ہے۔ حکومت بھی اسی سے طاقت حاصل کرتی ہے اگر قانون نہ ہو تو حکومت بے کار محض ہے بلکہ درحقیقت قانون کا وجود حکومت کے وجود پر مقدم ہے اور قانون ہی حکومت کو وجود میں لاتا ہے۔ قانون اور حکومت کا یہ تعلق بالکل فطری ہے۔ ہر قانون کا مقصد ہوتا ہے کہ ایسی جماعت کو وجود میں لائے جو اس کا نفاذ کرے اگر کسی ایسی جماعت کا وجود نہ ہو تو قانون کا نفاذ نہ ہو سکے گا اور قانون کے فوائد سے عوام محروم ہو جائے گی۔

آئین قانون سازی کی بنیاد ہے۔ جس سے ملک کے تمام قوانین اخذ ہوتے ہیں۔ اور اصول تمام قوانین سے منعکس ہوتے ہیں۔ جن پر ملک میں عمل درآمد ہوتا ہے۔ اسلامی اور مسلم ممالک میں کس طرح اسلام اپنے قوانین میں جزوی یا مکمل طور پر موجود ہے۔ ان اسلامی اور مسلم ممالک کے قوانین کو اسلامی شرائط کے زاویے، وسیع پیمانے پر بدل دیتے ہیں۔ کیونکہ اسلامی نظام قانون میں خدا کا حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ واسوہ (سنت) آخری وحتمی سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(1) Ahmad, Manzooruddin, Islamic Political system in the Modern Age, Royal Book Company, Karachi, 1991, PP. 158-159

(2) Principles of State, P-56-57

(3) Islamic Political system in the modern age, PP-162-163

مولانا امین احسن اصلاحی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

''جن مسائل و معاملات کے بارے میں قرآن وسنت کے صریح احکام موجود ہیں ان میں مسلمانوں کے ارباب حل وعقد اور ان کے اولوالامر کا منصب صرف ان قوانین کے امر و نفاذ تک محدود ہے وہ ان قوانین کے اندر نہ کسی ترمیم و تنسیخ کے مجاز ہیں اور نہ ان کی جگہ دوسرے قوانین بنانے کا حق رکھتے ہیں۔[1]

تاہم قرآن وسنت کے احکام وہدایت کی نوعیت اصول وکلیات کی ہے۔ ان میں بنیادی واصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے ان میں تعرض کم ہی کیا گیا ہے۔ اس خلاء کو پر کرنے نیز تمام پیش آمدہ نئے اجتماعی وسیاسی اور قانونی مسائل ومعاملات میں اسلام کے منشاء ومزاج کے مطابق قوانین بنانے کی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کے اصول کو جاری فرمایا۔[2]

اس غرض سے ایک مکمل شورائی نظام بھی خود قرآن وسنت کے اندر تجویز کیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق، بنیادی محکم اصول جو کہ ناقابل تبدیل و تنسیخ ہیں، قرآن مجید کی صورت میں، اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ انسانی عقل محدود ہونے اور خواہشات کے تابع ہونے کی بنیاد پر، ایسا دائمی اور ہمہ گیر قانون نہیں بنا سکتی جو آفاقی خصوصیات رکھتا ہو اور ہر طبقے کے تمام انسانی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ضامن بن سکے، اس لئے بنیادی اصول، کتاب الٰہی اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے واضح کر دیے گئے۔ جن کی عملی صورت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک ریاست قائم کر کے پیش کردی ہے۔ لہٰذا، اب انسانوں کو اس قانون کی تنفید، جزئیات وفروعات میں تبدیلی کا حق، وقت کے تقاضوں کی روشنی میں حاصل ہے۔

مقننہ کا دائرہ کار اور دائرہ اختیار:

اسلامی ریاست کا سب سے اہم عضو مقننہ ہے۔ ہر ایک مہذب اور جمہوریت پسند حکومت میں مجلس قانون ساز کو ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں جن کی بدولت ان کو انتظامیہ کے کم وبیش اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ادارہ حکومت کی پالیسیوں پر بحث کرتا ہے اور کسی بھی ریاست میں اسے سب سے بالاتر ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔

مقننہ کی قوت کے بارے میں علامہ سیر عالیہ لکھتے ہیں:

''التی تتکفل بتنفیذ القوانین، وتسیر شؤون الدولة.''[3]

اجرائی قوت وہ ہے جو قانون کے نفاذ کی کفیل ہوتی ہے اور ملکی امور کو آسان بنانے کی ذمہ داری رکھتی ہے۔

علامہ محمد مبارک لکھتے ہیں کہ:

''ویقصد بها فی الدولة المعاصرة الهیئة الحاکمة التی تقوم بتنفیذ القوانین و تسیر الادارة المرافق العامة وهی تکون من جمیع المسؤولین فی الاصطلاح الحدیث رایس الدولة، ورایس الوزراء، والوزراء، وجمیع موظفی الوزارات، ورایس الدولة هو صلة الوصل بین السلطتین: التشریعیة والتنفیذیة.''[4]

اس قوت سے ملک میں حاکم کی وہ مجلس مقصود ہے کہ قوانین کا نفاذ، ادارے کے کام، عام منافع اور ان کی حفاظت اس کا کام ہو۔ اور

---

1. اسلامی ریاست، ص ۴۹

2. اجتہاد کی اجازت اور ترغیب وحوصلہ افزائی سے متعلق رسول اللہؐ سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور حدیث ''حدیث معاذؓ بن جبل'' ہے، جس میں پیغمبرؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو ایسے مسائل میں، جن کی بابت قرآن وسنت کے نصوص سے رہنمائی نہ ملتی ہو، اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (سنن ابوداؤد، کتاب القضاء، باب اجتهاد الرأی فی القضاء، حدیث ۳۵۹۲)

3. عالیہ، علامہ، سمیر، نظام الدولة والقضاء والعرف فی الاسلام، دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۹ء، ص ۲۰۱

4. نظام الاسلام الحکم والدولة، ص ۸۴

یہ قوت تمام ذمہ داروں خواہ رئیس ہوں، وزیر ہوں یا ملازمین، ان تمام سے مختلف ہے اور جدید اصطلاح میں یہ قوت وزیر اعظم، وزیروں اور وزارتوں کے تمام ملازمین پر مشتمل ہوتی ہے۔ ملکی سربراہ تنفیذی اور تشریعی قوت کے درمیان صرف وصل کا واسطہ ہے۔

ہیرمن بیوکیما مقننہ کا کردار ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"The role of legislature in a democratic state is kept on increase. In recent age, its role is not restricted. Just to legislation but also plays a vital role in the selection of top eexecutives check over executive through criticising the administrative policies, asking questions, custodian of purse of nation by determines the nature and amount of taxes, appropriations and so on."(1)

ایک جمہوری ریاست میں مقننہ کا کردار بڑھتا جا رہا ہے۔ عہد جدید میں اس کا کردار صرف قانون سازی تک محدود نہیں ہے بلکہ حکام اعلیٰ کے انتخاب، انتظامیہ پر تفتیش، انتظامی پالیسیوں پر تنقید کے ذریعے انتظامیہ کا احتساب، سوال کرنا، ٹیکسوں کی رقم اور اس کے تناسب کو مستقل کر کے عوام کے مال کی نگہبانی کرنا، حق داروں کا حق ادا کرنا اور اسی طرح کے کاموں میں یہ اپنا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

مزید برآں وہ لکھتے ہیں:

"The system of parliament gradually becomes more settled and its power increased."(2)

پارلیمنٹ کا نظام بتدریج زیادہ منظم ہوتا جا رہا ہے اور اس کا اختیار بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

آسٹن رینے مقننہ کے دنیا میں رائج نظاموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Generally, speaking the legislative branch makes the laws legislatures usually consist of many members Chosen by the people of the country. There are several basic models of legislature that have been and are used in the world."(3)

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مجلس قانون ساز قوانین بناتی ہے۔ مقننہ عموماً بہت سے ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جن کو ملک کی عوام منتخب کرتی ہے۔ قانون سازی کے بہت سے بنیادی نمونے ہیں جو کہ دنیا میں موجود اور مستعمل ہیں۔

---

(1) Herman Beukema, William M. Geer, Contemporary foreign Governments, Rinehart and Company, ING Publisher, 1940, P-21

(2) Ibid

(3) Austin Ranney, Governing an introduction to Political science, USA. Prentice Hall, Inc. Asimon and Schustee Company, 1993, P-244

جمہوری نظام میں مقننہ کے دو قسم کے نظام مشہور ہیں: یک ایوانی مقننہ اور دو ایوانی مقننہ، یک ایوانی مقننہ میں حکومت چلانے کے لیے ایک مقننہ ہوتی ہے وہی قانون سازی کرتی ہے اور قانون کی منظوری دیتی ہے جو ملک میں نافذ ہوجاتا ہے جب کہ دو ایوانی مقننہ میں ایک ایوان زیریں ہوتا ہے اور دوسرا ایوان بالا ہوتا ہے۔

کینیتھ کلنٹن ویئر نے مقننہ کے دو نظاموں کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"Legislatures can have one house (unicameral) or two houses (bicameral). A 1973 survey found that nations with a legislature were nearly evenly divided between unicameral and bicameral The role of the two houses varies from one nation to another. In the united states, the two houses, the house of representatives and the senate, have roughly equal powers, and legislation passed by on house must be passed by the other to become law in many systems, the executive must also approve of any legislation passed by the legislature. In Britain, the house of commons is an elected body with the majority of the power; the house of lords can amend and delay bill passed by the house of commons, but may not cancel them, The house of lords has no power over taxation."(1)

پارلیمنٹ میں ایک ہاؤس (یونی کیمرل) یا دو ہاؤسز (بائی کیمرل) ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء کے سروے کے مطابق یہ معلوم ہوا ہے کہ مقننہ کے ساتھ اقوام یونی کیمرل اور بائی کیمرل میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ دونوں ہاؤسز کا کردار ہر ایک قوم سے دوسری قوم تک مختلف ہوتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دونوں ہاؤسز، ہاؤس آف ریپریزینٹیوز اور سینٹ مساوی اختیارات رکھتے ہیں۔ بہت سے نظاموں میں ایک ہاؤس سے پاس شدہ قانون کو قانون بننے سے پہلے دوسرے ہاؤس سے بھی منظور ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مقننہ سے پاس شدہ قانون کو انتظامیہ سے بھی منظور ہونا ضروری ہے برطانیہ میں بہت زیادہ اختیارات کے ساتھ ایک منتخب شدہ ادارہ ہاؤس آف کامن ہے۔ ہاؤس آف لارڈز، ہاؤس آف کامنز کے پاس شدہ بل کو تبدیل اور روک تو سکتا ہے مگر مسترد نہیں کرسکتا۔ ہاؤس آف لارڈز کا ٹیکس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔

امریکہ و برطانیہ میں دو ایوانی نظام قائم ہے۔ جس میں ایوان زیریں میں نمائندگی آبادی کے لحاظ سے جب کہ ایوان بالا میں نمائندگی وفاق کی اکائیوں کو یکساں برابری کے لحاظ سے دی جاتی ہے۔ اسے وفاقی نظام حکومت سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پاکستان وہ واحد ملک ہے جس میں وفاقی نظام حکومت کے برعکس ایک ایوان پر مشتمل پارلیمنٹ بنائی گئی جب کہ وفاقی نظام میں عموماً دو ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ ہوتی ہے۔

(1) Kenneth, Clinton Wheare, Federal Government, Oxford University Press, 1947, P-18

آئین کے آرٹیکل ۵۰ میں ہے کہ:

"پاکستان کی ایک مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) ہوگی جو صدر اور دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی جو بالترتیب قومی اسمبلی اور سینٹ کے نام سے موسوم ہوں گے۔"[1]

مغرب میں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کو عوام کی حاکمیت کی عملی صورت گردانا گیا ہے۔ لہٰذا اسے ہر طرح کے دستور و قانون کی تخلیق، تجویز اور ترمیم کا حق حاصل ہے۔[2]

جمہوری نظام نے دستور سازی کا اختیار عوامی نمائندگان پر مشتمل پارلیمنٹ کو دیا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کی خواہشات اور مفادات کی مطابقت میں ہو۔ دستور، عوامی فلاح و بہبود، معاشی و سماجی انصاف اور امن و امان، بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہو تاکہ عوام کے اقتدار اعلیٰ کا عملی اظہار ہو سکے اور وہ مقصد پورا ہو، جس کے لیے عوام اپنی حکومت منتخب کرتے ہیں۔[3]

قانون سازی میں مسلمانوں کی اکثریت کی تائید یا مفاد کا خیال رکھنا تو ضروری سمجھا گیا ہے مگر کسی فیصلے کی بنیاد محض اس بات کو نہیں بنایا گیا کہ اسے عوامی اکثریت کی حمایت حاصل ہے لہٰذا اسی کو قانون بنایا جائے۔ بلکہ اس بات کا اختیار خلیفہ وقت (سربراہ مملکت) کو دیا گیا ہے کہ وہ مناسب فیصلہ خود کرے۔

اسلامی ریاست کے ابتدائی دور میں خلیفہ یا عمال حکومت کے براہ راست (جمہوری طریق کے مطابق) انتخاب کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جس سے اس سلسلہ میں کسی انتخابی اصول کی وضاحت ہوتی ہو، تاہم بیعتِ عامہ کے ذریعے مسلمانوں کی اکثریت کی تائید کا نظام موجود ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ:

"خلافت راشدہ سے قریب تر اور عقلی اعتبار سے زیادہ معقول اور مسلم صدارتی نظام ہے، پارلیمانی نہیں ہے۔ خلافت راشدہ میں اختیارات کا ارتکاز خلیفہ کی ذات میں تھا۔ عہد حاضر میں امریکہ کا صدارتی نظام اس کے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ خلافت راشدہ میں خلیفہ کا انتخاب تاحیات ہوتا تھا جب کہ یہاں معاملہ ۴ یا ۵ سال کے لیے ہوتا ہے۔ امریکہ کے صدر کو منتخب ہونے کے بعد کانگریس کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس حوالے سے بطور دلیل سمجھ لینا چاہیے کہ صدارتی نظام پارلیمانی نظام کی نسبت عمرانی ارتقاء کی بلند تر سطح پر ہے۔"[4]

اسلامی ریاست کا ذمہ یہ ہے کہ دستوری سطح پر طے کر دیا جائے کہ یہاں کوئی قانون کتاب و سنت کے منافی نہیں بنایا جائے گا۔ مقننہ جو بھی ہو، اس کا نام چاہے پارلیمنٹ ہو، مجلس ملی ہو، مجلس شوریٰ ہو یا کسی اور نام سے موسوم ہو، یہ ادارہ اپنے اختیارات قانون سازی کو کتاب و سنت کے تابع رکھنے کا پابند ہو۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے خلاف کوئی قانون سازی کرنا مجلس قانون ساز کے حدود اختیار سے باہر ہو، اور ہر ایسا قانون، اگر وہ مقننہ پاس بھی کر دے، لازماً حدود دستور سے متجاوز (Ultrovires of the constitution) قرار

(1) The Constitution of the islamic Republic of Pakistan, 1973, P-56

(2) Soltau, Roger, H. An Introduction To Politics, Publisher Longman, London, 1968, P-179

۳ ڈاکٹر مستفیض احمد علوی، رائج الوقت سیاسی افکار کا تجزیہ، سہ ماہی فکر و نظر، شعبہ مطبوعات ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۴۵/۴ (جون ۲۰۰۸ء)، ص ۴۳-۴۷

۴ اسرار احمد، ڈاکٹر، خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، اپریل ۲۰۰۶ء، ص ۸۸-۸۹

پائے گا۔

اسلامی مملکت میں مقننہ اعلیٰ ترین اور اہم ترین ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ادارہ امت مسلمہ کے احساسات کا ترجمان اور قومی امنگوں کا پاسبان ہوتا ہے۔ اس کے دائرہ کار اور اختیارات مندرجہ ذیل ہیں:

1- جن معاملات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح اور قطعی احکام موجود ہیں مقننہ کا کام ہے کہ ان کے نفاذ کے لیے ضروری قواعد وضوابط مقرر کرے۔

2- جن معاملات میں کتاب وسنت کے احکام ایک سے زیادہ تعبیرات کے متحمل ہوں، ان میں مقننہ ہی یہ طے کرے گی کہ کون سی تعبیر کو قانونی شکل دی جائے۔ اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ مقننہ ایسے اہل علم پر مشتمل ہو جو تعبیر احکام کی اہلیت رکھتے ہوں، ورنہ ان کے غلط فیصلے شریعت کو مسخ کر ڈالیں گے۔

3- جن معاملات میں احکام موجود نہ ہوں یا کوئی اصولی رہنمائی نہ ملتی ہو، ان میں مقننہ کا کام یہ ہے کہ اسلام کے اصول عامہ کو پیش نظر رکھ کر نئے قوانین وضع کرے۔ اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔[1]
اس امر میں یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ قانون کتاب وسنت کے کسی اصول کے خلاف نہ بن جائے۔

4- مقننہ کا کام یہ بھی ہے کہ مخصوص مسائل پر غور وخوض کرنے کے لیے کمیٹیاں تشکیل دے۔ جو آزادانہ غور وفکر (اجتہاد) سے کام لے کر متعلقہ قانون کی تفصیلات مہیا کرے، لیکن ضروری ہے کہ تفصیلات اسلامی قانون کی روح اور ملت کے بہترین مصالح کے مطابق ہوں۔

اس سلسلہ میں علامہ اسد رقمطراز ہیں کہ:
"ہماری زندگی کے اجتماعی پہلو سے تعلق رکھنے والے معاملات کے متعلق اجتہادی قانون سازی انفرادی اختیارات تمیزی کے حوالے نہیں کی جا سکتی۔ یہ فیصلے پوری ملت کے اجماع پر مبنی ہونے چاہئیں۔"[2]

5- عوام کی مشکلات اور مصائب خلیفہ یا قائم مقام خلیفہ تک پہنچانا اسی مجلس کے دائرہ عمل میں شامل ہے۔ اگر خلیفہ یا عمال اسلام کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس مجلس کا یہ فرض ہے کہ وہ خلیفہ یا عمال سے جادہ ہدایت پر چلنے کا مطالبہ کرے۔

6- عمومی قانون کثرت رائے سے منظور کیا جائے۔

جہاں تک کسی ایوان میں ریاستی اور اجتماعی فیصلوں کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں برابر وزن کے دلائل وآراء کی صورت میں مختلف فیہ مسائل میں کثرت رائے کا اصول اپنانے کے علاوہ چارہ کار نہیں ہے۔

تاریخ اور فقہ اسلامی کی کتب میں موجود قال الجمہور کے الفاظ سے اس پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔"[3]

کسی بھی معاملہ میں قانون سازی کے ضمن میں مجلس تشریعی کے ارکان کے، بین اختلاف رائے کا پیدا ہونا بعید از امکان نہیں بلکہ موافق ومخالف آراء کا سامنے آنا ایک فطری امر ہے۔

علامہ محمد اسد کے نزدیک ایسی صورت میں اصولِ اکثریت کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ یعنی اجماع واتفاق رائے کی عدم موجودگی کی صورت میں کثرت رائے کو ترجیح دی جائے گی تمام اور معمولی نوعیت کے قوانین سادہ اکثریت سے جب کہ غیر معمولی اہمیت کے حامل قوانین دو

---

[1] الضرورات تبیح المحظورات (ضرورتیں ممنوع چیزوں کو جائز کر دیتی ہیں) اس سے قریب تر ایک دوسرا قاعدہ بھی ہے "الضرورات تقدر بقدرھا" (ضرورتوں کا اندازہ بقدر ضرورت لگایا جائے گا) الاشباہ والنظائر لابن نجیم، ص ۹۸، ۹۰

[2] اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول، ص ۸۸

[3] لسان العرب، بذیل مادہ جمہور؛ احکام السلطانیۃ للماوردی، ص ٦

تہائی ارکان کی رائے سے منظور کئے جائیں گے۔(1)

7- اراکین مجلس کو خلیفہ اور دیگر عمال حکومت کے افعال اور پالیسی پر تنقید کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ علاوہ ازیں مقننہ میں بحث و تقریر کی آزادی ہونی چاہئے تاکہ خلیفہ اور سرکاری کارندے مقننہ کے قواعد و ضوابط کے پابند ہوں اور اس اعلیٰ ادارہ کے وقار اور ساکھ کو نقصان نہ پہنچائیں۔

8- بدلتے ہوئے احوال و ظروف کی وجہ سے بعض اوقات ملکی دستور میں ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسلامی مملکت کی پالیسی جامد اور غیر متبدل نہیں ہوتی بلکہ اسلام ایک متحرک اور ترقی کا ضامن نظریہ حیات ہے۔ اس لئے مقننہ کو آئین میں مناسب ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

9- رئیس مملکت کو مقننہ کے پاس کئے ہوئے قانونی مسودوں کو مسترد کردینے کا اختیار نہیں ہونا چاہئے، ہاں البتہ اگر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مقننہ کا پاس کیا ہوا بل قومی مفادات کے منافی ہے تو اس صورت میں وہ عوام سے استصواب رائے کے ذریعے فیصلے کروا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں عوام کی رائے کو حتمی اور فیصلہ کن سمجھنا چاہئے۔

10- مقننہ کو مسودات زر منظور کرنے کا بھی کامل اختیار رہنا چاہئے۔ قومی میزانیہ (بجٹ) کو مقننہ میں پیش کیا جانا چاہئے۔ اراکین حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کے مندرجات کی شرح اور تفصیل بیان کریں۔ مجوزہ اخراجات کا جواز اور منصوبوں کی معقولیت کو بدلائل ثابت کریں۔ ارکان مقننہ کو بجٹ کی ہر شق پر نہ صرف اظہار خیال اور تنقید کرنے کا حق حاصل ہو بلکہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی نیا ٹیکس نہ لگایا جائے۔ الغرض مقننہ کے ارکان بجٹ میں ترامیم پیش کرنے کے مجاز ہوں اور اس وقت تک بجٹ پر عمل درآمد نہ کیا جائے جب تک ارکان مقننہ کی اکثریت اسے منظور نہ کر چکی ہو۔

اسلامی ریاست کی منتخب مقننہ کا بنیادی فریضہ تعبیر شریعت ہے۔ اس کا اختیار پوری قوم کا حق ہے۔ جن کی شرکت کے بغیر قانون سازی بے نتیجہ رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار کسی فرد یا طبقہ کو تفویض نہیں کیا بلکہ اس کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کے افکار سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> "The transfer of the power of Ijtihad from the individual representative of school to a Muslim leggislative assembly which in view of the growth of opposing sects is the only possible form Ijma can take in modern time will secure contributions to legal discussion from lay men who happen to possess a deep insight into affairs. In this way alone we can stir into activity the dormant spirit of life in our legal system and give it an evolutionary out look."(2)

---

(1) Principles of State, P-49

(2) Iqbal, Allama, Muhammad, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Publishered Institute of Islamic Culture Club Road, Lahore, 1986, P-138

فقہی مسلکوں کے انفرادی نمائندوں سے اجتہاد کا اختیار لے کر ایک مسلم قانون ساز اسمبلی کو منتقل کر دیا جائے۔ متحارب فرقوں کے پیدا ہو جانے کے پیش نظر عہد جدید میں یہی ایک صورت ممکن ہے جو اجتہاد اختیار کر سکتا ہے اور صرف اسی شکل میں عوام کی شرکت کو قانون سازی کے عمل میں یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ عوام معاملات میں گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی ایک واحد طریقہ ہے۔ جس کے ذریعے ہم اپنے فقہی نظام میں خوابیدہ روح کو از سر نو فعال اور متحرک بنا کر اسے ارتقائی شکل دے سکتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کا تصور نہایت واضح اور دو ٹوک ہے۔ ان کے نزدیک اب وقت آ گیا ہے کہ فقہی مسلکوں کے غیر منتخب نمائندوں سے اختیار لے کر اسے قوم کی منتخب اور نمائندہ قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے علامہ اقبال کی اس رائے کی کہ اب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا، تائید ان الفاظ میں کی ہے۔

''میں علامہ اقبال کی اس بات کو صد فیصد درست مانتا ہوں، کیونکہ پارلیمنٹ کے ذریعہ جو اجتہاد ہوگا وہ قرآن وسنت کے اندر رہتے ہوئے ہوگا۔ اجتہاد تو ہوتا ہی وہ ہے جو کتاب وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہو۔ اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی کہ پارلیمنٹ جو کچھ بھی پاس کر دے وہی دین بن جائے، اس لئے کہ اگر پارلیمنٹ کے اختیارات کو اتنی وسعت دے دی جائے تو حاکمیت پارلیمنٹ کے پاس چلی جائے گی۔ جبکہ اسلامی ریاست میں حاکمیت فقط اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف عوامی حاکمیت کا جو تصور ہے وہ تو کفر اور شرک کا ہے۔''[1]

مغربی مفکرین کی آراء میں پارلیمنٹ ہی اقتدار اعلیٰ کے اختیارات رکھتا ہے۔ اس ضمن میں برنٹ (Barnett) رقمطراز ہیں

"Parliament is the sovereign law-making body and accordingly the judges are constitutionally subordianate to Parliament. However, it has always been the case that judges contribute to the law-making process, both through the development of the common law and through statutory interpretation. From the perspective of the separation of powers, it is important to understand the apparent paradox of judges, the judiciary, 'making law' - a function of the legislature."(2)

پارلیمنٹ مقتدر اعلیٰ قانون ساز ادارہ ہے اور بمطابق جج اس کے تشکیل شدہ کارکن ہیں تاہم ہمیشہ سے یہی دستور رائج ہے کہ جج دونوں طرح کی قانون سازی میں شریک ہوتے ہیں۔ خواہ وہ عام قانون کی ترقی ہو یا مطلوبہ تجزیہ۔ اختیارات کی علیحدگی کے تناظر سے اس بات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ججوں کا ظاہری تناقضہ، عدالت، قانون سازی، دراصل مقننہ ہی کا ایک جزو ہے۔

ان الفاظ کی وضاحت مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

"Legislature, based on the principle of separation of powers, is the

---

1. خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص ۹۴، ۹۵

(2) Barnett, Hilaire, Under Standing Public Law, Publisher Cavendish Tayler and Francis Group, London and New York, 2010, P-32

most important, and its authorities are taking a dominant position inmechanism of the state It establishes a compulsory requirement that the executive must implement and which serve legistative framework for the judicially

Modern parliament is the supreme organ of popular representation, expressing the sovereign will of the people to regulate critical public relations mainly through the adoption of laws supervise the activities of executive bodies and senior officials".(1)

مقننہ کی بنیاد اختیارات کی علیحدگی کے اصول پر ہوتی ہے جو کہ بہت زیادہ اہم ہے۔ اور اس کے اختیارات ریاست کی مشینری میں مؤثر طور پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ ضروری مطالبات قائم کرتی ہے جن پر انتظامیہ عمل درآمد کرتی ہے۔ اور جو کہ عدالت میں بہت سے قانون سازوں کا ڈھانچہ ہے۔ جدید پارلیمنٹ معروف نمائندگی کا ایک بہترین عضو ہے۔ جس میں عوام کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ جو بنیادی طور پر سرکاری افسران اور انتظامی کارکنان کی سرگرمیوں کی نگرانی کو قبول کر کے عوامی تعلقات کی تنقید کی پابند ہو جاتی ہے۔

Packanhax کے خیال میں جو فرائض عصر حاضر کی پارلیمنٹ کی قانون سازی میں اہم حیثیت رکھتے ہیں یہاں اجمالاً ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

-1 "Legislatures choose the head of the state; they may also remove him by the process of impeachement, or they can change the law of his succession or election. For instance, the British Parliament can change the law of primogeniture of the method of abdiaction. The legislatures also approve the choice of the Prime Minister and his ministers in some contries. All ministerial nominations by the President in the U.S. have to be ratified by the Senate.

-2 Legislatures may also influence or control government behaviour or seek to make the executives accountable to them. Votes of no-confidence, censure motions, interpellation procedures, debates on budgets and major policies of the government, process of impeachement, etc are the various devices in the hands of the legislators to exercise their control over the government.(2)

(1) www.yqyq.net, organs of state, the r characteristics and types, P-4

(2) www.egyankosh.ac.in, organs of government unit 17, P-12

-3 Legislators choose their office-bearers and they can also remove them. They can also disqualify their members on the charge of proved misbeheviour or committing an act of corruption or treason or breach of privileges. Speakers and Deputy Speakers are elected by the rule-making bodies and they may remove them by a vote of no-confidence.

-4 The most important function of the legislatures is to make rules. because they are the rule-making departments of the government. The bills are moved, debated and then passed with or without amendments. In most of the countries having a "democratic" form of legislative behaviour, the bills are given three readings. Often the bills are referred to the committees of the parliament for more detailed scrutiny.

-5 A Legislature often holds the purse strings. Its approval is necessary for the annual budget or for the imposition of taxes. Through committees, they also scrutinize the expenditure of the government. In India, this is done by Public Accounts Committee." (PAC)(1)

-1 قانون ساز سربراہ مملکت کو منتخب کرتے ہیں، وہ پارلیمنٹ میں مقدمہ کے ذریعہ سے اُسے برطرف بھی کرسکتے ہیں یا وہ اس کی جانشینی اور انتخاب کے قانون کو بدل سکتے ہیں۔ حال ہی میں برطانوی پارلیمنٹ میں بڑے بیٹے کی جانشینی یا تخت و تاج سے دست برداری کے قانون کو بدلا گیا۔ کچھ ممالک میں قانون ساز وزیراعظم اور اس کے وزراء کی بھی توثیق کرتے ہیں۔ امریکہ میں صدر کی تمام وزارتی نامزدگیاں سینٹ کے ذریعے تسلیم کی جاتی ہیں۔

-2 قانون ساز حکومتی رویے کو ضبط یا موثر بھی بناسکتے ہیں یا وہ انتظامی کارکنوں کے احتساب کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔ عدم اعتماد کے ووٹ، ملامت شدہ حرکات، حکومتی پالیسی میں مداخلت کے طریقہ سے کسی ایک پہلو پر پارلیسانی بحث ومباحثہ میں سوالات کرکے بجٹ پر بحث ومباحثہ اور حکومت کی اعلیٰ پالیسیاں، پارلیمنٹ میں مقدمہ کا طریقہ وغیرہ جیسی مختلف تدبیریں حکومت کو قابو میں رکھنے کے لیے قانون سازوں کے پاس ہیں۔

-3 قانون ساز سرکاری کارکنان کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ انہیں برطرف کرنے کے بھی مجاز ہوتے ہیں۔ وہ ان کے غلط رویے کے ثبوت، بدعنوانی کا عمل سرزد ہونے، بغاوت یا امتیازی حقوق کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں انہیں نااہل قرار دے سکتے ہیں۔ قانون سازی سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ انہیں عدم اعتماد کے ووٹ سے برطرف بھی کرسکتے ہیں۔

-4 حکومت کے قانون ساز شعبہ جات میں کام کرنے کی حیثیت سے قانون سازوں کا سب سے اہم فریضہ قوانین کی تشکیل ہے۔

(1) www.egyankosh.ac in, organs of government unit 17, P-12

مسودات قانون بحث و مباحثہ کی طرف منتقل کئے جاتے ہیں اور پھر ترامیم یا ان کے بغیر پاس کئے جاتے ہیں۔ بیشتر ممالک میں قانون ساز ادارہ کی جمہوری شکل ہوتی ہے، مسودات تین ریڈنگز (قرأت) میں دیئے جاتے ہیں۔ اکثر مسودات مزید تفصیلاتی جانچ پڑتال کے لیے پارلیمنٹ کی کمیٹیوں کی طرف منتقل کیے جاتے ہیں۔

5- ایک قانون ساز کو حکومتی معاملات پر مکمل گرفت حاصل ہوتی ہے۔ سالانہ بجٹ کے لیے یا ٹیکسوں کے نفاذ کے لیے اس کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔ مزید برآں کمیٹیوں کے ذریعے وہ حکومتی اخراجات کی جانچ پڑتال بھی کرتے ہیں۔ بھارت میں یہ کام پبلک اکاؤنٹ کمیٹی (PAC) کرتی ہے۔

سارے عالم میں قانون ساز کارکنان کام کی تیزی اور وقت کی بچت کے لیے کمیٹی سسٹم استعمال کرتے ہیں دراصل قانون ساز کارکن اپنی کمیٹی ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ مزید تجاویز کے طور پر:

"کوئی بھی مجلس قانون ساز کسی کمیٹی کی مدد کے بغیر مؤثر طریقے سے اپنا پیغام سرانجام نہیں دے سکتی۔ کسی بہت بڑے اجلاس میں ان امور پر بحث ناممکن ہوتی ہے۔ جن پر بحث کے لیے وقت قلیل ہو لیکن اصول وسیع تر ہوں۔ جمہوری نظام میں قانون ساز چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو کر تفصیلی طور پر ان معاملات پر بحث کرتے ہیں۔ اور ان بحثوں کا نتیجہ بہت بڑے فیصلوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

متحدہ ریاست ہائے امریکہ کے ایک اجلاس میں مجلس قانون ساز کے اختیارات اور فرائض کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"Elected legislatures - whether under a parliamentary or presidentaial system - are the principal forum for deliberating, debating, and passing laws in a represntative democracty. They are not so-called rubber-stamp, parliaments merely approving the decisions of an authoritarian leader.

Legislators may question governemnt officials about their actions and decisions, approve national budgets, and confirm executive appointees to courts and ministries In some democracies, lagislative committees provide lawmakers a forum for these public examinations of national issues Legislators may support the governemnt in power or they may serve as a loyal political opposition that offers alternative policies and programs

Legislators have a responsibility to articulate their views as effectively as possible. But they must work within the democratic ethic of tolerance, respect, and compromise to reach agreements that will benift the general welfare of all the people - not just their political supporters Each legislator must alone decide on how to

balance the general welfare with the needs of a local constituency "(1)

منتخب شدہ قانون ساز　چاہے وہ پارلیمانی یا صدارتی نظام کے تحت ہوں۔ وہ نمائندہ جمہوریت میں صلاح ومشورہ، بحث اور قوانین پاس کرنے والے اہم کارکنان ہیں وہ محض منظوری دینے والے نہیں کہلاتے، پارلیمان محض اختیاراتی حکمران کے فیصلوں کو منظور کرتے ہیں۔ قانون ساز، قومی بجٹ منظور کرنے کے لیے اور عدالتوں اور وزارتوں کے لیے انتظامی کارکنان کو مستحکم کرنے کے لیے، سرکاری افسران سے ان کے فیصلوں اور کاموں کے متعلق سوالات کرسکتے ہیں۔ چند جمہوری نظاموں میں قانون ساز کمیٹیاں قومی اشاعتوں کے عوامی معائنوں کے لیے قانون سازوں کا اجلاس مہیا کرتی ہیں۔ قانون ساز اقتدار میں حکومت کی مدد کرسکتے ہیں یا وہ ایک وفادار سیاسی مخاصمت کی طرح خدمت کرسکتے ہیں۔ جو متبادل حکمت عملی اور منصوبوں کی پیش کش کرتی ہیں۔ قانون سازوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو سکے مؤثر طریقے سے اپنے نظریات کو واضح طور پر بیان کریں لیکن ان کو معاہدات تک پہنچنے کے لیے، بردباری، احترام اور سمجھوتہ کے جمہوری اخلاق میں کام کرنا چاہیے جو نہ صرف سیاسی مددگاروں کے لیے بلکہ پوری عوام کی فلاح و بہبود کے لیے فائدہ مند ہوں گے۔ ہر قانون ساز کو تنہا یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ قومی دستوری ضروریات کے ساتھ ساتھ مفاد عامہ میں کیسے توازن پیدا کرسکتا ہے۔

عہد جدید میں جمہوری اصولوں کو مکمل طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے ان جمہوری اصولوں کا تقاضا یہ ہے کہ قانون سازی کے لیے عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں اور یہ نمائندے قانون ساز اسمبلی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جمہوری معاشرے میں فرد ایک ووٹ رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں تمام افراد یکساں اور مساوی ہیں۔ جس رائے کے حق میں ووٹوں کی اکثریت ہو جائے وہ فیصلہ بن کر نافذ ہو جائے گا اور جو فیصلہ زیادہ لوگوں کی حمایت نہیں رکھتا، وہ نہیں اپنایا جائے گا۔

اسلام نے مجلس قانون ساز کے لیے جو ضابطہ مقرر کیا، اس کے ہر پہلو میں ہمارے لیے رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ اس کی علتوں اور حکمتوں پر غور کرکے عصر حاضر کے بے شمار مسائل کو ہم حل کرسکتے ہیں۔ خلفائے راشدین، خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گہری اور مسلسل سوچ و بچار کے ذریعہ مروجہ حالات کا تجزیہ کیا۔ ماضی کے تجربات کو سامنے رکھا اور آئندہ پیش آنے والے ہر طرح کے ممکنہ خطرات ونقصانات کو نشان زدہ کرنے کے بعد ایک واضح لائحہ عمل دیا، جس میں ہر اندیشے سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی اصول وضع کرکے ٹھوس منصوبہ بندی کی اور چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کا تعین کردیا۔ عہد جدید میں اگر پالیسی ساز ادارے سنجیدگی اور گہرائی سے معاملات کا جائزہ لے کر قانون سازی کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وسیع تر قومی و ملی مقاصد حاصل نہ ہوسکیں یا سیاسی استحکام اور مثبت نتائج حاصل نہ ہوسکیں۔

عدلیہ کا دائرہ کار اور دائرہ اختیار:

مقننہ اور انتظامیہ کی طرح عدلیہ بھی حکومت کے ڈھانچے کا ایک لازم جزو ہے۔ عدلیہ حکومت کے تینوں شعبوں میں بہت اہم ستون ہے۔ کسی بھی ریاست میں عاملہ اور مقننہ کے بعد اہم شعبہ قضاء عدلیہ ہی کا ہوتا ہے جس پر نظام ریاست چلتا ہے۔ قضاء کا مقصد انصاف کی فراہمی اور برقراری ہے جس ملک میں انصاف کے تقاضے پورے نہ ہو رہے ہوں لوگوں کو عدلیہ کے ذریعے انصاف نہ مل رہا ہو وہ حکومت دیرپا نہیں ہوتی اور بہت جلد خاتمہ کو پہنچ جاتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ عدلیہ حکومت کی دست برد سے آزاد ہو، عدالت کے دروازے ہر کس وناکس کے لیے کھلے ہوں اور انصاف پوری طرح میسر ہو۔

عدلیہ کا معنی ومفہوم:

اساسی مفہوم کی مناسبت سے فقہاء نے قضاء کی قانونی اور اصطلاحی تعریف مختلف الفاظ میں کی ہے لیکن مفہوم سب کا ایک ہے۔ علامہ

(1)　www.America.gov_engaging the world, Three Pillars of Government, P-2 of 3

سرخسی نے قضا کی تعریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے

''قضا ایک فرض محکم ذمہ داری اور واجب العمل قانون ہے۔''[1]

علامہ کاسانی رقمطراز ہیں'

"القضاء هو الحكم بين النّاس بالحق والحكم بما انزل الله عزّوجل."[2]

قضا کے معنی میں لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرنا اور اس قانون کے مطابق فیصلہ کرنا جو اللہ نے نازل کیا ہے۔

اس سلسلہ میں محمود بن محمد عروس لکھتے ہیں:

''حکومت کے مقرر کردہ با اختیار ادارے کی طرف سے کتاب و سنت اور احکام شرعیہ کی روشنی میں لوگوں کے تنازعات کا تصفیہ کرنے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کا نام قضا ہے۔''[3]

عبدالوہاب خلاف لکھتے ہیں کہ:

"الجهة المختصة بتفسير القواعد العامة والقوانين المصورية واللوائح التشريعية، وتطبيقها على المنازعات المرفوعة اليها."[4]

عوام کے قواعد وضوابط کو واضح طور پر بیان کرنے کی مخصوص شکل، ان کے درمیان رونما ہونے والے نزاعات کو حکومتی اور شرعی قوانین سے منطبق کرنے کا نام عدلیہ ہے۔

Geffery, K. Robert "Judiciary" کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ

"The Judiciary is the branch of government responsible for Interpreting authoritanely the laws by the legislative and administrated by the executive branch, in cases where dispute arises as to the meaning, validity or supposed branch of such laws "(5)

عدلیہ حکومت کی وہ شاخ ہے جو مقننہ کے ذریعے مصدقہ قوانین کی وضاحت کرنے کی اور انتظامیہ کے ذریعے نظم ونسق چلانے کی ذمہ دار ہے۔ان معاملات میں جہاں تنازعات واضح ،معقول یا ایسے قوانین کے مفروضہ کے طور پر پیدا ہوں۔

مزید برآں R.K.Pruthi لکھتے ہیں کہ:

"Judiciary is that branch of govrenment who Interpret law, setting

---

۱۔ المبسوط للسرخسی، ۱۶/ ۶۰

۲۔ بدائع الصنائع، ۷/ ۲

۳۔ عروس، محمود بن محمد، تاریخ القضاء فی الاسلام، المطبعة المصرية الاهلية الحديثة بالقاهرة، ۱۹۳٤م، ص ۹

٤۔ خلاف، شیخ، عبدالوهاب، السلطات الثلاث في الاسلام، طبع دار آفاق الغد، القاهرة، ۱٤۰۰ھ، ص ۱٦

(5) Geffrey, K. Robert, A Dictionary of Political Analysis, Great Britian Hazeel Waston and Viney Ltd. 1971, P-190

disputes and giving Justice."(1)

عدلیہ حکومت کی وہ شاخ ہے جو قانون کی وضاحت کرتی ہے۔ تنازعات کا حل اور انصاف مہیا کرتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام تعریفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدلیہ ریاست کا وہ اہم ادارہ ہے جو دستور اور قانون کی روشنی میں لوگوں کو انصاف فراہم کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ایسا ادارہ ہے جو قانون کا اطلاق کرتا ہے۔ اور تمام ریاستی اداروں کو اپنی مقرر کردہ حدود میں رکھتا ہے تاکہ قانون کی پاسداری اور حقوق کے نفاذ کو ممکن بنایا جاسکے۔

عدلیہ کی ضرورت واہمیت:

کسی قوم کی ترقی کا قیاس اس کے نظام قضاء کی ترقی پر کیا جاتا ہے۔ پس ماندہ قبائل میں قوی کمزور پر غالب ہوتا ہے قوت کو سیادت اور غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ جب قوم شہریت اور تمدن کے مدارج طے کر لیتی ہے تو اس کی فکر میں حق وانصاف کی سیادت اور قانون کو بالادستی حاصل ہو جاتی ہے جس معاشرہ میں فردی زندگی قانون کے سایہ عاطفت میں مطمئن نہ ہو خواہ مادی وسائل اس میں کتنے ہی کیوں نہ جمع ہو جائیں وہ معاشرہ متمدن نہیں کہلا سکتا پس تہذیب و تمدن اس اطمینان واستقرار حق کا نتیجہ ہے جس کی بنیاد عدل وانصاف پر ہو اور عدل بغیر قضا کے ممکن نہیں۔

عدلیہ کی اہمیت کے پیش نظر اسلام نے اس کا اہتمام کیا ہے اور اسے عظیم ترین عمومی محافظ کا درجہ دیا ہے اور اس کی سربراہی کرنے والوں کے لیے مخصوص شرائط عائد کی ہیں جو اس اختیار کے ہدف کو یقینی بنانے پر مشتمل ہیں۔ عدلیہ کی تقرری کا اہتمام، امام (تنفیذی اتھارٹی) کی طرف سے ہوتا ہے، تاہم وہ احکام جن پر عمل مطلوب ہو، تنفیذی اختیارات سے متعلق نہ ہوں بلکہ وہ شرعی احکام ہوں جن کے سامنے سب سرنگوں ہوں۔

علامہ محمد مبارک لکھتے ہیں:

"عدالة القضاء واستقامة سيره في كل بلد دليل على رقية الأخلاقي، وعلى استتاب الأمن فيه، ولذلك تحرص الأمم على قوة القضاء وعدالة القضاء، وعلى ابعاد امؤثرات عنهم، وخاصة من أصحاب النفوذ والسلطان، ومن القائمين بالحكم أنفسهم من الرؤساء والوزراء وغيرهم. ولذلك وضعت قاعدة حصانة القضاة اي عدم جواز عزلهم و نقلهم وتاديبهم الا من مجلس يؤلف من كبار القضاة أنفسهم حتى لا يتعرض انقمة رايس أو وزير اذا حكموا في امر حكماً يخالف هواه او مصلحته "۲

ہر شہر میں قضاء کی عدالت اور استقامت کا نفاذ اخلاقی ترقی اور قیام امن کی دلیل ہے۔ اسی وجہ سے اقوام، قوت، عدالت قضاء اور عادلانہ فیصلوں پر نظر انداز ہونے والے فیصلوں پر حرص کرتی ہیں۔ اور حاقتوروں کا اثر دور کرنے پر بہت زیادہ حریص ہیں۔ خاص طور پر جنہیں بادشاہ کی طرف سے قوانین نافذ کرنے کی اجازت ہو۔ اور وہ خود کو بھی اس فیصلے پر قائم رکھنے والے ہوں جو سردار، وزراء اور ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ اسی وجہ سے ایک قاعدہ کلیہ وضع ہوا ہے کہ قاضیوں کا تحفظ ان کو سزا دے کر ہی ہو سکتا ہے۔ انہیں معزول اور تبدیل کرنا جائز نہیں ہے مگر یہ عمل وہ مجلس کر سکتی ہے جو خود قاضیوں سے بنی ہو۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ حاکم وقت یا وزیر کو اس وقت کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے جب وہ اپنی خواہشات یا نفع کے خلاف کوئی فیصلہ کریں۔

---

(1)　R.K Pruthi, Principles of Political Science, New Delhi, Mohit Publications, 2006, P-130

۲۔　نظام الاسلام الحكم والدولة، ص ۸۴

مندرجہ ذیل عبارت سے بھی عدلیہ کی ضرورت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

"The judiciary settles disputes and interprets laws and the constitution. It protects individual rights, and is the guardian of laws and the constitution. It has also got the power of judicial review which has led to judicial activism in recent years. All this requires it to be independent and impartial."(1)

عدلیہ تنازعات کا حل اور آئین وقوانین کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ انفرادی حقوق کی نگہداشت کرتی ہے اور آئین وقانون کی محافظ ہے۔ اسے عدالتی نظرثانی کا اختیار بھی حاصل ہے جو عصر حاضر میں عدالتی فعل ارادیت میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے یہ تمام مطالبات آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں۔

لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرنے اور قوانین کو مذکورہ موقع محل کی مطابقت سے نافذ کرنے کے لیے قوت قضیہ کا ہونا ضروری ہے کیونکہ صرف پارلیمنٹ میں قوانین پاس ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں قضا کا نظام تقریباً انہی خطوط پر چلتا رہا جن پر عہد رسالت میں تھا۔ جزیرۂ عرب کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے متعدد صوبوں میں تقسیم کر کے ہر صوبے میں ایک والی مقرر کر رکھا تھا جس کے ذمہ اقامت صلوٰۃ، تعلیم دین اور نظم ونسق کے امور کے ساتھ ساتھ لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ اور حدود وقصاص کا نفاذ بھی تھا۔۲

عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں خلافت کی سرحدیں بہت زیادہ وسیع ہوگئیں، مختلف اقوام کے ساتھ ربط وضبط میں ترقی ہوئی اور خلیفہ پر سلطنت کے مشاغل کی غیر معمولی کثرت ہوگئی تو ایک مستقل اور آزاد نظام عدالت کی ضرورت محسوس ہوئی۔

نظام قضاء کا کام چونکہ انتہائی ذمہ داری اور بے حد احتیاط سے کرنے کا تھا اس لئے خلفاء راشدین نے اسے عام قاضیوں کے دائرہ اختیار میں نہیں دیا بلکہ یا تو خود اس ذمہ داری کو نبھایا یا پھر انتہائی ذمہ دار اہل علم کو اس کے لیے مقرر کیا۔

جمہوری نظام میں عدلیہ کی اہمیت کے پیش نظر ایچ رحمٰن لکھتے ہیں کہ

"Nothing touches the welfare and security of the citizen more than the Judiciary. No mass, therefore, can over-estimate the importance of the mechanism of Justice."(3)

عدلیہ سے بڑھ کر کوئی بھی حکومتی عنصر (Organ) کسی شہری کو فلاح اور تحفظ فراہم نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی قوم عدل و انصاف سے بڑھ کر کسی دوسرے نظام کو اہمیت نہیں دے سکتی۔

ظہیر الدین منظری حقوق وفرائض کے تعین میں عدلیہ کی اہمیت کو مسلمہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

---

(1) www.egyankosh.ac.in, Organs of Government: Exceutive, Legislature and Judiciary, P-18

۲۔ محمد الخضری بک، محاضرات فی تاریخ الامم الاسلامیۃ، دار المعرفۃ، بیروت، بس، ۱۳۷۶ھ، ۲/ ۳۲، ۱۳۳

(3) Rahman, H, Introduction to Pakistan Constitution, (East Pakistan) Narayan Machive Press, 1958, P-189

"Every society has a system of rights and obligations. Disputes arise among its citizens and the emergence of legal system and arrangement of an arbitrator is but natural. Justice and judiciary are always given much importance, even in the most primitive societies. Judiciary is the most important organ of state "(1)

ہر معاشرے میں حقوق وفرائض کا ایک نظام ہوتا ہے۔ اس کے شہریوں کے درمیان جھگڑے جنم لیتے ہیں۔ اور قانونی نظام اور ثالث کے انتظامات کا ظہور ہوتا ہے جو ایک فطری عمل ہے۔ قدیم ترین معاشروں میں انصاف اور عدلیہ ہمیشہ بہت زیادہ اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ لہٰذا عدلیہ ریاست کا اہم ترین عنصر ہے۔

ریاست، جمہوری ہو یا اسلامی، عدلیہ کی اصولی عظمت کے علاوہ اس کی عملی افادیت بھی مسلمہ ہے۔ فصل خصومات کے ذریعہ صیغۂ عدالت معاشرہ میں قیامِ امن وسکون کا موجب ہے۔ تنازعہ خواہ شہریوں کے مابین ہو یا حکومت اور شہریوں کے درمیان اس صیغۂ کارفرمائی ہر حال میں امن عامہ کو فروغ دیتی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ معاشرہ کی متصادم قوتوں کے درمیان تو یہ صیغۂ رفع شر کا کام کرتا ہے۔ جب اختلافات، قانونی تنازعہ کا رخ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے عدالت کا یہ کردار بڑا اہم ہے۔

عدلیہ کا دائرہ کار اور دائرہ اختیارات:

دنیا میں عدالت کے مختلف نظام رائج ہیں ہر ریاست میں اس کا اپنا قانون ہوتا ہے۔ جس پر وہاں کی رعایا عمل کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ دنیا کے دیگر قوانین میں قدرے مشترک یہ چیز ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کے خود ساختہ ہوتے ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ ان کے اصول بھی بدلتے رہتے ہیں، نہ صرف زمانہ بلکہ حاکموں کے ساتھ ساتھ قوانین بھی ان کی مرضی کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی قانون بھی دیرپا نہیں ہوتا اور پھر وہ ہر وقت قابل عمل بھی تو نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے برعکس اسلام نے عدالت کا ایک ایسا جامع نظام پیش کیا ہے۔ جو کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اس ہستی (اللہ تعالیٰ) کا بنایا ہوا ہے۔ جس کی نظر میں قانونی لحاظ سے شاہ وگدا سب برابر ہیں۔ قانونی اور سیاسی حاکمیت میں کوئی امتیاز نہیں۔ اگر قانون کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے تو طاقت کا سرچشمہ بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

محمد اسد کی رائے میں جہاں تک ریاست کے تیسرے ستون یعنی عدلیہ کے نظام کی تشکیل وتنظیم کا تعلق ہے تو شریعت نے اس باب میں بھی تفصیلی احکام وضوابط مقرر نہیں کیے ہیں۔ شریعت نے صرف عدل، غیر جانبداری اور عدالتی ضابطہ اخلاق (Judicial ethics) یعنی ججوں کو عدل گستری کے معاملے میں کیا رویہ اور طرز عمل اختیار کرنا چاہیے) اور قانون شہادت کے بنیادی اصول بیان کر دیے ہیں۔ رہا عدالتوں کا انتظامی پہلو اور اس کی ہیئت ترکیبی کا مسئلہ تو اسے ملت کی سوجھ بوجھ اور ہر زمانے کے اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کی مجلس شوریٰ کو آزادی حاصل ہے کہ وہ کوئی ایسا عدالتی نظام وضع کرے جو بہترین نتائج دے سکتا ہو۔ البتہ اس معاملہ میں محمد اسد کی رائے میں سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ عدالتی نظام احکام شریعت کی بنیاد پر چلایا جائے گا۔(2)

اس سلسلہ میں مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ:

---

(1) Leghari, Zaheeruddin, Concept of Islamic System of Government and judiciary, Perspective Shari'ah, Shariah academy International Islamic University Islamabad, I.IV, June 2003, P-2

(2) Asad, Islamic Constitution-Making, PP 52-53

"عدلیہ کا دائرہ عمل بھی خدا کی قانونی حاکمیت کا اصول آپ سے آپ متعین کر دیتا ہے۔ اسلام جب بھی اپنے اصولوں پر ریاست قائم کرتا ہے، اس کے اولین جج خود انبیاء ہوتے ہیں، اور ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ قانون الٰہی کے مطابق کریں۔ پھر جو لوگ انبیاء کے بعد اس کرسی پر بیٹھیں ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ اپنے فیصلوں کی بنیاد اس قانون پر رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول سے ان کو ملا ہے۔ اسلامی ریاست کی عدالتیں قانونِ الٰہی کو نافذ کرنے کے لیے بنتی ہیں نہ کہ اس کے خلاف فیصلے کرنے کے لیے۔"[۱]

شریعت نے عدلیہ کا جو دائرہ کار متعین کیا ہے، اس حوالہ سے امام طرطوشی لکھتے ہیں کہ

"بيد أنه لما جاء ت الشريعة من عند الله تعالىٰ على لسان نبيه، صاحب المعجزة محمد صلى الله عليه وسلم. فمنها ما أقرته في نصابه، ومنها ما نسخته وأبطلت حكمه فعادت الحكمة البالغة الى امر الله تعالىٰ والحكم بما انزل الله، وبطل ما سواه."[۲]

پس جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم (جو کہ معجزات کے مالک ہیں) کو شریعت دی گئی تو بادشاہوں کے وضع شدہ اصول وضوابط میں سے بعض معمول بہ اور بعض منسوخ کر دیے اور منسوخ کا حکم باطل ہے اور اس کی جگہ اعلیٰ پالیسی وضع کی گئی اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر فیصلے کئے جانے لگے اور اس کے ماسوا تمام مراجع باطل کر دیئے گئے۔ صرف شریعت کے مطابق فیصلے ہونے لگے۔

اسلامی ریاست میں عدلیہ شریعت اور رعایا کے اخلاق کا تحفظ کرتی ہے کیونکہ جب بھی افراد کے درمیان یا افراد اور حکومت کے درمیان، حکومت کے اداروں کے درمیان یا صوبوں میں یا صوبوں اور مرکز میں یا کسی اور طرح کا کوئی تنازع پیدا ہوگا، عدلیہ ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ یہ تنازع کسی بھی امر کے بارے میں ہوسکتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی قانون کے حق پر ہونے (یعنی یہ قانون رضائے الٰہی کے مطابق ہے) اور کسی قانون کی تشریح وتعبیر کا فیصلہ بھی عدلیہ ہی کرے گی۔ اسلامی ریاست میں احکام خداوندی پر اسی طریقہ سے ہی عمل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح افراد اور معاشرہ میں انصاف اور احکام خداوندی کے نفاذ میں توازن وتوافق برقرار رہ سکتا ہے۔ لہٰذا مندرجہ ذیل امور کی بجا آوری میں ہی عدلیہ اپنے اختیارات کا دائرہ صحیح خطوط پر متعین کرسکتی ہے۔

ا۔ عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری:

بعض جدید مفکرین کا خیال ہے کہ کسی ریاست کے متمدن اور غیر متمدن ہونے کا اندازہ محض اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی عدلیہ کس حد تک بااختیار اور آزاد ہے۔ ایک مکمل طور پر بااختیار اور ہر قسم کے دباؤ سے آزاد عدلیہ ہی بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ قانون کے مطابق فیصلے کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ عدلیہ کی آزادی وخود مختاری سے مراد یہ ہے کہ وہ انتظامیہ اور مقننہ کے اثر اور دباؤ سے آزاد ہو اور اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے سلسلہ میں عدلیہ پر کوئی بیرونی اثر نہ ہو کیونکہ افراد کو آزادی دلانے کے لیے عدلیہ کا خود مختار ہونا ضروری ہے اگر انتظامیہ کو یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ وہ عدلیہ سے اپنی مرضی کے بغیر فیصلے کرائے تو اسے عوام کی آزادی کو غصب کرنے کے مواقع حاصل ہو جائیں گے۔

لہٰذا غیر جانبدارانہ انصاف کو رواج دینے کے لیے ضروری ہے کہ عدلیہ کا کام ایسے افراد کے ہاتھ میں ہو جو اپنے فرائض کو آزادی اور

۱۔ اسلامی ریاست، ص ۳۹، ۲۵۰

۲۔ سراج الملوک، ۱/۲۲۲

خود مختاری سے ادا کر سکیں اور انتظامیہ سے بھی اس کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کا مواخذہ کر سکتے ہوں۔ عدلیہ جتنی زیادہ خود مختار ہو گی، اتنی آزادی اور منصفانہ طریق سے اپنے فرائض منصبی کو ادا کر سکے گی۔

عدلیہ کی آزادی کی ضرورت اس لیے بھی درپیش ہے کہ وہ ہر طرح کے اثرات سے پاک ہو کر اپنے فرائض بخوبی سرانجام دے

"Independent and professional judges are the foundation of a fair, impartial, and constitutionally guaranteed system of courts of law. This independence does not imply judges can make decisions based on personal prefrences, but rather that they are free to make lawful decisions - even if those decisions contradict the government or powerful parties involved in a case.Thus judicial rulings can be impartial, based on the facts of case, legal arguments, and relevant laws - without restrictions or improper influence by the executive or legislative branches. These principles ensure equal legal protection for all."(1)

آزاد اور پیشہ ورانہ جج ایک منصفانہ، غیر جانبدارانہ اور آئینی، قانون کی عدالتوں کے ضامن نظام کے بانی ہوتے ہیں۔ اس آزادی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ جج ذاتی ترجیحات پر فیصلوں کو بنیاد بنائیں بلکہ یہ کہ وہ بھرپور قانونی فیصلے کرنے میں آزاد ہوں۔ اگرچہ وہ فیصلے کسی معاملہ میں شامل اختیاراتی جماعتوں یا حکومت سے اختلاف کرتے ہوں۔ ایسے عدالتی احکامات غیر جانبدارانہ ہو سکتے ہیں جن کی بنیاد ایک معاملہ کے حقائق، قانونی دلائل اور متعلقہ قوانین پر رکھی گئی ہو۔ انتظامیہ یا مقننہ کے اداروں کی پابندیوں یا غیر مناسب اثر سے آزاد ہوں۔ یہ اصول سب کے لیے مساوی طور پر قانونی تحفظ کو یقینی بناتے ہیں۔

"The judiciary powers of the united states, shall be vested in one supreme courts, and such courts as the congress may from time to time ordain and establish."(2)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عدالتی اختیارات عدالت عالیہ کے قبضہ میں ہوتے ہیں، اور ایسی عدالتیں جیسے کانگریس وقتاً فوقتاً قائم اور مقرر کی جا سکتی ہیں۔

قانون سازی کے تمام اختیارات کانگریس کو حاصل ہیں وہ کسی صورت میں بھی انتظامیہ کے تابع نہیں۔ صدر کانگریس کو برخاست نہیں کر سکتا۔ اور کانگریس بھی صدر یا اس کے وزراء کو عدم اعتماد کی بنا پر عہدے کے مستعفی ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اس طرح عدالتی اختیارات ایک سپریم کورٹ اور دیگر وفاقی عدالتوں کو حاصل ہیں اور عدلیہ حکومت کے دوسرے شعبوں یعنی انتظامیہ اور مقننہ کے اثر و رسوخ اور دباؤ سے آزاد ہے وہ اپنے دائرہ عمل میں مکمل طور پر خود مختار ہے۔

"Judges should be free from executive and legislative control. They

(1) www.America.gov, Three Pillars of Government, P-2 of 3

(2) Dimock, Marshall Edward, American Government in Action, Rinehart and Company, Inc, New York, 1949, P-51-52

should be appointed by the Head of State ment: should have fixed and long tenure, should not be easily removable, and should get handsome salaries and allowances. The Judiciary in India, the U.S. and most democratic countries enjoys independence It acts as the guardian of the consitut.on and the rights and libert.es of the people "(1)

جج، انتظامیہ اور مقننہ کے تسلط سے آزاد ہوتے ہیں۔ انہیں ریاست کا سربراہ میرٹ پر منتخب کرتا ہے۔ لہٰذا انہیں آسانی سے برخاست نہیں کیا جا سکتا اور حکومتی سطح پر ان کی عمدہ تنخواہیں اور الاؤنس ہونے چاہئیں۔ بھارت، امریکہ اور متعدد جمہوری ممالک میں عدلیہ آزاد ہوتی ہے۔ یہ عوام کے حقوق، آزادی اور آئین کے محافظ کے طور پر کام کرتی ہے۔

ہیلری برنٹ عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"The crown appoints the Judges. Once appointed, judges are entirely independent of government and can not be dismissed. When acting Judicially, judges must be completely free of bias - whether political or otherwise by connection, there should be no parliamentary criticism of Judicial decisions."(2)

سربراہ مملکت ججوں کا تقرر کرتا ہے۔ ایک دفعہ تقرری کے بعد جج حکومت کی طرف سے مکمل طور پر آزاد ہوتے ہیں اور انہیں آسانی سے برخاست نہیں کیا جا سکتا۔ عدالتی نظام میں کام کرتے ہوئے ججوں کو تعصب سے مکمل طور پر آزاد ہونا چاہئے۔ آیا کہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا اس کے علاوہ ہو۔ عدالتی فیصلوں میں پارلیمنٹ کی تنقید بھی نہیں ہونی چاہئے۔

اس ضمن میں بروہی لکھتے ہیں:

"Where in the independence of the judiciary shall be fully secured."(3)

جہاں عدلیہ آزاد ہوگی وہاں وہ مکمل طور پر بااختیار ہوگی۔

کیونکہ اگر عدلیہ آزاد ہوگی تو عوام کو پورا انصاف ملے گا۔ اسی طرح عدلیہ کی آزادی کا اندازہ پاکستان کے آئین کے مختلف آرٹیکلز سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۶ء کے آئین میں نہ صرف عدلیہ آزاد تھی بلکہ کوئی بھی جج کسی صوبے کا گورنر نہیں بن سکتا تھا۔ اسی طرح ۱۹۶۲ء کے آئین میں بھی عدلیہ کی آزادی واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔[۴]

پاکستان کے آئین نے سپریم کورٹ کو بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے ضروری اختیارات دیے ہیں، پاکستان میں عدلیہ مختلف مراحل

---

(1) www.egyankosh.ac.in, organs of Government, P-20

(2) Understanding Public Law, P-30

(3) Brohi, A.K., Fundamental Law of Pakistan, 1st Edition, Din, Muhammadi Press Karachi, 1958, P-939

۴　جاوید مسلم، عدلیہ کے مسائل اور اس کا حل، ہفت روزہ کہکشاں، ۱۵ تا ۲۲ جون ۱۹۹۷ء، ص ۱۰

سے گزری ہے، غیر آئینی اقدامات بھی اٹھائے گئے مگر عدلیہ نے ہر حالت میں اپنی آزادی کو یقینی بنایا کیونکہ عدلیہ سمجھتی ہے کہ آئین کی پاسداری اور قانون کی حکمرانی سے ہی ملک میں جمہوری نظام کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔[1]

حکیم یوسف لکھتے ہیں:

"The positive aspect relates to the facilitation of the judicial officer's ability to freely come to a decision based on personal conviction about the understanding of the law. The main constraints to judicial independence on the positive view of the matter are jurisdictional doctrine and judicial precedent, products of the judicial system itself. Thus, it is of an internal nature. Both principles help to ensure certainty in the law in some way but could also constrain lower courts in the proper exercise of their discretion. Thus the two sides consist of measures designed to afford the judge 'freedoms from' external constraints and 'freedoms to' follow their conscience in thier just adjudication of disputes."(2)

آزادی کا مثبت پہلو عدالتی افسران کی اہلیت میں سہولت پیدا کرنے سے متعلقہ ہے جس میں وہ قانون کی سمجھ بوجھ کے متعلق اور ذاتی یقین کی بنیاد پر فیصلے کرنے میں آزاد ہوتے ہیں۔ عدلیہ کی آزادی پر مثبت نظریہ سے پابندیاں، حاکمانہ اختیارات کا معائنہ اور عدالتی نظیر کا معاملہ ہیں۔ اسی طرح یہ ایک اندرونی فطرت ہے کہ دونوں پہلو (مثبت اور منفی) کسی طریقہ سے قانون کو یقینی بنانے میں مدد کرتے ہیں لیکن اپنی فہم و فراست کے مناسب عمل میں چھوٹی عدالتوں کو مجبور بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ان دو پہلوؤں سے مراد یہ ہے کہ جج کو بیرونی پابندیوں سے آزادی حاصل ہو اور عدالتی حکم کے جھگڑوں میں اپنے ضمیر کی پیروی سے بھی آزادی حاصل ہو۔

ریاست میں عدلیہ کا ادارہ مکمل طور پر حکومت اور دوسری مرکزی طاقتوں سے علیحدہ ہونا چاہئے۔ دراصل آزاد عدلیہ کا کردار قانون کی گرفت اور اس کے برتر ہونے کو یقینی بناتا ہے۔ علاوہ ازیں عدلیہ غیر جانبدارانہ اور آزادانہ منصف کا کام کرے اور اسے خصوصی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں تاکہ یہ خود کو دوسرے حکومتی عناصر، غیر سرکاری اثر و رسوخ، سیاسی تنظیموں اور بیرونی دباؤ سے آزاد اور منفرد رکھ سکے، کیونکہ عدلیہ مالیاتی و اقتصادی انتظام و انصرام، جمہوری اداروں کے فروغ، استحکام اور منصوبوں کی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے ریاست کا ایک اہم جزو ہے، اس کے فیصلے اور احکامات گورننس پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔

۱۔ روزنامہ جنگ لاہور، ۲۷ فروری ۲۰۱۱ء، ص ۱۰، بقیہ تبصرہ

(2) Transitional Justice, Judicial Accountability and the Rule of Law, P-18.

ii۔ قانون کی حاکمیت و بالاتری:

اسلام نے عدل کے غیر جانبدارانہ نفاذ کو بڑی اہمیت دی ہے اور غیر جانبدارانہ عدل کو اسلامی انتظامی ڈھانچے کا ایک لازمی جزء قرار دیا ہے۔ کیونکہ عدل و انصاف کا قیام ہر مہذب و متمدن انسانی معاشرہ کی اولین ضرورت ہے اس کے بغیر نہ لوگوں کے مابین حقوق و فرائض کا تعین ہو سکتا ہے اور نہ ظلم و استحصال کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ہر زمانہ میں قانون سازی اور تشریح کا بنیادی مقصد یہی رہا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے اسلام نے قانون کی حاکمیت اور بالاتری کو تسلیم کیا ہے تاکہ وہ مملکت کی مصلحتوں کی پرواہ کئے بغیر مبنی برحق فیصلہ صادر کرے خواہ حکومت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ ذیل عبارت سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ:

"The Judiciary will not at any cost, allow the government to restore to illegal practices. If the Government over tends to illegal practices, Judiciary will interrupt as it is duty bound to do so."(1)

عدلیہ حکومت کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کوئی غیر قانونی کام کرے، اگر حکومت ایسا کرتی ہے تو پھر عدلیہ کو حکومت کے اس فعل سے روکنے اور اسے ایسا کرنے سے منع کرنے کا حق ہے۔ (عدلیہ کا کام قانونی طریقے سے ملک کا نظام چلانا اور ہر کام کو غیر قانونی ہونے سے بچانا ہوتا ہے)

سید شبیر رضوی عدلیہ میں قانون کی حاکمیت کے متعلق لکھتے ہیں:

"Judicial review is power of any court to hold unconstitutional and hence unenforceable any law, official action based upon a law, and any other action by a public official that it deems upon careful, normally pain staking, reflection and in line with the cannons of the taught tradition of the law as well as judicial self-restraint to be in conflict with the basic law."(2)

عدالتی نظر ثانی سے مراد کسی عدالت کا وہ اختیار ہے جس میں وہ غیر آئینی اور کسی ناقابل عمل قانون کو اپنے اختیار میں رکھتی ہے۔ اسی طرح سرکاری کام جس کی بنیاد قانون پر رکھی گئی ہو یا کسی غیر سرکاری افسر کا کام جو نہایت، احتیاط، محنت اور سوچ و بچار سے کیا گیا ہو، اس کو بھی یہ اپنے اختیار میں رکھتی ہے۔ قانون کے ترتیبی رسم و رواج کے تصادم کو قابو میں رکھنے کے ساتھ ساتھ عدالت بنیادی قانون کے جھگڑوں میں بھی ضبط نفس کا مظاہرہ کرتی ہے۔

چیف جسٹس افتخار احمد چودھری نے اپنے ایک خطاب میں قانون کی حاکمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا:

"قانون کی حکمرانی کے لیے آئین کی مضبوطی اور لیگل فریم ورک کا ہونا بہت ضروری ہے۔ قانون کی حکمرانی کا عامل، اقتصادی ترقی پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔ عالم معاشی ترقی پر بھی قانون کی حکمرانی کے نمایاں اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سپریم لاء کے طور پر ریاست کا آئین اس کے

---

(1) The Nation, Lahore, 31.3.1997, P-1

(2) Rizvi, Syed, Shabbir Raza, Fundamental Rights and Judicial review in Pakistan, Vanguard Books (Pvt.) Lahore, 2000, P-301

ہر ادارے کو آزاد اور خود مختار رکھتا ہے۔تاہم ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے قانون کی حکمرانی کو یقینی بنانا ضروری ہے۔[1]

آر۔کے پرتھی عدلیہ میں قانون کی پاسداری کے بارے میں لکھتے ہیں

"It keeps all the programs and functions anes of government with in their respective jurisdiction and limitation. Generally, the judicial branch interprets the laws of the nation. Because of the nature of law enforcement, the judicial branch often has the largest member ship."(2)

عدلیہ تمام حکومتی عناصر اور اداروں کو اپنی مقرر کردہ حدود اور حاکمانہ اختیارات میں رکھتی ہے۔عموماً عدالتی ادارہ ہی قوم کے قوانین کی ترجمانی کرتا ہے کیونکہ قانون کے نفاذ کی نوعیت کے لحاظ سے عدالتی ادارہ اکثر بہت بڑی رکنیت کا حامل ہوتا ہے۔

قانون کی حکمرانی (Rule of Law) گو ایک مغربی اصطلاح ہے جسے سب سے پہلے پروفیسر البرٹ ڈائسی نے استعمال کیا اور اس حاکمیت قانون کے تین پہلو پیش کیے:

1- کسی بھی فرد کو قانون کی خلاف ورزی کرنے پر عدالت مجوزہ کے سوا اور کوئی سزا دینے کا مستحق نہیں۔

2- کوئی فرد خواہ کسی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ حیثیت کا حامل ہو۔قانون سے بالا نہیں ہو سکتا۔

3- فرد کے حقوق کا تحفظ دستاویزی قانون سے نہیں بلکہ عدالت کے ذریعہ سے ہوتا ہے لہٰذا عدالت کا فرض ہے کہ وہ ہر قسم کے خوف و اثر سے بے نیاز ہو کر قانون کے نفاذ اور عدل کے استقرار کا کام انجام دے۔[3]

قانون کی حکمرانی کے یہ تینوں اجزا ابتدا ہی سے اسلامی تعلیمات اور اسلام کے قائم کردہ معاشرہ اور عدالتی نظام میں مغرب سے کہیں زیادہ واضح اور روشن دکھائی دیتے ہیں۔

iii۔حقوق کا تحفظ اور انصاف کی فراہمی:

عدلیہ کا بنیادی مقصد نظم معاشرہ میں توازن و اعتدال کی برقراری، افراد کی استواری کردار، حقوق کی فراہمی اور اسلامی اقدار کا تحفظ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مقدمات اور تنازعات کی تہ تک رسائی، معاملات کی کھوج اور چھان بین اور عدل و انصاف کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے صحیح اور درست فیصلوں پر پہنچ کر انہیں نافذ کرنے میں بھی عدلیہ بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

اسلام میں قانون اور عدلیہ کے سامنے بلا امتیاز مذہب و نسل اور طبقہ و اقتدار کے سب افراد کے درمیان مساوات کا اصول سختی سے اپنایا گیا ہے۔حتیٰ کہ سربراہ ریاست کو بھی کوئی تحفظ اور امتیاز حاصل نہیں۔

کسی بھی سیاسی نظام کا بنیادی مقصد انسانی حقوق کا تحفظ ہے اور یہ کام حکومتی عناصر میں سے عدلیہ ہی سرانجام دے سکتی ہے۔

"To administer justice, decide disputes and punish criminals. In a

1- روزنامہ جنگ، لاہور، ۷ فروری ۲۰۱۱ء ص ۱۰

(2) Principles of Political Science, P-130

(3) Dicey, Albert, V. "An Introduction to the study of the constitution, Press MacMillan and Co Ltd, New York, London, 1965, P-188

federal set up, the centre-state disputes are resolved by the highest courts as in the U.S. and India. Higher judiciary protects the consitution and can annual laws which are violative of the Constitution. Rights of the people are protected by the courts and for that purpose writs are often issued by the higher courts."(1)

عدالتی نظم ونسق، جھگڑوں کے فیصلے اور مجرموں کو سزا دینا عدلیہ ہی کا فریضہ ہے۔ انڈیا اور امریکہ کے وفاقی نظام میں مرکزی ریاست کے جھگڑے عدالت عظمیٰ حل کرتی ہے۔ وہ آئین اور ان سارے قوانین کا تحفظ کر سکتی ہے جو آئین کی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں رعایا کے حقوق کی عدالتیں ہی محافظ ہوتی ہیں اور ان مقاصد کے لئے احکامات اکثر اعلیٰ عدالتوں سے ہی نافذ ہوتے ہیں۔

جو ادارے ملکی نظم ونسق کو چلانے کے لیے قائم کیے جاتے ہیں ان کے سامنے کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ جہاں انتظامیہ کا کام ملکی نظم ونسق چلانا ہوتا ہے وہاں عدلیہ کا کام شہریوں کو انصاف مہیا کرنا اور ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرنا ہوتا ہے۔

۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعہ (۳)۱۷۵ پر زور دیا گیا ہے تاکہ لوگوں کے شہری حقوق کا تحفظ ہو سکے اور انہیں حکومتی اداروں کے ممکنہ جبر اور زیادتی کے خلاف دادرسی میسر آ سکے کیونکہ ہمارے ہاں شہریوں کے حقوق غصب کرنے اور ریاستی جبر کی مثالیں عام ہیں اس لئے اس کی اہمیت وضرورت کو سنگین طور پر محسوس کیا گیا۔

"Judiciary is the guardion of the rights and liberty, life and property, and honour and happiness of the common man. The common citizen comes into contact with the courts more thqn with any other organ of the government."(2)

عدلیہ عام آدمی کے حقوق اور آزادی، زندگی اور جائیداد، عزت اور خوشی کی محافظ ہوتی ہے۔ عام شہری کا واسطہ حکومت کے دوسرے اداروں کی نسبت عدالتوں سے زیادہ پڑتا ہے۔

عدلیہ میں حقوق وانصاف کی ادائیگی کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور دیگر قاضیوں کو ارسال کیا:

''قضا ایک زبردست فرض اور قابل عمل سنت ہے۔ مقدمات اور اس کی سفارشات سامنے ہوں تو عقل وانصاف سے کام لو۔ جس حق بات کا نفاذ نہ ہو اس کا زبان سے نکالنا بے سود ہے۔ ملاقات انصاف اور ہم نشینی میں مساوات کا خیال رکھو۔ کوئی تمہارے حلم سے فائدہ نہ اٹھائے اور نہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے مایوس ہو۔ مدعی کے ذمے شہادت شرعی ہے اور مدعی علیہ پر قسم ہے۔ مسلمانوں میں صلح کرانا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ اس صلح سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ کیا جائے۔ اپنا سابق فیصلہ بطور نظیر کے استعمال کرنا ضروری نہ سمجھو۔ اگر غور وتدبر کے بعد حق کی طرف رہنمائی ہو تو اس کو اختیار کرو۔

---

(1) www.egyankosh.ac.in, Organs of Government. Executive, Legislature and Judiciary, P-20

(2) The Constitution of Pakistan, PP-151-152

اگر کسی امر کے متعلق قرآن وحدیث سے فیصلہ معلوم نہ ہو اور قلب پریشان ہو تو عقل سے کام لے کر نظائر وامثال پر قیاس کرو۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ عدالتی نظم ونسق کی تاریخ میں اب تک ان سے بہتر اصول پیش نہیں کئے جا سکے اور اگر ان اصولوں کی بنیاد پر آج دنیا کے کسی بھی خطہ میں عدلیہ کو منظم کیا جائے تو عدل وانصاف اور فراہمی حقوق پر مبنی ایک مہذب معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

محکمہ عدلیہ (عدلیہ کے محکمہ جات)

عدالت کسی بھی ریاست کا ایک اہم عضو ہوتا ہے جو عدلیہ کے احکامات پر عمل درآمد کرتے ہوئے فوجداری، دیوانی اور انتظامی معاملات میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان میں عدالت کا آزادانہ اختیار رہتا ہے۔ عدالت کے تمام فیصلے طاقت پر مبنی ہوتے ہیں جن کی بغیر کسی حیل وحجت کے تعمیل ہوتی ہے۔ عدالتی نظام کا ایک پیچیدہ ڈھانچہ ہے۔ جو مخصوص اداروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

وکی انسائیکلو پیڈیا میں عہد جدید کی عدالتوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"The judiciary includes the Supreme Court, provincial high courts, District & sessions Courts, Civil and Magistrate courts exercising civil and criminal jurisdiction. Some federal and provincial courts and tribunals such as Services court, Income tax & exise court, Banking court and Boards of Revenue's Tribunals are as well established in all provinces".(2)

ذیل میں مندرجہ بالا عدالتوں کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے جو عصر حاضر میں رائج ہیں:

أ۔ عدالت عالیہ مرافعہ:

اسلامی ریاست کی سب سے بڑی عدالت مرافعہ ہے اس عدالت کا قاضی امام اکبر ہوتا ہے۔ اس عدالت کا ذکر قرآن مجید میں واضح ہے۔ ارشاد الٰہی ہے

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾ [۳]

اے رسولؐ! ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کریں۔

شریعت اسلامی میں سب لوگوں سے زیادہ فیصلہ کرنے کا حق دار خلیفہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ خود کرے یا اپنے کسی نائب کے ذریعہ سے اس کو عمل میں لائے لیکن قاضی فیصلہ جات کرنے میں بالکل آزاد ہے۔ خلیفہ یا کسی اور با اثر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے کسی فیصلے پر مجبور کرے بلکہ وہ اسے کسی مقدمہ کی دوبارہ سماعت کے لیے بھی مجبور نہیں کر سکتا۔

۱۔　السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الشہادات، باب لا یحیل حکم القاضی علی المقضی لہ، ۱۰، ۱۱۵؛ احکام السلطانیۃ للماوردی، ص۱۰۹، ۱۱۰؛ معین الحکام، ص۱۶

(2)　en.wikipedia.com, Politics of Pakistan, P-1 of 9

۳۔　المائدۃ: ۴۷

"القاضی اذا قضی فی حادثة فی الحق ثم امر السلطان ان یسمع هذه الحادثة ثانیا بمشهد من العلماء لا یفترض علی القاضی ذلک."[1]

قاضی جب کسی مقدمہ میں کوئی فیصلہ کر چکے اس کے بعد سربراہ مملکت اسے حکم دے کہ وہ اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت علماء کے سامنے کرے تو اس کا حکم ماننا قاضی کے لیے ضروری نہیں۔

عصر حاضر میں عدالت عالیہ مرافعہ کو سپریم کورٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک محدود دائرہ میں رہتے ہوئے مقننہ اور انتظامیہ کے اختیارات کا جائزہ لیتی ہے۔ یہ آئینی و رقانونی پیچیدگیاں، بین الصوبائی معاملات، صوبوں اور وفاق کے درمیان معاملات بھی طے کرتی ہے۔

جدید جمہوری ممالک میں عدالتی نظر ثانی کا اختیار عدالتوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہے۔ عدلیہ کے زیادہ تر اختیارات اور فرائض کی ذمہ داری عدالتیں ہی سرانجام دیتی ہیں کیونکہ وہ عوام الناس کے حقوق کا موثر طریقے سے تحفظ کر سکتی ہیں۔

اس ضمن میں امریکہ اور انڈیا کی سپریم کورٹ کی ہیئت پیش نظر رہے جسے تمام اداروں پر برتری اور حاکمیت حاصل ہے

"The study of judicial review virtually relates to the two democratic countries of the world, i.e. United States and India, both having written constitutions and a federal system of government. Both the American Supreme Court and the Indian Superme Court recognize judicial supremacy. The American judiciary can also declare an Act unconstitutional, if it fails to satisfy the requirements of the "due process of law." The "Due Process" Clause and "Judicial Supermacy" has turned the American Supreme Court into a kind of super legislature."(2)

عدالتی نظر ثانی کا مطالعہ درحقیقت دنیا کے دو جمہوری ممالک سے متعلق ہے مثلاً امریکہ اور بھارت دونوں میں تحریری آئین اور صدارتی وفاقی نظام ہے۔ امریکہ اور بھارت کی سپریم کورٹ کو عدالتی حاکم اعلیٰ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ امریکہ کی عدلیہ ایک غیر آئینی ایکٹ کا اعلان بھی کر سکتی ہے اگر یہ مقررہ قانونی کاروائی کے مطالبات سے غیر مطمئن ہو۔ حسب قانون، کلاز (دستور) اور 'عدالتی بالادستی' کو امریکی عدالت عالیہ یعنی اعلیٰ مقننہ کی ایک قسم میں بدل دیا گیا ہے۔

نظر ثانی کے حق کی رو سے عدالت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ملکی قوانین کا تحفظ کرتے ہوئے کسی بھی انتظامی قانون کو معطل کر دے یا غیر دستوری قرار دے دے کیونکہ دستور ہی ملک کے سیاسی نظام کی بنیاد ہوتا ہے اور اس کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہی برتر اور قابل عمل ہوتے ہیں۔

تمام انتظامی اور عدالتی عہدے داروں کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے کہ سپریم کورٹ کی معاونت کریں۔ اس سلسلہ میں تمام حکومتی

۱۔ مولانا، شیخ نظام و جماعة من علماء الهند الأعلام، الفتاوی الهندیة، الطبعة دار الکتب العلمیة، بیروت، ۲۰۰۰م، ۳۰۲/۳

(2) The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan 1973, PP-118-119

اداروں کو بھی اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ بھی عدالت کے احکامات کی تعمیل کریں۔ ماتحت عدالتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ عدالت عظمیٰ کی تمام ہدایات پر عمل کریں۔ تاکہ وہ لوگوں کو سہولت اور آسانی کے ساتھ انصاف فراہم کر سکے۔

عدالت عالیہ ولایت:

یہ عدالت صوبہ کی سب سے بڑی اور آخری عدالت ہوتی ہے۔

عہد نبوی میں اس عدالت کا تصور کہیں نہیں ملتا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود عدالت کے قاضی اکبر تھے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض عدالتیں ضرورت کے تحت چند علاقوں میں قائم کیں۔ عہد خلفائے راشدین میں بھی ایسی عدالتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

عدالت فوق العادۃ (اسپیشل ٹریبونل)

یہ عدالت خاص حالات میں خاص معاملات کے متعلق قائم ہوتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں اس قسم کی عدالتوں کی مثالیں موجود ہیں۔

امام سرخسی رقمطراز ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح نجران کی عدالت کے قاضی مقرر ہوئے۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ عدالت یمن کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔"[1]

عہد نبویؐ میں زیادہ تر اس قسم کی عدالتیں ضرورت کے مطابق قائم کی جاتی تھیں۔[2]

عہد خلفائے راشدین، خصوصاً عہد فاروقی میں عدالتوں کا ایک منظم نظام رائج ہوا اور ہر صوبہ کی سطح پر ایک عدالت قائم ہوئی۔ اس کے چند نظائر یہ ہیں:

شریح بن حارث کوفہ کی عدالت عالیہ کے قاضی تھے۔[3]

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بصرہ میں رئیس مجلس قضاء تھے۔[4]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے صوبے کے قاضی تھے۔[5]

کعب بن سور بصرہ کی عدالت کے قاضی تھے۔[6]

یہ وہ عدالت کی قسمیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور سے ثابت ہیں زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق عدالتوں کا ڈھانچہ بدلہ جا سکتا ہے۔ لیکن عدالت کی رو سے انصاف ہر حالت میں برقرار رہنا چاہیے۔ عصر حاضر کے نئے تقاضوں کے

---

1. المبسوط، ۱۶/۷۶
2. عدالت صلح (صلح کی طرف مائل کرنا)، عدالت اصلاح بین الناس (نزاعی مقدمات کا مصالحت کے اصول پر فیصلہ کرنا)، عدالت تحکیم (عدالت کا فریقین کی مرضی کے مطابق ثالث مقرر کرنا)، عدالت حاکمہ بتدئیہ (مقدمہ کی قانونی سماعت کرنے والی پہلی عدالت ہے)، عدالت حاکمہ مصر (عدالت شہر و ہر ضلع کے صدر مقام میں اس قسم کی عدالت ہوتی ہے)
3. السنن الکبریٰ، کتاب آداب القاضی، ۱۰/۸۷
4. المبسوط، ۱۶/۶۰
5. السنن الکبریٰ، کتاب آداب القاضی، ۱۰/۸۷
6. ایضاً

مطابق ''آئین پاکستان'' میں عدالتوں کا ڈھانچہ کچھ اس طرح تشکیل دیا گیا ہے۔

آئین کے آرٹیکل ۲۰۲ تا ۲۰۳ میں ہائی کورٹ کے اختیارات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"Subject to the constitution and law, a high court may make rules regulating the practice and procedure of the court or of any court subordinate to it. Each high court small supervise and control all courts subordinate to it."(1)

قانون اور آئین کی رو سے، عدالت عظمیٰ قوانین کو باضابطہ بنا کر اپنی کسی ماتحت عدالت کی تعبیر و تشریح کر سکتی ہے کہ عدالت عالیہ کو ماتحت عدالتوں کے ضبط اور نگہداشت کے چند اختیارات دیئے گئے ہیں۔

اور وہ اپنے اختیارات اس حد تک استعمال کر سکتی ہے جس حد تک اسے متعلقہ قوانین کے تحت اختیار حاصل ہے۔ ان اختیارات کا مقصد عدالتی نظام کو بہتر اور انصاف کے حصول کو سہل بنانا ہے۔

عدالت عالیہ کے علاوہ وفاقی شرعی عدالت بھی ہوتی ہے۔ جس کے ججوں میں علماء کرام بھی ہوتے ہیں۔ (جو اسلامی سکالرز ہوتے ہیں) جنہیں اسلامی قوانین پر مکمل دسترس حاصل ہوتی ہے۔(2) یہ عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ آیا کوئی قانون اسلام کی تعلیمات کے منافی ہے۔ اگر کوئی قانون اسلام کے منافی ہو تو، وفاقی قانون کے معاملہ میں صدر یا صوبائی قانون کے معاملہ میں گورنر اسلام کے احکامات کے مطابق قانون کو لانے کے لیے اقدامات کرتے ہیں۔ عدالت ان قوانین کے تحت جو نفاذ حدود سے متعلقہ ہوتے ہیں، جرائم پیشہ عدالتوں کے فیصلوں سے گذارشات بھی سنتی ہے۔ یہ قوانین شراب، چوری اور غیر قانونی جنسی تعلقات جیسے جرائم سے متعلقہ ہوتے ہیں۔(3)

علاوہ ازیں مخصوص عدالتیں اور ٹریبونل خاص قسم کے معاملات کو نمٹانے کے لیے قائم ہوتے ہیں

"Such as drug courts, commercial courts, labour courts, traffic courts, an insurance appellate tribunal, an income tax appellate tribunal, and special courts for bank offences. There are also special courts to try terrorists. Appeals from special courts go to high courts except for labour and traffic courts, which have their own forums for appeal. Appeals from the tribunals go to the Supreme Court".(4)

قانون سازی 'مقننہ' کا کام ہے لیکن اگر قانون غیر واضح اور پیچیدہ ہو تو عدالتیں فیصلہ کرتی ہیں کہ قانون کیا ہے؟ اور اس کو کیسے نافذ

---

(1) The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1973, P-133

(2) شرعی عدالت کے علاوہ پیش آمدہ مسائل کی خصوصی نوعیت، اور عادات و رسم کی رعایت سے عدل و انصاف پر مبنی بہترین حل اسلامی اصولوں کی روشنی میں پیش کرنے کے لیے محض جامد قانون پر انحصار نہیں کیا جا سکتا بلکہ معاملات سے متعلق اکثر امور مفتی اور مجتہد کی صوابدید پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ان مفتیان اور مجتہدین پر مشتمل ادارہ کا نام دارالافتاء ہے۔

(3) www en.wikipedia.com, Politics of Pakistan, P-4,5 of 9

(4) Ibid, P-5 of 9

کرنا چاہیے؟ حالات حاضرہ کی روشنی میں موثر طریقے سے قانون کی تشریح و توضیح کرنی چاہیے۔ عدالتوں کو عوام الناس کے ابھرتے ہوئے جذبات سے باخبر رہنا چاہیے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ مقننہ کا کوئی قانون عوام الناس کے حقوق و فرائض کو پامال تو نہیں کر رہا۔ عدالتوں کا سب سے اہم کام عدالتی نظر ثانی ہے، جس کے تحت وہ مقننہ اور انتظامیہ کے امور کا معائنہ کرتی ہیں۔ عدالتیں حکومتی کارکردگی کی بھی نگرانی کرتی ہیں اور سیاسی نظام کے استحکام کے لیے بھی ممد و معاون ہوتی ہیں۔ لیکن عدالتوں کا رویہ کسی قسم کی رکاوٹ یا تباہی پر مبنی نہیں ہونا چاہیے تاکہ سیاسی تنظیم پر قابو پانے میں کسی دشواری سے دو چار نہ ہونا پڑے۔

عدلیہ کو اپنی متعین حدود میں رہتے ہوئے قانون کے موثر نفاذ کی خاطر آزاد اور خود مختار ہونا چاہیے۔ اس محکمہ یا ادارہ میں کام کرنے والے افراد کو اپنے خاص ہونے کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ ایک خاص مقام رکھنے کا دعویٰ کریں کہ وہ دوسرے حکومتی کارکنان سے علیحدہ اور آزاد ہیں جن کو نگرانی کا کام سونپا گیا ہے۔ عدلیہ کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف شہریوں کے آپس کے حقوق کا تعین اور نگرانی کرے بلکہ شہریوں اور ریاست کے درمیان، صوبوں کے مابین، مرکز اور صوبوں کے درمیان حقوق و فرائض کی ذمہ داری کا تعین اور ان کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو حل کرے۔

اعضائے ریاست کی باہمی مداخلت ـــــــ ایک جائزہ

کسی بھی ریاست کے حکمران کی اہم ضرورت قوانین تشکیل دینا اور ان کو مربوط و منظم کرنا ہے۔ یہ کام وہ اپنے تین عناصر انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے ذریعہ سے سرانجام دیتا ہے۔ انتظامیہ کا کام ملکی نظم ونسق، مقننہ کا کام قانون سازی اور عدلیہ کا کام قوانین کا نفاذ اور عوام الناس کو عدل وانصاف فراہم کرنا ہے۔ اس طرح ریاست کے یہ تینوں اعضاء اپنے تفویض کیے گئے کاموں کو بخوبی سرانجام دیتے ہیں اور باہم مربوط ہیں۔ ان کے ہم آہنگ فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے ایک سیاسی نظام مستحکم ہوتا ہے اور اسے قوت حیات ملتی ہے۔

ہیگل نے ان اداروں کے باہمی تعلق کو یوں بیان کیا ہے:

"**Legislative:** In his political state the legislative have authority to make general rules **Government:** In his Political state the government or "administrative" power is "to subsume single cases and the spheres of particularity under the universal the executive. Administrates should be selected on the basis of their own ability, not on the bases of birth and this profession ought to be open to all". (1)

Judiciary: In his political state judiciory applies those rules which legislature formulate". (2)

مقننہ: سیاسی ریاست میں مقننہ عمومی طور پر قوانین بنانے کا اختیار رکھتی ہے۔

حکومت: ہمہ گیر انتظامیہ کے تحت ایک سیاسی ریاست میں حکومت یا انتظامیہ کا اختیار انفرادی معاملات کا اطلاق کرنا اور مخصوص کردار ادا کرنا ہے۔ انتظامی کارکنان اپنی اہلیت پر منتخب ہونے چاہئیں نہ کہ وہ موروثی بنیادوں پر ہوں۔ اور یہ پیشہ سب کے لیے قابل رسائی ہو۔

عدلیہ: سیاسی ریاست میں عدلیہ اُن قوانین کا نفاذ کرتی ہے جن کو قانون ساز وضع کرتے ہیں۔

اگر ریاستی اداروں کے باہمی تعلق کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ عدلیہ اور انتظامیہ کا باہمی تعلق تیسرے ادارے مقننہ کے ساتھ مقابلتاً کم ہے جب کہ آپس میں ان کا تعلق بہت زیادہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مقننہ تو قانون سازی کرنے کے بعد فارغ ہو جاتی ہے۔ تاہم عدلیہ کو اس قانون سازی کے مطابق فیصلے کرنے پڑتے ہیں جب کہ انتظامیہ ان فیصلوں پر عمل درآمد یقینی بناتی ہے۔ یوں ان اداروں کا باہمی تعلق مسلسل اور متواتر ہے۔

عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے طرز حکومت کا بنظر عمیق جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ادوار میں حکومت (عاملہ) اور مجلس شوریٰ (مقننہ) میں کوئی حد بندی موجود نہ تھی۔ پیغمبر اعظم ﷺ اگر مدینہ کی ریاست کے حکمران تھے تو اس ریاست کے شارع و قانون ساز اور قاضی القضاۃ بھی تھے۔ گویا عاملہ، مقننہ اور عدلیہ ریاست کے تینوں شعبوں کے وظائف واختیارات آپ ﷺ کی ذات میں جمع تھے"۔ (3)

(1) *Harman, Judd M, Political thought from plato to present, Megrue, Hillbook Company, London, 1964, P-354*

(2) *Political thought from plato to the presant, Mc Grace-Hill Book Company, NewYork, London, 1964 ,PP-354 55*

(3) *Principles of state, p-56-57*

عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے تعامل سے مترشح ہوتا ہے کہ جہاں تک صدر ریاست کا تعلق ہے وہ صدر ہونے کی حیثیت سے ریاست کے ان تینوں شعبوں کا صدر ہے مگر اس دور میں یہ تینوں شعبے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔

عہد خلفائے راشدین میں اہل الحل والعقد کے مشورہ سے انتظامی معاملات چلائے جاتے اور قانونی مسائل کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ نظم ونسق کے ذمہ دار الگ تھے جن کا قضاء (عدالت) میں کوئی عمل دخل نہ تھا اور قاضی الگ تھے جن پر انتظامی ذمہ داریوں کا بار نہ تھا۔ افضل الرحمٰن اعضائے ریاست کے باہمی تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "The executive works directly under the supervision and instruction of the Head of State. In the judiciary, he makes appointments, but cannot ordinarily dismiss any judge nor can he influence or alter his judicial decisions, They act quite independently of the executive in judicial matters The law is supreme and fundamental and all departments, branches and organs of the State are equally subject to it. If there is any dispute between the State organs on any matter, it must be referred to Allah and His Messenger (that is, the Islamic Law) for final decision."(2)

انتظامیہ براہ راست سربراہ ریاست کی ہدایت اور نگرانی کے تحت کام کرتی ہے۔ عدلیہ میں سربراہ تقرریاں کرتا ہے لیکن عام طور پر نہ وہ کسی جج کو برخواست کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے عدالتی فیصلوں کی ترمیم یا ان میں اپنا اختیار استعمال کر سکتا ہے۔ وہ (جج) عدالتی معاملات میں انتظامیہ سے بالکل آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ قانون اہم اور بالاتر ہوتا ہے اور ریاست کے تمام شعبے، ادارے اور عناصر اس کے سامنے مساوی ہیں۔ اگر کسی معاملے میں اعضائے ریاست کے مابین کوئی جھگڑا ہو جائے تو انہیں حتمی فیصلہ کے لئے اللہ اور اس کے پیغمبر (یعنی اسلامی قانون) کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

انتظامیہ کے فرائض میں مقننہ اور عدلیہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انتظامی طریق کے فیصلے کرنا شامل ہے مثلاً مقننہ اور عدلیہ کے فیصلوں کے لئے Mob.lity کا انتظام اور دیگر اس قسم کے اقدامات، جب کہ عدلیہ بھی نظامیہ اور مقننہ کو مختلف مشوروں اور فیصلوں کے ذریعے پابند کر سکتی ہے یا Guide کر سکتی ہے۔ غرض یہ کہ کوئی ادارہ بھی دیگر ادارے کی مدد کے بغیر نہ تو استحکام پا سکتا ہے اور نہ درست طور پر اپنے فرائض سر انجام دے سکتا ہے۔

لارڈ بورے (Lord Borne) انسانی حقوق میں اعضائے ریاست کے باہمی تعلق کے کردار کو یوں بیان کرتے ہیں:

۱؎ مودودی، اسلامی ریاست، ص ۳۲۵: ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ:
"حضور ﷺ کو یہ اپنے انتظامات وراثت میں بالکل نہیں ملے۔ فوج، خزانہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے اداروں میں سے کوئی چیز مدینہ میں موجود نہیں تھی ہر چیز حضور ﷺ کو خود ہی پیدا کرنی اور ترقی دینی تھی۔ قانون سازی صرف دینی معاملات تک ہی محدود نہیں تھی اس میں دنیوی مسائل پر بھی توجہ دی گئی"
(حمید اللہ، اسلامی ریاست، ص ۲۲،۲۳)

(2) *The Encycloprdia of seerah, Vol: 1,P-775*

"Breathed new life into the relationship between Parliament, government and the judiciary, so that all three are working togeather to ensure that a culture of respect for human rights becomes embedded across the whole of our society". (1)

پارلیمنٹ، حکومت اور عدلیہ کا باہمی تعلق ایک نئی زندگی کا قیام ہے تا کہ تینوں عناصر اس بات کو یقینی بنانے کے لئے مل جل کر اس طرح کام کریں کہ تمدن میں احترام حقوق انسانی ہمارے پورے معاشرے کے گردونواح میں مجسد ہو جائے۔

لارڈ ہنٹ (Lord Hunt) ریاستی اداروں پر عدالتی کنٹرول کو ضروری قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"Parliament makes the Laws, the judiciary interprets them and the judiciary develop the common law Parliament also confers all manner of powers on the executive and other bodies, and it is for the courts to ensure that those powers are neither exceeded nor abused but exercised lawfully".(2)

پارلیمنٹ قانون سازی کرتی ہے، عدلیہ ان کی ترجمان ہے اور عدلیہ کامن لاء کو فعال بناتی ہے۔ پارلیمنٹ، انتظامیہ اور دوسرے کارکنان کو ان کے اختیارات میں ہر طریقہ سے مشورہ بھی دیتی ہے۔ عدالتوں کا یہ کام ہے کہ وہ ان اختیارات کو یقینی بنائیں، نہ وہ (اختیارات) حد سے تجاوز کریں اور نہ ہی ان کا ناجائز استعمال ہو لیکن قانون کے مطابق کام کریں۔

امریکہ جہاں کا طرز حکومت صدارتی ہے وہاں دستوری نظام کی سب سے اہم اساس تقسیم اختیارات کا اصول ہے اور یہ اصول وہاں کے سیاسی نظام کا ایک خاص وصف بن گیا ہے۔

"Separation of powers is a political doctrine originating from the United States Constitution, according to which the legislative, executive and judicial branches of the united states government are kept distinct in order to prevent abuse of power. This U.S form of separation of powers is associated with a system of checks and balances." (3)

امریکی آئین سے اخذ شدہ اختیارات کی علیحدگی ایک سیاسی نظریہ ہے جس کے مطابق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کے

---

(1) *website www theyworkforyou com/lords, Judiciary, Legislature and Executive, House of Lords debates, 21may2003, P-8*

(2) *Ibid*

(3) *www wikipedia.org, Separation of powers under the united states constitution, P-1*

شعبوں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو اختیارات کے ناجائز استعمال سے بچنے کے لئے ایک دوسرے سے جدا رکھا گیا ہے۔ امریکی ڈھانچے میں اختیارات کی علیحدگی ان عناصر کو متوازن رکھنے کے نظام سے متعلقہ ہے۔

امریکی آئین کے مطابق حکومت کے تین ادارے ہیں، اس آئین کے آرٹیکل 1 کے سیکشن 1 میں بتایا گیا ہے

"All legislative powers here in granted shall be vasted in a congress of the united states" (1)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کانگریس میں مقننہ کے تمام منظور شدہ اختیارات کو وسعت دی جائے گی۔

مقننہ کے اختیارات امریکی کانگرس کو دیئے گئے ہیں جب کہ انتظامیہ کے اختیارات کے متعلق بتایا گیا ہے جو کہ آرٹیکل 2 کے سیکشن 1 میں ہے

"The executive powers shall be vested in president of the united states of America" (2)

انتظامیہ کے اختیارات کو امریکی صدر استعمال کرے گا جب کہ آرٹیکل 3 کے سیکشن 1 میں عدلیہ کا بتایا گیا ہے کہ

"The Judiciary powers of the united states, shall be vested in one supreme courts, and such inferior courts as the congress may from time to time ordain and establish".(3)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں عدالتی اختیارات سپریم کورٹ اور دیگر عدالتوں کو حاصل ہوں گے۔ اسی طرح کانگریس وقتاً فوقتاً احکام صادر کر سکتی ہے اور ان کا قیام عمل میں لا سکتی ہے۔

تحریری آئین کی غیر موجودگی میں برطانیہ میں کوئی باقاعدہ تقسیم اختیارات نہیں ہے۔ عملی طور پر برطانیہ میں انتظامیہ اور مقننہ میں قریبی تعلق ہے۔ پارلیمنٹ اور حکومت کے بعد دو اداروں میں فرق ہے۔ مقننہ کا جو باقاعدہ نظام ہے وہ آج کل حکومت سے مختلف ہے اس طرح، جس طرح کہ ایک پارلیمنٹ کے ایکٹ کا قانونی اثر انتظامیہ کے فیصلے سے مختلف ہوتا ہے۔

"In England, there was never a complete separation the administration from the judiciary. The courts were losing their historical control over the activities of the executive" (4)

برطانیہ میں عدلیہ انتظامیہ سے مکمل طور پر علیحدہ کبھی نہیں تھی۔ انتظامیہ کی سرگرمیوں پر عدالتوں نے اپنا تاریخی کنٹرول کھو دیا ہے۔
برطانوی آئین میں یہ ضروری نہیں ہے کہ انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے مابین تعلقات کا معائنہ ہو۔ اختیارات کی علیحدگی واضح اور یقینی نہیں ہے، جس طرح آئین میں تحریر شدہ ہے:

---

(1) *Rogess, Dr C.Rolland, our Federal constitution, prentice Hall, Inc, Englewood cliffs, N.J, 1965, P-9*

(2) *Ibid, P-48*

(3) *American Government in Action, P-52*

(4) *Wade, E.C.S, godfreyphillips, Constitutional and Administrative Law, 9the Edition, The chaucer press Limited, Great Britain, 1977, P551-53*

EXECUTIVE	LEGISLATURE	JUDICIARY
Ministers are Members of Parliament exercising both government and legislative functions	Law-making power Delegates power to make subordinate legisalation to executive. Scrutinises and controls executive.	Interprets and applies law. Independence guaranteed. Keeps executive within powers granted by parliment via judicial review proceedings. (1)

انتظامیہ: اس میں وزراء ہی پارلیمینٹ کے ارکان ہوتے ہیں جو حکومت اور مقننہ دونوں کے امور سرانجام دیتے ہیں۔

مقننہ: اس کے پاس قانون سازی کا اختیار ہوتا ہے اور انتظامیہ کے اختیارات ماتحت قانون سازوں کو سونپنا بھی اس کا کام ہے۔ انتظامیہ پر قابو اور اس کی جانچ پڑتال کرنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔

عدلیہ: یہ قانون کی وضاحت اور اس کا نفاذ کرتی ہے۔ آزادی کی ضامن ہے۔ عدالتی نظرثانی میں کاروائی کے ذریعہ انتظامیہ کو پارلیمنٹ سے منظور شدہ اختیارات میں رکھتی ہے۔

برطانیہ میں عدلیہ کی آزادی مکمل طور پر نہیں ہے بلکہ انتظامیہ کا زیادہ کنٹرول ہے۔ اختیارات کی تقسیم محض عدالتی خودمختاری تک محدود ہے۔ انتظامیہ اور مقننہ میں بڑا ہی گہرا ربط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انتظامیہ جزو ہے تو مقننہ کل ہے۔ اول الذکر اپنے وجود کے لئے ہمیشہ موخر الذکر کی رہین منت رہتی ہے۔

برطانیہ میں عدلیہ پر انتظامیہ کا کنٹرول ہوتا ہے اور عدلیہ کی آزادی جو تاریخی طور پر برطانیہ میں تھی اب ختم ہوگئی ہے۔

پارلیمانی ممالک جہاں کا طرز حکومت پارلیمانی ہوتا ہے وہ اپنے نظام کو بہتر بنانے کے لئے بہت سی کوششیں کرتے ہیں۔ ہر ادارہ اپنے دائرہ کار میں آزادانہ طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

"Parliamentary and presidential governments are two most popular forms of democracy today While a parliamentary government is based on initimate relationship between the executive and the legislature separation of powers is the basis of the Presidential System. India and U K have a parliamentary form of government where the Head of State is the nominal excutive, while the cabinet in actual fact, exercises real excutive function, and is answerable to the legislature. The United States offers the best example of a presidential form of government. the tenure of the real executive the President, being fixed. "(2)

(1) *Under Standing Public Law, P-33*

(2) *www egyankosh.ac.in, organs of government, unit 17, P-19*

آج کے جمہوری نظام میں پارلیمانی اور صدارتی حکومتیں دو معروف ڈھانچوں میں تقسیم ہیں۔ پارلیمانی حکومت کی بنیاد مقننہ اور انتظامیہ کے مابین گہرے تعلق پر ہے۔ اختیارات کی علیحدگی صدارتی نظام کی بنیاد ہے۔ بھارت اور برطانیہ میں حکومتی ڈھانچہ پارلیمانی ہے، جہاں سربراہ ریاست انتظامیہ میں برائے نام ہوتا ہے جب کہ کابینہ ہی دراصل انتظامی امور سرانجام دیتی ہے اور مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ متحدہ ریاستیں حکومت کے صدارتی ڈھانچے کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں جن میں انتظامیہ کا دورانیہ اور صدر کی مدت مقرر ہوتی ہے۔

آسٹن رینے (Austin Rannay) نے مقننہ پر انتظامیہ کے بے جا دباؤ کی تردیدیوں کی ہے۔

"In U.S A no such power is rested with the president. These are some circumstances when executive use its power to dissolve the legislature but it cannot be justifiable in which condition dissolution should These types of dissolution showed that the lack of under standing between legislature and Executive but in the time of crisis, executive can take such steps. Mostly legislatures worked under pressure of executive and most of time they change their decisions due to the pressure of executive."(1)

امریکہ میں صدر کے پاس کوئی دوسرا اختیار نہیں ہوتا مگر کچھ مخصوص حالات میں انتظامیہ مقننہ کے مسائل کے حل کے لئے اپنا اختیار استعمال کرتی ہے۔ لیکن یہ (اختیار) اتنا قابل جواز نہیں ہوتا کہ وہ اس مسئلے کا حل پیش کر سکے۔ مسائل کے حل کی ان اقسام سے مقننہ اور انتظامیہ کے مابین مفاہمت کی کمی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن بحران کی حالت میں انتظامیہ ایسے اقدامات کر سکتی ہے۔ بیشتر قانون ساز انتظامیہ کے دباؤ کے تحت کام کرتے ہیں اور اکثر اوقات وہ انتظامیہ کے دباؤ کی وجہ سے اپنے فیصلے بدل دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صدارتی اور پارلیمانی نظام کے تقابل میں لکھتے ہیں

"صدارتی نظام میں عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ بالکل علیحدہ ہوتے ہیں۔ انتظامیہ کا سربراہ صدر منتخب ہونے کے بعد مقننہ کا دست نگر نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وہ اطمینان اور یکسوئی سے انتظامی امور سرانجام دیتا رہتا ہے جب کہ قانون سازی کانگریس کا کام ہے جو کسی خارجی دباؤ کے بغیر اپنا کام کرتی رہتی ہے اور عدلیہ پوری آزادی کے ساتھ آئین وقانون کی حفاظت کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ اس کے برعکس پارلیمانی نظام میں مقننہ اور انتظامیہ گڈمڈ ہوتے ہیں"۔[2]

محمد اسد کی رائے میں مغرب کی جمہوری مملکتوں میں مقننہ اور عاملہ کے دائرہ ہائے کار ایک دوسرے سے الگ رکھے جاتے ہیں اور اس علیحدگی کو عاملہ کی طرف سے اقتدار و اختیار کے غلط استعمال کے خلاف ایک مؤثر حفاظتی اقدام قرار دیا جاتا ہے چنانچہ عاملہ اور مقننہ کے

(1) Austin Ranny, Governing, An Introduction to Political Science (USA. Prentice Hall, Inc. A simon and schustee company, 1993, P-244

[2] خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص ۹۰

دائروں میں شدید حد بندی کے سبب حکومت کا انتظام ملکی اور قانون سازی دونوں کے اعتبار سے خصوصاً اہم قومی ضرورت کے مواقع پر جب کہ اسے تمام فیصلے جلد جلد کرنا پڑتے ہیں، شدید رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس عاملہ اور مقننہ کے باہمی ارتباط کی بابت اسلام نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ مغرب کی جمہوری مملکتوں کے نظام میں پائی جانے والی ان خامیوں سے محفوظ ہے۔ اسلامی ریاست میں امیر کے ذریعے سے حکومت کے انتظام، قانون سازی اور اہم اجتماعی امور میں فیصلہ سازی کے پہلوؤں میں ارتباط پیدا کر کے اقتدار کی اس ثنویت پر بطریق احسن قابو پایا جا سکتا ہے جس کے باعث مغربی مملکتوں میں انتظامیہ اور مقننہ کے درمیان اکثر اختلاف پیدا ہوتا رہتا ہے اور بعض اوقات حکومت غیر موثر بن جاتی ہے۔(1)

کسی بھی ملک میں جمہوریت کو فروغ دینے کے لئے ضروری ہے کہ ریاست کے تینوں ادارے آزادانہ طور پر کام کریں۔

"The ed fice of a democratically elected government stands on three main pillars the executive, the legislature and the jud.ciary It is the responsibility of the government to enforce Laws enacted by the legis.ature and it is the Prerogative of the jud.ciary to interpret, these laws when ever a dispute arises with regard to their legal implications" (2)

مخصوص جمہوری طریقے سے منتخب شدہ حکومت کے تین اہم ادارے انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ پر منحصر ہوتے ہیں۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ مقننہ کے وضع کیے ہوئے قوانین کو نافذ کرے اور عدلیہ کو یہ خصوصی اختیار حاصل ہے کہ جب کوئی مسئلہ قانونی معاملات میں پیدا ہو جائے تو وہ اُن قوانین کی تشریح کرے۔

گویا ان تینوں اداروں کی آزادانہ بقا کے بغیر کسی ملک میں جمہوری اقدار پنپ نہیں سکتیں۔

"In a civilized society, no decent democratic order can be envisaged or contemplated with out the institution of Judiciary".(3)

ایک مہذب معاشرہ میں عدلیہ کے بغیر کسی عمدہ جمہوری اصول کا تصور یا تامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی، آزاد عدلیہ کا ایک (corner stone) ہے جب تک وہ آزاد نہ ہو، بنیادی حقوق اور انصاف کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

مارشل ایڈورڈ (Marshall Edward) تقسیم اختیارات کے نظریہ میں رقمطراز ہیں

"Thus in practice the legislative branch sometimes exercise administrative powers, the executive has aquired judicial powers,

(1) Asad, Principles of State, P-51

(2) Saeed Malik, Independence of the Judiciary, The Nation Lahore, 21,1,1996

(3) Kazi, Faizul Haq, Law of politics in Pakistan, Royal Book Company, Karachi, 1976, P-19

especially in connection with its Regulatory Commission, and the courts influence both and ministration and legislature, the central idea of Separation of Powers was to safeguard the people, sliberty and by parceling out responsibilities among three separate branches to prevent a connection of strength in anyone. For example, the principle of separation of powers is accompanied by theory of checks and balances which holds that one branch must check, supplement and balance the power of the others in order that their freedoms may be further harmed in".(1)

عملی طور پر مقننہ کی شاخ بعض اوقات انتظامی اختیارات کو استعمال میں لاتی ہے۔ خصوصاً باضابطہ کمیشن کے ساتھ تعلق کے قیام میں انتظامیہ کو عدالتی اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اور عدالتیں مقننہ اور انتظامیہ دونوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، تقسیم اختیارات کے نظریے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ لوگوں کی آزادی کی حفاظت کی جائے اور ذمہ داریوں کو تین مختلف شاخوں میں اس طرح تقسیم کرنا کہ طاقت کا تعلق کسی ایک تک محدود نہ ہو جائے مثال کے طور پر نظریہ تقسیم اختیارات کا اصول، توازن کے نظریے سے وابستہ ہے۔ ہر شاخ کو اصولاً دوسروں کی کمی کو پورا کرنے اور توازن قائم کرنے کے لئے، جائزہ لینا چاہئے۔ تاکہ آئندہ ان کی آزادیاں ضرر رساں نہ ہوں۔

عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی پاکستان کے تینوں آئین کے مختلف آرٹیکلز کو دیکھ کر ہو جاتی ہے کہ نہ صرف ۱۹۵۶ء کے آئین میں عدلیہ آزاد تھی بلکہ ۱۹۵۶ء میں کوئی بھی جج کسی صوبے کا گورنر نہیں بن سکتا تھا اس طرح ۱۹۶۲ء کے آئین میں بھی عدلیہ کی آزادی واضح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے جب کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں تو ایک واضح آرٹیکل کے ذریعے عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کا بتا دیا گیا ہے تا کہ عوام کو مکمل اور صاف انصاف مہیا ہو اور وہ جلد انصاف حاصل کر سکیں۔

عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کے تصور کی ضرورت اس لیے درپیش آتی ہے تاکہ عدلیہ ہر طرح کے اثرات سے پاک ہو کر اپنے فرائض سرانجام دے سکے۔

یہ ایک عالمگیر اصول ہے اور دیگر مہذب معاشروں کی طرح پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء میں اس تصور کو واضح جگہ دی گئی ہے۔ اس کے اسلامی رنگ کے پیش نظر قرارداد مقاصد میں جو کہ اب آئین کا حصہ بن چکی ہے عدلیہ کی آزادی اور انتظامیہ سے علیحدگی کے تصور کو ابھارا گیا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعہ (3)175 میں واضح طور پر عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کو یقینی بنانے پر زور دیا گیا ہے۔

آرٹیکل 175 کی دفعہ (3) یہ ہے:

"The Judiciary shall be separated progressively from the executive within [fourteen] years from the commencing day" (2)

(1) *Dimock, Marshall Edward, American Government in Action, Rinehart and company, Inc, New York, 1949, P-51-52*

(2) *The Constitution of the Islamic Rebublic of Pakisnian 1973, PP-115.16*

عدلیہ آئندہ چودہ سالوں کے اندر اندر انتظامیہ سے بتدریج علیحدہ ہو جائے گی۔

عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے تصور کو شروع سے ہی تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور آئین کی دفعات ۲۰۳ اور ۱۷۵ کی ذیلی دفعہ (۳)، قرارداد مقاصد میں اس کا ذکر رہا ہے تاہم اس پر عمل درآمد کی راہ میں ریاست اپنے وقتی مفادات کی خاطر روڑے اٹکاتی آئی ہے۔

اس طرح ان تمام نکات کو دیکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی واقعی ایک ضرورت بن چکی تھی کیونکہ عدلیہ کی آزادی جب تک نہ ہو تب تک عام شہری کو منصفانہ انصاف ملنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی علیحدگی کو وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

"An independent judiciary is the last hope of agreived citizen seeking red ressers against excesses of an all powerful Executive which in the case of Pakistan, has all alone been dominated by mighty feudal lards "(1)

ایک آزاد عدلیہ غمزدہ شہری کے لئے آخری امید ہوتی ہے جو کہ ایک طاقتور انتظامیہ کی زیادتیوں کے خلاف اسے سہولت بہم پہنچانے کی تلاش میں رہتی ہے، جس طرح کہ پاکستان میں جاگیردارانہ نظام کا قبضہ تن تنہا تسلط حاصل کر چکا ہے۔

کسی بھی مہذب معاشرہ میں شہریوں کے حقوق کے یقینی تحفظ کے لئے قانون کی حکمرانی کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں عدلیہ کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے عدلیہ کو انتظامیہ اور مقننہ کے دباؤ سے مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیے تاکہ انتظامیہ عدلیہ پر ایسا دباؤ نہ ڈالے جس سے عدلیہ مخصوص فیصلہ دینے پر مجبور ہو جائے۔

اس طرح اس کی علیحدگی سے اختیارات کسی ایک ہاتھ میں مرتکز نہیں ہوتے اور آمریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ اگر اختیارات ایک ہی ہاتھ میں دے دیے جائیں تو آمریت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس لئے تمام اختیارات کو ان کے اپنے اپنے اداروں کی حدود میں رہنے اور اپنی حدود میں کام کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔(۲)

عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی اس لئے ضروری ہے کہ انتظامیہ ان کاموں میں اپنا وقت صرف نہ کرے جو ان کے دائرہ کار سے باہر ہوں اور عدلیہ کے کام انتظامیہ کے دباؤ سے محفوظ ہو کر کیے جائیں۔

"Judiciary legislature and Executive should not exceed their respective powers as enshrined in the constitution, but work in harmony to maximise public good. It is assumed that none of the organs of the state, whether it is the judiciary or the executive or the legislature, would exceed its powers as laid down in the constitution."(3)

(1) *Mazhar-ul-Haq, The Constitution of Pakistan, P-152*

(۲) جنگ فورم رپورٹ، آزاد اور خودمختار عدلیہ ایک سوال، جنگ جمعہ میگزین، ۸ مارچ ۱۹۹۶ء، ص ۱۵

(3) *http://tribune.com.pk/story/11832/Judiciary-and-Executive-to-stay-with-limits*

عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ کو آئین میں محفوظ شدہ اپنے جداگانہ اختیارات سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے لیکن زیادہ سے زیادہ عوامی بھلائی کے لئے ہم آہنگی سے کام کرنا چاہیے۔ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ریاستی عناصر یعنی عدلیہ، انتظامیہ یا مقننہ میں سے کوئی آئین میں طے شدہ اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کرے گی۔

اگر عدالتی اختیارات کسی صورت میں، منتظمیہ کے پاس ہوں یا انتظامیہ کسی طور پر اثر انداز ہو رہی ہو تو انتظامیہ اپنے نظم ونسق کو اپنی منشاء کے مطابق چلانے کی غرض سے عدلیہ کے مقاصد کو نظر انداز کرتے ہوئے اثر انداز ہوتی ہے۔

پاکستان میں بھی یہی صورت قائم ہو چکی تھی چنانچہ یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے مکمل طور پر الگ کیا جائے تاکہ اس ادارے کے مقاصد پورے ہو سکیں۔

ایک بہتر حکومت کے لئے آزاد اور خود مختار محاسبہ ضروری ہے۔ ظاہری طور پر کسی بھی ادارے کو خود اپنا محاسبہ کرنے کے فریضہ پر مامور نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کی بد قسمتی یہ ہے کہ اختیارات ہمیشہ سے انتظامیہ کے پاس رہے ہیں اگر ہم ملک میں اسلامی جمہوریت کے خواہش مند ہیں تو تمام ریاستی عناصر کو جمہوری لحاظ سے ترقی دینا ہوگی۔ آئین میں موجود تمام اختیارات کو ریاستی عناصر میں تقسیم کرنا ہوگا اور انہیں اپنے دائرہ کار میں دلچسپی اور خلوص سے کام کرنا ہوگا تاکہ ملک میں خوشحالی اور امن وامان کی فضا پیدا ہو۔ لیکن کوئی بھی آئین کے انفاذ کے مطابق اپنے فرائض سرانجام نہیں دیتا۔

لہٰذا تمام عناصر سیاسی نظام کے عدم استحکام کے بھی ذمہ دار ہیں۔ ریاست میں جمہوریت کی حقیقی روح پیدا کرنے کے لئے تینوں عناصر یعنی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کو صحیح طور پر کام کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ایک کو اپنے متعین کردہ دائرہ کار میں رہنا ہوگا۔ اس طرح سیاسی نظام میں بہتری اور استحکام پیدا ہوگا۔

اختیارات کی علیحدگی، آئینی نظریہ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ریاستی اداروں کے اختیارات، امور اور کارکنان کی وضاحت کرتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد اختیارات کو کسی ایک ادارے تک مرتکز ہونے سے بچانا ہے۔ اختیارات کے ناجائز استعمال سے بچاؤ کے لئے ہر ریاستی عنصر کا محاسبہ ضروری ہے۔ تحریری آئین کے تحت اختیارات کی علیحدگی کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ریاست کے استحکام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اختیارات کی علیحدگی کا تصور آئین کے تحت مقدس ہو۔

مرکز اور صوبے ـــــ ایک تعارف

ایک معاشرہ کے انتظامات کو خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلانے کے لئے ریاستی اکائیوں کو مختلف حصوں اور شعبوں میں تقسیم کرنا ناگزیر امر ہے۔ یہ خاص انتظام تاریخ کے ابتدائی ادوار اور قرون وسطیٰ میں دنیا کے مختلف علاقوں میں اپنایا گیا۔ اس خاص اصول کے پس پردہ یہ فلسفہ کارفرما ہے جس کے تحت انتظامی مستعدی کے لئے تقسیم اختیارات کا نظام اپنانا ضروری ہے۔ مفروضہ یہ ہے کہ انتظامی مشینری جس قدر زیادہ چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم ہوگی اسی قدر نظام بہتر نتائج کا حامل ہوگا۔ ریاستی نظام کے اس طریقہ کو اگر آئینی وقانونی تحفظ حاصل ہو جائے تو اسے وفاقی نظام کا نام دیا جاتا ہے۔ موجودہ دور کی ریاستوں کا دائرہ کار سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں میں وسیع وعریض ہے لہٰذا ان کے معاملات اس صورت میں ہی بہتر طور پر چلائے جاسکتے ہیں۔ اگر وفاقی نظام کے تحت اختیارات مرکز اور اکائیوں کے مابین تقسیم کر دیئے جائیں۔ تقسیم اختیارات کا نظام وفاقی اکائیوں کو مضبوط بناتا ہے۔ تقسیم اختیارات کی اس افادیت کی بناء پر یہ اصول اشتراکی ممالک کے سیاسی نظاموں میں بھی اپنایا گیا ہے اگرچہ اس کی شکل مختلف نوعیت کی ہے۔

کسی بھی وفاقی نظام میں مرکزیت یا لامرکزیت کے رجحانات کا پایا جانا قدرتی عمل ہے۔ مرکزیت پر مشتمل نظام زیادہ تر تیسری دنیا کے مختلف ممالک میں رائج ہے۔ جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی حکمرانوں سے آزادی حاصل کی۔ یہ ممالک زیادہ تر فوجی حکومتوں کے زیر سایہ رہے ہیں۔ فوجی حکمرانوں نے اپنے اختیارات کے استحکام کی خاطر شدید قسم کے مرکزیت کے حامل نظام قائم کئے۔ جہاں تک لامرکزیت تقسیم اختیارات کا تعلق ہے اس کے لئے یورپی ممالک اور امریکہ کی مثال دی جاسکتی ہے۔ امریکہ کا دفاعی نظام ایک کامیاب مثالی وفاقی نظام ہے جس کی تقلید میں دوسرے ممالک نے بھی اپنے ہاں وفاقی نظام کا تجربہ کیا ہے۔

وفاقی نظام میں مقامی حکومت کی خود اختیاری بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مقامی حکومت کے تحت عوام میں اپنے مقامی معاملات زیادہ آزادانہ ماحول میں طے کرنے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے کیونکہ مقامی معاملات ومسائل کی نوعیت کو مقامی لوگ زیادہ تر بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

سرور عالم ﷺ نے اپنی سیاسی حکمت عملی سے ریاست کے استحکام کے لئے وفاقی شہری مملکت کی بنیاد ڈالی اور وہاں کے مروجہ نظام ہی کو اختیار فرمایا کیونکہ میثاق مدینہ کی رو سے مہاجرین مکہ، مدنی مسلمان، غیر مسلم عرب اور یہودی قبائل آپ ﷺ کی سیادت میں ایک مرکز پر جمع تھے۔

ساجد الرحمن صدیقی عربوں کے جمہوری نظام کو اس طرح بیان کرتے ہیں

> "قبائلی نظام جمہوری نظام کے بہت قریب تھا۔ سردار، عمر، علم اور خاندانیت میں افضل ہونے کی بناء پر منتخب کیا جاتا تھا۔ آئین مدینہ نے اس نظام کو قبول کیا اور اس طرح علاقائی جمہوریت کا نظام بھی مہیا کیا گیا۔ علاقائی جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ مرکزی حکومت وفاق پر اپنی مرضی کو مسلط نہیں کرتی تاہم کسی وفاقی 'کائی' کو بادشاہت، جاگیردارانہ نظام یا اشرافیہ، استبدادیت قائم کرنے کی اجازت نہ تھی" [۱]

کسی بھی ریاست کے اندرونی استحکام وترقی اور بیرونی دنیا میں اس کے وقار کا انحصار تقسیم اختیارات پر ہے۔

> "نبی کریم ﷺ نے جب مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تو سب سے پہلے اس کے داخلی استحکام اور امن کی خاطر مدینہ منورہ کو اس کا دارالخلافہ قرار دیا جس کا نام مدینہ اور قبۃ الاسلام رکھا اور اسے حرم قرار دیا" [۲]

۱۔ اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل، ص ۹۶، ۹۷

۲۔ وفاء الوفاء، ۱/ ۸۰۷

آپ ﷺ نے ملک کو مضبوط بنانے کے لئے بارہ صوبوں میں تقسیم کیا اور ہر صوبہ کا الگ الگ حاکم مقرر کیا اور اس نظام کے تمام اخراجات بیت المال سے پورے کئے جاتے تھے۔[1]

حضور اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کی مرکزی حکومت کو مضبوط رکھا۔ صوبائی خود مختاری اپنی جگہ مسلم لیکن مضبوط مرکزی حکومت، سلطنت کی بقاء کے لئے ضروری ہے تا کہ صوبائی تعصب ختم ہو اور صوبوں کو بھی حقوق دیے جا ئیں۔

خلفائے راشدین کے عہد زریں میں ہر معاملہ میں عوامی آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور ان کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا۔ عوام کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر ریاست کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا تا کہ ملکی نظم ونسق کا بہتر طور پر انتظام و انصرام ہو سکے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جزیرہ نمائے عرب کو دس صوبوں میں تقسیم کیا تا کہ نظم ونسق کو احسن انداز میں چلایا جا سکے یہ ان کا عظیم کارنامہ تھا۔ ان صوبوں کی ترتیب کچھ یوں ہے:

''مکہ مکرمہ، طائف، حضرموت، خولان، زبید اور رمع، الجند، نجران، جرش، بحرین''۔[2]

ایک وسیع علاقے کو چھوٹے صوبوں میں تقسیم کرنے کا عمل آپؓ کی فہم وفراست اور عقل ودانش کی ایک روشن دلیل ہے۔ جس سے آج تک نوع انسانی مستفید ہو رہی ہے۔ پوری دنیا کا کوئی خطہ یا کوئی بھی مملکت اس پالیسی کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

مؤرخ یعقوبی لکھتے ہیں:

حضرت عمرؓ نے ۲۰ ھ میں ملک کو ان صوبہ جات میں تقسیم کیا:

مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر اور فلسطین، جو ممالک فتح ہوئے اُن کی جو تقسیم پہلے سے تھی اور جو مقامات صوبے یا ضلعے تھے اکثر جگہ حضرت عمرؓ نے اسی طرح رہنے دیئے جیسا کہ آپ ﷺ نے نوشیروانی انتظامات اسی طرح بحال رکھے۔[3]

نوشیروان کی سلطنت، عراق کے علاوہ تین بڑے صوبوں یعنی خراسان، آذربائیجان اور فارس میں منقسم تھی۔[4]

نظام حکومت کے نظم ونسق میں جو چیز سب سے مقدم ہے وہ ملک کا مختلف حصوں یعنی صوبہ اور ضلع وغیرہ میں تقسیم کرنا ہے۔ اسلام میں حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کا آغاز کیا اور حالات کے موافق نہایت تدبر وتفکر اور اجتہادی بصیرت سے اس کی حدود قائم کیں۔

اس قسم کی تقسیم میں ہر ایک کا اپنا انتظامی ڈھانچہ اور شعبہ جات ہوتے ہیں۔ علاقائی یا مقامی انتظام مرکزی حکومت سے نسبتاً مختلف

۱۔ علامہ بلاذری نے ان حکام کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کا حضور ﷺ نے مختلف اوقات میں تقرر فرمایا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

صوبہ	گورنر	صوبہ	گورنر	صوبہ	گورنر
مکہ مکرمہ	عتاب بن اُسید انصاریؓ	طائف	مالک بن عوفؓ، عثمان بن العاصؓ	بحرین	العلاء الحضرمیؓ
عمان	عمروؓ بن العاص	نجران	سفیان بن حرب۔ عمرو بن الحزمؓ	صنعاء (یمن)	باذان، المہاجر بن میہؓ
السواحل	ابوموسیٰ اشعریؓ	جند	معاذ بن جبلؓ	وادی القری	عمرو بن سعیدؓ بن العاص
تیما	یزید بن اُبی سفیان	یمامہ	ثمامہ بن اثالؓ	حضرموت	زیاد بن عبید انصاریؓ (فتوح البلدان ص ۷۶)

۲۔ بغدادی، الخطیب، أبوبکر، احمد بن علی، تاریخ بغداد و مدینۃ الاسلام، مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱۹۱۲ء، ۱۲ ، ۲٦٠

۳۔ عباسی، احمد بن ابی یعقوب، تاریخ یعقوبی، طبع دار صادر، بیروت، س ن، ۱/۲۰۰

٤۔ ایضاً، ۱/۲۰۲

ہوتا ہے تاہم مقامی یا علاقائی اور مرکزی حکومت کے مابین تعلقات کو دو الگ طریقوں سے منظم کیا جا سکتا ہے اور اس طرح دو جدا نظام ہائے حکومت رکھنے والی ریاستیں معرض وجود میں آتی ہیں۔

۱۔وحدانی نظام حکومت ۲۔وفاقی نظام حکومت

وحدانی نظام حکومت (جیسا کہ برطانیہ میں ہے) میں اقتدار اعلیٰ سے متعلقہ تمام معاملات ایک واحد مرکزی حکومت کے پاس ہوتے ہیں جو کہ اپنے مخصوص علاقہ میں ریاست کے لئے قانون سازی اور عدالتی فرائض انجام دیتی ہے۔ وحدانی نظام میں علاقائی یا مقامی حکومتیں تشکیل دی تو جاتی ہیں لیکن یہ حکومتیں اپنے اختیارات کو مرکزی حکومت کی مرضی و منشا کے مطابق چلانے کی پابند ہوتی ہیں جب کہ وفاقی نظام میں اختیارات کی تقسیم وحدانی نظام کے برعکس ہے۔ وفاقی ریاستوں میں چونکہ مرکزی حکومت کے ساتھ صوبائی حکومتیں اور اس کے بعد مزید مقامی سطح پر حکومتیں موجود ہوتی ہیں اس لئے دستور کے تحت مرکزی اور علاقائی حکومتوں کا دائرہ کار متعین کر دیا جاتا ہے اور ہر حکومت اپنے دائرہ عمل میں کامل اختیارات کی حامل ہوتی ہے۔ ہر حکومت کو آئینی تحفظ حاصل ہوتا ہے اور دو حکومتوں کے درمیان تنازعہ کا تصفیہ وفاقی عدالت کرتی ہے۔(1)

وفاق کا معنی و مفہوم

لفظ فیڈریشن (وفاق) لاطینی زبان کے ایک لفظ (Foedus) جو کہ عبرانی لفظ (Brit) کی طرح ہے، سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے "معاہدہ یا عہد نامہ"

> "This is implied in the derivation of the word "federal", which comes from the Latin foedus, meaning covenant."(2)

ڈینیل (Deniel) وفاقی نظام حکومت کی تعریف یوں کرتے ہیں

> "Federalism is essentially a system of voluntary self-rule and shared rule".(3)

وفاقی نظام حکومت، لازمی طور پر رضا کارانہ شخصی اور شراکتی حکمرانی کا نظام ہے۔

اصل میں وفاقی انتظامات ایک طرح سے شراکت داری، جسے ایک معاہدہ کے ذریعہ قائم کیا جاتا ہے۔ اس انتظام کے تحت داخلی معاملات خاص قسم کی تقسیم کے ذریعہ حصہ داروں (مرکزی حکومت اور اکائیوں) کے مابین تقسیم کر دیئے جاتے ہیں اور اس کی بنیاد اکائیوں کے باہمی استحکام اور ان کے مابین خاص اتحاد پر مبنی ہوتی ہے۔(4)

---

(1) Robert G.Dixon, JK, the world book encyclopeadia, world book inc, A scott fetzer company London, 1985, Vol.7, P-68

(2) Denial J.Elazar and John Kincaid (eds) the covement connection from federal the ology to modem federalism, Lahham, MD: lexington, books, 2000, P-4

(3) Deniel, J.Elazar, Exploring Federation, The university of alabama press, 1985, P-5

(4) Wheare, K.C, Federal Government, oxford university press london, 1963, P-47

وفاقی نظام ان ریاستوں میں نافذ ہوتا ہے جہاں متعدد علاقائی وحدتیں موجود ہوں۔ ہر علاقائی وحدت کی الگ حکومت ہوتی ہے جو مستقل طور پر ملک کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وحدتیں مل کر ایک اتحاد قائم کر لیں تو وہ وفاق کہلاتا ہے۔ اسی طرح ایک مرکزی حکومت ہوتی ہے جو وفاقی حکومت کہلاتی ہے۔

صوبہ کا معنی و مفہوم

عربی لفظ جو صوب سے مشتق ہے، جس کے معنی طرف اور جانب کے ہیں اور یک دوسرا مفہوم گیہوں، کھجور اور مٹی وغیرہ کا ڈھیر بھی ہے۔

الصحاح میں ہے:

"الصوبة، هو موضع التمر وتقول: دخلت علي فلان فاذا الدنانير مصوبة بين يديه، اي مهيلة"[1]

تاہم لغوی اعتبار سے لفظ صوبہ کا استعمال کسی دستے کے لئے ایسا ہی صحیح ہو سکتا ہے جیسے کہ ملک کے کسی حصے کے لئے ہو۔

Oxford American Dictionary میں صوبہ کا معنی یوں بیان کیا گیا ہے:

"Province. A principal administrative division of some countries".(2)

چند ممالک کی بہت اہم انتظامی تقسیم کا نام صوبہ ہے۔

ریاست کو رقبے، آبادی اور امور حکومت کے لحاظ سے اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ اکائیاں ولایات (صوبے) کہلاتی ہیں۔

ہر صوبے کی ایک ذیلی حکومت ہوتی ہے جس سے اس کی پہچان اور تشخص نمایاں ہوتا ہے۔

مرکز اور صوبوں میں تقسیم اختیارات اور تفویض اختیارات

جدید ریاستیں انتظامی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی معاملات میں اس قدر وسیع و عریض ہیں جن کی وجہ سے مسائل پیچیدہ صورت اختیار کر جاتے ہیں ایک بہتر حکمت عملی جس میں معاملات کو منظم طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے جیسے مقاصد کے حصول کے لئے وسیع پیمانے پر انتظامی مشینری کا قیام اہم ضرورت بن جاتا ہے۔ قدیم معاشروں کا نظام ہم عصر خانگی کی طرح سادہ اور آسان تھا ان کے فرائض، دائرہ کار اور مسائل بھی محدود تھے۔ مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ سے متعلق امور اس فرد واحد کے پاس تھے جو اپنے خاندان یا قبیلے کا سربراہ تھا۔ وہ اپنے اختیارات میں سب سے برتر تھا۔ عصر حاضر میں جدید ریاستوں کا نظام بہت ہمہ گیر ہے اور انہیں ان گنت مسائل کا سامنا ہے ان مسائل کی نوعیت واقسام بھی مختلف ہو جاتی ہیں۔ جدید ریاست محض پولیس سٹیٹ نہیں جس کا کام امن وامان کے قیام تک محدود ہو بلکہ وہ رفاہی مملکت کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔

ایک ترقی یافتہ نظام میں اس کے معاملات و مسائل بھی پیچیدہ نوعیت کے ہوں گے اور اس مقصد کی خاطر اس نظام کو وسیع پیمانے پر ایک ایسی انتظامی مشینری کی ضرورت ہوگی جو کاروبار مملکت میں شرکت کر سکے اس انتظامی مشینری کا نظام مستحکم اور مستقر بنیادوں پر چلانے کے لئے تقسیم اختیارات کا نظام تشکیل دیا جاتا ہے۔[3]

---

[1] الصحاح الجوہری، بذیل مادہ صوب

(2) The Oxford American Dictionary of current English, Published oxford university press, inc, newyork, 1999, P-638

(3) Hasnat, Dr. Farooq, The system of Federation in Pakistan, constitutional provisions for decentralization, south asian studies, July 1989, vol:6, No.2, P-81

وفاقی و مرکزی نظام کی حامل ریاستوں کو ضرورت کے مطابق بہت سے نیم خودمختار انتظامی علاقوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے جن کو صوبے، کینٹن ریاستیں اور کاؤنٹیز وغیرہ کہا جاتا ہے۔(۱)

تقسیم اختیارات کا نظام باہمی مفادات کا شعور، مقامی امور کی مستعد انجام دہی، خود انحصاری اور اپنی مدد آپ جیسی خصوصیت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اس نظام کے ذریعے معاشرتی و سماجی بہبود سے متعلق خدمات سرانجام پاتی ہیں اور ملکی اقتصادیات میں اضافہ ہوتا ہے۔

تقسیم اختیارات کا اصول وفاق کا ایک لازمی عنصر ہے۔ مرکز اور علاقائی یونٹوں میں اختیارات کی تقسیم اس طرح کردی جاتی ہے کہ کوئی بھی حکومت ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی وہ معاملات جو پوری قوم کے مفادات سے متعلقہ ہوتے ہیں وہ مرکزی حکومت کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، مثلاً دفاع، امور خارجہ، کرنسی، پوسٹل سروسز، تجارت وغیرہ جب کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے نظام کا قیام، تعلیم، زراعت، نظم و نسق سے متعلقہ امور مقامی یا علاقائی معاملات کے زمرے میں آتے ہیں۔ اختیارات کی یہ تقسیم یا تو امریکی طرز کی ہوتی ہے۔ جس میں کچھ اختیارات مرکزی حکومت کو دینے کے بعد مابقائی اختیارات ریاستوں (اکائیوں) کے سپرد ہیں یا پھر کینیڈا کی طرح جس میں علاقائی حکومتوں کے اختیارات مخصوص کرنے کے بعد تمام اختیارات مرکز کے پاس ہوتے ہیں۔(۲)

اختر مجید تقسیم اختیارات کے متعلق لکھتے ہیں:

> "Powers are divided and shared between constituent governments and a general government having certain nation-wide, continet-wide, or world-wide responsibilit.es The distribution of powers is intended to protect the integral authority of both the general and the constituent governments as well as the existence of their respective communities. A democratic federation is, in effect, emphasizes partnership and cooperation for the common good, while also al.owing diversity and competition to foster liberty and efficiency".(3)

اختیارات، دستور ساز اور عام حکومت جو کہ یقینی طور پر قومی، براعظمی یا عالمی سطح پر ذمہ داریاں اٹھاتی ہے، کے درمیان تقسیم کیے جاتے ہیں۔ تقسیم اختیارات کا مقصد عام اور آئینی دونوں حکومتوں کے کلی اختیار اور ان کے عوام کے وجود کو تحفظ دینا ہے۔ جمہوری وفاق دراصل فلاح عام کے لئے اشتراک و تعاون پر زور دیتا ہے اور اس کے علاوہ حریت و لیاقت کو پروان چڑھانے کے لیے مسابقت اور تنوع کی بھی ترغیب دلاتا ہے۔

مختلف معاشروں میں انتظامات کی بہتر طور پر چلانے کے لئے مختلف طریق کار استعمال کیے جاتے ہیں لیکن ان معاشروں میں

---

(1) *The world Book Encyclopedia, vol.7, P-68*

(2) *Where, K.C, Federal Government, P-94*

(3) *Ahktar Majeed, Hand Book of Federal Countries, 2005, Publisher McGill. Queen, S university Canada, 2005, P-10*

اختیارات کی تقسیم اس لئے بھی ناگزیر ہو جاتی ہے کہ مقصد سیاسی نظام کے علاوہ ان معاشروں کی بناوٹ اور ساخت اس قسم کی ہوتی ہے کہ ان میں لسانی اور دوسری اقلیتیں موجود ہوتی ہیں اور ان کو مطمئن کرنے سے ہی کامیاب سیاسی نظام کی ضمانت مل سکتی ہے۔

وفاقی نظام حکومت چند ایک ضروری لوازمات کی موجودگی میں کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ کہ وفاقی اکائیوں کے مابین جغرافیائی اتصال ہونا بہت ضروری ہے اگر کوئی ایسا وفاق جنم لے جس کے یونٹ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہوں اور ان کی حدود ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہ ہوں تو ان کے عوام کے درمیان تعاون و اخوت کے جذبات میں کمی رہ جاتی ہے اور وفاق مضبوط حیثیت اختیار نہیں کرتا اگر جغرافیائی لحاظ سے وفاقی اکائیاں دور دراز واقع ہوں تو دفاعی اور قومی اتحاد کے نقطۂ نگاہ سے وفاق کی کمزوری کا سبب بنے گی [1]

جیسے پاکستان میں مشرقی و مغربی حصوں کے درمیان ۱۱۰۰ میل کا طویل فاصلہ وفاقی نظام کی ناکامی کا ایک اہم سبب بنا'' [2]

Wheare کا کہنا ہے کہ وفاقی نظام زیادہ کامیابی سے چل سکتا ہے اس لئے کہ اختیارات کی تقسیم کی وجہ سے انتظامی معاملات کی انجام دہی بآسانی ممکن ہوتی ہے اس سلسلہ میں بہت سی وفاقی ریاستوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جن کا نظام کامیابی سے ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے ان میں امریکہ، جرمنی، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، کینیڈا اور بھارت شامل ہیں۔ [3]

اس قسم کے وفاقی نظاموں کا ڈھانچہ اکائیوں کے درمیان توازن پیدا کرنے، ان کے اقتدار اعلیٰ اور آزادی کے تحفظ کا ضامن ہوتا ہے۔ بہت سے ممالک میں وفاقی نظام مکمل طور پر انتظامی سہولت کی بنیادوں پر تشکیل دیا گیا ہے جب کہ دوسری جانب بعض قوموں نے اس نظام کو لسانی و گروہی اعتبار سے منقسم معاشروں کی وجہ سے اپنایا چونکہ پاکستان کثیر الگروہی و کثیر اللسانی ملک ہے لہذا یہاں دونوں وجوہات (گروہی بنیادوں پر قائم صوبائی بند و بست اور انتظامی مستعدی) کی خاطر یہ نظام قائم کیا گیا۔

آئین کے آرٹیکل ایک کی دفعہ (۲) میں ہے کہ:

''وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے اور ایسی ریاستیں اور علاقے جو الحاق کے ذریعے یا کسی اور طریقہ سے پاکستان میں شامل ہیں، یا ہو جائیں'' [4]

وفاقی جمہوریہ ایک ایسی ریاست ہوتی ہے، جس میں اقتدار اعلیٰ جمہور کو حاصل ہوتا ہے اور جمہوریہ اختیار اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرتے ہیں۔ وفاقی جمہوریہ کئی اکائیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اکائیاں ریاستیں، صوبے یا کسی دیگر نام سے پکاری جاتی ہیں۔ ان اکائیوں کو انتظامی قانونی، مالی اور عدالتی اختیارات دستور میں متعین قواعد کے مطابق حاصل ہوتے ہیں اور عموماً وفاق ان اختیارات میں مداخلت نہیں کرتا۔ وفاق صرف وہ اختیارات استعمال کرتا ہے جو دستور اسے عطا کرتا ہے۔

مرکزی حکومت چند ایک قومی نوعیت کے معاملات میں خود مختار حیثیت کی حامل ہوتی ہے (دفاع، کرنسی، خارجہ معاملات وغیرہ) لہذا ضروری ہے کہ وفاقی اکائیاں چند ایک امور میں مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں اگر وہ ایسا نہ کریں تو پوری وفاقی مشینری کا وجود خطرے میں پڑ

---

(1) Appadorai, A, The Substance of politics, Oxford university press London, 1954, PP-441,442

(2) Kahlid B, Sayeed, "Ploitics in Pakistan, The Nature and Direction of change", Publisher series centre, Karachi, 1980, P-69

(3) Wheare, K.C, Federal Government, P-47

(4) The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1973, P-3

سکتا ہے کہیں وفاقی حکومت میں بہت زیادہ اختیارات کا ارتکاز اسے وحدانی نظام کی حیثیت دے گا لہذا اکائیوں کو آئین کے تحت اپنا علیحدہ تشخص اور خودمختاری برقرار رکھنی چاہیے۔(1)

وفاقی نظام میں مقامی حکومت کی خودمختاری کا مقام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بہت سے وفاقی نظاموں میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان ضروری معاملات طے کئے جاتے ہیں یا وہ ایک دوسرے کے مساوی حیثیت رکھتی ہیں اس صورتحال میں مقامی حکومتیں آئینی طور پر ایک رابطے کی پوزیشن حاصل کر لیتی ہیں۔

روانتسا (Dr. Ruwantissa) وفاقی نظام میں عوامی رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"Federalism requires that both the nation and its constituent polities are composed of independently governing complete institutions of their own who have the right to modify their institutions, work processes and mode of governance within the limists set by the federal constitution."(2)

وفاقی نظام مطالبہ کرتا ہے کہ وفاق اور اسکی ذیلی دستور ساز حکومتیں اپنے زیر انتظام اداروں کو مکمل آزادی کے ساتھ چلانے اور وفاقی آئین کی قائم کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے حکومت کے طریقہ کار، کاروائی کے انداز اور اپنے اداروں میں ترمیم کا حق رکھتی ہیں۔

مختلف ریاستوں میں رائج وفاقی نظام میں دو قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں یعنی جن ریاستوں میں یہ نظام اپنایا گیا ہے وہاں مرکزیت اور لامرکزیت (تقسیم اختیارات) کے تصورات عملی شکل میں پائے جاتے ہیں۔

مرکزیت ایک ایسا طرز حکومت ہے جو اپنی کارکردگی میں مستعد تو ہو سکتا ہے لیکن اس میں مقامی حکومت کا کوئی تصور نہیں ہوتا یعنی مرکزیت میں مقامی حکومتی اداروں سے سیاسی اختیارات کی مرکزی حکومت کو منتقلی کی جاتی ہے۔(3)

مرکزیت میں مرکز پسندی کا رجحان پایا جاتا ہے تاکہ مرکز زیادہ سے زیادہ طاقتور ہو جائے جب کہ لامرکزیت میں ایسا تصور پایا جاتا ہے کہ مرکز سے زیادہ سے زیادہ اختیارات صوبوں کو مل جائیں۔

روانتسا (Ruwantissa) وفاقی نظام میں لامرکزیت کی اہمیت کو یوں بیان کرتے ہیں

"A non-centralized federal system should be strengthened by guaranteeing constituent polities representation in the national legislature, thus giving them substantial influence over the constitutional amendment process of the country. In addition, a

---

(1) Wheare, K.C, opcit, PP-35,36

(2) www.Tamilcanadian.com

(3) Encyclopedia of social science, Macmillan Company New York, Thirteen printing, 1959, Vol III, P-308

guaranteed role in the national political process must be given to the provincial, territorial or state legislatures. The most important characteristic or element that brings to bear the distinctive success of a federal system is the existence of a non centralized party system."(1)

دستور ساز حکومتوں کی قومی مقننہ میں نمائندگی کو یقینی بنا کر ایک لامرکزی وفاقی نظام کو تقویت دی جانی چاہئے۔ اس طرح انہیں ملک میں ہونے والی آئینی ترمیمات کے طریقہ کار پر پوری طرح اثر انداز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ مزید برآں صوبائی، علاقائی یا ریاستی مجالس قانون ساز کو قومی سیاسی دھارے میں مسلمہ کردار ادا کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ سب سے اہم خوبی یا عنصر یہ ہے کہ ایک لامرکزی پارٹی سسٹم کا وجود ہی ایک وفاقی نظام کی امتیازی کامیابی کا باعث بنتا ہے۔

عہد عباسی کے اوائل میں ملکی نظام میں مرکزیت قائم تھی۔ صوبوں کے گورنر مرکز کے احکام کے پابند تھے، مطلق العنان گورنر نہ تھے اس کے برعکس امویوں کے دور حکومت میں حجاج بن یوسف اور زیاد بن ابیہ مطلق العنان گورنر تھے، دراصل عباسیوں کے دور میں گورنری کے منصب پر غیر معمولی شخصیتوں کے تقرر سے گریز کیا گیا تھا، اس لئے آسانی سے لامرکزیت، مرکزیت میں تبدیل ہو گئی تھی اور گورنروں میں اپنا اثر و اقتدار بڑھانے کا حوصلہ موجود نہ تھا۔ عباسیوں کے عہد اول میں اہم صوبائی عہدے دار بیت المال کا افسر، ڈاک کا افسر اور قاضی تھے۔ گورنر کے اختیارات فرائض نماز کی امامت اور فوجی قیادت تک محدود تھے۔ ؎۲

گورنر کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ دیئے جانے والے احکامات اور لگائی جانے والی بعض پابندیوں کے بارے میں سربراہ مملکت اور مجلس عاملہ سے بحث کرے کیونکہ وہ صوبے کے حالات کو نزدیک سے جانتا ہے اور صوبے کا انتظام بھی صوبائی ہوتا ہے نہ کہ مرکزی۔

مقامی علاقوں کے لئے صوبائی حکومت ہی مرکزی حکومت ہوتی ہے جس کے دائرہ اختیار کے تحت وہ ہوتے ہیں۔ ؎۳

آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۲۹ اور ۱۳۰ میں صوبہ کے عاملانہ اختیارات کے متعلق بتایا گیا ہے

"صوبے کے عاملانہ اختیارات گورنر کو حاصل ہوں گے اور وہ ان اختیارات کو دستور کے مطابق، یا تو براہ راست یا اپنے ماتحت افسروں کے ذریعے استعمال کرے گا۔

۱۔ گورنر کو اس کے کارہائے منصبی کی انجام دہی میں مدد اور مشورہ دینے کے لئے وزراء کی ایک کابینہ ہوگی، جس کا سربراہ وزیر اعلیٰ ہوگا۔

۲۔ گورنر صوبائی اسمبلی کے ارکان میں سے ایک وزیر اعلیٰ مقرر کرے گا جس کو صوبائی اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوگا" ؎۴

ہر صوبہ کا ایک گورنر ہونا چاہیے جو انہیں اوصاف و شرائط کا حامل ہو جو امیر مملکت کے لئے ضروری ہیں۔ کیونکہ وہ صوبہ کے تمام نظم و نسق کا ذمہ دار اور اس کا آئینی اور انتظامی سربراہ ہوتا ہے۔ وہ صوبائی نظام حکومت کو کامیابی سے چلانے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرتا ہے

(1) www Tamilcanadian.com, A Federal solution some lessons and analogies, P-4 of 7

۲۔ صبحی صالح، ڈاکٹر، النظم الاسلامیة نشأتها وتطورها، طبع دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۸، ص ۳۱۰

(3) Ahmed, sh, Shafi, Modern States, Publisher, Sh.M.Ashraf sons, Lahore, 1986, P-213

(4) The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1973, PP-89,90

اور حکمت عملی وضع کرتا ہے۔

مزید برآں ہر صوبہ میں گورنر اور مجلس قانون ساز کے ایوان پر مشتمل ایک صوبائی مقننہ بھی ہونی چاہیے۔ اس کو یہ اختیار حاصل ہو کہ صوبہ کے امن و امان اور انتظام و انصرام کے لئے قانون وضع کرے۔ صوبائی امور کے متعلق قانون وضع کرنے کا اسے کلی اختیار ہو صوبائی مقننہ کے بھی وہی اختیارات ہونے چاہئیں جو مرکزی سطح پر مقننہ کے ہوتے ہیں۔

صوبوں کے مسئلے میں آئینی پہلو کے علاوہ ایک اور پہلو جس سے اس مسئلے کا جائزہ لینا ضروری ہے وہ مفاد عامہ کے نقطۂ نظر سے انتظامی پہلو ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آیا ہماری موجودہ صوبائی حد بندی عوام کے لئے سہولت اور رحمت کا سبب ہے یا اس کے برعکس۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی صوبائی تقسیم ایک نوآبادیاتی طاقت کے سیاسی اور معاشی مصالح کی مرہون منت ہے جس میں عوام کی فلاح و بہبود اور سہولت کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان کا یہ المیہ رہا ہے کہ اسے خود غرض اور کوتاہ اندیش حکمران ورثہ میں ملے جو ذاتی مفادات کی خاطر اختیارات کے استعمال اور فیصلہ سازی میں کسی کو شریک بنانے پر تیار نہ تھے۔

تقی الدین النبہانی والی صوبہ کے اختیارات کے بارے میں رقمطراز ہیں

> ''والی اپنے صوبے کا شرعی حاکم ہوتا ہے اسے صوبے کے اندر حکومتی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں وہ صوبے میں پائے جانے والے تمام محکموں کا نگراں ہوتا ہے۔ والی اپنے صوبے کے اندر ان محکموں کے حکومتی امور سے متعلقہ معاملات، ان کے قیام اور کام کی انجام دہی کی نگرانی کا اختیار رکھتا ہے۔ والی کسی ملازم کا تبادلہ کرنے یا معزول کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو وہ متعلقہ محکمے کو اس کا حکم دے سکتا ہے۔ اس محکمے کو والی کے حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی تاکہ صوبے کا انتظام صحیح طریقے سے چلتا رہے''[1]

اسحاق سندیلوی صوبہ کے اختیارات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''صوبائی حکومتوں کے اختیارات کا سرچشمہ امیر کی ذات ہے، ان کا عزل و نصب ان کے دائرہ اختیار میں کمی بیشی اور حدود حکومت کا تعین اسی کے اختیار میں ہے اس اختیار کا استعمال وہ شرعی اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ کرے گا۔۔۔ حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کا اسوہ حسنہ تو یہاں تک اجازت دیتا ہے کہ یہ والیان صوبہ (گورنر) کا تقرر بھی خود صوبہ کے اہل الرائے کے رائے سے ہو۔ نامزدگی یہ لوگ کریں گے اور منظوری یا نامنظوری کا حق امیر المؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے۔ گورنر کی نامزدگی کون کرے۔ صوبائی مجلس تشریعی یا دوسرے لوگ، اس کا فیصلہ وقت اور حالات کے ہاتھ میں ہے''[2]

حکومت کا کامیاب وفاقی نظام یقینی طور پر مرکزی حکومت اور صوبائی، صدقائی یا ریاستی حکومت کے مابین توازن قائم کرتا ہے۔ وفاقی نظام اپنی اندرونی حدود کے استحکام اور پائیداری کو بھی یقینی بناتا ہے اگر حدود میں تبدیلی کرنا مقصود ہو تو وہ عوامی دلچسپی اور تمام حکومتوں کی بھرپور رضامندی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

۱۔ النبہانی، تقی الدین، نظام الحکم فی الاسلام، طبع دار الحزب التحریر، ۲۰۰۳ء، ص ۶۹

۲۔ سندیلوی، محمد اسحاق، اسلام کا سیاسی نظام، دار المصنفین معارف اعظم گڑھ طبع گردید، ۱۹۵۷ء، ص ۶۳، ۶۴

ایک وفاقی طرز حکومت کی کامیابی کی بنیادی اور لازمی شرط یہ ہے کہ وفاقی اکائیاں چھوٹی ہوں اور اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے اور اپنے مسائل حل کرنے کے لئے ان کے باشندوں کو خاطر خواہ اختیارات، مواقع اور سہولتیں حاصل ہوں۔

اس طرح کے نظام کے حامل سیاسی اداروں میں عوام کو نمائندگی دی جاتی ہے نیز سیاسی جماعتیں مفاداتی گروہوں، مجالس قانون ساز اور سول انتظامیہ کی تشکیل کے لئے نئے اصول رائج کیے جاتے ہیں تاکہ ان میں عوام کو شریک کیا جا سکے سیاسی قوت کے بڑے سرچشمے بالعموم ختم ہو جاتے ہیں۔ عوام اور گروہوں کے سیاسی اختلافات کے باوجود مملکت کے اساسی اصولوں پر عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے نیز احکام اجرائی کرنے اور پرامن انتقال اقتدار کے لئے مسلمہ قانونی طریق کار پر عمل کیا جاتا ہے اور یہ سرا نچلی سطح تک پایا جاتا ہے یعنی اختیارات کی تقسیم ہر سطح پر ہوتی ہے۔[1]

مرکزی اور صوبائی سطح پر حکومت کے دائرہ کار میں نمایاں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور وہ رفاہی سرگرمیوں کے ذریعے عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرتی ہے اس کے علاوہ سیاسی اداروں کا نظام نہایت مستحکم ہوتا ہے اور ان کے فرائض کی تخصیص کی جا سکتی ہے۔ مختلف مفادات اور متحارب مطالبات کو منوانے کے لئے باقاعدہ گروہ اور سیاسی جماعتیں سرگرم عمل ہوتی ہیں۔ یہ معقول بات ہے کہ صوبائی حکومت عوام سے اقرب ہوتی ہے اور غیر منافع بخش تنظیمات کے ساتھ اعتماد بحال کرنے کے لئے سخت محنت کرتی ہے۔ اس لئے وہ عوام کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے اور انہیں حل کر سکتی ہے۔

مرکز اور صوبوں کے باہمی تعلقات

ریاست کے افعال اور پالیسیوں میں مرکز اور صوبوں کے تعلقات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ حکومت کی مشترکہ سرگرمیوں، خودمختاری، اختیارات، ذمہ داریوں اور مالی وسائل میں باہم یکجا ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات صوبوں کے تعلقات ان سے قومی مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور صوبائی مقاصد کے حصول کے لئے مرکزی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح حکومتی کردار، سماجی، معاشی اور دوسری علاقائی پالیسیوں کے ارتقاء میں تعلقات اور تعاون مزید وسعت اختیار کر لیتے ہیں۔ نتیجتاً دونوں حکومتیں ایک دوسرے کے انتظامی امور میں بھرپور تعاون کر کے یگانگت اور یکجہتی کا ثبوت دیتی ہیں۔

رچرڈ سائمن (Richard Simeon) مرکز اور صوبوں کے تعلقات کی نوعیت میں لکھتے ہیں۔

> "Neither side in the debate denies the importance of federal-provincial relation; the issue is whether they should constitute somthing like a third order of government, with real decision-making power, or whether, instead, they should be seen primarily as opportunities for consultation and debate Each side also tends to argue for somewhat different reforms in the process, a clarification of the powers of each level and argue for reforms in the

(1) *Almond, G.A and G.B, powel, comparitive politics (2nd-ed) Toronto, worldBook, Inc, A Scott Fetzer Company London, 1978, P-43*

central government which will make it more regionally responsive, and therefore more able to bypass provinces. Advocates of collaborative federalism call for a more formalized network of intergovernmental machinery designed to make co-operation more effective".(1)

کسی بھی صورت میں مرکزی اور صوبائی تعلقات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا انہیں حکومت کا کوئی تیسرا انتظام قائم کرنا چاہیے جس کے پاس اختیارات حقیقی ہوں یا اس کی بجائے انہیں باہمی مشاورت اور بحث و مباحثہ کے مواقع بھی حاصل ہوں۔ ہر حکومت (مرکزی یا صوبائی) سیاسی عمل میں مختلف اصلاحات کے لئے دلائل پیش کرتی ہے۔ اپنے اختیارات کی ہر سطح پر وضاحت کرتی ہے۔ اور مرکزی سطح پر اصلاحات کو یقینی بناتی ہے۔ تا کہ مرکزی حکومت علاقائی طور پر زیادہ فعال ہو اور صوبوں کی اثر پذیری سے آزاد ہو سکے۔ اشتراکی وفاقیت کے حامی بین الحکومتی تعاون کو مزید موثر بنانے کے لئے سیاسی عمل کو زیادہ سے زیادہ قانونی بنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

مندرجہ ذیل عبارت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ وفاق اور صوبوں کو باہمی اشتراک عمل سے حکومتی پالیسیوں کو رفاہ عامہ کے لئے سودمند اور نتیجہ خیز بنانا چاہیے:

"Federal and provincial government should commit themselves to a joint initiative aimed at eliminating the use of other conditional grants, loans and tax expenditures for the promotion of policies; that fall outside their respective legislative jurisdiction, the federal government's commitment to regional equalization of tax revenues should be spelled out more specifically in the Constitution. Finally, formal procedures for constitutional amendment should be made more flexible."(2)

وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے جس کا مقصد ان حکومتی پالیسیوں کی کامیابی کے لئے مشروط عطیات، قرضہ جات اور ٹیکس کے اخراجات کا خاتمہ ہو جو ان کے قانونی دائرہ اختیار سے باہر ہوں۔ ٹیکسوں سے حاصل شدہ آمدنی کی منصفانہ علاقائی تقسیم کے بارے میں وفاقی حکومت کی ذمہ داری کا آئین میں واضح طور پر بیان کیا جانا چاہیے۔ بالآخر آئینی ترمیم کے باضابطہ طریقے بھی بہت زیادہ لچکدار ہونے چاہئیں۔

ریاست میں حکومتی ایجنسی وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو ایسے منصوبوں سے روکتی ہے جو شورائی اور عدالتی اختیارات کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وفاقی کارکن کے غیر ضروری قرضہ جات اور صوبائی سطح پر غیر ملکی امداد کی خواہش کرنا وغیرہ صوبہ اور مرکز کے باہمی تعلق نہ ہونے کی بنا پر ان کے مقاصد کے حصول کے لئے قانون سازی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جدید جمہوری ممالک میں اختیارات زیادہ تر مرکز تک ہی محدود رہتے ہیں جب کہ صوبے اور علاقے اس

(1) http.//www.the canadian encyclopedia com, Federal-provincial Relations, P-3

(2) http.//www jistor org/stable/3232383

کے دست نگر ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں اختر مجید لکھتے ہیں:

"The Sharing of powers between the federal government and the state or provincial governments often evolves to a point at which federal powers became exclusive but state/provincial powers remain shared. This has created serious problems for many federal systems."(1)

وفاقی حکومت اور ریاستی یا صوبائی حکومتوں کے مابین اختیارات کی تقسیم اکثر اس نہج پر پہنچ جاتی ہے کہ جس میں وفاقی اختیارات تو مخصوص رہتے ہیں لیکن ریاستی یا صوبائی اختیارات منقسم ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے وفاقی نظاموں کے لئے سنگین مسائل تخلیق پاتے ہیں۔

ایسے گھمبیر مسائل کے حل کے لئے لازمی ہے کہ اختیارات کی تقسیم مساوی اور یکساں ہو صوبوں کو نمائندگی دی جائے اور انہیں باقاعدہ طور پر منظم کیا جائے۔

ڈاکٹر رووانٹسا (Dr.Ruwantissa) لکھتے ہیں کہ:

"To achieve this objective, it is necessary to establish both separate legislative and separate administrative institution Both the central government and provincial government must share responsibility in fiscal, administrative and policy matters. In federal systems, this is usually accomplished on a contractual basis. The contract acts as an efficient legal device that enables governments to be joined in responsibility toward the citizenry while at the same time remaining independent of each other."(2)

اس مقصد کے حصول کے لئے مقننہ اور انتظامیہ کے شعبہ جات کا الگ قیام ضروری ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو مالیاتی، انتظامی اور پالیسی کے معاملات میں ذمہ داری لینی چاہیے۔ وفاقی نظاموں میں یہ عمل معاہداتی بنیادوں پر انجام پاتا ہے۔ یہ معاہدہ ایک موثر قانونی تدبیر کے طور پر کام کرتا ہے جس سے حکومتیں بلاشرکت غیر آزادانہ طور پر شہری حقوق کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔

ریاست میں سماجی فلاح و بہبود، قومی ایجنسیوں اور اعتماد پر مبنی تنظیموں کے حقوق و فرائض کا بوجھ مرکزی حکومت سے کم کرنے کے لئے باضابطہ صوبائی ڈھانچہ تشکیل دینا چاہیے تاکہ مرکز اور صوبہ کے تعلقات کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے اور ان کا مابین تقسیم اختیارات

(1) *Handbook of federal countries, 2005, P-4*

(2) *www.tamilcanadian.com, P-4 of 7*

کے فرق اور بڑھتے ہوئے انتشار کو ختم کیا جا سکے۔

سن فورڈ (Sanford) لکھتے ہیں کہ اگر ایسے اقدامات کو روبہ عمل نہ لایا گیا تو اس کے ملک پر منفی اثرات مرتب ہوں گے:

"Such actions could further weaken national commitments to provide service, enforce rightsand protect values across a gamut of policy areas Supporters emphasize that Bush is seeking to enable states and local governments to act independently of federal regulation Opponents stress that he is eviscerating federal commitments in key areas of social policy and the environment in particular."(1)

ایسے اقدامات حکمت عملی کے دائرہ کار میں خدمات کی فراہمی، حقوق کے نفاذ اور اقدار کے تحفظ کے قومی عزم کو کمزور کرتے ہیں۔ حکومتی کارکنان کا کہنا ہے کہ بش انتظامیہ ریاستوں اور علاقائی حکومتوں کو اس قابل بنانے کی سعی و کاوش میں ہے کہ وہ وفاقی دستور سے آزاد ہو کر کام کریں۔ جبکہ مخالفین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ سماجی پالیسی اور بالخصوص ماحول جیسے اہم شعبوں کے متعلق وفاقی دعووں کو نظر انداز کر رہا ہے۔

صوبائی خودمختاری

عصر حاضر میں گذشتہ ادوار کی طرح مرکزی تسلط قائم ہے لیکن کچھ ترقی یافتہ ممالک میں حکمرانوں کی کوشش ہے کہ وہ صوبائی خودمختاری کی حوصلہ افزائی کریں تا کہ عوامی مسائل کی تفہیم و تحلیل کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کیا جا سکے۔ کیونکہ مرکزی اقتدار کا ناجائز استعمال ہی سابقہ حکومتوں کی ناکامی کا باعث بنا۔

اسلامی حکومت چاہے مرکزی ہو یا علاقائی، وہ ہر حال میں قرآن و سنت کے احکام کی پابند ہے اور یہ پابندی دونوں پر یکساں طور پر عائد ہے۔ لہذا کسی بھی علاقائی حکومت کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون بنائے یا کوئی اقدام کرے۔ اسی میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کوئی علاقائی حکومت ایسا کوئی قانون نہیں بنا سکتی، نہ کوئی ایسا اقدام کر سکتی ہے جو انصاف کے عام اصولوں کے خلاف ہو۔ اسی طرح تعلیمی نظام میں اسلامی تعلیمات کو مدنظر رکھنا جس طرح مرکز کے لئے ضروری ہے، اسی طرح علاقائی وحدتوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ نیز بعض امور ایسے ہیں جن میں پورے ملک کی پالیسی کا یکساں ہونا ملی یکجہتی کے لئے ضروری ہے ان کا تعین تمام علاقائی وحدتوں کے مشورے سے کیا جا سکتا ہے، مثلاً بین الاقوامی تعلقات، امور خارجہ، دفاع اور بین الاقوامی تجارت وغیرہ۔ لیکن ان بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علاقائی وحدتوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جا سکتی ہے۔

خلفائے عباسیہ کا معمول تھا کہ وہ دور دراز اسلامی صوبوں کا گورنر خاندان عباسی کے ممتاز افراد اور بڑے بڑے جرنیلوں کو مقرر کرتے تھے۔۔۔ جب تک سلطنت عباسیہ کی مرکزی قوت مستحکم رہی اس وقت تک یہ نیابت عباسی سلطنت کی سلامتی کے لئے کوئی خطرہ نہ بن سکتی تھی

(1) *Hand book of Federal Countries, 2005, from Article United states of America, Sanford F. Schram, P-385*

لیکن جب مرکزی قوت میں ضعف وانحطاط پیدا ہو گیا تھا اس وقت ان صوبوں میں گورنروں کے بعض قائم مقاموں نے مرکز سے خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا"۔[1]

سید امیر علی رقمطراز ہیں

"Under mansoor the office of a provincial governor was by no means a sinecure".(2)

منصور کے دور میں صوبائی گورنر کا عہدہ پھولوں کی سیج نہ تھا۔(یعنی ان کی حیثیت مرکزی حکومت کے ایک آلۂ کار سے زیادہ نہ تھی)۔

''مگر ہارون الرشید کے دور میں ابراہیم بن اغلب افریقہ کا گورنر مقرر کیا گیا اور ہارون الرشید نے داخلی معاملات میں اس کی خودمختاری تسلیم کر لی"۔[3]

ایک مضبوط مرکزی حکومت تشکیل دیتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ صوبوں کو خودمختاری دیئے بغیر مرکزی حکومت کا چلانا کس قدر دشوار عمل ہے۔

حضرت عمرؓ اور بعد کے خلفاء کے عہد حکومت میں والیوں کو اجازت تھی کہ وہ خلیفہ سے رجوع کیے بغیر اپنے اختیارات کا استعمال کریں۔اسی طرح تمام ذمہ دار اور ملازمین کو بھی اپنے دائرہ کار میں خودمختاری حاصل تھی کہ وہ کتابیں پڑھیں اور لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لئے علم حاصل کریں تاکہ لوگوں کے کام بلا تاخیر سرانجام پائیں اور ان کی مشکلات رفع ہوں۔[4]

دولت اسلامیہ کے ہر عہد میں معاملات کی ترقی کے باوجود انتظامی امور میں خودمختاری اور اعمال کی انجام دہی میں تیزی، دونوں چیزیں شامل ہیں۔

اس سلسلہ میں تقی الدین النبھانی لکھتے ہیں:

''جب ولید بن عبدالملک نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو حجاز (مکہ، مدینہ، طائف) کا والی مقرر کیا تو آپ نے ان سے مطالبہ کیا کہ حدیں توڑنے والے اور ظلم کرنے والے لوگوں کے ساتھ مجھے آزادی سے نمٹنے دیا جائے۔ولید نے کہا، ''حق کے ساتھ جو چاہو کرو خواہ ہمیں ایک درہم بھی نہ دو"۔اس طرح عمر بن عبدالعزیز نے صوبے کے انتظامی امور میں اپنے آپ کو خودمختار بنایا اور آپ رحمہ اللہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے اپنے گورنروں کو انتظامی امور میں مکمل خودمختاری دی"۔[5]

تمام خلفاء صوبوں کے انتظامی امور میں یہی رویہ اختیار کرتے تھے اور ان کا نصب العین صرف اور صرف لوگوں کی بھلائی ہوتا

۱۔ صالح، ڈاکٹر، صبحی، النظم الاسلامیہ نشأتہ وتطورہ، طبع دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۸ء، ص ۳۱۱

(2) Ameer, syed, Ali, A Short history of the Saracens, Alfareed printers 25, Darbar Markeet, Lahore, 1927, P-409, P-218,219

(3) Von Ka remer, The Orient under the Caliphs, P218,219

۴۔ نظام الحکم فی الاسلام، ص۷۶

۵۔ ایضاً، ص۷۷

تھا۔ اگر عوام کے سب سے کمزور آدمی بھی شکایت کرتا تو اس کی شکایت سنی جاتی ۔ صوبے میں بے چینی اور بدامنی ہوتی تو والی کو معزول کر دیا جاتا تھا۔

پاکستان میں مرکزی حکومت یا فیڈرل گورنمنٹ ایک طرح کی فیڈریشن ہے، جس میں پاکستان کے چاروں صوبے آئین کی رو سے تو خود مختار ہیں مگر حقیقتاً جہاں انہیں ایک ہاتھ سے خود مختار بنایا جاتا ہے۔ دوسرے ہتھکنڈوں کے ساتھ اُن سے مرکزی باگ ڈور کے ذریعے یہ خود مختاری سب کر لی جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً آرڈیننس اور احکامات کے ذریعے مرکزی حکومت صوبوں کے حقوق اور خود مختاری کو معطل کئے رہتی ہے۔

اس طرح صوبوں کو قابو میں رکھنے کے لئے سب سے بڑا ذریعہ مرکز کی طرف سے امدادی رقوم کی ترسیل ہے۔ جس کے ساتھ کڑی شرائط وابستہ ہوتی ہیں یعنی صوبائی منصوبوں کی مرکز سے پیشگی منظوری لینا، ان کی تکمیل تک مختلف مراحل کی رپورٹ دینا اور صوبائی اخراجات کا حساب دینا وغیرہ۔

آئین کے آرٹیکل ۱۴۹ کی دفعہ (۱، اور ۳) میں ہے کہ:

ہر صوبے کا عاملانہ اختیار اس طرح استعمال کیا جائے گا کہ وہ وفاق کے عاملانہ اختیار میں حائل نہ ہو یا اسے نقصان نہ پہنچائے اور وفاق کا عاملانہ اختیار کسی صوبے کو ایسی ہدایات دینے پر وسعت پذیر ہوگا جو اس مقصد کے لئے وفاقی حکومت کو ضروری معلوم ہوں۔

''وفاق کا عاملانہ اختیار کسی صوبے کو ایسے طریقے کی بابت ہدایت دینے پر بھی وسعت پذیر ہوگا جس میں اس کے عاملانہ اختیار کو پاکستان یا اس کے کسی حصے کے امن یا سکون یا اقتصادی زندگی کے لئے کسی سنگین خطرے کے انسداد کی غرض سے استعمال کیا جانا ہو'' [۱]

آئین کی شرح میں جسٹس محمد منیر لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ صوبائی خود مختاری کا تقاضہ یہ ہے کہ صوبہ کو اپنے معاملات اپنی مرضی سے طے کرنے اور انتظامی امور اپنی مرضی سے چلانے کا اختیار ہونا چاہیے تاہم ملکی بقاء، سلامتی، ہم آہنگی اور ترقی کے لئے دستور نے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ صوبے بعض معاملات میں وفاقی عاملہ کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔ اس آرٹیکل سے اگرچہ صوبائی اختیارات پر ایک طرح کی بندش لگائی گئی ہے مگر یہ بندش ملکی سلامتی کیلئے ہے، اس لئے اسے ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا'' [۲]

اس صوبائی ڈھانچے نے پاکستان اور اہل پاکستان کے لئے بے شمار مسائل پیدا کئے ہیں کیونکہ مرکزی حکومت صوبائی حکومت کی ترقیاتی پالیسیوں پر کانفرنس کے ذریعہ بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ گورنر مرکزی سرومز کے رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے اثر و رسوخ اور دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں اور یوں مرکزی حکومت بغیر بحث و تمحیص کے مقصد براری کر لیتی ہے جب کہ یہ طرز عمل آئین کی رو سے ان کے استحقاق کے منافی ہے۔

اس سیاسی ڈھانچہ کو تبدیل کرنا عین مقتضائے مصلحت ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے نہایت مستحسن و مطلوب ہے۔ یہ اقدام ایسے فتنے کے ازالہ کی راہ ہموار کردے گا جو عامۃ الناس کی فلاح و بہبود اور مملکت اسلامی کی بقاء، وحدت اور خوشحالی کے لئے روز افزوں خطرے کی

---

(1) The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, 1973, PP-100,101

۲؎ شرح اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور (نو ترمیم شدہ) ص ۱۸۵

صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

اس ضمن میں پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات کار کی نئی بساط بچھانا ایک مستحسن قدم ہے جس کے نتیجے میں اختیارات اور وسائل، صوبوں کی طرف منتقل ہوں گے۔ مشترکہ مفادات کی کونسل (CCI) کو ایک موثر اور کارفرما ادارہ بنا کر حکمرانی اور فیصلہ سازی میں مرکز اور صوبوں کے اشتراک کا ایک نیا نظام تجویز کیا گیا ہے۔ "قومی مالیاتی ایوارڈ" کو صوبوں میں وسائل کی فراہمی کے لئے ایک نیا آہنگ دیا گیا ہے ملک کے وسائل پر مرکز اور صوبوں میں ملکیت اور انتظام و انصرام کے اشتراک کا بندوبست تجویز کیا گیا ہے" [۱]

اگر اس ترمیم پر صحیح معنوں میں عمل ہو تو صوبے کے انتظام و انصرام میں استحکام پیدا ہوگا بشرطیکہ مرکز اور صوبے باہمی تعاون، خلوص نیت اور احساس ذمہ داری سے اپنے اپنے دائرہ عمل میں مصروف کار رہیں۔ اس طرح سیاسی نظام کی بنیادیں مضبوط ہوں گی جس سے ملک میں خوشحالی اور امن وامان کا دور دورہ ہوگا۔

محمد اسحٰق سندیلوی لکھتے ہیں:

"یہ بات قابل غور ہے کہ صوبائی حکومتوں کی بے راہ روی یعنی جادۂ شریعت سے انحراف یا رعایا پر ظلم وستم کی صورت میں مرکز کی مداخلت اس کا فرض ہے، اور ان سب امور کی روک تھام کرنا اس کی اہم ذمہ داری ہے" [۲]

بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن میں صوبوں کے لئے وفاقی احکامات کی تعمیل کرنا لازم ہو جاتا ہے، اس ضمن میں اختر مجید لکھتے ہیں:

"The accommodation of human diversity, however, remains the leading challenge for federalism. It is also the leading challenge for the world. The flowering of cultural, religious and national identities has created conflict worldwide. Equitable, democratic resolutions of these conflicts will require negotiated governance arrangments of a federal nature within and between nation-states.

At the same time, issues of environmental protection, global equity, and world peace all point to a need to employ federal principles and practices on a global scale in order to help guarantee the future against catastrophe".(3)

انسانی اختلاف کی موافقت نہ صرف وفاقی نظام بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ کیونکہ ثقافت، مذہب اور قوم کے

---

۱ پروفیسر خورشید احمد، اٹھارویں ترمیم، خوش آئند پیش رفت، ترجمان القرآن ۱۳۷، ۵ (مئی ۲۰۱۰) ص ۱۹

۲ اسلام کا سیاسی نظام، ص ۲۶۳

(3) Handbook of Federal Countries, 2005, P-14, Ann1-Griffiths

اختلافات عالمی جھگڑوں کا موجب بنتے ہیں۔ ان جھگڑوں کے مساویانہ اور جمہوری حل کے لئے قوموں کے درمیان وفاقی طرز کی باہمی گفت وشنید کے انتظامات کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی مساوات اور انصاف اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ وفاقی قوانین اور مہارتوں کو عالمگیر سطح پر رائج کیا جائے تاکہ انسانیت کے مستقبل کو کسی ناگہانی آفت سے بچانے کی ضمانت دی جاسکے۔

بحث سے ثابت ہوا کہ اگر مرکز اور صوبوں کے حکمران آئین اور وفاق کی شرائط پر عمل کریں اور سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اپنی آئینی حدود وقیود کی پابندی کریں تو نہ صرف وہ ایک دوسرے کے لئے محتسب کا کردار ادا کر کے عوام کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں بلکہ بار بار کی اسمبلیاں توڑنے کی نوبت بھی نہ آئے گی اور ملک مضبوط ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو ریاست بہت سی قومیتوں پر مشتمل ہو وہاں تہذیبی، سیاسی اور معاشی معاملات میں باہمی شکر رنجیاں موجود ہوتی ہیں مگر جن ممالک میں وفاقی جمہوری نظام قائم ہو وہاں یہ شکایات ہونے کے باوجود ایک حد سے آگے نہیں بڑھتیں بلکہ جہاں باہمی معاشی اور دوسرے مشترک مفادات فروغ پاتے ہیں وہاں یکجہتی کو فروغ ملتا ہے۔

باب چہارم

اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی کے ایجابی پہلو

فصل اول: قیام عدل اور بنیادی حقوق کے حوالے سے پالیسی

فصل دوم: مستحقین کی فلاح و بہبود اور حقوق نسواں کا تحفظ

فصل سوم: غیر مسلم رعایا کے حوالے سے اقدامات

قیام عدل ــــــ ایک تعارف

عدل کے بنیادی مقاصد میں افراد کا حق خود ارادیت، اظہار رائے کی آزادی، تمام مناصب تک یکساں پہنچ، ملکی معاملات میں مشاورت میں شمولیت، سیاسی مسائل میں حق تنقید اور سیاسی رہنماؤں کا احتساب شامل ہیں جن کے بغیر سیاسی عدل کا قیام ممکن نہیں ہے۔ معاشی معاملات میں وراثت اور ہبہ کے ذریعے حصول مال، محنت کا جائز معاوضہ، ذخیرہ اندوزی کی ممانعت، دولت کی منصفانہ تقسیم وہ بنیادی پہلو ہیں جو معاشی عدل کے قیام کے لئے شرط ہیں۔ قانونی نقطہ نظر سے بلا تفریق مذہب وملت انصاف کا حصول، قوانین کا شفاف ہونا، نفاذ قانون میں اصول پرستی اور حکام اور قاضیوں کا اہل ہونا عدل کے قیام کے لئے ضروری ہیں۔

عدل کا معنی ومفہوم

اسلام کے تمام بنیادی مآخذ میں اصطلاح "عدل" استعمال ہوئی ہے اور اسے اسم ذات اس صفت دونوں طرح لیا گیا ہے۔ اول الذکر شکل میں اس اصطلاح کا مفہوم، انصاف اور ثانی الذکر صورت میں متوازن ہے۔

عدل بفتح دال کے معنی قیمت، فدیہ، مرد صالح اور حق وانصاف کے آتے ہیں جیسے:

"ما قام فی النفوس انه مستقیم"[۱]

جو بات انسانی ذہنوں کو صحیح اور سیدھی محسوس ہوتی ہے وہ عدل ہے۔

امام راغب اصفہانی عدل کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:

"العدل هو المساوات فی المکافات".[۲]

مکافات میں مساوات کا لحاظ رکھنا عدل ہے یعنی نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدلہ بدی ملنا چاہیے۔

گویا ہمارے ہاں انصاف کے مروجہ مفہوم کو ادا کرنے کے لئے لفظ "عدل" ہی زیادہ مناسب ہے مگر عدل ایک وسیع المعنی اصطلاح ہے جس کا مفہوم توازن، تناسب، مساوات، ہم آہنگی، انصاف، افراط وتفریط سے اجتناب اور لوگوں کے تعلقات ان بنیادوں پر قائم کرنا جس سے ہر فرد کو اس کا جائز حق مل جائے۔ نیز یہ کہ جو کچھ ہم سوچیں، کہیں یا کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائیں۔

علامہ صالح طوحی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ:

"هو أن تعطی من نفسک الواجب وتاخذه"[۳]

دوسروں کے حقوق ادا کرنا اور اپنے حقوق کا لینا عدل ہے۔

علامہ الماوردی عدل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"واذا کان العدل من احدی قواعد الدنیا التی لا انتظام لها الا به، ولا صلاح فیها الا معه وجب ان یبدأ بعدل الانسان فی نفسه ثم بعدل له فی غیره"[۴]

۱۔　لسان العرب، بہ ذیل مادہ عدل

۲۔　مفردات القرآن، باب العین

۳۔　طوحی، صالح، نضرۃ النعیم فی مکارم اخلاق الرسول الکریم، دار الفکر، بیروت، ۲۰۰۰ء، ۲۷۹۳،۷

۴۔　ادب الدنیا والدین، ص ۲۲٤

عدل دنیا میں نظم لانے والے قواعد میں سے ہے اور اس کے بغیر زمین میں اصلاح نہیں آسکتی تو ضروری ہے کہ انسان اول اپنے آپ پر اور پھر اوروں پر عدل نافذ کرے۔

عدل کی تعریف میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"الامانات الی اھلھا و الحکم بالعدل، فھذان جماع السیاسة العادلة، و السیاسة الصالحة"[1]

سیاست عادلہ اور سیاسۃ صالحہ کی عمارت دو ستونوں پر ہے، ایک ہے مناصب اور عہدے اہل تر لوگوں کو دینا اور دوسرا ہے عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کرنا۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ:

"اللہ کے دین کا مقصد یہی ہے کہ اس کے بندوں کے درمیان انصاف قائم کیا جائے اور لوگ انصاف پر قائم رہیں"۔[2]

مندرجہ بالا تعریفات سے عدل کا اساسی مفہوم واضح ہوتا ہے کہ عدل کرنا ہر ایک کے لئے واجب العمل ہے کیونکہ عدل کے بغیر رعیت کی اصلاح ممکن نہیں اور حکومت کو دوام نہیں۔ لہذا جہاں بھی مسلمانوں نے اس معیار کو قائم رکھا وہاں ان کی حکومت مستحکم اور مضبوط رہی لیکن جہاں کہیں انہوں نے عدل کے معیار کو قائم نہ رکھا ان کا شیرازہ بکھر گیا۔

قیام عدل اسلامی ریاست کا مقصد وجود

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام دین عدل ہے، عدل اسلام سے الگ کسی چیز کا نام نہیں بلکہ بعض اعتبارات سے اسلام کے اصل مزاج کا سب سے بڑا اشارہ ہے اور دین کا جو تصور اسلامی تعلیمات نے پیش کیا ہے اس کے امتیازی خدوخال عدل وانصاف کے آئینہ میں سب سے زیادہ واضح شکل میں نظر آتے ہیں۔ عدل وانصاف کو اسلام میں زندگی کی ایک ابدی اساسی قدر ٹھہرایا گیا ہے جو فکر وشعور کے ہر زاویے سے لے کر نظم زندگی کے ہر گوشے میں جاری وساری ہے۔ یوں عدل وانصاف وہ بنیادی انسانی قدر اور عالمگیر صداقت ہے، جس پر انسانی معاشرہ بلکہ آسمان سے زمین تک پھیلا ہوا دنیا کا یہ سارا کارخانہ قائم ہے اگر یہ ختم ہو جائے تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ عدل وانصاف کا قیام تمام آسمانی شریعتوں کا نصب العین رہا ہے، چنانچہ اسلامی شریعت کا بنیادی مقصد بھی اعلیٰ معاشرتی زندگی کی تنظیم کے علاوہ نفوس کی پاکیزگی کی خاطر صفت عدل وانصاف کی حفاظت ہے۔

فقہاء اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اسلامی ریاست کے شہریوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنا اسلامی ریاست کے حکمران پر ضروری اور اس کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے۔ اسلامی ریاست کے حکمران پر عائد یہ ذمہ داری قرآن کریم، سنت رسول ﷺ، اجماع امت اور عقلی استدلال سے ثابت ہوتی ہے۔

قرآن کریم سے استدلال

قرآن کریم کی متعدد آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اسلامی ریاست کے حکمران کے لئے عوام الناس میں عدل سے فیصلہ کرنا

۱۔ السیاسة الشرعیة فی اصلاح الراعی والرعیة، ص ۷

۲۔ الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة، ص ۵

عدل پر ضمناً گفتگو "عدل اور حقوق کی بہم رسانی" کے تحت آچکی ہے لیکن اسلامی ریاست کے استحکام اور پائیداری میں عدل مرکزی اہمیت کا حامل ہے اس لئے اس پر الگ عنوان کے تحت گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے۔

واجب قرار دیا ہے۔

یوں جملہ سیاسی نظریات اور اسلامی تصور خلافت کی روشنی میں، ہیئت عمرانیہ کی تکوینی سنن الہیہ سے مطابقت پذیری اور ابدی الوہی اقدار زندگی کے مطابق صورت گری کے لیے اساس و بنیاد اور غایت وغنیمی "عدل" ہی ہے جو ریاست کا اساسی وظیفہ ٹھہرتا ہے۔

قیام عدم کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ باہمی لین دین کے معاملات ہوں یا نظم مملکت و انتظام، زبانی بات چیت ہو یا تحریر و دستاویز کی شکل، عدل کے تقاضوں کو ہر حالت میں پورا کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے

۱۔ ﴿وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ فَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ﴾

"اور ہم (مکرر) حکم دیتے ہیں کہ آپ ﷺ ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور ان کی خواہشوں پر عملدرآمد نہ کیجئے اور ان سے یعنی ان کی اس بات سے احتیاط رکھیں کہ وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بھی بچلادیں پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو یہ یقین کر لیجئے کہ بس اللہ ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعض جرائم پر ان کو سزا دیں اور زیادہ آدمی تو بے حکم ہی ہوتے ہیں"۔

انبیاء علیہم السلام کو "بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ" کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی روشنی میں فیصلہ دینا ہی اقامت عدل ہے گویا اسلامی شریعت عدل پر قائم ہے اس کا ہر ہر حکم عدل پر مبنی ہے جہاں عدل ہوگا وہاں شریعت ہوگی۔

﴿فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾[۲]

"تو ان میں عدل کے موافق فیصلہ کیجئے بے شک حق تعالیٰ عدل کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں"۔

چنانچہ قرآن کریم میں ریاستی اقتدار کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے جتنے بھی الفاظ وارد ہوئے ہیں مثلاً استخلاف فی الارض، تمکن فی الارض، وراثت الہی، امر، حکم اور امانت ان سب میں اختیار و اقتدار سے زیادہ عدل گستری اور حق پروری کا مفہوم و روح پائی جاتی ہے اور لفظ حکم اور حکومت کے اصل لغوی معانی "القضاء بالعدل" ہی کو حکومت و ریاست کی غایت قرار دیتے ہیں۔

سنت نبوی ﷺ سے استدلال

اسلامی ریاست کے پہلے حکمران خاتم المرسلین سیدنا محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی روشنی میں اسلامی ریاست میں قضا کا عہدہ خود سنبھالا آپ ﷺ نے ایک ایسا عادلانہ نظام قائم فرمایا جس کی نظیر دنیا کے کسی معاشرے میں نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے سنت کی صورت میں ایسی لازوال تعلیمات مہیا کر دیں جن کی بدولت نہ صرف عہد نبوی ﷺ میں انصاف کی فراوانی ہوئی بلکہ بعد میں بھی خلفائے راشدین اور انصاف پسند حکمرانوں نے عادلانہ نظام قائم کیا۔ حضور ﷺ نے اسلامی ریاست کے اولین حکمران کی حیثیت سے ابوذر غفاریؓ کو اس انتظام کی اہمیت و نزاکت کا احساس ان الفاظ میں دلایا

"یا اباذر انک ضعیف وانها امانة وانها یوم القیامة خزی وندامة الا من اخذ بحقها وادی الذی علیه فیها"[۳]

۱۔ المائدۃ ۵: ۴۹

۲۔ النساء ٤: ١٠٥

۳۔ جامع صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب کراهیة الامارۃ بغیر ضرورۃ، رقم الحدیث ٤٦٨٣

اے ابوذرؓ تم کمزور آدمی ہو اور حکومت کا منصب ایک امانت ہے۔ قیامت کے روز وہ رسوائی اور ندامت کا موجب ہو گا سوائے اس شخص کے جس نے اس کے حق کا پورا پورا لحاظ رکھا اور جو ذمہ داری اس پر عائد تھی اسے ٹھیک ٹھیک ادا کیا۔

یہ اس حدیث نبوی ﷺ کا بڑا اہم نکتہ ہے جسے نمایاں کرنے کے لئے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے زیر نظر باب کے علاوہ اس سے اوپر اس مضمون کو ممتاز کرنے کے لئے اس کا ایک الگ باب بھی قائم کیا ہے، جس میں انہوں نے اس روایت کو الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ دوبارہ نقل کیا ہے۔

"انکم ستحرصون علی الامارة وستکون ندامة یوم القیامة، فنعم المرضعة وبئست الفاطمة"[1]

ایک وقت آئے گا جب کہ تمہارے اندر عہدہ ومنصب کا لالچ پیدا ہو جائے گا، لیکن قیامت کے روز یہ سراسر پچھتاوے کا باعث ہو گا تو اچھا ہے کہ یہ دنیا میں نہ ملے؟ جس سے اگر چہ ان عمال کو دیگر انتظامی امور کی دیکھ بھال بھی سپرد کی گئی مگر ان کی تقرری کا بنیادی مقصد اور غرض وغایت ہمیشہ اس عہدہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہی رہا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بہت سے صحابہ کرام کو خود تفقہ کی تربیت دی اور وہ اصولی ہدایات دیں جو ان کے لئے منصب قضاء کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں مشعل ہدایت ثابت ہوئیں۔

اجماع امت سے استدلال

قرآن وسنت کی واضح نصوص اور نبی کریم ﷺ کے اسلامی ریاست کے اولین حکمران کی حیثیت میں 'منصب قضاء' سے عہدہ برآ ہونے کے ان گنت عملی شواہد کی روشنی میں امت مسلمہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ اسلامی ریاست میں لوگوں کے درمیان عدل وانصاف سے فیصلہ کرنے کی ذمہ داری ریاست کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے۔ اس لیے ریاست کا حکمران ہی اس ذمہ داری کو نبھانے کا پابند ہے۔
اس ضمن میں فقہاء کی آراء یہ ہیں:

"ولان نصب الامام الاعظم فرض بلاخلاف بین اهل الحق ولا عبرة بخلاف بعض القدرية لاجماع الصحابة رضي الله عنهم على ذلك ولمساس الحاجة اليه لتقيد الاحكام انصاف المظلوم من الظالم وقطع المنازعات التي هي مادة الفساد وغير ذلك من المصالح التي لا تقوم الا بامام"[2]

"وكان اذا اسلم قوم اقام عليهم من يعلمهم شرائع الدين ويقضي بين المتنازعين وقد حكم الخلفاء الراشدون بين الناس وقلدوا القضاة والحكام"[3]

"فاما الاصل فهو الامام المستخلف على الأمة فتقليد القضاء من جهته فرض"[4]

"وأما ايقاع القضاء بين المتنازعين ففرض عين على الامام بنفسه او نائبه اى القضاء (فرض

۱۔ جامع صحیح بخاری، کتاب الأحکام، باب ما یکره من الحرص علی الامارة، رقم الحدیث ۷۱۴۸

۲۔ بدائع الصنائع، ۷/ ۲

۳۔ ادب القاضی للماوردی ۱/۱۳۳، ۱۳۵

۴۔ مغنی المحتاج ۴/ ۳۷۲

کفایة کالامامة العظمی، لا بد للناس من حاکم لئلا تذهب حقوق الناس "[۱]

امت کے اس اجماع کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بعد اسلامی ریاست کے حکمران کی حیثیت میں آپ ﷺ کے خلفاء بھی خود اس منصب کی ذمہ داریوں کو اسی طرح نبھاتے اور بوقت ضرورت اس منصب کے اہل افراد کو یہ ذمہ داریاں تفویض فرماتے رہے، جس طرح کے حضور ﷺ نے کیا۔

حضرت عمرؓ کے نزدیک عدل صرف ریاست کی نہیں بلکہ پوری رعایا کی ذمہ داری ہے انہیں ہر ہر معاملے میں عدل ہی کے اصولوں پر کاربند رہنا چاہیے پھر ہی عدل وانصاف کی برکتوں سے معاشرہ فیض یاب ہو سکتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں خلفائے ثلاثہ کے نافذ کردہ نظام کو بدستور جاری رکھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے مشہور تابعی حضرت محمد بن سیرین کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنے دور خلافت میں تمام قاضیوں کے نام ایک مراسلہ جاری کیا، جس میں یہ حکم دیا کہ تم بالکل اسی طرح فیصلے کیا کرو جس طرح پہلے خلفاء اپنے عہد حکومت میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ میں اختلاف کرنا پسند نہیں کرتا، میں جماعتی نظم قائم رکھنے کے حق میں ہوں اور اپنے پیش رو خلفاء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دنیا سے رخصت ہونے کا خواہش مند ہوں۔

"عن ابن سیرین عبیدة السلمانی عن علی قال اقضوا کما کنتم تقضون فانی اکره الاختلاف حتی یکون الناس جماعة واموات کما مات اصحابی "[۲]

عقلی استدلال

اسلامی ریاست میں قضاء کی اولین ذمہ داری ریاست کے حکمران پر عائد ہوتی ہے اس لئے کہ اس منصب کی ذمہ داریوں میں شہریوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے امن وسکون میں مخل ہونے والوں کی بیخ کنی، تنازعات ومخاصمات کا خاتمہ، ظالموں کی سرکوبی، مظلوموں کی دادرسی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کا نفاذ جیسے خطیر امور شامل ہیں اس لیے عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان امور کو نبھانے کا فریضہ ریاست کی سب سے مقتدر ہستی ہی سرانجام دے۔

اس ضمن میں شیخ الاسلام عبدالعزیز بن عبدالسلام لکھتے ہیں:

"واجمع المسلمون علی ان الولایات من افضل الطاعات، وان الولاة المقسطین اعظم اجر او اجل قدر امن غیرهم، لکثرة ما یجری علی ایدیهم من اقامة الحق ودرا الباطل فان احدهم یقول الکلمة الواحدة، فیدفع بها مائة ألف مظلمة فما دونها، او یجلب بها مائة الف مصلحة فما دونها فیاله من کلام یسیر واجر کبیر "[۳]

۱۔　کشاف القناع، ۲۸۶/۶

۲۔　الجامع الصحیح البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب علی بن أبی طالب، رقم الحدیث ۳۷۰۷
خلفاء اربعہ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ سربراہ ریاست کا یہ فرض ہے کہ اگر وہ خود اس فریضہ کو سرانجام دینے سے قاصر ہو تو اس کی ادائیگی اسلامی ریاست کے شہریوں میں سے ایسے افراد کو تفویض کرے جن کی اس منصب کے لئے اہلیت اور قابلیت ہر لحاظ سے مسلم ہو۔

۳۔　عز الدین ابن عبد السلام، قواعد الاحکام فی مصالح الأنام، مطبعہ حسینیة، قاهره ۱۹۳۴ء، ص ۱۴۱

اور تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ملکی انتظام چلانا تمام عبادات سے افضل ہے اور عادل حکمران دیگر لوگوں سے اجر و ثواب میں بہتر ہیں، اس لیے کہ ان کے ہاتھوں حق کا قائم ہونا اور باطل کا ختم کرنا جاری ہوتا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ ایک شخص کے فرمان سے ایک ہزار یا اس سے زیادہ مظالم دفع ہوتے ہیں اور ایک ہی فرمان سے ایک ہزار یا اس سے زیادہ فوائد جب ہوتے ہیں تو ہر اس شخص کے لیے خوشی ہے کہ جس کو مختصر کلام کے ذریعہ بڑا اجر و ثواب حاصل ہو جائے۔

یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اسلامی ریاست میں قضاء کے منصب کی ذمہ داریاں بنیادی طور پر ریاست کے حکمران پر عائد ہوتی ہیں اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہوسکنے کی صورت ہی میں وہ اس منصب کی اہلیت پر پورا اترنے والوں کو یہ ذمہ داریاں تفویض کر سکتا ہے۔

ابن الطقطقی رحمہ اللہ نے خلیفہ کے فرائض منصبی کو یوں بیان کیا ہے

"واقرار حقوقهم مقارها، واغاثه ملهوفهم، واجابة مستصرخهم والتسوية في حكمه بين الا بعد منهم والاقرب والاذل والاعز فهذه حقوق تلزم السلطان تجري مجرى الفروض الواجبة، وبهذه الأمور تجب طاعته على رعيته"[1]

حقدار کو اس کا حق دینا، مظلوم کی مدد کرنا، مظلوم کی مدد چاہنے والے کی مدد کرنا، دور اور نزدیک، کمزور اور قوی کے درمیان عدل سے فیصلہ کرنا (نزدیک اور قوی کا لحاظ نہ کرنا) پس یہ تمام حقوق سلطان پر لازم ہیں فرض اور واجب کی طرح، اور ان مذکورہ امور کی انجام دہی کی وجہ سے اس خلیفہ کی اطاعت، رعیت پر واجب ہوتی ہے۔

علامہ بدرالدین ابن جماعہ لکھتے ہیں:

"العدل في سلطانه وسلوك موارده في جميع شانه قال الله تعالى: ان الله يامر بالعدل والاحسان"[2]

حاکم اپنی سلطنت میں عدل کرے اور اسے زندگی کے تمام شعبوں میں قائم رکھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اللہ انصاف کرنے اور بھلائی کرنے کا حکم کرتا ہے۔

ہر نظام حکومت زبان سے انصاف قائم کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اور جو طریقہ اس نے اختیار کیا ہے اسے ہی حق و انصاف سمجھتا ہے لیکن حقیقی انصاف وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے انصاف قرار دیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سیکولر ڈیموکریسی بھی یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ انصاف کی علمبردار ہے لیکن عملی صورت حال یہ ہے کہ بہت سے سیکولر جمہوری معاشروں میں سربراہ حکومت کو متعدد قوانین سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

قیام عدل کے لئے علمی و فکری استحکام

اسلامی ریاست نے علم سے دین و دنیا کی تفریق ختم کرکے اس کے جس کردار کا تعین کیا وہ اجتماعی اور ہمہ گیر ہے یعنی اعتقاد و عمل کے اعتبار سے مسلمان بنانا، اور جملہ اصناف علوم اور حقائق اشیاء کا مطالعہ اسلامی نقطہ نظر سے کرنا، نیز اخذ نتائج میں سمع و بصر کے بعد فواد سے کام لینا یعنی تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس مسلسل اس علم کا مقصود قرار پایا۔

علم کا اصل مقصد اخلاق ہیں، جو کہ مطلوب ہیں، اور علم ان اخلاق کا ذریعہ ہے۔ معلم اخلاق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام صرف لوگوں

۱۔ الفخري في الآداب السلطانية والدول الاسلامية، ص ۶۱،۶۲

۲۔ تحرير الأحكام، ص ۱۶۸ وایضاً النحل ۱۶: ۹۰

تک علم پہنچانا نہیں بلکہ اخلاق کی عملی تشکیل و تعمیر بھی ہے۔

اس مقصد کی تکمیل میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسی کامیابی سے ہمکنار کیا جس سے کوئی اور ہمکنار نہ ہو سکا۔

چنانچہ مولانا محمد اسحاق سندیلوی لکھتے ہیں کہ:

"سب انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اصل مقصد بعثت ایک ہی تھا یعنی عبد اور معبود کا تعلق استوار کرنا اور یہی کمال انسانیت ہے۔ اس میں سب انبیاء و مرسلین علیہم السلام کامیاب ہوئے لیکن جو کامیابی نبی اکرم ﷺ کو حاصل ہوئی وہ اپنی جگہ بے نظیر و بے مثل ہے۔ آنحضرت ﷺ کے فیضان صحبت سے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی نئی قوم اور امت وجود میں آ گئی جسے اللہ تعالیٰ نے "خیر امۃ" کا خطاب عطا کیا، جس کا ہر فرد ولی کامل اور ولایت عظمیٰ کے ایسے درجے پر فائز تھا جس پر ان کے بعد نہ اب تک کوئی فائز ہو سکا ہے اور نہ قیامت تک کوئی فائز ہو سکتا ہے۔"[۱]

آپ ﷺ کے پیش نظر دو کام تھے ایک اس معاشرے کی اصلاح جو فکری و عملی لحاظ سے بے شمار الجھنوں میں گھرا ہوا تھا۔ دوسرے اس معاشرے کے پسندیدہ افراد کو مجتمع کر کے نئی اجتماعیت کی بنیاد جس میں انفرادی اور اجتماعی طرز عمل مثالی ہو۔

اس پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فریضہ اس طرح انجام دیا کہ لوگوں کی فکری اصلاح کے لیے اسلام کے بنیادی عقائد کی اس طرح تعلیم و تربیت فرمائی کہ عقیدہ کی حقیقت خوب اچھی طرح لوگوں کے قلب و دماغ میں راسخ ہو گئی۔ انسان، کائنات اور کائنات کی ہر چیز کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ اور فکر و شعور تبدیل ہو گیا۔ عقیدہ کی گہری چھاپ ان کے فکر و نظر، تہذیب اخلاق اور اعمال پر بھی نمایاں نظر آنے لگی۔

انسانی معاشرہ کی مستحکم بنیادوں پر تنظیم کے لئے صرف احکام، قوانین کا نفاذ یا عدل کا قیام ہی کافی نہیں بلکہ رعایا کے علمی و فکری معیار کو بہتر بنانا اور انسانی رویہ میں مثبت، تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا بھی ضروری ہے۔ جس سے انسان میں کمال ایمان، خشیت الٰہی، تدبر و تفکر اور صلاح و تقویٰ پیدا ہوتا ہے تاکہ وہ اسلام کے نظام زندگی اور اس کی روشنی میں قائم ہونے والی ریاست کے عمل میں اپنا کردار ادا کر کے ایک مفید شہری ثابت ہو۔

قیام عدل اور بنیادی حقوق کے حوالے سے پالیسی

اسلامی شریعت کی رو سے انسانوں کے مابین کوئی نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنیاد عدل و انصاف اور قول کے احترام پر نہ ہو۔ قرآن مجید نے یہ بتایا کہ ماضی میں جتنی آسمانی شریعتیں اتاری گئیں اور جتنی کتابیں بھیجی گئیں ان سب کا واحد مقصد یہ تھا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں کوئی عالمگیر نظام ظلم کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔

خود اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن مسلمان حکومتوں میں عدل و انصاف اور قانون الٰہی کی بالادستی موجود رہی ان کو نہ صرف دینوی کامیابی ملی بلکہ ان کو صدیوں دنیا کی امامت اور رہنمائی کرنے کا موقع ملا اور جیسے ہی قانون کی بالادستی اور عدل و انصاف میں رکاوٹ پیدا ہوئی ان میں کمزوری اور تباہی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک اولی الامر کا ادائے امانت کے علاوہ دوسرا فریضہ قیام عدل اور حقوق کی ادائیگی ہے۔ وہ عادل حکومت کے لیے جسے وہ السیاسۃ العدلیہ کا نام دیتے ہیں دو بنیادی اصول بتلاتے ہیں۔ اول یہ کہ از روئے انصاف مقدمات کے فیصلے کرنا اور دوم یہ کہ

۱۔ ماہنامہ "الحق" دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور، ۱۷: ۸، جون ۱۹۸۲ء، ص ۳۰

اہل حقوق کا حق ادا کرنا۔

"قد أوجبت أداء الأمانات الى اهلها، والحكم بالعدل فهذان جماع السياسة العادلة، والسياسة الصالحة"[۱]

حاکم میں خصوصاً امانت کی صفت بنیادی اور بہت اہم ہے اس وصف کی عدم موجودگی میں وہ اپنی ذمہ داری کے فرائض بطریق احسن نہیں نبھا سکتا۔

اس ضمن میں حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا

"ما وجدت صلاح ما ولاني الله الا بثلاث. أداء الأمانة والأخذ بالقوة، والحكم بما أنزل الله، الا واني ما وجدت صلاح هذا المال الا بثلاث ان يؤخذ من حق، ويعطى في حق، ويمنع من باطل"[۲]

"میں نے امور خلافت کی اصلاح تین باتوں میں پائی ہے۔ایک تو یہ ہے کہ امانت اہل لوگوں کو سپرد کردی جائے۔ دوسری یہ کہ مستقل کارکردگی ہو جائے اور قرآن مجید کے مطابق فیصلہ ہو جائے اور جو دولت ہے اس کی اصلاح ان تین باتوں میں پائی۔پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا حصول حلال اور جائز طریقے سے ہو۔دوسری یہ کہ اس کا مصرف بھی حلال ہو اور تیسری بات یہ کہ باطل سے پرہیز کیا جائے"۔

اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ نے عوام الناس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"یہ ضروری ہے کہ میں تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک کہ تمہارے خلاف کوئی کاروائی کرنا قانون کی رو سے واجب نہ ہو جائے"۔[۳]

گویا اسلامی ریاست میں کسی فرد کا مقام حقوق و فرائض کی ادائیگی اور عدم ادائیگی کی بنیاد پر متعین ہوتا ہے اور خلافت کا ادارہ ہر دو صورتوں میں اس کے مقام کا خیال رکھے گا۔دوسری طرف یہ حق حکمران کو بھی کسی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے تحت رہنے والے افراد معاشرہ کے ساتھ ان کے مقام سے گرا ہوا سلوک کریں۔

بنیادی حقوق کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بذات خود واضح ہیں:

آج انسان کی اجتماعی زندگی میں ہر سطح پر حقوق کی جو غیر منصفانہ تقسیم اور اس کے خلاف ایک مسلسل معرکہ آرائی نظر آتی ہے اس کا واحد حل یہی ہے کہ اسلام کے عطا کردہ پائیدار اور منصفانہ بنیادی حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں ادا کیا جائے۔اگر حکومت، فرد یا گروہ ان کی خلاف ورزی کرے تو نہ صرف مجرم کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے بلکہ وہ اللہ کے یہاں گناہگار اور دنیا و آخرت میں سزائے الٰہی کا مستحق ہوگا۔جس شخص کو جس حد تک بھی اقتدار حاصل ہے وہ اپنے ماتحت افراد کے حقوق کا محافظ و نگراں ہے۔اس پہلو سے سربراہ مملکت کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔لہٰذا قیام عدم درج ذیل اقدامات کا متقاضی ہے۔

۱۔ السياسة الشرعية، ص ٥

۲۔ حسن، كسروى، ابو عبد الله، موسوعة آثار الصحابة، طبع دار الكتب العلمية، بيروت، بس، ١٧٩/١، رقم ٩٦٤

۳۔ تاريخ الامم والملوك، ٤٤٦/٣

ا۔ شورائی کی حقیقی روح کا قیام

عدل کا تقاضا ہے کہ اسلامی مملکت کے نظام کی بنیاد شوریٰ پر ہو۔ اسلامی مملکت کا سربراہ شوریٰ کی جانب سے مقرر ہوگا اور تقرری کے بعد ملک کے تمام اہم فیصلے اس شوریٰ سے پاس کرنے کے بعد نافذ کرے گا۔

رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ ایک ایسے مکمل نظامِ حیات کی تشکیل و تکمیل تھا جس کی روح شوریٰ ہو۔ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے ہر فیصلے، کام اور حکم پر غور کرتا، اس پر عمل کرتا اور اسے دوسروں کے لیے بیان کرتا اسی لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اسوۂ رسول ﷺ شریعت کا دوسرا بڑا ماخذ و مصدر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے شوریٰ کے بارے میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے طرزِ عمل کی تمام ضروری تفصیلات بیان کی ہیں۔

اس ضمن میں امام بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"وكانت الأئمة بعد النبي ﷺ يستشيرون الأمناء من أهل العلم في الأمور المباحة ليأخذوا بأسهلها فإذا وضح الكتاب أو السنة لم يتعدوه إلى غيره اقتداء بالنبي ﷺ"[1]

نبی کریم ﷺ کے بعد مسلمانوں کے حکمران ان لوگوں سے مشورہ لیا کرتے تھے جو اپنی دیانت و امانت کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہوتے تھے اور جو دین کا علم رکھتے تھے۔ یہ مشاورت مباحات میں ہوتی (غیر منصوص) تاکہ آسان ترین اور مفید ترین کو اختیار کیا جائے۔ جب قرآن یا سنت کا واضح حکم مل جاتا تو پھر یہ حضرات اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے اس کا یہ طرزِ عمل نبی کریم ﷺ کی پیروی کی وجہ سے تھا۔

ائمہ سے مراد خلفاء راشدینؓ اور صحابہ و تابعینؒ ہیں۔ ان کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ اجتماعی امور میں ذاتی رائے کی بجائے شوریٰ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔

عصرِ حاضر میں اصحابِ شوریٰ کے اوصاف سے متعلق ایک ضابطہ اخلاق کا اجراء کیا جائے جس میں امانت کا احساس، عدل اور احساسِ ذمہ داری کا تصور موجود ہو تاکہ یہ مجلس شوریٰ اپنے میں سے اولی الامر کا انتخاب کریں اور وہ اپنے تمام معاملات مشورے سے طے کریں۔ اس طرح شورائیت کی حقیقی روح اجاگر ہوگی اور ملکی معاملات میں عوام الناس کی دلچسپی بڑھے گی۔

مساوات کی حقیقی روح کا قیام

عدل کا لازمی تقاضا اور ضروری مظہر مساوات ہے چنانچہ اسی بناء پر انسانوں کے مختلف گروہوں کے لیے مختلف قوانین کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ قانون کے سامنے تمام انسان مساوی ہیں کسی کو کوئی ترجیحی یا استثنائی مقام حاصل نہیں۔ مساوات عدل کا غایہ ہے اور عدل ماموربہ ہے۔

علامہ صالح طوحی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"المساواة في حق الكرامة الانسانية، فلا يؤذى أحد بسبب لونه، أو جنسه، أو مذهبه، أو عقيدته.

المساوات في حق ابداء الرأي من المسلم وغير مسلم، قال الله تعالى:

﴿قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾[2]

۱۔ جامع صحيح بخاری، كتاب الاعتصام، باب قول الله تعالى وامرهم شورى بينهم، رقم الحديث ۷۳۶۹

۲۔ آل عمران ۳:۶۴

"المساواة في حرمة الدماء والأموال والأعراض"[1]

انسانی شرافت اور عزت کے حق میں مساوات یہ ہے کہ کسی شخص کو رنگ، جنس، مذہب اور عقیدے کی وجہ سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔اظہارِ رائے میں مساوات کو اپنایا جائے خواہ مسلمان ہو یا کافر۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، تو کہہ اے اہل کتاب! تم آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر ہے۔اسی طرح لوگوں کی عزت، مال اور خون کے تحفظ واحترام میں بھی مساوات قائم ہو۔

انسانوں کے درمیان مساوات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب کے ساتھ عدل وانصاف ہو، کوئی بھی شخص ظلم وزیادتی کا ہدف نہ بننے پائے۔انسانوں کے مابین فرق وامتیاز اور ان پر ظلم وزیادتی اللہ کے آتشِ غضب کو بھڑکاتی ہے اور جس قوم کو یہ مرض لگ جائے وہ بالآخر تباہ ہو جاتی ہے۔

عوام کے لیے معاشی سہولیات کی فراہمی

اسلامی ریاست رفاہی ریاست ہے، جو شخص بھی عام حالات میں اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل نہ کر سکے، اسلامی ریاست ان کو پورا کرے۔وہ ہر اس فرد کی کفالت کی ذمہ دار ہے جو نادار اور اپنا معاشی بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہو۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

> "(جب اللہ نے فتوحات کا سلسلہ آپ کے لیے شروع کر دیا) کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ریاست پر ناداروں کی کفالت یا مستحق اور مفلس قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری اس وقت عائد ہوگی جب کہ وہ اس موقف میں ہو۔اس موقف میں ہوتے ہوئے اپنی اس ذمہ داری کو اپنے وسائل کے لحاظ سے پوری طرح یا حسبِ استطاعت وہ ادا نہ کرے تو اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرے گی اور گناہ گار ٹھہرے گی"۔[2]

علامہ اسد کے نزدیک اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریوں میں معاشی تحفظ، معاشی عدل ومساوات کا قیام اور معاشی ترقی کا اہتمام وغیرہ بھی شامل ہے، وہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

> "اسلام ایک ایسے عادلانہ ومساویانہ معاشرے کے قیام کا علمبردار ہے جو اپنے افراد کے لئے صرف روحانی ضرورتوں کا کفیل اور ان کی اخلاقی اصلاح وتربیت ہی کا ذمہ دار نہیں بلکہ ان کی جسمانی واقتصادی ضرورتوں کی تکمیل کا بھی ذمہ دار ہے۔کیونکہ از روئے شریعت ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کے لئے ایسی اقتصادی سہولتیں بہم پہنچائے جو انسانی مسرت وراحت اور عزت ووقار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں"۔[3]

علامہ اسد کی رائے میں جس طرح ایک سربراہ خاندان اخلاقاً اور قانوناً اپنے اہل وعیال کی معاشی کفالت وبہبود کا ذمہ دار ہے بعینہٖ ریاست وحکومت بھی اخلاقاً وقانوناً اپنے شہریوں کی اقتصادی بہبود کی ذمہ دار ہے۔

اس ضمن میں وہ رقمطراز ہیں کہ:

"The government is morally and legally bound to ensure to

۱۔ نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم، ۲۷۹۵/۷

۲۔ ابن حجر، عسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۳ء، ۲۴۵/۵

(3) Asad, Muhammad, principles of state and government in Islam, published by the university of california press. berkeley 1961 PP 86-87

economic well being of the citizens whose affairs it administers, and to see it that no pesson's standard of livingFalls below on equitable level". (1)

اسلامی ریاست اخلاقاً اور قانوناً دونوں اعتبار سے شہریوں کی، کہ جن کے معاملات کا انتظام و انصرام اور دیکھ بھال کا کام اس کے حوالے ہوا ہے، معاشی کفالت و بہبود کی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس امر کا خیال رکھے کہ ریاست کے اندر کسی شخص کا معیار زندگی و معیارِ معیشت منصفانہ و مساویانہ سطح سے نیچے نہ گرنے پائے۔

معیارِ معیشت میں مساوات سے مراد بظاہر معیشت یعنی مکان، لباس اور غذا وغیرہ میں تقریباً برابری ہے۔ مال و دولت میں کمی بیشی کے باوجود افرادِ ریاست کے رہن سہن، بود و باش اور معاشی اوضاع و اطوار میں بڑی حد تک مماثلت موجود ہو چونکہ یہ معاشی مساوات قابل عمل بھی ہیں اور اپنے اندر گوناگوں انفرادی و اجتماعی اور مادی و روحانی فائدے بھی رکھتی ہے۔ لہٰذا اسلام ریاست کو اختیار دیتا ہے کہ وہ پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے عمل کو عادلانہ خطوط پر استوار کرے اور تمام پیداواری شعبوں اور ترقیاتی سکیموں کو اس طرح منظم اور مرتب کرے کہ ترقی کا عمل پر امن طریقہ سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا رہے۔

حکمران کا عوام سے نرم، خیر خواہانہ اور خیر سگالی کا رویہ

راعی اور رعایا کے تعلقات ایک اسلامی مملکت کے لئے اسی وقت بار آور ہو سکتے ہیں جب کہ وہ نیک نیتی، خیر خواہی اور خیر سگالی پر مبنی ہوں۔ یوں تو دین ہی نام ''خیر خواہی'' کا ہے۔ اس لیے رعایا کے لیے نرمی اور خیر خواہی تمام اعمال کی محرک ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے ایک خطبہ میں ان باتوں کو بڑی جامعیت کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ جس میں حکمران اور عوام دونوں کے حقوق و فرائض کی جامع نشان دہی کی گئی ہے۔

ابواسامہ ہذلی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک اور خطبہ میں ارشاد فرمایا

''ایھا الناس ان لنا علیکم حق النصیحة بالغیب والمعونة علی الخیر، ایھا الرعاء انه لیس من حلم أحب الی الله ولا اعم نفعا من حلم امام ورفقه'' ۲

اے لوگو! تمہارے اوپر ہمارا یہ حق ہے کہ تم پیٹھ پیچھے ہماری خیر خواہی کرو اور بھلائی کے کاموں میں ہماری مدد کرو۔ (اس کے بعد حکام سے خطاب کر کے فرمایا) ایک افسر اور حاکم کی بردباری سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی بھی بردباری اور نرمی پسند نہیں ہے اور نہ اس کی بردباری اور نرمی سے زیادہ کسی کی بردباری اور نرمی کا فائدہ وسیع اور عام ہے۔

حضرت علیؓ کا ایک قول بھی اس سلسلے میں منقول ہے جو انہوں نے جزیرہ کے عامل حارث بن اشترؒ کو وصیت فرمایا:

''فاستعن بالله علی ما اھمک، واخلط الشدة باللین والرفق ما کان الرفق ابلغ، واعترم بالشدة

---

(1) *Asad, Muhammad, principles of state and government in Islam, published by the university of california press, berkeley, 1961, PP. 88-87*

۲۔ الفاروق عمرؓ ۱۰۶/۲

حين لا يعني عنك الا الشدة"[۱]

جب بھی تمہیں کوئی مشکل پیش آئے تو اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کرو، اور نرمی کے ساتھ ساتھ سختی بھی کرو اور جب تک نرمی فائدہ دیتی ہو تو نرمی کرو اور جہاں نرمی کا کوئی فائدہ نہ ہو تو وہاں ضرور سختی کرو۔

رفق اور نرمی حاکم کے لئے بہترین صفت ہے۔ البتہ نرمی وہاں کرنی چاہیے جہاں نرمی کرنے میں مصلحت ہو اور جہاں سختی کرنے میں مصلحت ہو وہاں نرمی کی جگہ سختی ہی کی جائے۔

اس ضمن میں محمد الموصلی الشافعی لکھتے ہیں کہ:

"قد ورد الشرع ببيان خصال فيها نظام الملك والدول وهي ثلاثة. اللين وترك الفظاظة والمشاورة، وأن لا يستعمل على الأعمال والولايات راغب فيها، ولا طالب"[۲]

شریعت نے ان خصائل کا ذکر کیا ہے جن سے ریاست اور حکومت کا نظام چلتا ہے وہ تین خصائل ہیں، نرمی کرنا اور سختی چھوڑنا، اہل افراد کے ساتھ مشورہ کرنا، مناصب ان افراد کو نہ دینا جو ان کے ساتھ رغبت رکھیں یا ان کا مطالبہ کریں۔

علامہ طرطوشی فرماتے ہیں کہ:

"وينبغي للسلطان أن لا يتخذ الرعية مالا وقنية فيكون عليهم بلاء وفتنة ولكن يتخذهم اهلا واخوانا فيكونون له جندا او أعوانا"[۳]

بادشاہ اور حاکم کے لئے مناسب نہیں ہے کہ رعایا کو حصول مال کا ذریعہ بنائے تاکہ یہ لوگوں پر مصیبت اور فتنہ نہ بنے بلکہ رعیت کے ساتھ اپنی اولاد اور بھائیوں کی طرح سلوک کرے نتیجہ میں یہ لوگ اس کے فوجی اور معاون ہوں گے۔

فریضہ عدل اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک امیر و مامور کے مابین غیر معمولی اعتماد، تعاون، مخلصانہ تعلقات کی پاکیزگی و شفافیت اور خیر سگالی کے جذبات پروان نہ چڑھیں۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کی منشا ہے کہ ریاست عدل و انصاف، برابری اور انسانی وقار کے اصولوں پر استوار ہو۔ ایسا متوازن اور عادلانہ نظام قائم ہو جس میں ہر فرد، جماعت اور طبقے کے حقوق محفوظ ہوں اور ظلم و ناانصافی کے سد باب کا موثر انتظام ہو۔

عہد جدید میں ایک جمہوری ریاست ہی اسلامی اصولوں کے مطابق سماج کی تشکیل ممکن بنا سکتی ہے۔ جس میں ایک فرد نہ صرف دنیاوی معاملات میں ترقی و خوشحالی کی منزل پا سکتا ہے بلکہ روحانی بلندیوں کو بھی چھو سکتا ہے بشرطیکہ اس جمہوری مملکت میں ہر فرد اسلامی تعلیمات کا گہرا شعور اور ادراک رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر اسلامی جمہوریہ پاکستان آئین کی رو سے تو خالص اسلامی ریاست ہے اور اس کی بنیاد اسلام سے ہم آہنگ نظریہ پر ہے مگر عوام الناس کے حقوق قرآن و سنت کی روشنی میں محفوظ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام علمی و فکری عدم شعور کی بناء پر سیاست کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور حکمران کا صحیح انتخاب نہیں کر پاتے۔

۱۔ الاتابکی، ابو المحاسن، يوسف بن تغري، النجوم الظاهرة، دار لاحياء التراث العربي، بيروت، س-ن، ج ۱، ص ۳۶

۲۔ الموصلي، محمد بن محمد، حسن السلوك الحافظ لدولة الملوك، طبع دار الوطن، اردن، ۱۹۴٦ء، ص ۷۳

۳۔ الطرطوشي، ابوبكر محمد بن محمد، سراج الملوك طبع المكتبة المحمودية التجارية الجامعة الازهر قاهره مصر، ۱۹۳۵ء، ص ۲۰۰

اسلام میں کفالت اجتماعی کا تصور

اسلام نے اپنے فریضہ میں اجتماعی اور اقتصادی ضروریات کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ اس کی بنیاد ہی دو امور پر قائم ہے جن میں عوام کی بھلائی و بہتری اور امن و سلامتی شامل ہیں۔ اسلامی ریاست کا مقصد ہی دراصل اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے غریب عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانا ہے بلکہ اس کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ وہ ہر اس فرد کی کفالت کرے جو وسائل معاش سے محروم ہو اور اس میں اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ ہو۔

علامہ ابو نعیم اصفہانی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"اعلم انه لما صعب على كل احد ان يحصل لنفسه أدنى ما يحتاج اليه الا بمعونة عدة رجال له فلقمة طعام لو عددنا تعب محصليها من الزراع، والطحان، والخباز، وصاع آلاتها لصعب حصره احتاج الناس ان يجتمعوا فرقة فرقة ليتظاهروا ولأجل ذلك قيل 'الانسان مدنى الطبع اى لا يمكنه التفرد عن الجماعة بعيشه بل يفتقر بعضهم الى بعض فى مصالح الدين والدنيا"[1]

جان لو انسان کے لئے یہ مشکل ہے کہ دوسروں کے تعاون کے بغیر اکیلے زندگی کی تمام ضروریات پوری کرے مثلاً انسان کو خوراک کی ضرورت ہے تو ایک لقمہ کے ہاتھ تک لانے والوں کی محنت کو دیکھیں کہ کتنی مشقتوں کے بعد حاصل ہوتا ہے، زمیندار اور کسان کی محنت آخر تک، پھر گندم کی پسائی کی تکلیف، پھر پکانے والے کی تکلیف اور اس تمام کے لیے آلات بنانے والوں کی تکالیف، اگر ہم اس تمام تکالیف کو گننا چاہیں تو بہت مشکل ہے۔ لہٰذا لوگ اس بات کے محتاج ہیں کہ گروہ در گروہ جمع ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے جدائی قبول نہیں کرتا بلکہ انسان اپنی دنیا اور دین کے مصالح میں ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ ریاست میں احسان، مواسات جیسے جذبات کار فرما دیکھنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں افراد کو ضروریات اور آسائشات زندگی حاصل ہوتی ہیں اور ان کی معاشی تنگی دور ہوتی ہے۔

وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"والعمدة فى تحصيلها الرحمة والمودة ورقة القلب، وعدم قسوته مع 'الانقياد لافكار الكلية والنظر فى عواقب الأمور"[2]

اس صفت کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ جذبہ ہمدردی و محبت اور رقت قلب کو عمل میں لایا جائے اور قساوت قلبی اور سنگ دلی سے اجتناب کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اجتماعی امور (افکار کلیہ) کی رعایت اور دور اندیشی بھی پیش نظر ہو۔

آپ فرد اور ریاست کی خوشحالی کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں، وہ اس ضمن میں ایک دقیق وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"جملہ کائنات فی الحقیقت ایک وحدت ہے، اس میں ایک انسان تو انسان صغیر یعنی چھوٹا انسان ہے، اور دوسرا انسانی

۱۔ اصفہانی، ابو نعیم، احمد بن عبد اللہ، الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ، طبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، س ن، ص ۲۶۲

۲۔ حجۃ اللہ البالغۃ، ۱/۱۰۴

معاشرہ یعنی انسان کبیر ہے اور یہ چھوٹا انسان بڑے انسان کا ایک حصہ ہے اور دونوں ایک جسم کی طرح ہیں۔ اگر انسان صغیر نیک اور خوشحال ہے تو سمجھا جائے گا کہ انسان کبیر یعنی انسانیت میں نیکی اور خوشحالی ہے لیکن اگر پوری انسانیت میں ایک بھی انسان بُرا یا بدحال ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ پوری انسانیت کو تکلیف ہے"۔[1]

انسانی زندگی باہمی تعلقات کا مجموعہ ہے اس لئے معاشرہ کے بغیر انسان اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ فردکی تعمیر و ترقی میں ایک صالح اور مضبوط اجتماعیت کا کردار بہت اہم ہے۔ ایک خوشگوار اور مضبوط اجتماعیت میں باہمی اخوت، خیر خواہی اور نظم وضبط اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ باہم مربوط ہیں۔ معاشرہ باہمی اخوت اور خیر خواہی کی بنیاد پر ہی مستحکم ہوتا ہے۔ اسلام نے ہی اس تصور کا اجاگر کیا کہ کائنات کی تمام اشیاء لوگوں کے لئے ہیں اور استحقاق و استفادہ میں سب مساوی ہیں۔

امام ماوردی رحمہ اللہ نے مصائب کی آسانی اور تکالیف کی تخفیف کے لئے یہی نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان اپنے علم کے مطابق یہ سمجھے کہ موجودہ اسباب واشیاء آخر کار فنا ہو جائیں گی اور یہ خوشی کے اسباب جو آج موجود ہیں ایک دن ختم ہو جائیں گے تو پھر اسے اپنی پریشانی میں تسلی محسوس ہوگی اور اس کے رنج والم اور بے صبری میں کمی آئے گی۔

وہ اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"ان يعلم ان النعم زائرة، وانها لا محالة زائلة، وان السرور بها اذا اقبلت مشوب بالحذر من فراقها اذا ادبرت، وانها لا تفرح باقبالها فرحا حتى تعقب بفراقها ترحا فعلى قدر السرور يكون الحزن"۔[2]

ا۔ کفالت اجتماعی کے اصول ومبادی

اسلام آخری اور مکمل دین ہے۔ اس لیے اس نے ہر قسم کے انسانوں کی فطرت کے مطابق ہدایات دی ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کے لئے روحانی اور اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ قانونی اور انتظامی ضابطوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر اسلام میں اخلاقی وقانونی ضابطوں کے درمیان حسین امتزاج پیدا کیا گیا ہے۔ اسلام نے مستحقین یا کمزور افراد کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کا تعلق خود اس کی ذات سے بھی ہے، اجتماع اور ریاست سے بھی ہے۔ دنیا کا ہر آدمی دوسرے کی مدد کا محتاج ہے چاہے کسی بھی طبقہ سے اس کا تعلق کیوں نہ ہو۔ مرض، رنج وغم، معذوری، ضعف، بڑھاپا اور جانی ومالی صدمات سے کون نہیں دوچار ہوتا اور ان سب صورتوں میں کون اخلاقی یا قانونی مدد کا محتاج نہیں ہوتا؟

اسلام نے مستحقین کے مسائل حل کرنے کے لیے ہمہ جہتی اقدام کیا، اسی نے ان کے مسائل کا صحیح اور واضح تصور دیا۔ ان کی حقیقی کمزوریوں کی رعایت کی ان کے اندر عزم وحوصلہ پیدا کیا، انہیں جدوجہد پر ابھارا۔ اس کے ساتھ سماج کو ان کی خدمت کی ترغیب دی اور انہیں قانونی تحفظات عطا کیے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ اسلام جو مکمل اور بلا شرکت غیرے اقتدار سے کم کسی چیز پر راضی نہیں اور جو اپنے ماننے والوں کو دنیا کی تمام

۱۔ شاہ ولی اللہ، احمد دھلوی، البدور البازغة، صدر حیدر آباد، اکیڈمی العربی (مصحح الحیدری، صح لجنت ر د)، ادارہ النشر اکادمیۃ الشاہ ولی اللہ، ۱۹۷۰ء، ص ۶۸، ۶۹

۲۔ ادب الدنیا والدین، ص ۲۶۴

طاقتوں سے کئی گنا زیادہ طاقت ور بنانا چاہتا ہے۔ جو بار بار یاد دہانی کراتا ہے کہ کائنات میں موجود تمام چیزیں تمہارے استعمال کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ لہذا بڑی جانفشانی اور سرتوڑ کوشش سے انہیں حاصل کرو اور اپنی ضروریت کی تکمیل میں لاؤ۔

دین اور دنیا کی کامیابی کا انحصار علم پر ہے علم جس طرح کی ریاضت اور محنت چاہتا ہے اس کا صحیح اندازہ بہتر طریقہ سے وہ اصحاب کر سکتے ہیں جن کی زندگیاں اس مقصد کے پیچھے شمع کی طرح گھلتی رہی ہیں۔ اسلام نے علم کے لئے کی جانے والی کوشش کی اس قدر ہمت افزائی کی ہے کہ اُسے جہاد سے تعبیر کیا ہے۔

شریعت کے اس اصول کو علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"وکل فرض کلفه الله تعالى الانسان فان قدر عليه لزمه وان عجز عن جميعه سقط عنه وان قوى على بعضه وعجز عن بعضه سقط عنه ما عجز عنه ولزمه ما قدر عليه منه سواء اقله او اكثره"[1]

ہر وہ فرض جس کا اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف بنایا ہے اگر اس کے ادا کرنے کی اس میں طاقت ہے تو وہ پورا کا پورا اس پر لازم ہوگا اور اگر وہ اس سے بالکلیہ عاجز ہے تو وہ فرض بھی بالکل ہی اس سے ساقط ہو جائے گا لیکن اگر اس کا کچھ حصہ ادا کر سکتا ہے تو جتنا حصہ نہیں ادا ہو سکتا ہے وہ ساقط ہو جائے گا اور جو حصہ ادا کر سکتا ہے اس کا ادا کرنا اس پر لازم ہو جائے گا۔ چاہے وہ تھوڑا سا حصہ ہو یا بڑا حصہ۔

پوری شریعت کی بنیاد اسی استطاعت اور عدم حرج پر رکھی گئی ہے۔ یہی اصول کمزور کے سلسلہ میں بھی اس نے برتا ہے۔ اس نے بیماری، جسمانی معذوری، سفر کی زحمتوں اور مالی مشکلات وغیرہ کی اپنے تمام احکام میں پوری پوری رعایت کی ہے اور جس کام کو جس حد تک انسان انجام دے سکے اتنی ہی اس پر اس کی ذمہ داری بھی ڈالی ہے اور جہاں جو حکم اس کی طاقت سے باہر ہو اس سے اسے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو شخص اپنی محنت، مشقت اور ذاتی جدوجہد سے غربت، جہالت، مرض اور دوسری کمزوریاں دور کر سکتا ہے اسے ہاتھ پیر توڑ کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قوت عمل اور صلاحیت سے نوازا ہے اس کا اپاہج بن کر زندگی گزارنا بہت بڑا جرم ہے وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہے کہ آدمی محض اپنی سستی، کاہلی اور بے عملی کی وجہ سے ریاست پر بوجھ بن جائے اور دوسرے اسے خوشی یا ناخوشی سے برداشت کرتے رہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ آدمی کسی کا دست نگر رہنے یا کاسہ گدائی لے کر گھومنے کی جگہ محنت و مشقت کے ذریعہ آگے بڑھے اور اللہ نے اسے جو صلاحیت دی ہے اس کا بھرپور استعمال کرے۔ خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسرے کو بھی فائدہ پہنچائے۔

۲۔ صاحب ثروت افراد پر اجتماعی ذمہ داری

ایک مالدار شخص پر جہاں اپنے قریب ترین افراد کے حقوق عائد ہوتے ہیں وہاں اس پر معاشرے کے مستحقین افراد کے حقوق بھی عائد ہوتے ہیں جن سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔ ان دونوں قسم کے حقوق کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ ایک طرف اہل و عیال، عزیزوں اور قرابت داروں کے مطالبات کو پورا کرنا اس پر فرض ہے تو دوسری طرف وہ ان تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جو معاشرے کے جزء ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ کسی معاشرے کا بہترین فرد وہی ہے جو ان دونوں قسم کے تقاضوں کو سامنے رکھے اور ان کے پورا کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔

صاحب ثروت افراد کی احسان مندی یہ ہے کہ وہ محتاجوں، بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کی ضروریات معلوم کریں اور انہیں پورا

---

[1] المحلی لابن حزم، ۱۰/۶۹

کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں اگر وہ اس سے اغماض برتیں گے تو معاشرے میں طرح طرح کی برائیاں جنم لیں گی۔ بہر حال احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے محروم افراد اور طبقات کی اعانت کے لئے انسانی ہمدردی کو ایک ایسا ہمہ گیر اصول قرار دیا ہے، جو ہر صالح انسانی معاشرے میں ہمیشہ سے ایک مسلمہ کلیہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ولما كان انتظام المدينة لا يتم الا بانشاء الفة ومحبة بينهم وكانت الالفة كثيرا ما تفضي الى بذل المحتاج اليه بلابدل او تتوقف عليه انشعبت الهبة والعارية ولا تتم ايضاً الا بمواساة الفقراء انشعبت الصدقة"۔[1]

مملکت کا نظام اس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے درمیان محبت اور الفت پیدا کی جائے، اور عام طور پر الفت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ضرورت کی چیز بلا معاوضہ دوسرے کو دی جائے، چنانچہ اس وجہ سے ہبہ، قرض اور لین دین کی صورتیں پیدا ہوئیں اور اسی طرح فقراء کی ہمدردی کے لئے صدقہ و خیرات کی ضرورت پیش آئی۔

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے۔ اب جو صاحب ثروت افراد اس صفت حمیدہ سے متصف ہوتے ہیں وہ بالعموم ریاست کے پسماندہ اور محتاج افراد کی اعانت اور خدمت کے کاموں میں مددگار بنتے ہیں کیونکہ ان افراد کی ضروریات کی تکمیل اور قیام حیات کے جملہ مصالح انہیں کی ذات سے وابستہ ہیں۔

﴿وَفِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾[2]

اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہی فرمان چند الفاظ کے اضافہ سے سورۃ المعارج میں بیان فرمایا۔

﴿وَالَّذِيْنَ فِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ، لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾[3]

اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور محروم افراد کے لئے مقررہ حق ہے۔

مندرجہ بالا آیات اور اس مضمون کی متعدد دوسری آیتوں میں محروم الوسائل لوگوں کی مالی کفالت کا جو حکم دیا گیا ہے اور یہ ان کا حق قرار دیا گیا ہے جسے ادا نہ کرنے والوں کو عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

یہی تاکیدی حکم حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے مالدار لوگوں پر فقراء کی ضرورت کے مطابق مال دینا فرض کیا ہے۔ فقراء ہرگز مشقت میں نہیں پڑتے جب کہ وہ بھوکے ہوں یا ننگے ہوں مگر ان کے مالداروں کے جرم کی وجہ سے اس تکلیف میں مبتلا ہوتے

۱۔ حجة الله البالغة، ۴۳/۲

۲۔ الذاريات ۵۱: ۱۹

۳۔ المعارج ۷۰: ۲۵

ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے سخت حساب لے گا اور ان کو دردناک عذاب دے گا"۔[1]

اس تصور کی وضاحت آپ ﷺ نے اس طرح بھی فرمائی:

"لو كان لي مثل أحد ذهباً لسرني أن لا تمر علي ثلاث ليال وعندي منه شيء إلا شيئا أرصده لدين"[2]

اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو میری خواہش اس میں ہے کہ تین راتیں گزرنے سے بھی پہلے میرے پاس کچھ نہ بچے سوائے اس قدر مال کے جسے میں ادائیگی قرض کے لیے بچا رکھوں۔

اسی طرح قحط کے زمانے میں عوام الناس کی مشکلات رفع کرنے کے اہتمام کے حوالے سے حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان بھی بڑا معنی خیز ہے جو صاحب ثروت افراد کو ایسے حالات میں ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ آپؓ نے ارشاد فرمایا:

"فو الله لو أن الله لم يفرجها ما تركت أهل بيت من المسلمين لهم سعة إلا أدخلت معهم أعدادهم من الفقراء فلم يكن اثنان يهلكان من الطعام على ما يقيم واحداً"[3]

اللہ کی قسم! اگر قحط رفع نہ ہوتا تو میں کوئی بھی ایسا گھر نہ چھوڑتا جس میں کھانا موجود ہوتا مگر اس کے افراد کے برابر مستحقین اور محتاجین کو اس میں کلیتاً داخل نہ کر دیتا کیونکہ ایک شخص کا کھانا یقیناً دو افراد کو ہلاک ہونے سے بچا لیتا۔

شاہ ولی اللہ اس ضمن میں رقمطراز ہیں کہ:

"ثم لما كان من الناس من يتبع فكراً فاسداً ولا يقيم صلة الرحم كما ينبغي ويعد ما دون الواجب كثيرا مست الحاجة الى ايجاب بعض ذلك عليهم أشاء وا أم أبوا مثل عيادة المريض وفك العاني والعقل واعتاق ما ملكه من ذى رحم و غير ذلك، وأحق هذا الصنف ما استغنى عنه بالاشراف على الموت فانه يجب في مثل ذلك ان يصرف ماله على عينه فيما هو نافع في المعاونات المنزلية او يصرف ماله من بعده في اقاربه"[4]

جب یہ دیکھا جاتا ہے بعض انسانی طبائع برے خیالات اور بے ہودہ افکار کے پیچھے لگی رہتی ہیں اور صلہ رحمی جیسے عمدہ اوصاف کے خلاف بغاوت کرتی ہیں اور بہت سے غیر ضروری کام کرنے پر آمادہ رہتی ہیں تو ایسی حالت میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس قسم کے (خلائق) امور کو ضروری قرار دیا جائے اور لوگوں کے قبول و انکار سے بالاتر ہو کر ان پر لازم کر دیا جائے مثلاً عیادت مریض، مصیبت زدہ (مقروض وغیرہ) کی حکومتی فلاح، دیت (اقرباء پر پڑے ہوئے تاوان کی ادائیگی) اپنے ذی رحم محرم کو غلامی سے نجات دلانا وغیرہ اور اس قسم کے معاونت و نصرت کا سب سے

۱۔ طبرانی، سلیمان بن احمد، المعجم الصغیر، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷ء، ۱/۲۷۵

۲۔ جامع صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب تغلیظ العقوبة لمن لا یؤدی الزکوۃ، رقم الحدیث ۹۹۱

۳۔ جامع صحیح البخاری، کتاب المفرد، باب المواساۃ، رقم الحدیث، ۵٦۲۔ ابن سعد نے حضرت عمرؓ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ "اگر مجھے اتنا مال نہ ملتا، جو لوگوں کی ضرورت پوری کرتا اور لوگوں کی حاجت پوری کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہ ہوتی کہ ہر گھرانے میں اس کے افراد کے برابر دوسرے افراد داخل کر دوں تا کہ وہ سب آدھی آدھی خوراک آپس میں تقسیم کر کے کھائیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بارش برسا دے تو میں ایسا ہی کرتا کیونکہ لوگ آدھا پیٹ کھانا کھانے سے ہلاک نہیں ہوتے۔ (الطبقات الکبریٰ، ۳/۳۱٦)

٤۔ حجة الله البالغة، ۳/٤٦

زیادہ استحقاق اس وقت ہو جاتا ہے جب انسان موت کے کنارے کھڑا اور مال سے بے پرواہ ہو جائے اس لیے کہ اس وقت اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مال کو اپنی ذاتی اور معاشرتی مفید کاموں پر زیادہ سے زیادہ صرف کرے یا پھر اپنی موت کے بعد اپنے اقرباء کے لیے چھوڑ جائے اور اس طرح ان کی اعانت و مدد کرے (بہر حال تقسیم دولت کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے)

اسلام جس قسم کا کفالتی نظام پیش کرتا ہے اس میں اولیت اس بات کو دی گئی ہے کہ اسلامی ریاست کے صاحب ثروت و صولت سے کچھ دولت مختلف ذرائع مثلاً زکوٰۃ، انفاق فی سبیل اللہ، انفاق العفو، وقف، قرض حسنہ، امداد باہمی کے اہم ذرائع یعنی شرکت صنائع، شرکت مفاوضہ، شرکت مضاربت، مزارعت اور مساقات وغیرہ سے ان کی حاجات و ضروریات پوری کرے۔ اسلامی تعلیمات کی اصل روح یہ ہے کہ دولت و ثروت جمع و ذخیرہ اندوزی کے لیے نہیں بلکہ خرچ کرنے کے لئے ہے اور اس کا مصرف ذاتی و انفرادی تعیش کی بجائے اجتماعی ضروریات کی کفالت ہے۔

۳۔ کفالت عامہ کے اجراء و تنفیذ میں ریاست کا کردار:

تیسرے اصول کے تحت اسلام نے کفالت کی ذمہ داری ریاست کو سونپی ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کرے کہ محروم، مسکین، نادار اور بے سہارا افراد اپنی مفلسی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اجتماعی خزانے سے بقدر ضرورت مال حاصل کر سکیں اور ریاست کا کوئی باشندہ بھوکا، پیاسا، ننگا، بے ٹھکانہ اور مرض کی بے علاج حالت میں نہ رہے۔ اس سلسلہ میں امام ابن حزم لکھتے ہیں کہ

"اور ہر ایک بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء و غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مال فے (بیت المال کی آمدنی) اُن غرباء کی معاشی کفالت کو پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے یعنی ان کے فاضل مال سے بہ جبر لے کر فقراء کی ضروریات میں صرف کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔[1]

اسلام درحقیقت ایک فلاحی ریاست کے تصور کا حامل ہے اور اس کے اس تصور کی امتیازی خصوصیت انسانی زندگی کے دنیوی و اخروی دونوں پہلوؤں کی تعمیر و ترقی کا اہتمام ہے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا نظم قائم کرے کہ معاشرہ کا کوئی فرد بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے اور عام شہریوں کو معاشی، معاشرتی و علمی ترقی کے مواقع فراہم ہوں۔

اسوہ رسول ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود بالخصوص دکھی، مصیبت زدہ، مفلوک الحال اور مفلس و محتاج لوگوں کو باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنانا اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن تدبیر کرنا آپ ﷺ کی بعثت کے اعلیٰ مقاصد میں شامل تھے۔ اس اہمیت کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا

"السلطان ولی من لا ولی له"[2]

۱۔ المحلی، ۱۵۶/۶

۲۔ جامع صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الساعی علی المسکین، رقم الحدیث ۵۵۴۸

جس کا کوئی سرپرست نہیں حکومت اس کی سرپرست ہے۔

نبی ﷺ کے بعد جو افراد اسلامی ریاست کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے انہیں اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا۔ اس حقیقت پر خلافت راشدہ کی پوری تاریخ گواہ ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی ذمہ داریاں بتاتے ہوئے ایک خطبہ میں فرمایا:

"ایہا الناس ان اللہ قد کلفنی ان اصرف عنہ الدعاء"[۲]

لوگو! اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں۔

عزالدین ابن عبدالسلام اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ امام ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑنے دے کہ وہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری کرے تاکہ ان کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ رب العالمین سے ان کی تکمیل کے طالب ہوں (حکمرانوں پر) مسلمانوں کے جملہ حقوق کے بیان میں یہ جملہ کتنا جامع اور واضح ہے"۔[۲]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو لکھا:

"بے شک اللہ تعالیٰ نے امیر اور امام کو حکم دیا ہے کہ وہ قوم کے نگہبان اور چرواہے ہوں، اس لیے امیر نہیں بنایا کہ وہ لوگوں کو ٹیکسز کے بوجھ سے دبا دیں"۔[۳]

حضرت علیؓ کے معمولات میں ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:

"یمشی فی الأسواق وحدہ، وھو وال یرشد الضالۃ، ویعین الضعیف ویمر بالبقال والبیع"[۴]

آپؓ اکیلے بازاروں میں جاتے تھے حالانکہ وہ خلیفہ وقت تھے اور جو لوگ اپنی راہ کھو چکے ہوتے ان کی رہنمائی فرماتے۔ ضعیف لوگوں کے ساتھ تعاون فرماتے اور سبزی فروشوں اور تاجروں پر بھی نظر رکھتے۔

ان حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست گوناگوں وسیع ذمہ داریوں کی حامل ہے۔ اب وہ نئے تقاضوں اور نئے رجحانات کی روشنی میں کفالت عامہ کے پروگرام کو وسعت دے اور انہیں اپنے وسائل سے پورا کرے تاکہ عوام کی فلاح وبہبود کا حق بخوبی ادا ہو سکے۔ یہ عمل شریعت کے منشا کی عین تکمیل ہے۔

علامہ جوینی رحمہ اللہ نے سربراہ مملکت پر یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ مفلوک الحال کی اعانت کو اپنی اہم ذمہ داری سمجھے اور کسی صورت میں بھی اس سے دستبردار نہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

"اسلامی علاقہ میں موجود لوگوں کے تحفظ کے لیے اب جو کام باقی رہ گیا ہے وہ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال ہے جو ہلاکت

۱۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء لا نکاح الا لولی، رقم الحدیث: ۱۱۰۱
یہ حدیث مبارکہ عام طور پر نکاح وغیرہ جیسے معاملات کے ضمن میں ذکر کی جاتی ہے لیکن اس کے مفہوم کو امور عامہ تک بھی وسیع کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ عز الدین، عبد العزیز بن عبد السلام، قواعد الاحکام فی مصالح الأنام، مطبعۃ حسینیہ، مصر، ۱۹۳٤ء، ۱/۱٤۸

۳۔ ایضاً

٤۔ البدایۃ والنھایۃ، ۸/٥

کے قریب پہنچ گئے ہوں۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی صوبہ جات کے ذریعہ، حاجت روائی کے نظام اور فاقہ کشوں کی دست گیری کے ذریعہ ہوگی۔ حاجت روائی اور ضرورت مندوں کی ضروریات کی تکمیل کی بڑی اہمیت ہے۔ امام کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کی کفالت اور نگرانی کو اپنی اہم ترین ذمہ داریوں میں شمار کرے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا اپنے سارے سازوسامان سمیت کسی مفلس مسلمان کی تکلیف کے مقابلہ میں ہیچ ہے"۔[1]

ایک اسلامی ریاست میں ان تمام بنیادی لوازمات کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے، جن پر زندگی کے قیام و استحکام کا انحصار ہے۔ ان بنیادی ضروریات میں خوراک، لباس، رہائش، معاش، تعلیم، علاج اور انصاف شامل ہیں۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

ابن آدم کیلئے سوائے ان امور کے کوئی ضروری حق نہیں، رہنے کے لئے گھر، ستر ڈھاپنے کیلئے کپڑا اور ضرورت کی روٹی اور پانی"۔[2]

ابن حزم نے جہاں غریبوں کی کفالت کا ذکر کیا ہے وہاں ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری بھی امراء علاقہ پر عائد کی ہے۔ ان کے نزدیک بھی بنیادی ضروریات حق خوراک، حق لباس اور حق رہائش ہی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

"فیقام لهم بما یاکلون من القوت الذی لا بد منه ومن اللباس للشتاء والصیف بمثل ذلک وبمسکن یکنهم من المطر والصیف والشمس وعیون المارة"[3]

ان کی ضروریات میں زندگی کی بقاء کے لئے ضروری کھانا، سردیوں اور گرمیوں کا لباس اور ایک ایسا گھر (شامل ہے) جوان کو بارش (کے پانی)، گرمی، دھوپ اور گزرنے والوں کی تانک جھانک سے محفوظ رکھے۔

یہ انسان کے مکان کی کم سے کم ضرورت ہے جو ہر انسان کو میسر ہونی چاہیے۔ اصل میں یہ ذمہ داری بحیثیت مجموعی معاشرہ کے تمام ذی استطاعت و اصحاب ثروت پر عائد ہوتی ہے لیکن اگر اصحاب استطاعت اس ذمہ داری سے غافل ہوں یا رضا کارانہ طور پر اس کی انجام دہی ممکن نہ ہو تو ایسے حالات میں ریاست کا حرکت میں آنا اور قوت نافذہ کا استعمال کرنا لازمی ہو جاتا ہے اس لیے کہ ریاست اجتماعی امور کی نگران اور مصالح عامہ کی محافظ ہوتی ہے۔ اب یہ حاکم ریاست کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو نبھانے کیلئے جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔

ابن جوزی نے رعایا کے متعلق حضرت عمرؓ کی ہمہ گیر فکر کو یوں بیان کیا ہے:

"لئن عشت ان شاء الله لاسیرن فی الرعیة حولا، فانی اعلم ان للناس حوائج تقطع عنی، اما هم فلا یصلون الی واما عمالهم فلا یرفعونها الی، فاسیر الی الشام فاقیم بها شهرین، ثم اسیر الی مصر، فاقیم بها شهرین، ثم اسیر الی البحرین، فاقیم بها شهرین، ثم اسیر الی الکوفة، فاقیم بها

۱۔ غیاث الامم فی التیاث الظلم، ص ۲۳۲

۲۔ جامع ترمذی، کتاب الزهد، باب منه الخصال التی لیس لابن آدم حق فی سواها، رقم الحدیث ۲۳٤۱

۳۔ المحلی، ۱۵٦/٦

شهرين، ثم اسير الى البصرة، فاقيم بها شهرين "[1]

اگر زندگی نے مہلت دی اور میرے مولا نے چاہا تو میں پورا سال رعایا میں سفر کر کے گزاروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ لوگوں کو مشکلات مجھ سے روک لیتی ہیں اور وہ مجھ تک نہیں پہنچ پاتے ، ورعمال بھی ان کی (شکایت ومشکلات) کو مجھ تک نہیں پہنچاتے۔ پس میں شام جاؤں گا اور وہاں دو ماہ قیام کروں گا پھر میں مصر جاؤں گا اور وہاں دو ماہ قیام کروں گا اور پھر بحرین جاؤں گا اور وہاں دو ماہ قیام کروں گا پھر دو ماہ کوفہ جا کر ٹھہروں گا اور پھر دو ماہ بصرہ میں قیام کروں گا (تاکہ عوام کے مسائل کو جان سکوں لیکن موت نے آپ کو اس کی مہلت نہ دی۔

عصر حاضر میں ایک اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کے لیے ضروری ہے ایسے ادارے تشکیل دیئے جائیں جو مستحقین افراد اور مختلف امراض میں مبتلا افراد کے لئے مناسب روزگار، دیکھ بھال کا فریضہ سرانجام دیں۔ لیکن یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا، جب تک حکمران وقت خود اس جذبہ واحساس سے سرشار نہ ہو، جیسا جذبہ حضرت عمرؓ میں موجود تھا۔ لہذا ان اداروں کی کارکردگی ایسے ہی حکمران کی متحرک و موثر نگرانی وسرپرستی کی مرہون منت رہے گی۔

۱۔　سیرت عمر بن الخطاب لابن جوزی، ص ۱۲۱

حقوق نسواں کا تحفظ

دنیا کے دوسرے مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے برعکس اسلام نے عورت کے مرتبہ و مقام اور فلاح و بہبود کے لیے خاص اقدامات کیے ہیں، جس کے عملی نفاذ سے عورت کو اس کے تمام حقوق میسر ہوتے ہیں اور اس کے جملہ مسائل احسن طریقے سے حل ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے ہر شعبہ زندگی میں اعتدال اور توازن کو برقرار رکھا ہے، اس نے یہ نہیں کیا عورت کو ایک لونڈی، ایک خادمہ اور ایک مظلوم مخلوق بنا دے اور اس طرح اسے شرف انسانیت سے محروم کر دے، اور نہ ہی اس کی یہ تعلیم ہے کہ عورت کو خاتون خانہ بنانے کی بجائے شمع محفل بنا دیا جائے، اسے اشتہار کی علامت بنا کر ذلیل و رسوا کیا جائے، اور اس کی عفت و عصمت کو بازاروں میں نیلام کیا جائے، اور نہ اسے مردوں کے لیے ایک کھلونے کی حیثیت دی ہے بلکہ اسلام نے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے یہ معتدل راہ اختیار کی ہے کہ عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ دائرہ کار تجویز کیے ہیں جس میں دونوں ہی اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق سرگرم عمل رہیں اور تہذیب و تمدن کے لیے بہتر اور مفید ثابت ہوں۔

بنیادی انسانی حقوق کا تعلق فرد کی ذات سے ہے اور جس معاشرے میں فرد کو یہ حقوق میسر نہیں وہاں اجتماعیت کی صحت مندی کا تصور ممکن نہیں۔

لاسکی کی زبان میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے:

> "We will build rights upon individual personality because ultimately, the welfare of the community is built the happiness of individual".(1)

ہمیں حقوق انفرادی شخصیت کی بنیاد پر فراہم کرنے چاہییں کیونکہ معاشرے کی فلاح و بہبود کا انحصار فرد کی خوشی پر ہے۔

اسلام فرد سے لے کر اجتماعیت کے عروج تک کو سمیٹ لیتا ہے وہ حقوق کی تعلیم دیتا اور ان کی ترغیب کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اسلام نے ایک طرف عورت کو شرف انسانیت سے آراستہ کیا اور حقوق سے نوازا اور دوسری طرف اس کے اخلاق و کردار اور عورت کے ہر روپ، ماں، بیٹی، بہن اور بیوی۔ ہر حیثیت کے لیے احترام پیدا کیا، اور اس کے تمام مسائل حل کیے اور اسے فوز و فلاح کی منزل سے ہمکنار کیا اور آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی یہ صرف اسلام کا عطا کردہ ضابطہ حیات ہے جہاں عورت کو تکریم اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت میسر آسکتی ہے۔

اسلام نے عورتوں کو مخصوص میدانوں میں جو حقوق دیئے ہیں وہ ان کے عملی اقدام کے لیے ریاست کو اس بات کا موجب ٹھہراتا ہے کہ وہ ان کی ادائیگی کو یقینی بنائے اور کسی صورت میں بھی صنف نازک کے حقوق پامال نہ کرے۔

ان بنیادی مباحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ذیل میں عورتوں کے حقوق پر گفتگو کی جائے گی۔

دینی و اخلاقی حقوق

قبل از اسلام جاہلی معاشروں میں عورت ہر قسم کے حق سے محروم تھی، جہاں عورت زندگی کے حق سے ہی محروم ہو، وہاں اس کے پڑھنے لکھنے کے حق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر اسلام نے جہاں عورت کو اعلیٰ و ارفع مقام دیا وہاں اس پر یک احسان یہ بھی فرمایا کہ اسے درس و تدریس اور تعلیم و تربیت میں مردوں کے برابر مکلف قرار دیا۔ چونکہ شریعت اسلامی کے مخاطب مرد اور عورت دونوں ہیں۔ لہذا عورتوں

(1) A Grammar of politics, P-95

کے لیے بھی حصول علم جو ان کو بنیادی دینی اُمور کی تعلیم دے اور احکام اسلامی کے مطابق زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھائے وہ ان کے لیے فرض عین قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ آنحضور ﷺ نے ابتداہی سے تعلیم نسواں کی طرف توجہ دلائی۔ آپ ﷺ نے سورۃ البقرۃ کی آیت کے متعلق فرمایا:

"تم خود بھی اس کو سیکھو اور اپنی خواتین کو بھی سکھاؤ" [۱]

تربیت کے لئے خدمت میں حاضر ہونے والے وفد کو آپ ﷺ تلقین فرماتے۔

"تم اپنے گھروں میں واپس جاؤ، اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہو، ان کو دین کی تعلیم دو اور ان سے احکام دینی پر عمل کراؤ"۔ [۱۰۰]

اس ضمن میں علامہ ابن الحاج رقمطراز ہیں:

"لیت المرأة حقها فی امر دینها من زوجها ورفعته الی الحاکم وطالبته بالتعلیم لامر دینها لان ذلک لها اما بنفسه او بواسطة اذنه لها فی الخروج الی ذلک لوجب علی الحاکم جبره علی ذلک کما یجبره علی حقوقها الدنیویة، اذا ان حقوق الدین آکد و اولی" [۲]

اگر عورت اپنے خاوند سے اپنی دینی تعلیم و تربیت کے حق کا تقاضا کرے اور حاکم کے پاس دعویٰ دائر کردے تو قاضی کے لئے لازم ہے کہ جس طرح وہ اس کے دنیوی حقوق کی پاسبانی کرتا ہے اسی طرح دینی حقوق کی، جو دنیوی حقوق سے اولیٰ اور مؤکد ہیں، حفاظت کرے اور خاوند کو بیوی کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے پر مجبور کرے۔

عورتوں کے لیے اتنی تعلیم لازمی ہے جو بچوں کی پرورش، تربیت اور سیرت سازی میں معاون ثابت ہو۔ کیونکہ وہ معاشرے کا نصف حصہ ہے اور تمدن کی صلاح و فلاح کے لئے ان کی دینی و اخلاقی تربیت از بس ضروری اور ناگزیر ہے۔ اسلامی مملکت کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے اور اس کا مقصد تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ کے مطابق ڈھالنا ہے۔

۲۔ معاشرتی حقوق

اجتماعی سطح پر اسلام نے عورت کو معاشرے کے ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے نوازا ہے۔ اس نے خلیفۃ اللہ ہونے کے ناطے ہر انسان پر اپنی ذات کے مصالح خمسہ اور دوسرے تمام افراد کے مصالح خمسہ یعنی دین و نفس و آبرو اور نسل و مال کی حفاظت کو فرض ٹھہرایا ہے۔ مرد کی طرح ہر عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے ان مصالح کی بھرپور حفاظت کرے اور ریاست سے اس تحفظ کا مطالبہ کرے نیز انہی مصالح خمسہ کی حفاظت کی خاطر اسلام عورت کو بہت سے احکام اور تکالیف شاقہ سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور کئی خصوصی احکام اس پر لاگو کرتا ہے۔ چنانچہ عورت کے تحفظ دین کی خاطر غیر مسلم سے اس کے نکاح کی حرمت اور اہلیت دینی کا اثبات، تحفظ نفس کی خاطر مرد کے برابر حق دفاع نفس، حفاظت عفت و آبرو کی خاطر پردہ و حجاب کے احکام اور حد قذف کا اجراء اور تحفظ عقل و مال کی خاطر اہلیت اجتماعی و اقتصادی کا اثبات اور حریت فکر و تصرف کے علاوہ ذاتی مسئولیت ایسے مبادی مقرر فرمائے گئے ہیں۔

اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس پاکیزہ معاشرہ میں عورت کی حرمت و تقدس کا کس قدر

۱۔ سنن الدارمی، رقم الحدیث ۳۳۹۰

۲۔ ابن الحاج، مذکور، محمد سلام، المدخل بفقه الاسلامی، دار الاحیاء، القاهرة، ۱۹۶۰ء، ۲۷۷/۲

اہتمام تھا:

''مسلمان عورت بنی قینقاع کے بازار میں کسی کام سے گئی۔ نقاب اوڑھے ہوئے تھی، ایک یہودی نے اس کی راہ روک کر استہزاء کیا، پھر اس لعین نے اس خاتون کو بے حجاب کرنے کی کوشش کی تو وہ مدد کو چلائی، فوراً ایک مسلمان دوڑا چلا آیا اور مسلمان عورت کی آبرو و تقدس کے دفاع میں ملعون یہودی کو قتل کر دیا۔''[1]

مدنی ریاست نے عورت کو جو حقوق و مراعات عطا کی تھیں، وہ ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتی تھی اور جہاں کہیں حقوق تلف ہوتے دیکھتی تو ان کے تحفظ کے لئے، پوری جدوجہد کرتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾[2]

''عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے سے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں''۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لیے وہ تمام معاشرتی و عائلی حقوق موجود ہیں، جو عصر حاضر میں ایک اسلامی ریاست کو فراہم کرنے چاہیں۔

عورت کی اہلیت اجتماعی کا اولین مظہر اس کا حق ایجاب ہے کہ ولی اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی نہیں کر سکتا۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''الثیب أحق بنفسها من وليها والبكر تستأذن في نفسها، وإذنها صماتها''[3]

لڑکی اپنے ولی سے اپنی ذات کا زیادہ حق رکھتی ہے اور بکر (کنواری لڑکی) سے اس کی ذات کے بارے میں اجازت لی جائے گی اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے۔

اس موقع پر ابن قیم رحمہ اللہ کی یہ تصریح قابل غور ہے کہ:

''بالغ و عاقل عورت کا ولی، اگر اس کے مال میں، اس کے خلاف منشا تصرف کا مجاز نہیں تو اس کی مرضی کے خلاف اس کی جان (نفس) کسی کے عقد میں کیوں کر دے سکتا ہے''۔[4]

عورت کی اہلیت اجتماعی کا دوسرا بڑا مظہر یہ ہے کہ وہ حالت امن و جنگ میں کسی کافر کو امان دے تو اس کی امان نافذ ہو گی اور ہر مسلمان کے لیے اس کی حفاظت لازمی ہو گی۔ عورت کی امان کا صحیح ہونا رسول اللہ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ایک عام بات تھی۔

۱۔ المدخل للفقه الإسلامي، ۲/۲۷۷

امام غزالی نے بھی ایسا ہی قول بیان کیا ہے کہ مرد پر لازم ہے کہ علم دین عورتوں کو سکھائے گر نہ سکھائے تو باہر جا کر عالم سے پوچھنا عورت پر فرض ہے، اگر امور دین سکھانے میں قصور کرے گا تو مرد خود گنہگار ہوگا۔ (غزالی، ابو حامد محمد، کیمیائے سعادت)

۲۔ البقرة ۲:۲۲۸

۳۔ جامع ترمذي، كتاب النكاح، باب ما جاء في استئمار البكر والثيب، رقم الحديث: ۱۱۰۷

۴۔ زاد المعاد، ۲/٤

ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ:

"ان المرأة تاخذ للقوم يعني تجير على المسلمين"[۱]

عورت پوری قوم کے لیے امان دے سکتی ہے یعنی مسلمانوں کی طرف سے امان دے سکتی ہے۔

پھر مزید برآں یہ کہ عورت اپنے فطری دائرے سے باہر کئی سماجی و معاشرتی مناصب پر فائز ہونے کی اہلیت و استعداد سے بھی بہرہ ور ہے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے شفا بنت عبداللہ عدویہ کو بازار کا نگران مقرر کیا تھا۔ وہ قضاء الحسبہ (Accountability court) اور قضاء سوق (Market Administration) کی ذمہ دار تھیں۔

اس ضمن میں ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

"شفاء بڑی سمجھدار اور باصلاحیت خاتون تھیں۔ حضرت عمرؓ ان کی رائے کو مقدم رکھتے تھے اور پسند فرمایا کرتے تھے اور دوسروں پر فضیلت دیتے تھے"[۲]

ابن الہمام عورت کی اہلیت و استعداد کے تحت لکھتے ہیں:

"ليس في الشرع سوى نقصان عقلها ومعلوم انها لم يصل الى حد سلب وَلَا يتها بالكلية، الا ترى أنها تصلح شاهدة وناظرة في الاوقاف ووصية على اليتامى"[۳]

عورت کا نقصان عقل اس کی ولایت کے بالکلیہ سلب کا سبب نہیں بنتا بلکہ وہ گواہی دینے، ناظر اوقاف بننے اور یتیموں کی وصی بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔

عورت کو شرعی طور پر تمام عقود و معاملات طے کرنے، تملک و اکتساب اور اپنے مملوکات میں ہر جائز تصرف کا حق حاصل ہے اور اس مسئلہ میں اس کی اہلیت شرعی پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جاسکتی اور نہ اس کا شوہر بغیر اس کی اجازت کے اس کے مال میں کوئی تصرف کرسکتا ہے۔

اس طرح یہ پہلو مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ مالی تصرفات کے سلسلہ میں اسلام نے عورت کو کس نظر سے دیکھا ہے۔ چنانچہ عورت اپنی ملک ذاتی (Private Property) رکھ سکتی ہے اور ریاست اس کے اس حق کی محافظ ہوگی۔

دین اسلام جو ایک فطری، عملی اور روزمرہ کا دین ہے لہذا اس نے ان دونوں طبقوں (مطلقہ اور بیواؤں) کی سرپرستی اور ان کی داد رسانی کی ہے، اسلام نے ان کو جو مراعات دی ہیں ان کی عملی شکل عہد نبوی و عہد خلفائے راشدین میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ قمطراز ہیں:

"ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس ایک عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور اس نے کہا کہ ان کا باپ فلاں جنگ میں انتقال کر چکا ہے اور ان کے چچا نے جو کچھ مال تھا سب لے لیا ہے اس نے کچھ بھی ان لڑکیوں کے لیے نہ چھوڑا اور بغیر

۱۔ جامع ترمذی، كتاب السير، باب ما جاء في أمان العبد، رقم الحديث: ۱۵۷۹
یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اگر کوئی عورت مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف بھی کسی کو امان دے دے تو جائز ہے"۔ (سنن ابوداؤد، كتاب الجهاد، باب في أمان المرأة، رقم الحديث: ۲۷٦٤)

۲۔ الاستيعاب لابن عبد البر، ٤/١٨٦١، المحلى لابن حزم، ٩/٤٢٩

۳۔ ابن الهمام، كمال الدين، محمد، فتح القدير، دار احياء التراث العربي، بيروت، لبنان، ١٩٨٦م، ٥/٤٨٦

مال کے ان کے نکاح کا سامان بھی نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے لڑکیوں کے چچا کو بلا کر قرآن کریم کا فیصلہ سنایا کہ دو ثلث لڑکیوں کا ہے۔ ایک ثمن ماں کا اور باقی تمہارا ہے" [۱]

حضرت عمرؓ تمام بیوہ عورتوں کے لئے فکر مند رہتے تھے چنانچہ بیوہ عورتوں کے وجہ معاش اور ان کے سکون خاطر کے لئے انہوں نے فرمایا:

"اما واللہ لئن بقیت لأرامل أهل العراق لأدعهم لا یفتقرون الی امیر بعدی" [۲]

اگر میں زندہ رہا تو کوئی بیوہ اپنی گزران کے لئے کسی کی محتاج نہ رہے گی (اہل عراق کا تذکرہ بطور مثال ہے۔ مقصود میں عموم ہے)

علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں:

ایک مسکین اور خستہ حال عورت حضرت عمرؓ کے پاس آئی اور کہنے لگی امیر المؤمنین مجھے کپڑا دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تمھیں جس موسم میں کپڑے ملتے ہیں یہ وہ موسم نہیں ہے اس نے کہا یہ صحیح ہے لیکن میرے پاس وہ کپڑے نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک کرتہ نکال کر دیا، فرمایا یہ کچھ مرمت طلب ہے اس پر پیوند لگا لینا، گھر میں کام کاج کرنے کے لائق ہے۔ [۳]

ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

جب حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں حضرت غیلان ثقفیؓ نے اپنی چاروں عورتوں کو بیک وقت طلاق دے دی جو بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے عورتوں سے کوئی خاص رغبت بھی نہ تھی۔ طلاق دے کر اپنے مال و جائیداد کو اپنے لڑکوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو ان کو بلا کر سخت ڈانٹا اور فرمایا تم نے سمجھا ہے کہ اب بڑھاپے میں مرنے کا وقت قریب ہے میراث عورتوں کو کیوں ملے؟ تم نے بدنیتی کے ساتھ طلاق دی ہے کہ عورتیں محروم ہو کر رہ جائیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم عورتوں کو اپنے عقد نکاح میں واپس لے آؤ اور ان کو میراث اور ترکہ میں حقدار بناؤ ورنہ میں بزور حکومت ان کو تمہارے مال کا وارث بناؤں گا"۔ [۴]

"جب حبان نے اپنی انصاریہ عورت کو طلاق دے دی اور وہ ان کے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں۔ اسی اثناء میں حبان کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمانؓ نے اسے ان کے ترکہ میں وارث بنایا"۔ [۵]

عصر حاضر میں عورتوں کے حقوق کی نگہداشت اور ان کے حصول کی جدوجہد کرنے والوں میں مختلف ادارے ہیں، اس سے پہلے معاشرہ اور برادری نظام تھا لہذا ان دونوں کی ذمہ داری ہے کہ آگے بڑھ کر ان کے جائز اور شرعی حقوق دلائیں۔ ان حقوق کو اختصار سے بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ نان ونفقہ شرعی اصولوں کے مطابق عورت کو دلائیں۔

۲۔ مہر جو کہ عورت کا حق اور جہیز کا سامان جو عورت اپنے ماں باپ کے گھر سے لے کر آئی وہ عورت کا حق اور اس کی ملکیت ہے، وہ دلائیں۔

۳۔ بیوہ اور مطلقہ کو شوہر فوت ہونے کی صورت میں وراثت کا حصہ دلائیں۔

۴۔ مطلقہ اور بیوہ کے مال و اسباب کا تحفظ دلائیں اور ان کی حفاظت کریں۔

۱۔ کتاب الخراج، ص ۳۷

۲۔ سیرت عمر لابن جوزی، ص ۶۷

۳۔ ابن حجر، عسقلانی، احمد بن علی، الأصابه فی تمییز الصحابة، مطبعة مصطفی، قاهره، ۱۳۲۳ھ، ۴۶۴/۴

۴۔ الاصابة فی تمییز الصحابة، ۱۸۷/۳

۵۔ نووی، ابو زکریا، یحیی بن شرف، تهذیب الاسماء واللغات، دار الکتب العلمیة، بیروت، س ن، ۳۲۹،۲

۵۔ایسی عورتوں کے لیے جن کو شوہر کے گھروں میں یا والدین نزدیک نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ٹھکانہ نہ مل سکے تو دارالامان اور بیوہ گھر قائم کریں جہاں ایک طرف وہ امن سے رہ سکیں اور کوئی ہنر وغیرہ سیکھ کر تعلیم حاصل کریں اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں ، اور نئے سرے سے زندگی گزاریں۔ بصورت دیگر ایسی ہر حاجت مند عورت کی جملہ ضروریات کی کفالت ریاست کے ذمہ ہی ہوگی۔

۳۔سیاسی حقوق

شریعت نے عورت کو جو حقوق عطا کئے ہیں ان میں سیاسی حقوق بھی شامل ہیں۔ ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ان حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لیے عورت کو پوری آزادی فراہم کرے اس سلسلہ میں رسم و رواج وغیرہ قسم کی چیزیں اس کی آزادی اور اس کے حقوق پر اثر انداز نہ ہوں۔

اسلام میں عورت کا کردار صرف خاندان یا معاشرے تک ہی محدود نہیں بلکہ اہلیت کی بنیاد پر عورت کو ریاستی سطح پر بھی اختیار دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں مسلم معاشرے میں ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے مرد و خواتین دونوں کو برابر اہمیت دی گئی ہے۔

ارشاد باری ہے،

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾[1]

''اور اہل ایمان مرد اور اہل ایمان عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں، وہ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بجالاتے ہیں ان لوگوں پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا، بے شک اللہ بڑا غالب اور بڑی حکمت والا ہے''۔

اس آیت مبارکہ میں خواتین اور مردوں کو ایک دوسرے کا اس طرح مددگار ٹھہرایا گیا ہے کہ:

(الف) سماجی و معاشرتی دائرہ میں معروف کے قیام اور منکر کے خاتمے

(ب) مذہبی دائرہ میں اقامت صلوٰۃ

(ج) اقتصادی دائرہ میں نظام زکوٰۃ کے قیام

(د) سیاسی دائرہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی اطاعت کے ذریعہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ تشکیل دیں۔

اسلام کی نظر میں عورت کی اصل ذمہ داری گھر کی نگہداشت اور اولاد کی تربیت ہے لیکن ساتھ ہی اس نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ امت مسلمہ کی بہبود کے پیش نظر بعض انتظامی ذمہ داریاں بھی اس کے حوالہ کی جا سکتی ہیں لیکن یہ استثنائی صورت ہے اور اسی لیے علماء اسلام نے صرف چار صورتوں میں عورتوں کو کام کی اجازت دی ہے۔

اول یہ کہ عورت کسی غیر معمولی صلاحیت کی مالک ہو اور سماجی حالات اس کی خدمت سے استفادہ کے متقاضی ہوں ایسی صورت میں وہ گھر کے محدود دائرہ عمل کو چھوڑ کر پوری امت کے مفاد کے لیے کام کر سکتی ہے۔

دوم یہ کہ عورت ایسے کام کرے جو فطری طور پر اس سے مناسبت رکھتے ہوں، مثلاً بچوں کی تعلیم اور عورتوں کا علاج وغیرہ، اس نوعیت کی خدمات وہ فرض کفایہ کے طور پر انجام دے گی۔

۱۔ التوبۃ ۹: ۷۱

اس ضمن میں امام ابن الہمام نے لکھا ہے کہ:

اگر اس طرح کے فرض کفایہ کے لیے عورت گھر سے باہر نکلنا چاہے تو شوہر کو اسے روکنے کا حق نہیں، لیکن عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ پردے اور اسلامی آداب و اخلاق کے احترام کے ساتھ نکلے"۔[1]

سوم یہ کہ شوہر کا ہاتھ بٹانے کے لیے عورت کام کرے، دیہاتی زندگی میں اس کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے اور جو عورتیں معاشی میدان میں شوہروں کا تعاون کرتی ہیں یقیناً انکا کردار قابل تعریف ہے۔

چہارم یہ کہ عورت کا اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پالنے کے لیے کام کرنا پڑے اور یہ اس وقت جب اس کا کوئی کفیل و ذمہ دار نہ ہو۔

اسی طرح اسلامی معاشرہ کے خصائص میں حریت و آزادی مردوں کی طرح عورتوں کو بھی حاصل ہے۔ان کے استقلال شخصیت کا یہ ایک نمایاں پہلو ہے۔

چنانچہ حریت فکر و رائے کا بھی پہلو ہے جو انہیں اپنی اہلیت ہمہ نوعی کی بنیاد پر ملنے والی تمام دینی تمدنی اور قانونی حقوق و معاملات کے استعمال اور تحفظ کی مکمل ضمانت فراہم کرتا ہے کہ عورت ہر حال میں خارجی تسلط اور دباؤ سے آزاد اور صرف شرعی حدود و مقاصد کی تکمیل کی پابند اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی مکلف ہے۔

آپ ﷺ نے عورتوں کو اس قدر حریت فکر سے نوازا اور ان کی رائے کو بڑے اہم معاملات میں وقعت دی تاکہ خواتین سے مشاورت کی واضح نظیر موجود ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے عطا کردہ زریں جمہوری اصولوں پر خلفائے راشدین بھی کاربند رہے۔حضرت عمر فاروقؓ نے مختلف ریاستی معاملات میں خواتین سے مشاورت کی۔

اس سلسلہ میں جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"ایک رات حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں لوگوں کے مسائل سے آگہی کے لیے گھوم رہے تھے کہ ایک گھر سے آپؓ نے ایک عورت کے اشعار سنے جس میں وہ اپنے شوہر کی جدائی کا ذکر کر رہی تھی۔جس کا شوہر جہاد پر جانے کی وجہ سے کافی عرصہ سے گھر سے دور تھا۔اس معاملہ نے آپؓ کو پریشان کر دیا اور آپؓ نے واپس آتے ہی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ سے اس پر مشاورت کی کہ عورت اپنے شوہر کی کب زیادہ مشتاق ہوتی ہے انہوں نے جواب دیا چھ ماہ پر۔پھر حضرت عمرؓ نے قانون بنایا کہ کوئی لشکری چھ ماہ سے زیادہ باہر نہیں رہ سکتا"۔[2]

علاوہ ازیں اسلامی ریاست میں عورتوں کو جو قانونی حقوق حاصل ہیں اسلام نے انہیں وہ تمام حقوق دیئے ہیں یعنی غربت و امارت اور شرافت و حقارت کی بناء پر قانون ایک عورت اور ایک مرد میں کوئی فرق نہیں کرے گا اور نہ ہی نسل و نسب در پیشہ وغیرہ کی بنیاد پر کسی کو شریف اور کسی کو کمین قرار دیا جائے گا۔نبی اکرمؐ نے یمن کے لیے جو مجموعہ قوانین تیار کرایا تھا اس میں عورت کی قانونی مساوات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

"ان الرجل یقتل بالمراۃ"[3] مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔

اسلام نے وضاحت کی ہے کہ جزا و حدود وغیرہ میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں۔چنانچہ سورۂ نور کی آیت مبارکہ میں مرد اور

۱۔ فتح القدیر ۵/۱۹۰

۲۔ سیرت عمر لابن جوزی، ص ۷۲

۳۔ السنن الکبری، ۸/۳۵۸

عورت دونوں کو سزا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔[1]

اصولی طور پر یہ سمجھنا چاہیے کہ مردوں یا عورتوں کے ساتھ جو احکام مخصوص ہیں انہیں چھوڑ کر بقیہ تمام احکام میں دونوں شریک اور ان کی جزا و سزا کے پابند ہیں۔

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں عورتوں کے بنیادی سیاسی حقوق کو اختصار سے بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ عورت کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہوتا کہ وہ بوقتِ ضرورت حکومت پر تنقید کر سکے اور ہر قسم کے عام ملکی مسائل پر بھی آزادانہ اظہار رائے کر سکے۔

۲۔ عورت کی شخصی آزادی بالکل محفوظ ہو۔ شریعت کی مقررہ پابندیوں کے سوا اور کوئی پابندی اس پر عائد نہ کی جائے۔

۳۔ بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف حاصل کرنے کا انتظام جس طرح مردوں کے لیے ہو اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہو۔

۴۔ ہر عورت کو ریاست کے بڑے سے بڑے حاکم سے درخواست و فریاد کرنے اور اس کی غلطیوں پر تنقید و تنبیہ کرنے کا پورا حق حاصل ہو۔

۵۔ کسی عورت کو اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ کے خلاف کسی بات کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

مندرجہ بالا مباحث سے یہ امر عیاں ہو جاتا ہے کہ اسلام نے دیگر افراد معاشرہ کی طرح خواتین کو بھی عزت، تکریم، وقار اور بنیادی حقوق کی ضمانت دیتے ہوئے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جہاں ہر فرد معاشرے کا ایک فعال حصہ ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست میں خواتین اسلام کے عطا کردہ حقوق کی برکات کے سبب سماجی، معاشرتی، سیاسی اور انتظامی میدانوں میں فعال کردار ادا کرتے ہوئے ریاست کو ارتقاء کی اعلیٰ منازل کی طرف گامزن کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی زندگی میں خواتین کے کردار کا مندرجہ بالا تذکرہ اس کی عملی نظیر پیش کرتا ہے۔

عورت کی مسئولیت و ذمہ داری

تحفظ حقوق نسواں کا لازمی تقاضا اور نتیجہ استقلال مسئولیت اور ذاتی ذمہ داری ہے، یعنی ہر وہ عمل و اختصاص جس کی اہلیت عورت کو حاصل ہے اس کی تکمیل کی ذمہ دار اور نتائج کی جواب دہ بھی وہ خود ہی ہے، اس مسئولیت و جواب دہی میں اس کے شریک کار کے سوا اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ عورت کی مسئولیت متنوع مظاہر رکھتی ہے مثلاً دینی و اخلاقی ذمہ داری (ذاتی تعمیر سیرت) عائلی ذمہ داری (تربیت اولاد، حفاظتِ بیت اور اطاعتِ خاوند) اجتماعی و معاشرتی ذمہ داری (امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تہذیبی مقاصد کی تکمیل) اقتصادی ذمہ داری (جملہ معاشی اعمال و تصرفات کی جوابدہی) اور سیاسی ذمہ داری (سمع و طاعت، اولوالامر کی، ریاست کی ہمدردی و خیر خواہی اور ملکی معاملات میں تعاون) وغیرہ۔ یہ سبھی مظاہر اسلامی ریاست میں عورت کے استقلال شخصیت اور ارفع و اعلیٰ حیثیت کے آئینہ دار ہیں۔ یعنی جب عورت اپنے صحیح مقام پر فائز ہو اور اپنے فطری فرائض ذمہ داری سے ادا کرے تو زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ریاست کو مہذب، قابل اور مخلص افراد بکثرت میسر آئیں گے پھر ان پر خوشحالی اور برکت کے باب کھلتے چلے جائیں گے اور یہ سب کچھ تبھی ہو سکتا ہے جب ہر مرد اور ہر عورت دینی تعلیم سے آراستہ اور اس پر کاربند ہو۔ بصورت دیگر زندگی کی اعلیٰ قدریں قدم قدم پر پامال ہوں گی اور ریاست میں امن و سکون عنقاء ہوتا جائے گا۔ لہٰذا عورت کو اس کا صحیح احترام مناعورت کی صحیح دینی تعلیم اور درست انداز فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

۱۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور ۲:۲۴)

زنا کرانے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

اسلامی ریاست کی شہریت

اردو لفظ "رعایا" جو کہ حدیث میں تلفظ "رعیت" وارد ہے،[1] اپنے مفہوم کے اعتبار سے انتہائی جامع لفظ ہے۔ عصری اصطلاح کے مطابق "شہری" یا "مواطن" کا لفظ ان مفاہیم میں اس کا مترادف ہے۔

شہریت، جدید مفہوم

شہریت ایک ایسا قانونی نظام ہے جس کو ریاست وضع کرتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے قوم کی حیثیت کا تعین ہو اور افراد کے ریاست کے ساتھ تعلق کی نوعیت واضح ہو۔[2]

دائرہ معارف برطانیہ کے مطابق "مواطنہ" ریاست اور شہری کے مابین اس تعلق کا نام ہے جسے اس ملک کا قانون متعین کرتا ہے اور جس کی بناء پر فرد و ریاست کے مابین حقوق و فرائض کا تعین ہوتا ہے۔[3]

"شہریت" اگرچہ مواطنت ہی کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے تاہم اس میں بایں طور وسعت ہے کہ اس کے تحت بیرون ملک بسنے والا شہری کی نگہداشت وحمایت ریاست کے فرائض میں شامل ہوتے ہیں۔

شہریت، شرعی نقطہ نظر:

فقہاء کے ہاں اسلامی ریاست پر دار الاسلام کا اطلاق ہوتا ہے اور ریاست کے شہریوں پر اہل دار الاسلام کا۔ ریاست اور فرد کے درمیان تعلق ایک سیاسی اور قانونی نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہی تعلق فرد و ریاست کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔[4] اور یہی تعلق جدید زبان میں شہریت، جنسیت (Citizenship) کہلاتا ہے۔

غیر مسلم رعایا کی اقسام

۱۔ معاہدین: یہ وہ لوگ ہیں جن کا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ ہو چکا ہو اور اس معاہدے میں فریقین کے فرائض اور ذمہ داریاں (حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے) طے کر لی گئی ہوں۔

۲۔ اہل صلح یا موادعین: یہ وہ لوگ ہیں جن سے کوئی جنگ ہو رہی ہو اور جنگ کے کسی واضح نتیجے پر پہنچنے سے قبل اس کے اختتام سے پہلے ہی ان سے کوئی مستقل یا عارضی مصالحت ہو گئی ہو اور فریقین کے درمیان جنگ بندی ہو گئی ہو۔[5]

۳۔ اہل ذمہ: ذمہ کے اصل لغوی معنی ذمہ داری اور گارنٹی کے ہیں، اور اہل ذمہ سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جن کے تحفظ اور جن کی بقا کی ذمہ داری

۱۔ البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاحکام، باب قول الله تعالیٰ "اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (النساء ۴: ۵۹) رقم الحدیث: ۷۱۳۸

۲۔ جمال الدین، صلاح الدین، نظام الجنسیة فی الشریعة الاسلامیة، دراسة مقارنة (القاهرة) ۲۰۰۱ء، ص ۱۶

(3) Encyclopedia Britannica, Vol.3, P.332

۴۔ فرد اور حاکم کے درمیان حقوق و ذمہ داریوں کا تعلق حدیث میں نہایت وضاحت سے ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے "الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته، فالامام الاعظم الذی علی الناس راع وهو مسئول عن رعیته" (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب، رقم الحدیث: ۷۱۳۸ نیز رقم حدیث: ۷۱۳۷)

۵۔ شرح السیر الکبیر، ۴/۶۱، العلاقات الدولیة فی الاسلام، ص ۵۶، علاوہ ازیں عام مصنفین نے معاہدین اور اہل صلح کو ایک قسم قرار دیا ہے، البتہ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اہل صلح کو معاہدین سے الگ ایک مستقل قسم قرار دیا ہے۔ (خطبات بہاولپور، ص ۲۲۴)

اسلامی ریاست نے اپنے ذمہ لی ہو اور اسلامی حکومت نے اپنی، اللہ اور رسول کی ذمہ داری پر ان سے یہ وعدہ کیا ہو کہ تمہارے جان ومال اور عقیدہ وآبرو سب کچھ یہاں محفوظ ہے۔

اہل ذمہ ہمیشہ سے اسلامی ریاست کی رعایا اور اسلامی معاشرے کا ایک حصہ ہیں وہ ان تمام حقوق سے متمتع ہوتے رہے ہیں جن سے مسلمان متمتع ہوتے رہے ہیں، یعنی تحفظ وحمایت، انصاف، محبت ومودت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی آزادی کی ضمانت یہ سارے حقوق انہیں معمولی مالی ٹیکس کے بدلے میں حاصل تھے جو جزیہ کے نام سے معروف ہے۔[1]

۳۔ مستامنین (مستامن کی جمع) حالت امن میں غیر مسلموں کی آخری قسم جو اسلامی ریاست میں موجود ہوتی یا ہوسکتی ہے وہ مستامن کی ہے۔ مستامن کے لغوی معنی تو امان طلب کرنے والے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مستقل قیام نہ کرنے کی نیت سے اسلامی ریاست میں داخل ہوتے ہیں اور اس وجہ سے انہیں ایک متعین مدت کے لیے وہاں رہائش کی اجازت دی جاتی ہے، جس کی تجدید بھی ہوسکتی ہے۔ قاعدہ یہی ہے کہ وہ مستقل طور پر قیام پذیر نہ ہوں گے ورنہ وہ (مستقل قیام کی صورت میں) مستامن سے ذمی بن جائیں گے اور اسلامی ریاست کی رعایا شمار ہوں گے۔[2]

غیر مسلم رعایا کے حقوق۔ ریاستی اقدامات

اسلام شرف انسانیت کا علمبردار دین ہے۔ ہر فرد سے حسن سلوک کی تعلیم دینے والے دین میں کوئی ایسا اصول یا ضابطہ روا نہیں رکھا گیا جو شرف انسانیت کے منافی ہو۔ دیگر طبقات معاشرہ کی طرح اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو بھی ان تمام حقوق کا مستحق قرار دیا گیا ہے، جن کا ایک مثالی ریاست میں تصور کیا جاسکتا ہے۔ کتاب وسنت میں ان لوگوں کے حقوق وفرائض بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں لیکن ان احکام کی حیثیت عام کلیات کی ہے۔ اسلام دنیا کے ایک وسیع وعریض علاقے پر حکمرانی کرتا رہا ہے ان علاقوں میں مختلف نسلوں اور مختلف ذہنی وفکری پس منظر رکھنے والے لوگ موجود رہے ہیں، اگر ان لوگوں کے حقوق کا موثر اور مناسب بلکہ مستقل بنیادوں پر بندوبست نہ کیا جائے تو امن وامان کا مسئلہ گھمبیر اور پیچیدہ شکل اختیار کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں مملکت غیر مستحکم ہو جاتی ہے۔ ملک میں آباد مختلف مذاہب کے لوگوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو مختلف متحارب گروہوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

شریعت اسلامیہ نے اسلامی ریاست میں رہائش پذیر غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے وجود کی رعایت وصیانت کو فرض قرار دیا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں اسلامی ریاست سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ غیر مسلم رعایا کے حقوق کے نفاذ کے لیے عملی طور پر اقدام کرے۔ ذیل میں عہد نبوی وخلفائے راشدین کی روشنی میں ان کے حقوق کے متعلق حکمت عملی پیش کی جاتی ہے۔

ا۔ جان کا تحفظ

انسان کے وہ بنیادی حقوق جو تمدنی زندگی میں انتہائی ضروری ہیں اور ریاست کا کوئی فرد بھی اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا، ان میں انسانی جان کا تحفظ خون، مال، عزت اور عقل کا تحفظ شامل ہیں۔ اسلام نے انتہائی موثر تعلیمات کے ذریعے اور عملاً جس طرح انسان کے ان

۱۔ کتاب الخراج، ص۳۸، ۱۳۹؛ ابن القیم، الجوزیۃ، محمد بن ابی بکر، احکام اهل الذمة، دار العلم للملایین، بیروت، لبنان، ۱۹۸۳م، ۸۹/۱

۲۔ العلاقات الدولیة فی الاسلام، ص۶۸

تمدنی حقوق کا تحفظ کیا ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر اس سلسلہ میں اس نے مسلم، غیر مسلم ملکی اور غیر ملکی کا کوئی فرق روا نہیں رکھا بلکہ ان حقوق میں دنیا کا ہر فرد اس کی نظر میں برابر ہے۔ اس کی نظر میں یہ سب حقوق اور حرمات معصوم ہیں، کسی شرعی سبب کے بغیر ان کو توڑنا اور پامال کرنا حرام ہے۔ کسی کا خون بہانا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ حق دار اس کا مطالبہ نہ کرے۔ ہاں اگر وہ دوسروں کی جان یا عزت پر کوئی ناحق حملہ کرے تو گویا وہ خود اپنے حقوق کو کھو رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کے روز اپنے خطبہ میں فرمایا:

"ان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا، فی بلدکم هذا، فی شهرکم هذا"[۱]

تمہارے خون، تمہارے اموال، تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارے شہر میں اور تمہارے اس مہینے میں محترم ہے۔

الفاظ کا یہ عموم واضح کرتا ہے کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ اس کی دلیل رسول اللہ کا یہ فرمان بھی ہے:

"من قتل معاهدا له ذمة الله وذمة رسوله، فلا یراح رائحة الجنة وان ریحها لیوجد من مسیرة سبعین عاما"[۲]

جس شخص نے کسی ذمی کو جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ذمہ لیا گیا ہے، قتل کیا اس نے اللہ کے ذمہ کو توڑا اور وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا حالانکہ اس کی خوشبو ستر سال کی دوری سے سونگھی جائے گی۔

اصل قانون کی نظر میں ایک مسلم اور ایک ذمی کی جان میں کوئی فرق نہیں۔ اس مسئلہ میں امام شعبی، امام نخعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ایک ذمی کے قصاص میں ایک مسلم کو قتل کیا جائے گا۔[۳]

ان دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلم کو کسی صورت میں بھی ناحق کوئی تکلیف پہنچانا جائز نہیں ہے نہ اس کی عزت و مال پر دست درازی جائز ہے اور نہ ناحق اس کی جان لی جا سکتی ہے۔

اسی طرح حضرت علیؓ نے غیر مسلموں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرمایا کہ:

"من کان له، ذمتنا، فدمه، کدمنا، ودیته، کدیتنا"[۴]

۱۔ الجامع الصحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حجة الوداع، رقم الحدیث: ٤٤٠٦، الطبقات الکبری، ۱۸۲/۲، السیرة النبویة، ۲۵۰/۲

۲۔ سنن ابن ماجه، کتاب الدیات، باب من قتل معاهدا، رقم الحدیث: ٢٦٨٦

اس بنیادی انسانی حق کی حفاظت کے لیے میثاق مدینہ کی دفعہ ۱۴ میں بھی اقدامات کیے گئے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں "اور کوئی ایمان والا غیر مسلم کی خاطر کسی ایمان والے کو قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی کافر کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا" میثاق کی یہ شق، نئی حالات کے پیش نظر، دی گئی تاکہ خونی غیرت و حمیت کی بناء پر اہل ایمان میں تنازعات کھڑے نہ ہوں اور بقول ڈاکٹر حمید اللہ مسلمانوں کے لیے یہ اصول رکھا گیا کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص پر اصرار نہ کریں اور کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد نہ کریں۔ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ص ۹۰)

۳۔ نیل الاوطار، کتاب الدماء، باب ما جاء لا یقتل المسلم بکافر، ۸/۷

۴۔ شرح مواهب، ۲۰۲/۲

ہم نے یعنی ہماری حکومت نے جن لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے (معلوم ہونا چاہیے کہ اس معاہدہ کے بعد) ان کا خون ہمارے خون کے اور ان کے خون کی قیمت (یعنی دیت) ہمارے خون کی قیمت کے برابر ہو جاتی ہے۔

اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندوں کی جان اور خون کی قیمت جب مسلمانوں کی جان اور خون کی قیمت کے برابر قرار پا چکی تھی تو اسلامی حکمرانوں کے لیے خود ہی سوچیے کہ صحابہ تو صحابہ اپنے اپنے علاقہ کے غیر مسلم باشندوں کو کیا حقارت آمیز نظروں سے بھی وہ دیکھ سکتے تھے۔

۲۔ عزت کا تحفظ

شریعت اسلامیہ کی رو سے اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلم باشندوں کی عزت و آبرو کو وہی حیثیت حاصل ہے جو مسلم باشندوں کی عزت و آبرو کو حاصل ہے۔ زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا، گالی دینا، مارنا پیٹنا یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے، جس طرح مسلمان کے حق میں ناجائز ہے۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اسے وضاحت سے لکھا ہے:

"ویجب کف الاذی عنہ وتحرم غیبتہ کالمسلم"[۱]

اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے۔

اس ضمن میں علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الھجاء لمسلم او ذمی حرام"[۲]

مسلمان یا غیر مسلم باشندے کی ہجو گوئی حرام ہے۔

صرف زندگی ہی کی حد تک احترام کا یہ اصول محدود نہیں ہے بلکہ:

"عظامھم لھا حرمۃ اذا وجدت فی قبورھم کحرمۃ عظام المسلمین، حتی لا تکسر لأن الذی لما حرم ایذاؤہ فی حیاتہ فتجب صیانۃ عظمہ عن الکسر بعد موتہ"[۳]

اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلم باشندوں کی ہڈیوں کا بھی احترام کرنا چاہیے۔ اگر وہ ان کی قبروں میں پائی جائیں۔ ان ہڈیوں کا احترام بالکل اسی طرح کرنا چاہیے جس طرح مسلم باشندوں کی ہڈیوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ غیر مسلم باشندوں کی ہڈیوں کا توڑنا بھی جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست نے ان کے وجود کی ذمہ داری لی ہے اور یہ ذمہ داری جس طرح ان کی زندگی میں ریاست پر عائد ہوتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔

۱۔ نیل الاوطار، ۲۷۲/۳ "جیسا کہ ابن عابدین نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ:

انہ بعقد الذمۃ وجب لہ ما لنا، فاذا حرمت غیبۃ المسلم حرمت غیبتہ، بل قالوا ان ظلم الذمی اشد (رد المحتار علی الدر المختار، ۲۴۴/۳) ان کیلئے وہی کچھ واجب ہے جو ہمارے لئے ہے پس جب کسی مسلمان کی غیبت کرنا حرام ہے، تو ذمی کی غیبت بھی حرام ہے، بلکہ ذمی پر ظلم کرنا زیادہ سخت جرم ہے۔

۲۔ عینی، محمود بن احمد، البنایۃ شرح الھدایۃ، المکتبۃ التجاریۃ، مکۃ المکرمۃ، ۱۴۱۱ھ، ۳۶/۷

۳۔ ابن نجیم، زین الدین، ابراھیم، البحر الرائق، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷م، ۲۱۰/۲

۳۔اموال واملاک کا تحفظ

جس طرح اسلام نے غیر مسلموں کی جان اور خون کا تحفظ کیا ہے، اسی طرح ان کی جائیداد و اموال کے تحفظ کو بھی یقینی بناتا ہے لہٰذا وہ ان کا مال چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹنے، ان کا مال چھیننے والے پر تعزیر عائد کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ان سے قرض لینے والے کے لئے اسے واپس کرنا ضروری قرار دیتا ہے اور واپس کرنے میں لیت ولعل کرنے والے کو سزا دیتا ہے۔ داعی اسلام ﷺ کے متعدد ارشادات موجود ہیں جن میں غیر مسلموں کے اموال پر دست درازی کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

صعصعہ بن معاویہ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ ہم لوگ جب اہل ذمہ کی بستیوں سے گزرتے ہیں تو ان کی چیزوں میں سے کبھی کوئی چیز لے لیتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا، بلا قیمت؟ میں نے کہا ہاں! بلا قیمت۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہم کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں (یعنی معمولی بات ہے) انہوں نے فرمایا۔

"هذا كما قال أهل كتاب ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾[1] انهم اذا ادوا الجزية لم تحل لكم اموالهم الا بطيب انفسهم"[2]

تم نے بھی وہی بات کی ہے جو اہل کتاب دوسروں لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ "امیوں کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے اور وہ اللہ پر جان بوجھ کر بہتان لگاتے ہیں" جب وہ جزیہ ادا کریں تو پھر ان کی رضامندی کے بغیر ان کا مال تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔

اس ضمن میں امام مالک رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ:

لا ينال منهم شيء الا بطيب انفسهم. قيل فالضيافة التي كانت عليهم فقال كان يخفف عنهم بها".[3]

ان سے ان کی مرضی کے بغیر کوئی چیز نہ لی جائے۔ کہا گیا کہ جو ضیافت ان کے ذمہ ہے تو فرمایا کہ وہ بھی کم سے کم ہو۔

یہ بات واضح ہے کہ اسلامی ریاست غیر مسلم رعایا کو ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا مکمل تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اس تحفظ اور حقوق کے معاملے میں اسلامی ریاست ان سے جزیہ وصول کرتی ہے۔ جزیہ کی وصولی میں کسی غیر مسلم پر جبر و ظلم کرنا جائز نہیں۔ غیر مسلم شہریوں سے جزیہ لینے کا مقصد دراصل یہ ہے کہ وہ ریاست کی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے میں تعاون کریں۔

دور جدید میں مسلم ممالک میں کہیں جزیہ کے نام سے غیر مسلم شہریوں پر کوئی ٹیکس نہیں ہے بلکہ شیخ مصطفیٰ سباعی، شیخ یوسف القرضاوی، عبدالکریم زیدان، وھبہ الزحیلی، مصطفیٰ الزحیلی وغیرہ علماء اس کے قائل ہیں کہ آج کی مسلم ریاستوں میں جزیہ نافذ نہیں کیا جائے گا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ شاید اصل وجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک میں غیر مسلم شہریوں پر مختلف قسم کے مساوی ٹیکس نافذ ہیں، جو مسلمانوں پر بھی ہیں، ان ٹیکسوں کو جزیہ کے نام سے موسوم کرنا ضروری نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم شہری جنگوں میں حصہ لیں تو ان سے جزیہ نہیں

۱۔ آل عمران ۳: ۷۵
۲۔ کتاب الأموال، ص ۱۴۹؛ أحکام القرآن لابن العربی، ۱/ ۲۷۷
۳۔ کتاب الأموال، ص ۱۴۹

لیا جائے گا۔ موجودہ زمانے کے مسلم ممالک میں ان کے غیر مسلم شہری قومی دفاع کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے پر تیار ہیں۔
رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اور خلافت راشدہ کے دور میں الگ الگ وقتوں میں مختلف علاقوں سے الگ الگ شرح کے مطابق جزیہ لیا گیا اور اکثر و بیشتر غریبوں، متوسط الحال لوگوں اور اہل ثروت کے لئے اس کی الگ مقدار رکھی گئی۔ نیز جو نہ دے سکے اس کو معاف کیا گیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ زمانے اور حالات کے فرق سے جزیہ کی مقدار حکومت اپنی صواب دید سے طے کر سکتی ہے اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔
چنانچہ امام قرافی رحمہ اللہ قمطراز ہیں کہ:

ان عقد الذمة يوجب حقوقا علينا لهم، لانهم في جوارنا وفي خفارتنا ذمة الله تعالى وذمة رسوله ودين الاسلام، فمن اعتدى عليهم، ولو بكلمة سوء او غيبة في عرض احدهم، او نوع من انواع الاذية او اعان على ذلك فقد ضيع ذمة الله تعالى وذمة رسول ﷺ وذمة الاسلام[۱]

عقد ذمہ ہمارے اوپر ذمیوں کے بہت سے حقوق واجب کر دیتا ہے، کیونکہ وہ ہماری پناہ اور حفاظت میں ہیں، نیز اللہ، اس کے رسول ﷺ اور دین اسلام کی ذمہ داری میں ہیں جس نے ان پر زیادتی کی، خواہ کوئی ناروایات کی یا اس کی غیبت کر کے اس کی عزت کو داغدار کیا یا اسے کسی بھی نوعیت کی اذیت سے دوچار کیا اس کے خلاف کسی کی مدد کی تو یقیناً اس نے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اسلام کی ذمہ داری کو پامال کر دیا۔

یہ تمام روایات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے کس قدر جگر سوزی کے ساتھ غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کیا۔
اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ غیر مسلموں کو ان کے علاقہ میں ان تمام بیرونی دشمنوں سے تحفظ فراہم کرے جو انہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور یہ وہ تمدنی حق ہے جس میں کوتاہی کو اسلام نے برداشت نہیں کیا، کیونکہ غیر مسلموں کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں بلکہ تمام مصائب سے ان کا دفاع کرنا، ان کے تحفظ کی خاطر قتال کرنا اور دشمنوں سے ان کے قیدیوں کو چھڑانا مسلمانوں پر لازم ہے کیونکہ وہ اس کے عوض جزیہ ادا کرتے ہیں۔

۲۔ حق مساوات و عدل

اسلامی مملکت میں غیر مسلم رعایا کو کئی معاملات میں مسلمانوں کے مساوی رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام نے انسانی عزو شرف پر زور دے کر رنگ و نسل، زبان و مذہب یا جائے پیدائش کو اونچ نیچ کی بنیاد بنانے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ ہر ایک کو یکساں حقوق دیے جائیں۔
رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ۔
میثاق مدینہ میں انسانوں کے حق مساوات کی حمایت کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا کہ بلا تفریق مرد و زن اور آزاد و غلام سب کی امان کی یکساں ٹھہرایا گیا یہ اقدام وہاں پہلے سے موجود حالت کے یکسر متضاد تھا۔ اس وقت عرب معاشرہ میں بالعموم انسانوں کے تین طبقات تھے۔

(۱)　آزاد　(۲)　غلام　(۳)　موالی

میثاق نے اس طبقاتی نظام کو یکسر ختم کر دیا اور اعلان کیا کہ اسلامی ریاست کے شہری خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، حقوق و فرائض میں

۱۔　القرافي، شهاب الدين، احمد بن ادريس، الفروق، دار احياء الكتب العربية، القاهرة، ۱۳۴۴ھ، ۳/ ۱۴

مساوی ہیں۔

اس سلسلہ میں میثاق مدینہ کی دفعہ ۱۵ کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں کہ:

"ان ذمة الله واحدة يجير عليهم أدناهم"[1]

اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے ان کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا یعنی کسی عام آدمی کی طرف سے دی گئی امان بھی ایک عقد شرعی ہے جسے بمقتضائے حکم قرآنی "اَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ"[2] "عہد و پیمان پورے کرو" پورا کرنا فرض ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں تعزیرات اور دیوانی قانون دونوں میں مسلمان اور غیر مسلم کا درجہ مساوی تھا۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی ذمی کو بھی دی جائے گی۔[3]

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں ابن شاش جذامی نے شام کے کسی علاقے میں ایک شخص کو قتل کر دیا، معاملہ حضرت عثمانؓ تک پہنچنے پر آپؓ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا صحابہ کرام کی مداخلت پر آپؓ نے ایک ہزار دینار دیت مقرر کی۔[4]

عظیم محدث ابن شہاب زہری مذکورہ واقعہ کی روشنی میں فرماتے ہیں:

ان دية المعاهد في عهد ابي بكر و عمر وعثمان رضي الله عنهم مثل دية الحر المسلم"[5]

بے شک ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے دور میں ذمی کی دیت آزاد مسلمان کی دیت کے برابر تھی اس ضمن میں حضرت علیؓ کا بھی یہی عمل تھا، آپؓ نے فرمایا

"اذا قتل المسلم النصراني قتل به"[6]

اگر کسی مسلمان نے عیسائی کو قتل کیا تو مسلمان (عوضاً) قتل کیا جائے گا۔

دیوانی قانون میں بھی ذمی اور مسلمان کے درمیان کامل مساوات ہے۔

۵۔ اقتصادی اور معاشی آزادی کا حق

غیر مسلم رعایا پر اسلامی حکومت میں کسب معاش کے سلسلہ میں کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت غرضیکہ جو کام بھی وہ کرنا چاہے کر سکتا ہے، بشرطیکہ ان چیزوں کے قریب نہ جائے، جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ وہ جس طرح مسلمانوں کے لئے ممنوع ہیں۔ اسی طرح ان کے لئے بھی ممنوع ہیں۔ مثلاً سودی کاروبار، جو بالآخر اسلامی ریاست کے لئے اجتماعی طور پر ہلاکت کا باعث بنتا ہے یا دیگر اس نوعیت کے کام وغیرہ۔

اس مسئلہ میں علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

۱۔ السیرة النبویة لابن هشام، ۱/۱۲۷۹ مزید مساوات کے اس تصور کی بنیادیں میثاق کی دفعہ ۲۳، ۲۵، ۲۵ب، ۳۵، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۵ اور ۴۷ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

۲۔ المائدة ۵: ۸

۳۔ کتاب الخراج، ص ۱۰۹

۴۔ شافعی، ابو عبد الله، محمد بن ادریس، المسند، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، س-ن، ۱/۳۴۴

۵۔ کتاب الأم، ۷/۳۲۱

۶۔ ایضاً، ص ۳۲۰

"ویضمن المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا اتلفه"[1]

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم فرد کی شراب یا خنزیر کو نقصان پہنچائے گا تو اسے اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ چیزیں وہ مسلمانوں کے شہروں میں نہ لائیں گے اور نہ ہی مسلمانوں کے ہاتھ بیچیں گے۔[2]

پیشوں کے اعتبار سے وہ کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کو اجرت پر ان سے کام کروانے کی کسی قسم کی ممانعت نہیں ہے۔ اسلام میں کسی پیشے کی وجہ سے کسی غیر مسلم سے کسی بھی نوعیت کی کوئی دوری رکھنے کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا، تجارتی معاملات میں جو ٹیکس مسلمان دیتے ہیں وہ ان کو بھی دینا ہوگا۔

۲۔ باہمی تعاون و کفالت کا حق

شریعت اسلامیہ نے از کار رفتہ اور معذور مسلمانوں کی کفالت کے لئے باقاعدہ ایک نظام وضع کیا ہے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسلام مسلم حکومت پر ان کی کفالت کو فرض قرار دیتا ہے، اسلامی بیت المال ان کی کفالت کا ذمہ دار ہوگا اور اگر کوئی حکومت اس حق کی فراہمی میں کوتاہی کی مرتکب ہوگی تو اسلام کی نظر میں وہ مجرم ہے۔

اس ضمن میں امام ابو عبید نے حضرت سعید بن مسیب سے ایک روایت نقل کی ہے:

"ان رسول الله ﷺ تصدق صدقة علی اهل بیت من الیهود فهی تجری علیهم".[3]

رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ایک گھرانہ کو صدقہ دیا اور (حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی) وہ انہیں دیا جاتا ہے۔

عمرو بن میمون، عمرو بن شرحبیل اور مرۃ ہمدانی سے روایت کیا گیا ہے کہ:

"انهم کانوا یعطون الرهبان من صدقة الفطر"[4]

وہ راہبوں کو صدقہ فطر میں سے دیتے تھے۔

خلفاء راشدین اور مسلم حکمرانوں نے غیر مسلموں کے لئے باہمی تعاون اور اجتماعی کفالت کے اس حق کی پاسبانی کا جس طرح حق ادا کیا، تاریخ اسلامی نے اس کی متعدد مثالیں اپنے دامن میں محفوظ کی ہیں۔

آپؓ نے تنگ دست اہل کتاب کو بھی مساکین کے زمرہ میں شامل کر کے انہیں بھی زکوۃ و صدقات کا مستحق ٹھہرایا۔ مزید برآں خالدؓ بن ولید اور اہل حیرہ کے درمیان جو صلح نامہ لکھا گیا تھا، اس کے الفاظ یہ تھے

"فان فتح الله علینا فهم علی ذمتهم، لهم بذلک عهد الله ومیثاقه اشد ما اخذ علی نبی من عهد او میثاق، وعلیهم مثل ذلک لا یخالفوا .. . وعیل من بیت مال المسلمین وعیاله ما اقام بدار الهجرة ودار الاسلام فان خرجوا الی غیر دار الهجرة ودار الاسلام فلیس علی المسلمین النفقة علی عیالهم". [5]

۱۔ الدر المختار، ۲/۲۲۳

۲۔ بدائع الصنائع، ۷/۱۱۳

۳۔ کتاب الأموال، ص ۶۱۳

۴۔ کتاب الأموال، نمبر ۱۹۹۲

۵۔ کتاب الخراج، ص ۱۴۴

اگر اللہ ہمیں فتح یاب کرتا ہے تو ان کو حقوق ذمہ بدستور حاصل رہیں گے اس کی ضمانت ہم اللہ سے کئے ہوئے عہد اور اس پختہ ترین میثاق کے حوالہ سے دیتے ہیں جو اس نے اپنے کسی نبی سے لیا ہے اس کا حوالہ دے کر ہم ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان شرائط کی خلاف ورزی نہ کریں اور اگر ان پر کوئی اور طاقت غالب آجائے تو انہیں اس بات کی آزادی ہوگی کہ اہل ذمہ جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ کریں۔

عملی طور پر اس کی تاریخ اسلامی میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ غیر مسلم رعایا کے معذور افراد کو اسلامی بیت المال سے باقاعدہ وظیفہ ملتا رہا۔ اجتماعی کفالت کے حق اور حقوق عامہ میں اسلامی حکومت کی نگاہ میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے بلکہ وہ برابر کے شہری شمار ہوتے ہیں۔

۸۔ حریت فکر و عقیدہ کا حق

اسلام خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دیتا ہے لیکن دیگر مذاہب کے لوگوں پر اپنے عقائد بدلنے اور اسلام قبول کرنے کے لئے دباؤ نہیں ڈالتا، نہ کسی جبر و اکراہ سے کام لیتا ہے۔ دعوت حق اور جبر و اکراہ بالکل الگ حقیقتیں ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے عہد میں مبلغین کی جماعتیں بھیجی جاتی تھیں، لیکن کسی بھی غیر مسلم کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے دین کو قبول کرے کیونکہ اسلام نے ایسے طریق دعوت سے منع کیا جس سے کسی کی مذہبی آزادی متاثر ہوتی ہو۔

ارشاد ربانی ہے۔

﴿أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾[۱]

کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں۔

اس ضمن میں میثاق مدینہ کی دفعہ ۲۵ غیر مسلم رعایا کو مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"وان یهود بنی عوف امة مع المؤمنین للیهود دینهم وللمسلمین موالیهم وانفسهم الا من ظلم واثم فانه لا یوتغ الا نفسه واهل بیته"[۲]

اور بنی عوف کے یہودی، مومنین کے ساتھ ایک سیاسی وحدت سے تسلیم کئے جاتے ہیں یہودیوں کے لئے ان کا دین اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین، موالی ہوں یا اصل، ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

مزید میثاق مدینہ کی ۲۶ تا ۳۵ تک کی دفعات میں یہ طے پایا کہ تمام قبائل کو اپنے دینی معتقدات میں حریت کا حق دیا جائے اور مذہبی آزادی کے اس تحفظ کو کسی ایک طبقہ کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے بلکہ یہ ضابطہ مقرر کیا گیا کہ

"ریاست مدینہ میں آباد یہود قبائل بشمول بنی نجار، بنی الحارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی اماوس، بنی ثعلبہ، جفنہ، بنی شطبہ، اور ان کے موالی یہودیوں کو بھی وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کو حاصل ہوں گے۔[۳]

آنحضرت ﷺ کے بعد خلفائے راشدین بھی آپ ﷺ ہی کے نقش قدم پر چلے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اہل حیرہ سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں اس بات کی تصریح کی گئی کہ

"ان کی خانقاہیں اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے اور نہ ان کا کوئی ایسا قصر گرایا جائے گا جس میں وہ ضرورت کے

۱۔ یونس ۱۰: ۹۹

۲۔ السیرۃ النبویۃ، ۲/۳۴۸

۳۔ ایضاً، ص ۳۵۰

وقت دشمنوں کے مقابلے میں قلعہ بند ہوتے ہیں۔ ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی اور نہ تہوار کے موقع پر صلیب لٹکانے سے روکا جائے گا۔[1]

اس ضمن میں علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"ولا یمنعون من اظهار شيء مما ذكرنا من بيع الخمر والخنزير والصليب وضرب الناقوس في قرية او موضع ليس من امصار المسلمين ولو كان فيه عدد كثير من أهل الاسلام وانما يكره ذلك في امصار المسلمين وهي التي يقام فيها الجمع والاعياد والاحدود واما اظهار فسق يعتقدون حرمته كالزنا وسائر الفواحش التي هي حرام في دينهم فانهم يمنعون من ذلك سواء كانوا في امصار المسلمين او في امصارهم"[2]

جو بستیاں اور مقامات مسلمانوں کے شہروں میں سے نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو شراب وخنزیر بیچنے اور صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائے گا خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو۔ البتہ یہ افعال مسلمان آبادی کے شہر میں مکروہ ہیں جہاں جمعہ و عیدین اور حدود قائم کی جاتی ہوں۔ رہا وہ فسق جس کی حرمت کے وہ بھی قائل ہیں۔ مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں بھی حرام ہیں تو اس کے اظہار سے ان کو ہر حال میں روکا جائے گا خواہ مسلمانوں کے شہر میں ہوں یا خود ان کے اپنے شہر میں۔

جہاں تک ان کے شعائر دین کی علی الاعلان بجا آوری کا تعلق ہے تو غیر مسلم اپنی بستیوں میں یہ کام کر سکتے ہیں، لیکن ناقوس صرف کلیسوں کے اندر ہی بجایا جانا چاہیے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسلامی ریاست کی حدود عمل میں اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب کی اشاعت اساسی اعتبار سے اولاً ممنوع ہے اور اگر کبھی اس کی جزوی اجازت دی گئی تو کام کراہت کے تحت اور زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے کیا گیا۔ اسلامی تعلیمات کے منافی کسی کام کی اشاعت کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے۔

۸۔ معاہدات کی پاسداری

مسلمان حکمرانوں نے جب بھی غیر مسلم رعایا کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ کیا، وہ ہمیشہ ان کی شرائط کے پابند رہے اور غیر مسلموں کو وہ حقوق دیتے رہے جو کہ معاہدے میں ان سے طے کیے گئے تھے، اس وقت تک ان شرائط کو پورا کرتے رہے جب تک دوسرے فریق نے خود ہی اس کی خلاف ورزی نہ کی۔ قرآن میں بھی ان معاہدوں کی اہمیت کو واضح طور پر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے کیے ہوئے معاہدوں کی پابندی کریں۔

ارشاد باری ہے:

﴿فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾[3]

جب تک دوسرے فریق کے لوگ تمہارے ساتھ عہد پر قائم رہیں تم بھی رہو یقیناً اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔

۱۔ الفاروق عمرؓ، ص ۱۲۴

۲۔ بدائع الصنائع، ۱۱۳/۷؛ شرح السیر الکبیر، ۲۵۱/۳؛ المصنف لابن أبي شيبة، رقم الحديث ۳۲۹۸۲

۳۔ التوبة ۹: ۷

ایک اور آیت مبارکہ میں ہے:

﴿وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾[1]

اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی صلح کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھ کچھ شک نہیں کہ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

ان معاہدات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جصاص لکھتے ہیں:

"وقد كان النبي ﷺ عاهد حين قدم المدينة اصنافا من المشركين منهم النضير، وبنو قينقاع وقريظة وعاهد قبائل من المشركين ثم كانت بينه وبين قريش هدنة الحديبية الى ان نقضت قريش ذلك العهد بقتالها خزاعة حلفاء النبي ﷺ"[2]

مدینہ تشریف لانے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے مختلف انواع کے اہل شرک سے معاہدات فرمائے جن میں بنونضیر، بنوقریظہ، بنو قینقاع اور مشرکین کے بعض دوسرے قبائل تھے پھر آپ کے اور قریش کے مابین حدیبیہ کی صلح بھی ہوئی، یہاں تک کہ قریش نے اس معاہدہ کو آنحضرت ﷺ کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ سے جنگ کر کے توڑ دیا اور اس کی خلاف ورزی کی۔

ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ:

''ان معاہدات میں دستور مدینہ نہایت اہم اور واضح ثبوت ہے۔ جو مدینہ کی اسلامی ریاست میں نبی اکرم، انصار مدینہ، مہاجرین مکہ اور اہل کتاب و مشرکین مدینہ کے مابین قرار پانے والا پہلا بین الاقوامی سیاسی معاہدہ اور دنیا کا اولین تحریری دستور ہے''[3]

عہد صدیقی میں اہل حیرہ سے حضرت خالد بن ولیدؓ نے جو معاہدہ کیا تھا، اس کی دفعات حسب ذیل ہیں

''کسی غیر مسلم کی مسلمانوں کے خلاف اعانت مت کرو، مسلمانوں کی مخالفت نہ کرو، ہمارے دشمن کو ہمارے خفیہ راز مت بتاؤ، اگر وہ ان دفعات کی پابندی نہ کریں گے تو ہماری طرف سے بھی ان کی امان دہی کا معاہدہ ختم ہو جائے گا اور ایفائے عہد کی صورت میں جس میں ادائے ٹیکس (جزیہ) بھی شامل ہے۔ ہم ان کی کسی بھی وقت امانت اور حمایت میں سبقت کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔''[4]

حضرت عمرؓ نے آذربائیجان کے غیر مسلموں کو اسلامی ریاست کے حقوق عطا کرنے کے لئے جو معاہدہ کیا، اس کا متن یہ ہے کہ

"هذا ما اعطى عتبة بن فرقد عامل عمر بن الخطاب امير المؤمنين آذربائيجان سهلها وجبلها وحواشيها واهل مللها كلهم الامان على انفسهم واموالهم وشرائعهم على ان يؤدوا الجزية على قدر طاقتهم... ومن حشر منهم في سنة وضع عنه جزاء تلك السنة"[5]

یہ وہ صلح نامہ ہے جو عتبہ بن فرقد جو امیر المؤمنین عمر بن خطاب کے نائب ہیں، نے آذربائیجان کے باشندوں کے ساتھ طے کیا کہ اس کے میدانی اور پہاڑی علاقوں میں اور بیرونی حدود کے ساتھ رہنے والے سب لوگوں کو امان دی جاتی ہے۔ ان کی جانوں، مالوں، ان کے

۱۔ الانفال ۸: ۶۱

۲۔ الجصاص، ابوبکر، احمد بن علی، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، س ن، ۱۹۸۵ء، ۳/ ۶۹

۳۔ عہد نبوی ﷺ کا نظام حکمرانی، ص ۸۷، ۹۹

۴۔ کتاب الخراج، ص ۱۵۵

۵۔ تاریخ الامم والملوک، ۵/ ۲۵۰

مذہبی احکام کو اس شرط پر کہ وہ جزیہ ادا کریں گے اپنی استطاعت کے مطابق اور ان میں سے جو شخص مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوگا اس سال کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔

دوران فتوحات غیر مسلم رعایا سے جو معاہدات ہوئے ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کے تحفظ، سلامتی اور بنیادی ضروریات کی حکومت ذمہ دار ہوگی اور اسے ہر حال میں پورا کرنے کی پابند ہوگی۔

جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے غیر مسلم رعایا سے معاہدات کے ذیل میں مشہور تابعی میمون بن مہران کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''تین باتوں میں مسلم اور غیر مسلم کوئی ہو، سب برابر ہیں، ایک تو معاہدے کے معاملے میں کہ اس کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے خواہ مسلمانوں سے کیا جائے یا غیر مسلموں سے، اسی طرح رشتہ داری (صلہ رحمی) کے حقوق مسلم اور غیر مسلم کی خصوصیت نہیں، تیسرا مسئلہ امانت کا ہے کہ مسلم کا امانت ہو یا غیر مسلم کی، خیانت حرام ہے [1]

غیر مسلموں کے حقوق کے بارے میں قرآن وسنت کی عطا کی گئی تعلیمات اور عہد نبوی ﷺ و خلفائے راشدین میں ان کے حقوق کے احترام و تحفظ کے ان روشن نظائر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو وہ تحفظ اور حقوق حاصل ہیں جن کا تصور ایسے کسی بھی دستور میں نہیں کیا جا سکتا جو انسان کا تخلیق کردہ ہے۔

معروف مستشرق واٹ اس کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

"The Christian inhabitants of Egypt and the fertile cresent were probably better off as Dhimmis under Muslim Arab rulers than they had been under Byzantine Greeks" (2)

عربوں کے دور اقتدار میں مصر کے عیسائی باشندے اپنے آپ کو بطور ذمی، یونانی بازنطینی حکمرانوں کی رعیت میں رہنے سے زیادہ محفوظ اور بہتر سمجھتے تھے۔

پروفیسر آرنلڈ نے بھی کھلے دل سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ

''مسلمانوں نے غیر مذہب والوں کو ہر جگہ مذہبی آزادی دی ہے، کس کس جگہ عیسائی اقلیت میں اور مسلمانوں کے زیر دست تھے جنہیں بڑی آسانی سے بزور بازو مسلمان بنایا جا سکتا تھا مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا اگر کسی جگہ بادشاہوں نے اس کا ارادہ بھی کیا تو مسلمان مفتیوں نے اس کو اس ارادے سے باز رکھا ہے'' [3]

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام میں اہل ذمہ کے حقوق کی عظمت کو واضح کیا جائے اور مسلم عوام اور قائدین کے ذہنوں میں یہ

۱۔ سیوطی، جلال الدین، عبد الرحمن، الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، الطبعۃ الأولی، ۲۰۰۰ء، ۳۶۸/۴

(2) watt.Montgomery watt, Islamic Political Thought, Aldine publisheng company, chicago, 1968, P-51

(3) Arnold, Sir, Thomos, The preaching of Islam, Publishing constable company Ltd London, 1913, P 449-48

شعور بیدار کیا جائے کہ غیر مسلم رعایا کے مذکورہ حقوق میں کوئی کمی کرنا یا ان کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے کسی ضروری حکم کی خلاف ورزی کرنا انتہائی بھاری جرم ہے۔

مملکت اسلامیہ میں رعایا کے حقوق برابر ہوتے ہیں۔ مسلم و غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ بجز کلیدی مناصب کے جن کا تعلق پالیسی کے تعین سے ہو یا وہ پالیسی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہوں یا جن سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لئے اسلام اور اسلامی قوانین کے علم و تفقہ کی ضرورت ہو۔ اسلامی مملکت ہونے کی بناء پر یہ ضروری ہے کہ ان عہدوں پر مسلمان ہی فائز ہوں تاکہ وہ انتظامی پالیسیوں کو قرآن و سنت کے احکامات کی روشنی میں نافذ کریں۔ علاوہ ازیں اسلامی حکومت غیر مسلموں کے قوانین شریعت اور طریق زندگی میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔

حکمت عملی کے نتائج واثرات ______ ایک جائزہ

اسلامی ریاست انسان کے انفرادی، اجتماعی، معاشرتی، معاشی اور قانونی شعبوں میں اور پھر قولی، عملی، مالی، سیاسی، قضائی اور اداری امور حتی کہ دشمنوں کے ساتھ معاملے میں بھی عدل کو چاہنے والی ہے۔ اور اس نے عدل کے بنیادی اصول بھی لوگوں کے لئے واضح کئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ نظام حیات انسانی کے لیے، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک ایسا بے مثل قانون ہے جو نفسیاتی اور معنوی طاقت رکھنے والا ہے۔ یہ حقوق بشریہ کا محافظ و نگہبان ہے۔ اس کو معمول بنانے سے انسانی اداروں کو فائدہ اور عروج حاصل ہوگا۔

عدل قانونِ الٰہی کے ساتھ تلازم رکھتا ہے اور یہ اس سے الگ نہیں ہے۔ اس کا یہ تلازم قرآن کریم، رسول اللہ ﷺ کی قولی و فعلی احادیث، صحابہ کرامؓ کے قولی و عملی تعامل، امت کے اجماع، شرعی قواعد اور عقلی دلائل سے ثابت ہے۔

اسلام نے انصاف کو یقینی بنانے کے لئے اسے ریاست کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ ہر فرد کو بلا امتیاز رنگ و نسل انصاف حاصل کرنے کا استحقاق حاصل ہے کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں۔ اسی لیے نفاذِ عدل کو عبادت اور تقویٰ کا درجہ دیا گیا ہے جو شخص قضاء کے منصب پر فائز ہو اگر دانستہ یا نادانستہ ناانصافی کرے تو وہ مجرم قرار پائے گا، گویا اصول اور فلسفہ کی حد تک اسلام انصاف کو تمام امور پر فضیلت دیتا ہے۔

عدل وانصاف کے اعلیٰ وارفع معیار کو قائم رکھنے کے لئے طاقت ور کے مقابلہ میں کمزور کی مدد اور حفاظت کی جائے، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جرائم کو روکے، مظلومین کو حقوق دلائے اور مفسدین کو سزا دے۔ اسلام خدا کی حکومت زمین پر قائم کرنا چاہتا ہے اور انسان پر انسان کے ظلم کو روکتا ہے اور انسانوں کے ساتھ دشمنی کو ختم کرتا ہے۔ عوام الناس کی فلاح کے لئے انصاف انتہائی ضروری ہے اور اسلامی ریاست کی سالمیت اور بقاء کا دارومدار اسی پر ہے۔ اس لئے عوام الناس کی روحانی اور علمی و فکری اساس کو اجاگر کئے بغیر ریاست کا استحکام ناممکن ہے چنانچہ ریاست کے امور میں ایک فعال علمی و فکری تحریک کا اجراء ہی اس کی بقاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ضمانت مہیا کر سکتا ہے۔ اس طرح حقوق کی ادائیگی کا خودکار عمل ریاست میں شروع ہوگا جس سے ریاست خوشحال ہوگی۔

اسلام نے مفلوک الحال افراد کی فلاح و بہبود کا ہمہ گیر تصور دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا، ان کی تمام پالیسیاں عوامی فلاح و بہبود اور رفاہ عامہ کا شاہکار تھیں۔ وہ ایسے نئے نئے ذرائع اور طریقے تلاش کرتے رہتے تھے جن سے یہ عظیم مقاصد حاصل ہو سکیں۔

اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ دولت کسی خاص طبقہ یا چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ جائے بلکہ وسیع پیمانے پر دولت کی گردش ضروری ہے تاکہ امیر و غریب کے درمیان تفاوت کو جس حد تک فطری طور پر ممکن ہو کم کیا جا سکے۔

دولت کی نامنصفانہ تقسیم ہی کے زیر اثر ایک محدود طبقہ ملکی وسائل پر قابض ہو کر اس کے برگ و بار سے مستفید ہوتا ہے اور یہی طبقہ پھر دولت کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے۔ غربت و افلاس کے خاتمہ اور معاشی خوشحالی کو عام کرنے کی بجائے دولت کے بہاؤ کا رخ اپنی طرف موڑ دیتا ہے جس کے نتیجہ میں عوام غربت اور مہنگائی کے شکنجے میں پھنس کر رہ جاتے ہیں، اس لئے اس ناہمواری کے خاتمہ کے لئے دو اقدامات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک سود کا خاتمہ اور دوسرا نظام زکوٰۃ کا حقیقی نفاذ، معیشت کی اصلاح میں دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ سود کے خاتمہ سے سرمایہ دارانہ ذہنیت اور اقتصادی شعبے میں استحصال کا خاتمہ ہوگا اور زکوٰۃ سے دولت کی تقسیم کے نظام میں انقلاب آئے گا۔ ملکی پیداوار میں اضافہ ہوگا

اوران اقدامات سے حقیقی معنوں میں عوام کی خوشحالی اور سماجی انصاف کی بنیاد رکھی جاسکے گی۔

اسلامی ریاست مستحقین افراد کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں جو مثبت حکمتِ عملی اختیار کرے گی، اس کے مقاصد کا حصول اس صورت میں ممکن ہوگا کہ مستحقین کی بنیادی معاشی ضروریات کی تکمیل ہو یعنی ضرورت مندوں اور معذوروں کو حکومتی سطح پر امداد ملے جس سے دولت کی منصفانہ تقسیم ہو۔ امیر و غریب کا فرق کم ہو اور ہر شخص عزت و وقار کے ساتھ اپنی ضروریات زندگی بآسانی پوری کر سکے۔

اسلام میں، جمہوری نظام حکومت ایک لازمی امر ہے جس میں لوگوں کے حقوق کی حفاظت، حکومت کا اولین فریضہ ہے۔ اس طرح ایک اور پہلو سے اسلامی جمہوریت کو خاص اہمیت دی جارہی ہے، وہ عورتوں کے حقوق سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام نے (اپنی حدود کے اندر) عورت کو معاشی جدو جہد کی اجازت دی ہے، وہ اسے تعلیم میں آگے بڑھانا چاہتا ہے، اسے دعوت و تبلیغ، نشر و اشاعت، تنقید و احتساب اور سیاسی و سماجی خدمات کا اہم حق پہنچاتا ہے۔ وہ اس کی مستقل شخصیت کا اعتراف کرتا ہے، اور اسلامی ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اس کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی مکمل ضمانت دے، اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حقوق میں ہمدردی اور تعاون جیسی صفات پیدا کرے تاکہ وہ بوقت ضرورت ایک متعین دائرہ کار میں اپنی تعلیمی، علمی اور فلاحی سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عورت کو نہ تو قیدی اور مملوک بناتا ہے کہ اس کے اختیارات ہی نہ ہوں، اور نہ اسے بے لگام آزادی دیتا ہے، جس سے دین و اخلاق کی قدریں مجروح اور معاشرے کا اجتماعی سکون غارت ہو۔ اسلام اس کے لئے دائرہ کار متعین کرتا ہے تاکہ وہ اصل کام کر سکے جو کہ اچھا خاندانی نظام ہے، جس کے نتیجے میں اچھا معاشرہ اور اچھا شہری نظام تشکیل پائے گا۔ مرد اپنی حدود پہچانے گا اور عورت اپنے اعمال کا تعین کرے گی، اس دوہری ذمہ داری سے اسلامی مملکت پرسکون، باوقار اور مستحکم ہوگی۔

اسلامی ریاست قوم پرستی سے پاک ہوتی ہے اور اس میں غیر مسلموں کو تمام حقوق مسلمانوں کی طرح حاصل ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست غیر مسلموں کو ایک مخصوص دائرہ عمل میں آزادی دیتی ہے۔ اگر وہ شرعی حدود کو بالائے طاق رکھ کر بے جا آزادی دینے کا دعویٰ کرے تو دینی شعار غیر مسلموں کو خواہشات اور ان کے تیار کردہ سانچوں میں ڈھلتی چلی جائیں گی یہاں تک کہ وہ اپنا تشخص بھی کھو بیٹھیں گی جیسا کہ لادینیت اور سیکولرازم کی وبا سے ہوا۔ اس کی آڑ میں دینی غیرت و حمیت کا خاتمہ، کفر و شرک کی خباثت اور نجاست کا عام ہونا، شرک و بدعت کا رواج اور الحاد کا فروغ پاجانا، یہ ایسے مہلک عناصر ثابت ہوئے جو دین اسلام کی اصل تصویر کو ختم کرنے کے درپے تھے۔

اسلام بنیادی طور پر امن کا داعی ہے اور کسی مملکت میں امن صحیح طور پر صرف اس وقت قائم ہوسکتا ہے جب کہ اس کے تمام باشندے بلالحاظ مذہب وملت یہ محسوس کرتے ہوں کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں۔ عصر حاضر کی ہر مسلم مملکت کے صاحب فکر لوگوں میں اس مسئلے کو، اسلامی جمہوریت کے ایک اہم پہلو کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان میں اس بات کی تحریک موجود ہے کہ غیر مسلم کے حقوق کی حفاظت اسلامی جمہوری اصولوں کی بنیاد پر رکھی جائے۔

اسلامی ریاست کے ایجابی پہلو کے اثرات اسی صورت میں سودمند ثابت ہوں گے جب اسلام کی اعلیٰ وارفع، خلاقی، روحانی، سماجی اور اقتصادی اقدار کو نافذ کیا جائے۔ جس سے ایک ایسی منصفانہ ریاست کی تشکیل ہوگی جو انسانی مساوات، احترام آدمیت، شخصی آزادی اور قانون کی نظر میں برابری کی علمبردار ہو تاکہ ریاست کے افراد اجتماعی مفادات اور تقاضوں کی حدود میں رہتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کریں۔ اس طرح ایک متوازن، جمہوری، روشن ضمیر، عادلانہ اور فلاحی معاشرہ قائم ہوگا۔

باب پنجم

داخلہ پالیسی کے سلبی پہلو

فصل اول: بدامنی اور لاقانونیت کے انسداد کے لئے حکمت عملی

فصل دوم: معاشی عدم استحکام اور مالیاتی بدعنوانیوں کا انسداد

فصل سوم: عمال حکومت کی نگرانی و احتساب

بدامنی اور لاقانونیت کے انسداد کیلئے حکمت عملی

اسلام کی وہ تمام تعلیمات جو فرد کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں رہنمائی کرتی ہیں، درحقیقت ارض اللہ کو اس بدامنی اور فتنہ وفساد سے محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا یہ ربانی نظام دراصل اس لیے وضع کیا گیا ہے کہ ان خطرات اور خدشات سے مامون ہو کر اسلامی ریاست کی حدود میں بسنے والے افراد پورے اطمینان اور سکون سے اپنی زندگی کے اصل مقصد یعنی عبودیت کے فرائض بطریق احسن انجام دے سکیں اور ان کی زندگیوں اور ان کی صلاحیتیں اپنے ابنائے جنس اور ابنائے وطن کی بہتری کے کام آسکیں اور اس طرح ایک ایسی ریاست وجود میں آسکے جو ساری دنیا کے لئے مثالی ہو۔

امن کی ایک فلاحی مملکت میں بنیادی حیثیت ہے۔ وہ برائیاں جو مملکت کی رعایا کو برباد کرتی ہیں اور ان کے امن و امان کو تہ و بالا کرتی ہیں مثلاً چوری، ڈاکہ زنی، جدال وقتال، شراب نوشی، جوابازی، سود خوری، ظلم و تعدی وغیرہ، اسلام ان سب کا سد باب کرتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے ایسے قوانین نافذ کئے کہ ان کا راستہ مسدود اور ان کے ذرائع معدوم ہو گئے۔

بدامنی کا معنی و مفہوم

لفظ امن جس کا مادہ (ا۔م۔ن) ہے، یہ لفظ بنیادی طور پر عربی زبان سے مشتق ہے۔ ہر ماہر لغت نے امن کے معنی اپنے انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔

صاحب لسان العرب لکھتے ہیں کہ:

"الامن. ضد الخوف، امن بنیادی طور پر خوف کی ضد ہے یعنی جہاں خوف نہیں ہو گا وہاں امن ہو گا۔ امن، امان اور امانت کا حقیقت ایمان سے گہرا تعلق ہے"[1]

امن کی تعریف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں یوں ہے کہ:

"Freedom from war and hostilities, a state or relation of concored and amity.

In International law, that condition of a nat on not at war with another.(2)

جنگ اور مخاصمت سے آزادی، مفاہمت یا دوستی کا تعلق یا حالت۔ بین الاقوامی قانون میں کسی قوم کا دوسری قوم کے ساتھ حالت جنگ میں نہ ہونا امن کہلاتا ہے۔

اس میں آسودگی قلب، داخلی اطمینان و سکون، انتشار اور پریشانیوں سے نجات شامل ہے۔ معاشرتی اعتبار سے باہمی تعاون واشتراک، سازگاری کی عمومی فضا، حقوق و فرائض کی متوازن ادائیگی اور معاشرت میں حسن و خوبی امن کے مفہوم میں شامل ہے۔ بین الاقوامی سطح پر قوموں کا باہمی جھگڑوں اور مناقشت سے پرہیز امن ہے۔

امن کی ضد بدامنی یعنی فتنہ، جھگڑے اور لڑائی کو جنم دیتا ہے۔ پر امن حالات میں اس طرح انتشار اور بگاڑ برپا کرنا کہ بے سکونی اور بدامنی کو فروغ حاصل ہو۔ فتنہ جھگڑے اور عذاب لوگوں کے مابین قتال کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ لسان العرب میں ہے:

---

1. لسان العرب، بذیل مادہ امن

(2) Encyclopedia Britanic (U.S.A), V-17, P.142

"والفتنة.. والفضيحة والفتنة. العذاب والفتنة. ما يقع بين الناس من القتال" [1]

ایک طرف تو فتنہ کا اطلاق ہر قسم کے امتحان وابتلاء پر ہوتا ہے تو دوسری طرف خصوصاً شرعی قانون سے بغاوت بھی اس کے اصطلاحی مفہوم میں شامل ہے۔ جس میں کمزور ایمان کے حامل مسلمانوں کے مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں بغاوت، بدامنی اور خانہ جنگی کا تصور بھی آجاتا ہے۔

لاقانونیت معنی و مفہوم

قانون کا لفظ لغوی اعتبار سے یونانی لفظ "کانون" سے ماخذ ہے۔[2]

جو سریانی کی وساطت سے عربی زبان میں داخل ہوا۔[3]

اس میں اس کے معنی "سیدھی سلاخ" یا مسطر (پیمانہ) کے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق "قاعدہ" پر ہونے لگا۔

دراصل قانون ان اصول و قواعد کے مجموعہ کا نام ہے جو ریاست یا مملکت اپنی حکومت میں عدل وانصاف قائم رکھنے کی خاطر منظور کرتی اور نافذ کرتی ہے۔[4]

قانون کے متضاد لاقانونیت ہے اور اصولیین کے نزدیک یہ لفظ جرم کے معنی میں مستعمل ہے۔ جرم کے لغوی معنی کاٹنے، خطا اور گناہ کے ہیں۔[5]

جب کہ اصطلاحی تعریف اصولیین یوں بیان کرتے ہیں:

"الجرائم محظورات شرعية زجر الله تعالىٰ عنها بحد او تعزير" [6]

جرائم شرعی لحاظ سے وہ ممنوع اور غیر قانونی افعال ہیں۔ جن پر اللہ تعالی نے (بلا واسطہ یا بواسطہ) زجر و توبیخ کی ہو خواہ حد کے طور پر یا تعزیر کے طور پر۔

سو جرم ایسا غیر قانونی عمل ہے، جس پر شریعت نے حد یا تعزیر کے طور پر سزا کو بیان کیا ہو۔ علاوہ ازیں کسی ممنوعہ فعل کو کرنا یا کسی لازم حکم کو نہ ماننا بھی جرم شمار ہوتا ہے۔

بدامنی کے محرکات

معاشرے کے مختلف طبقات کے مابین چپقلش، مذہبی، لسانی، علاقائی، قومی دباؤ، ثقافتی امتیازات اور ذاتی عناد و مفادات جیسے محرکات ہمیشہ بدامنی کا باعث بنتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ صورتیں اتنی پیچیدہ ہو جاتی ہیں کہ ریاست کا ہر فرد مستقل طور پر خوف و ہراس کا شکار ہو

---

1. لسان العرب بذیل مادہ فتن، ۱۳/ ۳۲۰،۱۹
2. اس لفظ کے ضمن میں ملاحظہ ہو۔ Encycolpedia of Islam, "Kanun" volume 4, P-55
3. تاج العروس میں مذکور ہے کہ لفظ قانون رومی (یونانی) یا فارسی لفظ ہے اور محیط المحیط میں اس لفظ کو سریانی قرار دیا گیا ہے۔ (تاج العروس، ۵/۵، ۳) درحقیقت یہ لفظ یونانی ہی ہے دیگر الفاظ کی طرح یہ بھی یونانی سے سریانی اور پھر عربی زبان میں آیا۔

(4) Fitzizerald, P.J, Salmondon Junsprudence, Published sweeland maxwell, London, 1966, P-29

۵۔ المنجد بذیل مادہ (ج ر م) ص ۸۸
۶۔ الاحکام السلطانیة، ص ۲۹۷

جاتا ہے۔جس سے ملک وملت کی ترقی کا عمل رک جاتا ہے اور وہ تباہی، تنزلی اور بربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔

ریاست میں بدامنی اور عدم استحکام کی صورت میں جو محرکات کارفرما ہوتے ہیں، ذیل میں ان کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔انسانی جبلت

انسانی فطرت میں نیکی اور بدی دونوں ودیعت کی گئی ہیں۔ان دونوں میں ہمیشہ کشمکش ہوتی رہتی ہے اگر انسان میں نیکی کی قوت غالب آجائے تو وہ اخلاقی اقدار کا پیش خیمہ بن جاتا ہے اور اسی بناء پر وہ اشرف المخلوقات ہے اور اگر برائی کی قوت غالب آجائے تو وہ چوپاؤں سے بھی بدتر ہے۔

چنانچہ سورۃ آل عمران میں انسانی جبلت کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾ [1]

لوگوں کے لئے عورتوں، بیٹوں، سونے چاندی کے ڈھیروں، نشان زدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتوں سے شہوات کی محبت دل کش بنادی گئی ہے یہ دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ انسان کو کچھ جبلتیں اور میلانات عطا کر دیئے گئے ہیں اگر انسان ان چیزوں کو غلط طریقہ سے حاصل کرنے کی سعی کرے اور اعتدال و توازن سے ہٹ جائے تو پھر انسان برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے جیسے۔

۱۔نفسانی اور شہوانی تسکین کے لئے بدکاری کا مرتکب ہوتا ہے۔

۲۔بقاء نسل کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے۔

۳۔مال ودولت کے حصول کے لئے چوری، رہزنی، رشوت اور کفر وارتداد جیسے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

۴۔طاقت وعہدہ کے حصول کے لئے قتل وغارت اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔

۲۔حکام کا رویہ:

حکام کا غلط رویہ اور طرز عمل بھی بدنظمی اور بے یقینی کو فروغ دیتا ہے۔برسر اقتدار طبقہ اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لئے ایسے غلط فیصلے کرتے ہیں جن سے عمومی سیاسی عمل کی روح مسخ ہو جاتی ہے اور وہ اپنے کارکنان کو ناجائز مراعات دے کر خوش کرتے ہیں جس سے ایک نہ ختم ہونے والا انتشار معاشرے کا مقدر بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ [2]

اور جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اس آیت کی تفسیر میں عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

۱۔　آل عمران ۳:۱۴

۲۔　البقرۃ ۲: ۲۰۵

''حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تولی کا ایک معنی پشت پھیرنا ہے اور دوسرا معنی والی یعنی حاکم بن جانا بھی ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے تو مطلب ہوگا کہ جب منافق آدمی (اخنس بن شریق) حاکم بن جاتا ہے۔ برسر اقتدار آجاتا ہے تو زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتا ہے (یعنی مسلمانوں کے خلاف سازش کرنا اور انہیں مالی و جانی نقصان پہنچانا ہے) اپنی من مانی کرے گا۔ لوگوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم کرے گا۔ لاقانونیت کا دور دورہ ہوگا یا غلط قانون جاری ہوں گے۔''[1]

مگر فساد فی الارض کا مرتکب ہونے کے لئے اقتدار میں آنا شرط نہیں۔ عام لوگ بھی اپنے غلط طرز عمل سے سماج کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لوگوں کی چار اقسام بیان کی ہیں کہ ان میں سے بعض بدامنی اور فساد فی الارض کا شکار ہوتے ہیں، جب کہ بعض دین کی بنیاد پر سربلندی کے خواہاں ہیں اور فتنہ و فساد سے اجتناب کرتے ہیں:

"فان الناس أربعة أقسام: القسم الاول. يريدون العلو على الناس، والفساد في الارض، هو معصية الله، وهؤلآء الملوك والرؤساء المفسدون، كفرعون وحزبه، وهؤلاء هم شرار الخلق ... والقسم الثاني. الذين يريدون الفساد بلا علو، كالسراق المجرمين من سفلة الناس، والقسم الثالث يريد العلو بلافساد، كالذين عندهم دين، يريدون أن يعلوا به على غيرهم من الناس، وأما القسم الرابع. فهم أهل الجنة، الذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا"[2]

لوگ چار قسم کے ہیں، ایک وہ لوگ جو علو و سربلندی، سرداری کے طالب اور خواہاں ہیں اور اللہ کی زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔ اپنی سربلندی و سرداری کے لئے ہر مکر و فریب کو جائز کر لیتے ہیں، یہ سخت ترین معصیت اور بہت بڑا گناہ ہے۔ ایسے سلاطین، شاہان ملک، رؤسا مفسدین جیسے فرعون اور اس کے گروہ میں سے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں شریر ترین لوگ یہی ہیں۔ دوسری قسم کے وہ ہیں جو فساد فی الارض چاہتے ہیں۔ سربلندی اور سرداری سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے، جیسے چور، ڈاکو، راہزن اور اس قسم کے جرائم پیشہ مفسد اور کمینے لوگ ہیں، تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو علو و سربلندی چاہتے ہیں مگر فساد فی الارض نہیں چاہتے اور یہ دین والوں کا طبقہ ہے، جن کے پاس دین ہے اور دین کے ذریعہ لوگوں پر علو و سربلندی کے خواہاں ہیں، چوتھی قسم کے لوگ اہل جنہ ہیں۔ جو نہ زمین میں اقتدار چاہتے ہیں اور نہ ہی فساد کے موجب بنتے ہیں۔

۳۔ رعایا کے حقوق کا عدم تحفظ

ریاست میں بدامنی اور بدنظمی کی صورتوں میں ایک صورت یہ بھی ہے کہ حکمران عوام الناس کے حقوق کی ادائیگی سے بے اعتنائی اور بے توجہی سے کام لینے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں رعایا حکام سے مایوس ہو جاتی ہے۔ عوام اور حکمران کے مابین فاصلے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اگر یہ فاصلے زیادہ دیر تک موجود ہیں تو نفرت، کدورت اور بغض و عناد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دواعی و محرکات نمو پا کر حکومت کے خلاف مظاہروں اور احتجاج کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس صورت حال میں عوام بددل اور مایوس ہو جاتے ہیں اور ریاستی معاملات سے قطع تعلق ہو کر بدامنی اور فتنہ و فساد کے مرتکب ہوتے ہیں۔

---

1. سواتی، صوفی عبدالحمید، معالم العرفان فی دروس القرآن، ملنے کا پتہ: مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج گوجرانوالہ، اگست ۱۹۹۹ء، ۳/ ۲۸۶، ۲۸۷
2. السیاسۃ الشرعیۃ ۱۳۰، ۱۳۱

عصر حاضر میں کسی فرد کا جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے یہ حالت اس وقت کسی ایک ملک کی نہیں دنیا کے اکثر ممالک اس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑھ کر فقر و فاقہ سوسائٹی کے امن و سلامتی کے لیے خطرناک ہے۔

اس ضمن میں یوسف قرضاوی رقمطراز ہیں:

"غریب طبقہ میں فقر و فاقہ کے باعث اضطراب و اشتعال پیدا ہوتا ہے اور لوگوں میں باہمی اخوت، محبت کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ فقر و فاقہ انسان کی جسمانی صحت پر بھی اثر انداز ہو کر اس کے مزاج میں تنگدلی، چڑچڑاپن اور غم و غصہ پیدا کر دیتا ہے جو اس کی قوت کار کو کم کر کے اسے معاشی طور پر کمزور کر دیتے ہیں"۔[1]

شمس الرحمن محسنی لکھتے ہیں:

"مالدار لوگوں کو دولت کی زیادتی اور محتاج طبقہ کو اس کی کمی تباہ کر دیتی ہے۔ دونوں گروہ مختلف قسم کے اخلاقی عیوب کا شکار بن جاتے ہیں اور ان ان کی کارگزاری بہت کم ہو جاتی ہے۔ ان دونوں طبقوں میں معاشی عدم مساوات کی وجہ سے وہ تعاون اور اتحاد عمل نہیں پیدا ہو سکتا جو معاشرہ کی جان ہے"۔[2]

غربت و افلاس انسان کے عقیدہ اور اخلاق دونوں کو خراب کر دیتا ہے اس کے گھر کا امن تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور اس کے افکار منتشر ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں اور وہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۴۔ قومیت پرستی اور تفرقہ بازی

مسلم ریاستوں میں جاری قوم پرستانہ رجحانات نے مسلمانوں میں ذہنی اور فکری انتشار و افتراق، سیاسی، معاشی اور معاشرتی عدم استحکام اور باہمی منافرتوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

قومیت پرستی کی وجہ سے مسلمانوں کی اخلاقی اقدار بھی شدید متاثر ہوئی ہیں۔ اس فکر نے مسلم ممالک کے داخلی اور خارجی امن و استحکام پر نہایت منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی معاشرہ مکمل طور پر یک لسان اور یک زبان نہیں ہوتا، اگر قومی و وطنی بنیادوں پر معاشرے کی تشکیل نو کی جائے تو لامحالہ پوری دنیا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جائے اور کائناتی امن و استحکام تباہی و بربادی کا شکار ہو جائے۔ بدقسمتی سے آج پوری دنیا بشمول دنیائے اسلام اسی راستے پر گامزن ہے۔

مسلم دنیا میں قومیت اور وطنیت کا تصور یورپ سے درآمد کردہ ہے اس وجہ سے اسلامی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی ہے جیسے سلطنت عثمانیہ جو مسلم خلافت اور مرکزیت کی آخری علامت تھی اس نسلی اور لسانی اختلاف میں مبتلا ہو کر عرب و ترک قومیتوں میں تقسیم ہو گئی جس سے مسلم سوسائٹی میں عام بے چینی، بددلی اور فسق و فجور کے جذبات نے جنم لیا۔

پاکستان میں بین الصوبائی تعصبات اور اخلاقی اقدار ظاہرداری پر مبنی ہیں۔ جس کی وجہ سے صوبوں کے درمیان علاقائی و قبائلی فسادات اور آویزش وقتاً فوقتاً سر اٹھائی رہتی ہیں اس حوالے سے بلوچستان اور شمالی وزیرستان میں حالات نازک دور سے گزر رہے ہیں جہاں نہ صرف قبائل کے مابین بلکہ حکومت قبائل کے درمیان بھی مفاد پرستانہ چپقلش ہوتی رہتی ہے اور آئے دن وسیع اور ہلاکتیں رپورٹ ہوتی رہتی ہیں نیز سرکاری املاک اور قومی ذخائر کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔

---

۱ القرضاوی، یوسف، اسلام اور معاشی تحفظ، ترجمہ عبدالحمید صدیقی، طبع شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۲۰، ۲۱

۲ محسنی، شمس الرحمن، شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے، طبع پنجاب آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۲

صوبہ سندھ میں کراچی میں ۹۰ کی دہائی میں مہاجروں اور مقامی سندھی آبادی کے درمیان ہونے والی نسلی ولسانی فسادات سے نہ صرف اس صوبے کا امن وامان تباہ ہوا بلکہ اس طرز عمل نے دوسرے صوبوں میں بھی قومیت پرستی کی آگ بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۹۶ء کی سالانہ رپورٹ کے مطابق یہ ہے کہ:

"صرف ۱۹۹۵ء کے سال کے دوران کراچی شہر میں ۱۴۰۰ افراد لقمہ اجل بنا دیے گئے اور ۱۵۰۰ مہاجروں کو سزائے قید بھگتنا پڑی تھی"۔(1)

بدامنی اور لاقانونیت کے حوالے سے حکمت عملی

بدامنی اور لاقانونیت ہر معاشرہ میں موجود ہوتی ہے۔ ان کے کئی ایک عوامل ہیں، اگر ان عوامل کا خاتمہ نہ کیا جائے جن کی وجہ سے بدامنی اور لاقانونیت کو فروغ ملتا ہے تو یہ عوامل سرطان کی طرح معاشرے میں سرایت کر جاتے ہیں اور اسے تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں۔

فتنہ وفساد جب پیدا ہو تو اسے ختم کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جب اس کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں تو پھر اس کا خاتمہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے جوں ہی کوئی فتنہ پیدا ہو فوراً اس کا سد باب ہونا چاہیے۔

معاشرتی امن وسکون کا استقرار اسلام کے مقاصد جلیلہ میں سے ہے اس لیے معاشرتی امن وسلامتی کو برباد کرنا اور فتنہ گناہ کبیرہ اور قتل انسانی سے بھی زیادہ گھناؤنا جرم ہے۔ معاشرے میں امن وسلامتی برقرار رکھنا افراد اور حکومت کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ ایک اسلامی ریاست بدامنی اور لاقانونیت کے انسداد کے لیے جو حکمت عملی اختیار کرے گی اس کے بنیادی طور پر دو طریقے ہوں گے۔ اس کے علاوہ جو بھی طریقے اختیار کیے جائیں گے وہ جزئیات میں ہی شمار ہوں گے۔

ا۔ اصلاح معاشرہ بذریعہ اخلاقی تربیت

نظام شریعت کی بنیادی اکائی اخلاق ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس بات کا درس دیتا ہے کہ جرائم کا ارتکاب ایمانی تقاضے کے خلاف ہے لہذا ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہارا یہ فرض ہے کہ تم جرائم کی وادی میں قدم نہ رکھو۔ دوسروں کی عزت، جان اور مال کو اپنی عزت، جان اور مال کی طرح سمجھو۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا يُظلِمَهُ ولا يحقره التقوى ههنا ويشير الى صدره ثلاث مرات بحسب امرء من الشر ان يحقر اخاه المسلم كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه (2)

مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے ذلیل کرتا ہے اور نہ ہی اسے حقیر جانتا ہے آپ ﷺ نے تین مرتبہ اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تقویٰ یہاں (دل) میں ہے۔ کسی انسان کا خون، مال اور عزت دوسرے پر حرام ہے۔

یہی وہ تربیت ہے جو نفس کو جرم کے اعتراف پر آمادہ کرتی ہے اور خواہ جرم کتنا ہی ہلکا اور چھپا ہوا کیوں نہ ہو، دل اندر سے آپ سے آپ فوری سزا کا طلبگار رہتا ہے اور چونکہ آخرت کے عذاب کا زبردست کھٹکا لگا ہوتا ہے، اس لئے اس دنیا میں آدمی زیادتی سرزد ہونے پر

---

(1) Year Book of the Muslim world, 1996, New Dehli, India, 1996, P-345

۲۔ الجامع الصحيح المسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله، رقم الحديث ٦٥٤١

از خود نادم اور شرمندہ ہوتا ہے، آخر کوئی تو بات تھی جس کی وجہ سے ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ اور غامدیہ رضی اللہ عنہا[1] نے دربار نبوت میں اپنے آپ حاضر ہو کر اپنے جرم کا اعتراف کیا، اور اپنے گناہوں کے داغ سے پاک کئے جانے کا مطالبہ پیش کیا، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی نگرانی کے احساس کا نتیجہ تھا اور اگر دل میں دین کی طرف سے خبردار کرنے والا وہ جذبہ نہ ہوتا تو اس قسم کا اعتراف بھی کبھی نہ پایا جاتا۔

اگر افراد معاشرہ کی تربیت کی جائے تو صرف تربیت و ترغیب سے ہی بدامنی اور لاقانیت کا خاتمہ ہو جائے۔

۲۔ جرائم کا سدباب بذریعہ سزائیں

انسانی جبلت و فطرت میں جرم کے دواعی و محرکات ہونے کے باعث معاشرے میں جرائم کا ارتکاب ایک ضروری اور فطری امر ہے۔ اس لئے ایسے جرائم جو معاشرے میں امن و سکون کے قیام اور لوگوں کی عزت، جان اور مال کی حفاظت میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں، کے سدباب کے لئے اسلام نے صرف تزکیہ نفس عقائد و عبادات اور اخلاقی تعلیمات کے ذریعے جرائم کے انسداد پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے لئے حدود و تعزیرات کے تحت قوانین بھی نافذ کئے۔ جن کی بدولت عہد نبوی ﷺ اور عہد خلفائے راشدین میں اسلامی ریاست اپنی سرحدی وسعتوں کے باوجود امن کا گہوارہ بن گئی۔

دنیا کا کوئی قانون سزا کے نظام سے مستثنیٰ نہیں۔ اس لئے اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں، وہ اصلاح نفس و معاشرہ کے لئے بڑی اہم حیثیت رکھتی ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے یہ اصول کہ ہر گناہ فساد ہے، بہت واضح طور پر بیان کیا، وہ فرماتے ہیں:

> "الحدود اعلم ان من المعاصی ما شرع اللہ فیه الحدود ذلک کل معصیة جمعت وجوها من المفسدة بان کانت فسادا فی الأرض"[2]

---

[1] سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں:
رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص حاضر خدمت ہوا اور آواز دے کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے زنا کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، وہ شخص اسی طرف کو مڑ گیا، جس طرف روئے مبارک تھا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے زنا کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ادھر سے بھی منہ پھیر دیا یہاں تک کہ چار مرتبہ اس نے دوبارہ ہر بار عرض کیا۔ جب وہ چار مرتبہ شہادت دے چکا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو بلا کر فرمایا کیا تجھے جنون ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا کیا تو شادی شدہ ہے؟ اس نے عرض کیا، جی ہاں۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو لے جا کر سنگسار کر دو۔
(الجامع الصحیح البخاری، کتاب المحاربین من أهل الكفر والردة، باب الاعتراف، رقم الحدیث: ٦٨٢٨)
عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں: قبیلہ جہینہ کی ایک عورت کو زنا کا حمل تھا، اس نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے قابل حد جرم سرزد ہو گیا ہے، مجھے مقررہ سزا دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ولی کو بلا کر فرمایا اس کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا، جب بچہ پیدا ہو جائے تو اس کو میرے پاس لے آنا، اس شخص نے حکم کی تعمیل کی، پھر جب وہ ورنی گئی تو آپ ﷺ کے حکم کے بموجب اس کے کپڑے میں دور دور ٹانکے لگا دیئے گئے، پھر آپ ﷺ نے حکم فرمایا اور اس کو سنگسار کر دیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے تو زنا کیا تھا! آپ ﷺ اس کی نماز پڑھتے ہیں؟ فرمایا اس نے تو ایسی توبہ کی ہے، اگر مدینہ والوں میں سے ستر آدمیوں کو وہ تقسیم کر دی جائے تو سب کی مغفرت کے واسطے کافی ہو جائے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی توبہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنی جان دی ہو؟ (الجامع الصحیح المسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنی، رقم الحدیث: ٤٤٣٣)

[2] حجة الله البالغة، ٢/ ٣٧٨

حدود کی کیفیت یہ ہے کہ بعض گناہوں کے لئے سزا مقرر کر دی گئی ہے اور یہ وہ گناہ ہیں جن میں فساد اور تباہی و برائی کے اسباب پائے جاتے ہیں کیونکہ گناہ ملک میں فتنہ و فساد ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالقادر لکھتے ہیں:

"ولعل السر فی نجاح الشریعة ان عقوباتها وضعت علی اساس طبیعة الانسان.. وقد استقلت الشریعة طبیعة الانسان فوصفت علی اساسها عقوبات الجرائم عامة"[۱]

یقیناً شریعت کی کامیابی کا راز اس کی سزاؤں میں ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، شریعت نے انسانی فطرت کا محاصرہ کیا ہے اور فطرت انسانی کی اساس کی بنیاد پر عام جرائم کی سزائیں متعین کی ہیں۔

جرائم کے سدباب کے لئے اسلام نے باقاعدہ طور پر حدود و تعزیرات کا نظام دیا ہے یہ سخت سزائیں جرائم کی بیخ کنی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں تاکہ ان سزاؤں کے پیش نظر آدمی جرم کے ارتکاب سے پہلے بار بار سوچے۔ علاوہ ازیں یہ سزائیں دوسروں کے لئے باعث عبرت بھی ہوں۔ یوں اسلام نے مملکت اسلامیہ کے باشندوں کے دین، جان، مال، عزت اور عقل کی حفاظت کے لئے اقدامات کئے ہیں تاکہ ریاست میں انتشار، فتنہ فساد اور بدامنی رونما نہ ہو۔

شریعت اسلامیہ میں بنیادی طور پر سزاؤں کی تین اقسام ہیں۔

i۔ حدود **ii۔ قصاص و دیت** **iii۔ تعزیر**

i۔ حدود

علامہ ابن عابدین نے حد کی یہ تعریف بیان کی ہے:

"عقوبة مقدرة وجبت لله تعالی زجرا فلا تجوز الشفاعة فيه بعد الوصول للحاكم"۔[۲]

وہ مقررہ سزا جو اللہ کی طرف سے مقرر ہو اور اس کا نفاذ اللہ نے فریضہ قرار دیا ہو اور جنہیں معاف کرنے کا اختیار حاکم یا قاضی کے پاس بھی نہ ہو۔

حدود پانچ ہیں جو قرآن سے ثابت ہیں۔

زنا، قذف، شراب نوشی، نشہ، چوری

جن کا تعلق براہ راست حقوق العباد سے ہے۔ اگر ریاست ان حدود کے نفاذ میں سستی و کاہلی کا مظاہرہ کرے گی تو اس سے معاشرے کا نظم و نسق متاثر ہوگا۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں دیگر جرائم کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ جن کے سدباب کے لئے زیادہ سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔

راہزنی: راہزنی یا قطع الطریق کو محاربت اور فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں رہزنی کی سزا ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے اگر مال لوٹا تو ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت میں کاٹے جائیں گے اور اگر قتل کریں تو صرف قتل کئے جائیں گے۔ قتل کرنے اور مال لوٹنے پر حاکم کو

۱۔ التشریع الجنائی، ۲/۶۱۳، ۷۱۴

۲۔ ابن عابدین، محمد امین، حاشیۃ رد المحتار علی الدر المختار، المکتبۃ التجاریۃ مصطفی احمد الباز، مکۃ المکرمۃ، ۱۳۸۲ھ، ۴/۴۰۳

اختیار ہوگا کہ اگر چاہے تو ہاتھ پاؤں مخالف سمت میں کاٹنے کے بعد قتل کردے یا سولی دے دے اور اگر چاہے تو صرف قتل کر کے سولی دے دے۔ راستے میں دہشت پھیلانے کی صورت میں جب نہ قتل کیا ہو، نہ مال لوٹا ہو، جلا وطن کئے جائیں گے یعنی قید کئے جائیں گے اور تعزیر دی جائے گی۔[۱]

ان مختلف قسم کے جرائم سے بچنے کا بڑا موثر ذریعہ ہے اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کا سبب بھی ہے۔

بغاوت: امام برحق (عوام یا اہل حل وعقد کا منتخب) کی اطاعت سے اعراض اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا بغاوت کہلاتا ہے۔

اگر کوئی گروہ باغی ہو جائے تو شریعت کا حکم ہے کہ اسے اطاعت کی تلقین کی جائے گی اگر پھر بھی بغاوت پر اڑے رہیں تو ان کے ساتھ قتال کیا جائے، اس وقت تک بغاوت ختم ہو جائے یا باغی اطاعت پر آمادہ ہو جائیں۔

اس ضمن میں علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''اگر امام کے علم میں یہ بات آئے کہ باغی شہر میں اسلحہ وغیرہ جمع اور لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں تو حاکم کو اختیار ہے کہ ان کو لڑائی سے پہلے ہی پکڑ کر قید کردے اور اس وقت تک قید میں رکھے جب تک وہ بغاوت سے باز نہ آجائیں اور ان سے توبہ اور رجوع ثابت نہ ہو جائے''[۲]

غرض معلوم ہوا کہ بغاوت کے مقدمے میں امام باغیوں کی تیاری کا علم ہونے پر انہیں باز رکھنے کے لئے قید کرسکتا ہے اور لڑائی کے دوران پکڑے جانے والے افراد کو امن قائم ہونے تک قید کیا جائے گا، نیز بھاگنے والے سے شر کا اندیشہ ہو تو ان کا پیچھا کر کے توبہ کرنے تک قید میں رکھا جائے گا۔ بغاوت پر یہ سزا اس لئے ہے تاکہ امت مسلمہ میں انتشار اور فتنہ نہ پھیلے کیونکہ فتنے سے بہت ہی قتل و غارت ہوتی ہے۔

جاسوسی: جاسوس دنیا کے ہر قانون میں قابل سزا جرم ہے۔ جاسوسی کسی ریاست کی سلامتی کو ضرر پہنچانے کے لئے کی جاتی ہے، اس کے نتیجے میں اہم راز اور معلومات سے دشمن کی طرف منتقل کی جاتی ہیں۔

اس ضمن میں علامہ ابن القیم لکھتے ہیں:

> ''اگر مصلحت کا یہ تقاضا ہو کہ ایک مسلمان سے جو مشرکوں کی جاسوسی کا کام کرتا ہے اسلامی سلطنت یا مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اغلب احتمال ہے تو اسے سیاسی طور پر موت کی سزا دی جاسکتی ہے''[۳]

حکومت کے خلاف سیاسی محاذ آرائی: عصر حاضر کا ایک اہم مسئلہ ہے کہ حکومت سیاسی مخالفت کو برداشت نہیں کرتی، جو افراد اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

پاکستانی آئین کے مطابق اگر انسدادی نظر بندی کا کوئی قانون بنے گا تو اس کا اطلاق صرف ایسے افراد پر ہوگا جن سے ملک کے دفاع، سلامتی اور اتحاد کو خطرہ لاحق ہو یا ایسے افراد جس سے خارجہ معاملات، عوامی نظم و ضبط یا رسد کی فراہمی کو خطرہ ہو۔[۴]

۱۔ المائدۃ ۵: ۳۳

۲۔ بدائع الصنائع، ۷/ ۱۴۰

۳۔ یجوز کقتل الجاسوس المسلم اذا اقتضت المصلحۃ قتلہ۔ (الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیۃ، ص۱۰۶)

(4) *Pakistan prison Rules (Jail (manual) (U/S 59 of Prison, Act, 1894) (Rules for the Superintendence and Management of Prisons of Pakistan) R. No 421 and Regulation 111 of 1818, For the confinement of state prisoners*

اسی طرح ریاستی قیدی(State Prisoner) کی اصطلاح اس فرد کے لئے استعمال کی جاتی ہے جس کو حفاظتی تحویل میں لیا گیا ہوتا ہے۔[۱]

اور یہ عام طور پر سیاسی مخالفین ہوتے ہیں اس کے علاوہ پاکستان میں اندیشہ نقص امن کی وجہ سے ۱۶/ ایم پی او کے تحت سیاسی مخالفین کو نظر بند کرنا بہت زیادہ عام ہے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد سیاسی مخالفین کی وہ ہوتی ہے جن کو مختلف جرائم کے الزام میں قید میں ڈالا جاتا ہے۔

حد ارتداد: ارتداد لوٹنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں اسلام سے لوٹ جانے کو ارتداد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[۲]

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ [۳]

"جس نے اپنے دین کو تبدیل کیا اسے قتل کردو"۔

ایک اسلامی مملکت میں اس حد کا اجراء ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ سزا نہ ہو تو بہت سے شر پسند دین اسلام کو مذاق بنا لیں کہ صبح اسلام لائیں اور شام کو کافر ہو جائیں۔ اس لئے اسلام کے بارے میں سنجیدہ رویہ اختیار کرنے اور اسلامی مملکت کو فتنہ سے محفوظ کرنے کے لیے اس سزا کا نفاذ ضروری ہے۔

۱۱۔ قصاص و دیت

شرعی لحاظ سے قصاص میں مجرم کو اسی طرح/ ذیت وہ سزا دی جاتی ہے جس طرح مجرم نے کسی جان یا جسم کے کسی حصہ کو تکلیف دی ہو جب کہ قتل خطا میں قصاص کی بجائے دیت دی جاتی ہے۔

قصاص کی دو اقسام ہیں:

(۱) قصاص فی النفس (۲) قصاص فی الاعضاء

قصاص فی النفس کے حوالے سے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى﴾ [۴]

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص کو فرض کیا گیا۔

نفس میں قصاص کے علاوہ اعضاء میں بھی قصاص کا حکم ہے:

﴿وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ [۵]

اور آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں (کا بھی) بدلہ ہے۔

---

(1) The constitution of Islamic republic of Pakistan 1973, Article 9,10

۲۔ قلعه جی، محمد رواس، موسوعة فقه عمر بن الخطابؓ، دار النفائس، بيروت لبنان، ۱۹۸۹ء، ص ۵۸

۳۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، باب ما جاء في المرتد، رقم الحديث: ۱۴۵۸

۴۔ البقرة ۲: ۱۷۸

۵۔ المائدة ۵: ۳۲

دیت کے حوالے سے قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِناً إِلَّا خَطَئاً وَمَن قَتَلَ مُؤْمِناً خَطَئاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ﴾[1]

مومن کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے سوائے خطا کے اور جس نے مومن کو غلطی سے قتل کیا تو اس کے ذمہ مومن غلام کا آزاد کرنا اور مقتول کے ورثاء کی طرف دیت حوالے کرنا ہے۔

قصاص و دیت کے احکامات انسانی جان کے تحفظ میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ احکامات نہ ہونے کی صورت میں انسانی جانوں کے ضیاع کو روکنا ناممکن ہو جائے اور قاتلوں کو کھلی آزادی مل جائے۔

iii۔تعزیر

ابن عابدین نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ:

"التعزیر لیس فیه تقدیر بل هو مفوض الی رای القاضی... لأن المقصود منه الزجر واحوال الناس فیه مختلفة"[2]

تعزیر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ (حاکم) اور قاضی صورت حال کے مطابق اس کا تعین کرے گا۔ جس کا مقصود اس سے زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کرنا ہے اور اس کے نفاذ میں لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں (یعنی ان کے جرم کے مطابق سزا دی جائے گی)

حسب ذیل صرف تعزیرات کے نام بیان کئے جاتے ہیں جو بدامنی اور فتنہ و فساد کے انسداد میں کارآمد ثابت ہوتی ہیں

۱۔وعظ و نصیحت	۲۔توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ)	۳۔تہدید (ڈرانا دھمکانا)	۴۔الہجر (بائیکاٹ)
۵۔تشہیر	۶۔غرامہ (جرمانہ)	۷۔حقوق/عہدے سے محرومی	۸۔حبس و قید
۹۔جلد (کوڑے)	۱۰۔جلاوطنی	۱۱۔قتل	۱۲۔صلیب/سولی[3]

پاکستانی فوجداری قانون میں بھی مندرجہ بالا سزائیں رکھی گئی ہیں۔ حدود و تعزیرات اور قصاص و دیت کے ضمن میں یہ سزائیں معاشرے میں جرائم کے سدباب اور امن و امان کی فراہمی میں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۔قصاص	۲۔دیت	۳۔ارش	۴۔ضمان یا تاوان	۵۔تعزیر
۶۔موت	۷۔عمر قید	۸۔قید (قید با مشقت یا قید محض)	۹۔جائیداد کی ضبطی	۱۰۔جرمانہ

شرعی سزاؤں اور پاکستان کے فوجداری قانون میں درج سزاؤں میں کوئی فرق کیونکہ عمر قید تو قید کا جزو ہے جب کہ جائیداد کی ضبطی اور جرمانہ ضمان کی ایک قسم ہے۔

اگر مندرجہ بالا سزاؤں کی تینوں اقسام پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حدود وہ ہیں جو اللہ کے حق کے طور پر واجب ہیں اور قصاص میں

۱۔ النساء ٤: ٩٢

۲۔ حاشية ابن عابدين، ٤/ ٦٠

(3) Criminal Law (Amendment) Act, 1998

اللہ اور بندوں کا حق مشترک ہے، ایسے کہ اللہ کی طرف سے مقرر شدہ ہے جب کہ بندوں کو معافی اور کمی بیشی کا اختیار ہے۔ تعزیر کبھی اللہ کا حق ہوتی ہے اور کبھی آدمی کا مگر آدمی کا حق اس میں غالب ہے، اسی لئے اس میں معافی سفارش، ابراء اور کمی جائز ہے۔

شریعت میں سزاؤں کا مقصد معاشرے سے فساد دور کرنا اور مصالح کی ترویج ہے نیز مجرم کو ڈرانا دھمکانا اور تادیب مقصود ہے تاکہ وہ دوبارہ جرم کا مرتکب نہ ہو اور دیگر افراد کے لئے باعث عبرت و موعظت ہو کہ وہ جرم سے دور رہیں۔

موجودہ جمہوری طرز حکومت میں بدنی سزاؤں کو ظلم کے مترادف قرار دیا گیا ہے اور اقوام متحدہ کے بنیادی حقوق کے چارٹر میں اس کو غیر انسانی سلوک قرار دے کر ایسی سزاؤں کو ترک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اگر انسانی جسم کو بچانے کے لئے پھوڑے کا آپریشن محض جائز ہی نہیں بلکہ اسے عین ہمدردی سمجھا جاتا ہے تو معاشرہ کو ظلم و فساد سے بچانے کے لئے بدکردار کو بدنی سزا دینا کیسے غیر انسانی سلوک بن جاتا ہے۔ اس پر رحم کر کے معاشرہ میں بدامنی اور لاقانونیت کو کیوں گوارا کیا جاتا ہے جب کہ یہ بات قرآن کے نص صریح کے خلاف ہے۔

جبکہ جیرلڈ ہیگر کا کہنا ہے کہ اکثر اوقات لاقانونیت ہی ریاست میں بدامنی کا باعث بنتی ہے

> "بدامنی دراصل ملک میں قانون سازی کے فقدان اور اس کی عدم اطلاقیت کی بناء پر جنم لیتی ہے۔ دنیا کا ہر ملک و معاشرہ امن و امان کی بحالی اور عمومی نظم و نسق چلانے کے لئے قوانین کا سہارا لیتا ہے۔ اگر وہاں قوانین کی صحیح تشریح نہ ہو رہی ہو یا قوانین پر عمل درآمد کرنے والے ادارے اور ایجنسیاں قوانین کی روح کے مطابق ان کے عملی اطلاق کو یقینی نہ بنا رہے ہوں یا قوانین کا ناجائز استعمال کر رہے ہوں، تمام صورتوں میں معاشرے میں بد نظمی پھیلتی ہے۔ اس طرح کی صورتحال نہ صرف ترقی پذیر ممالک میں بلکہ بعض ترقی یافتہ ممالک میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہے۔"[1]

امن عالم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ظلم و استحصال پر مبنی باطل نظام ہے جو چند مخصوص لوگوں کی ہوس اقتدار اور مفادات، دولت اور شہرت کے حصول کی خاطر کروڑوں، اربوں انسانوں کی زندگیاں اجیرن کرتا ہے۔

امن کے متعلق ایک عمومی بے حسی ہے کیونکہ مستبد طاقتیں اس قدر حاوی سیاسی اور حربی طور پر اس قدر بارسوخ اور ساتھ ہی ساتھ مغرور و متکبر ہیں کہ وہ کسی عمومی رائے کو خاطر میں نہیں لاتیں۔

اس وقت امریکہ، بھارت، روس، اسرائیل اور افغانستان اپنی سازشوں اور مکروہ عزائم کے ساتھ پاکستان کی داخلی سرحدوں میں در پردہ مداخلت کر رہا ہے جبکہ امن و امان کی صورت حال روز بروز خراب سے خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ سرحد کے قبائلی علاقے مکمل طور پر انتہاپسندی اور دہشت گردی کی لپیٹ میں آ چکے ہیں حتیٰ کہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں بھی تخریب کاری کے سائے منڈلا رہے ہیں جبکہ بلوچستان تو مذہبی، قبائلی، علاقائی انتہاپسندی کے علاوہ بیرونی قوتوں کی سازشوں کا گڑھ بنتا جا رہا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کون صحیح ہے اور کون غلط، کس کا موقف درست ہے اور کس کا غلط۔ اس وقت ہم سب کو ذاتی مفادات کی پرکشش وادی سے نکل کر حقیقت کی دنیا آباد کرنی ہوگی اور ایک پرچم کے سائے تلے جمع ہو کر پاکستان کی سلامتی کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی تب کہیں جا کر ایک خوشحال اور پرامن پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔

---

(1) Heeger, Gerald, The politics of under Development, London, 1974, P-161

عصر حاضر میں اقتصادی قوت کی بڑی اہمیت ہے اور جو قومیں اس میدان میں آگے بڑھتی ہیں سیاسی اعتبار سے بھی انہیں بالا دست قوت کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جس ریاست کی معیشت غیر مستحکم ہو، عوام زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم ہوں، گرانی کی وجہ سے اشیاء صرف عوام کی دسترس سے باہر ہوں، دولت کی تقسیم غیر منصفانہ ہو، ملکی معیشت قرضوں کے سہارے قائم ہو وہاں ترقی اور خوشحالی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ایسی ریاست مضبوط قوموں کے استحصال کا شکار ہوتی ہے اور معاشی بے چینی اور طبقاتی منافرت کی آگ پورے معاشرے کو بھسم کر دیتی ہے۔

معاشی عدم استحکام کی وجوہات

کسی بھی معاشرے میں ہر طرح کا معاشی عدم استحکام اور عدم توازن بنیادی طور سے وسائل پیداوار پر غیر منصفانہ قبضہ و تصرف اور دولت کی ناحق تقسیم سے جنم لیتا ہے۔ قدیم و جدید دور کے سارے اقتصادی نظاموں کا بلند بانگ دعویٰ رہا ہے کہ وہ انسان کے معاشی اور اقتصادی مسائل کو حل کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کے سب اپنے مقصد میں ناکام ہی رہے ہیں۔

درحقیقت اشتراکیت کو ابتدائی مدلل اور زوردار طریقے سے دنیا کے سامنے کارل مارکس نے پیش کیا لیکن وہ پہلا شخص نہ تھا جس نے اس لفظ کو استعمال کیا:

> "The word socialism was first used around 1830 to describe doctrines developed by F-M-C Fourier and Comte Henri-Simon in France and of Robert Owen in England Socialism is a system of social organization in which private property and the distribution of income are sub,ect to social control, rather than to determination by Individuals pursuing their own Interests or by the market forces of capitalism. The term is also applied to political movements whose aim is to put such a system into practice."(1)

لفظ "سوشلزم" پہلی مرتبہ ۱۸۳۰ میں فرانس کے ماہرین معاشیات F.M.C Fourier اور Comte Henri-Simon اور برطانوی صنعت کار اور سوشلسٹ Robert Owen کے پیش کردہ نظریات کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ سوشلزم ایک ایسا سماجی نظام ہے جس میں ذاتی ملکیت اور آمدنی کی تقسیم ریاست کے اختیار میں ہوتی ہے جبکہ افراد اور دیگر سرمایہ دارانہ قوتیں اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ اس لفظ کا اطلاق ان سیاسی تحریکوں پر بھی ہوتا ہے جن کا مقصد ایسے نظام کو زیر عمل لانا تھا۔

> "Individual enterprise is the breath of capitalism. It permits absolute freedom to choose any one of the thousands of openings for productive or commercial effort, to choose any site, to employ any quantity or quality of agents of production, to select any market for

(1) *The New Encyclopedia Britannica, V-10, P-926.*

them and to choose any method to dispose them of."(1)

ذاتی کاروبار سرمایہ دارانہ نظام کا روح رواں ہے۔ اس میں اس بات کی مکمل آزادی ہے کہ پیداواری اور تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے گوناگوں مواقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ (کاروبار کے لیے) کسی بھی جگہ کا انتخاب کیا جائے، کاروبار چلانے کے لیے کسی بھی تعداد اور قابلیت کے افراد ملازم رکھے جائیں اور سامان تجارت کو کسی بھی طریقے سے کسی بھی منڈی میں فروخت کرنے کی آزادی ہو۔

جاگیردارانہ نظام (Feudal system) "یہ نظام چوتھی اور دسویں صدی عیسوی کے مابین رواج پایا اس نظام کے تحت تمام زمینیں بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھیں۔ بادشاہ یا جاگیردار کسی دوسرے بادشاہ یا جاگیردار کی زمین کو اپنے قبضہ میں کر لیتا اور پھر جس شخص سے زمین حاصل کرتا اس سے ٹیکس وصول کر کے اسے زمین کے استعمال کا حق دیتا۔

"Feudalism, is a social system of rights and duties based on land tenure and personal relationships in which land (and to a much lesser degree other sources of income) is held in fief by vassals from lords to whom they offer specific services and with whom they are bound by personal loyalty."(2)

جاگیردارانہ نظام حقوق و فرائض کا ایسا نظام ہے جو زمین پر حق قبضہ اور ذاتی تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔ جس میں مزارعین جاگیرداروں سے قابل انتقال زمین (یا آمدنی کے دوسرے ذرائع) حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بدلے وہ مخصوص خدمات اور ذاتی وفاداری کے پابند ہوتے ہیں۔

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ تینوں نظام گردش دولت کو انسانیت کے تقاضوں کے مطابق کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ان نظاموں کے تحت زندگی بسر کرنے کے لیے انسانوں کو آزادی، اخلاق و مذہب کی قربانی دینا پڑتی ہے جو انسان کے لیے متاع گراں ہے۔

ان نظاموں نے معاشی مسائل، عدم توازن اور ناہمواری کو ختم کرنے کے بجائے ان میں بے پناہ اضافہ ہی کیا ہے کیوں کہ وہ بالعموم عام انسان کے مفاد میں وسائل پیداوار کو کنٹرول اور دولت کے بہاؤ کو صحیح سمت نہیں دے سکے۔ مذہبی نقطہ نظر سے دیکھیے تو دنیا کے سارے اقتصادی نظام اور تمام معاشی طریقے انسانی دماغ کی پیداوار ہیں۔ انسانی ذہن ایک تو محدود ہے اور وہ صرف اپنے حدود اور پیمانوں ہی میں رہ کر فکر و عمل کی راہ نکال سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسانی فکر و عمل افراد، طبقات اور پورے انسانی سماج کے مختلف النوع رجحانات، گوناگوں تعصبات اور طرح طرح کے میلانات کی آلائشوں سے خالی نہیں ہوتے۔

معیشت کے فساد سے فقر و فاقہ کی پریشانی، انتشار طبیعت اور ذہنی کوفت بلکہ صدہا دوسری بلائیں انسان کے دل و دماغ میں گھر کر لیتی ہیں اور افراد جماعت میں خود غرضانہ تصادم شروع ہو جاتا ہے، جس سے حکومت کے نظم و نسق پر تباہ کن اثر پڑتا ہے، بلکہ نظری اور تہذیبی شعبوں سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور اس طرح پورا انسانی تمدن خطرات کی نذر ہو جاتا ہے۔ جس کی صورت میں معاشی عدم استحکام پیدا ہوتا۔

اس سلسلہ میں علامہ اسد رقمطراز ہیں:

"This is the deepest socialogical lesson of Islam: there can be no happiness and strength in society that permits some of its members to suffer undeserved want while others have more than they need. If the available resources of a community are so unevenly distributed

---

(1) *Mohammed, Ahmed, Sh, Economics of Islam, Publisher sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1947, P-1*

(2) *The New Encyclopedia Britannica, V-4, P-75.*

that certain groups with in it live in affluence while the majority of the people are forced to use up all their energies in search of their daily bread, poverty becomes the most dangerous enemy of spiritual progress, and occasionally drives whole comminities away from God-Consciousness and into the arms of soul destroying materialism. It is undoubtedly this that the warning word.(1)

یہ اسلام کا عمیق سماجی درس ہے کہ معاشرے میں اس وقت تک خوشحالی اور استحکام نہیں آ سکتا جب تک کچھ افراد تو بنیادی ضروریات کی قلت میں مبتلا ہوں اور دیگر افراد کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ ہو۔ اگر دستیاب شدہ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم ہو یعنی چند گروہ تو عیش وعشرت کی زندگی گزاریں جبکہ رعایا کی اکثریت اپنی تمام تر توانائیاں روزانہ کی خوراک کی تلاش میں صرف کر دے، مفلسی روحانی ترقی کی خطرناک دشمن ہے اور پورے معاشرے کو خداشناسی سے دور کر کے مادیت کی تباہ کن آغوش میں لے جاتی ہے۔ بے شک یہ خبردار کر دینے والی بات ہے۔

اس وقت دو معاشی نظام جنہوں نے پوری دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت، ہر ایک کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ انسان کے معاشی مسائل کا حل ہے لیکن حقیقت میں وہ خود مسئلے ہیں جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان دونوں معاشی نظاموں نے خلق خدا کو مبتلائے رنج ومحن کر رکھا ہے۔

سید نواب حیدر نقوی رقمطراز ہیں کہ

Islam is a golden means between socialism and capitalism Social justice, economic growth, high employment and universal education should be the policy objectives. Examines such policy issues as nationalisation and encouragement of saving and investement.(2)

اسلام سماجی اور سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان ایک سنہری ثروت کا کردار ادا کرتا ہے۔ سماجی انصاف، معاشی ترقی، روزگار کے اعلیٰ ذرائع اور یکساں تعلیم "پالیسی" کے مقاصد ہونے چاہیں۔ بچت اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی اور قومیت جیسے پالیسی معاملات کا جائزہ لینا چاہیے۔

وحی الٰہیہ اور تعلیمات نبویہ سے اغماض وانحراف اور صرف ہوائے نفس پر بھروسہ کرنے کا ایک مہلک نتیجہ یہ ہے کہ انسان خواہشات میں گھر کر اپنے اصل مقصد حیات سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر اسے حکومت واقتدار ملتا ہے تو وہ انسانی زندگی کے ابدی حقائق کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیتا ہے۔ گویا وہ اپنا منتہی ومقصود حکومت، خود اختیاری اور خود ارادیت کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ آج تک نظام ہائے ملوکیت و استبداد میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔

مورخ مسعودی نے اموی خاندان کے زوال کے اسباب یہی بیان کیے ہیں کہ وہ سامانِ سلطنت اپنی تعیشات میں پڑ کر رعایا کی معاشی ترقی اور خوشحالی سے بے خبر ہو گئے تھے اور وہ ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کوئی مناسب اقدام نہیں کرتے تھے

"وذكر المنقري قال: سئل بعض شيوخ بني أمية ومحصليها عقيب زوال الملك عنهم الى بني

---

(1) *Asad, Muhammad, Principles of state and government in Islam, Gibralter, Doral-Andalus, 1980, P-90*

(2) *Naqvi, Syed, Nawab Haider, Islamic Economic System: Fundamental Issues, Islamic Studies, Islamabad (16.4), 1977, P 327.*

العباس: ماكان سبب زوال ملككم؟ فقال: إنّا شُغلنا بلذاتنا عن تفقد ما كانَ تفقده يلزمنا، فظلمنا رعيتنا، فيئسوا من إنصافنا، وتمنّوا الراحة منا، وتحومل على أهل خراجنا، فتخلّوا عنا، وخربت ضياعنا، فخلت بيوت أموالنا، ووثقنا بوزرائنا، فآثروا مرافقهم على منافعنا، وأمضوا أموراً دوننا أخفوا علمها عنّا، وتأخر عطاء جندنا، فزالت طاعتهم لنا، واستدعاهم أعادينا فتظافروا معهم على حربنا، وطلبنا أعداءنا فعجزنا عنهم لقلّة أنصارنا، وكان استتار الأخبار عنا من أوكد أسباب زوال ملكنا۔[۱]

المسعودی بیان کرتا ہے کہ بنو عباس کے پاس حکومت منتقل ہو جانے کے بعد بنی امیہ کے کسی شیخ سے پوچھا گیا کہ آپ کی حکومت کے زوال کا سبب کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا جن باتوں کی جستجو کرنا ہمیں لازم تھا ہم ان کو چھوڑ کر اپنی لذات میں منہمک ہو گئے اور اپنی رعیت پر ظلم کیا، وہ ہمارے انصاف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے ہم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا اور ہم نے خراج ادا کرنے والوں پر بوجھ ڈال دیا تو وہ ہم سے الگ ہو گئے اور ہماری جاگیریں برباد ہو گئیں اور بیت المال خالی ہو گئے، ہم نے اپنے وزراء پر اعتماد کیا تو انہوں نے اپنے فائدے کو ہمارے فائدے پر ترجیح دی اور انہوں نے ہم سے پوشیدہ طور پر کچھ کام کیے جن کا علم انہوں نے ہمیں نہ دیا، ہماری فوجوں کو بروقت تنخواہ نہ ملی تو وہ ہماری اطاعت سے دست کش ہو گئیں اور انہوں نے ہمارے دشمنوں کو بلایا اور انہوں نے ہمارے ساتھ جنگ میں ان کی مدد کی اور ہمارے دشمنوں نے ہمیں مقابلہ کے لیے بلایا تو مددگاروں کی قلت کی وجہ سے ہم ان کے مقابلہ سے عاجز آ گئے اور ہماری حکومت کے زوال کا سب سے زبردست سبب ہم سے ہمارے حالات کی پوشیدگی تھی۔

اس عیش وعشرت اور آرام وہ زندگی کے تمام اسباب کا دار و مدار اس بے بہا دولت پر تھا جس پر حکمران طبقہ قابض ہو گیا تھا اور اس نے اس پر بے دریغ تصرف کیا تھا۔

ماضی میں جو قومیں تباہ ہو گئیں ان کی تباہی کا سبب یہی تھا کہ انہوں نے عوام کو ان کے حقوق دینے سے گریز کیا تا کہ لوگ ان حقوق کو قیمت ادا کر کے ان سے خریدیں اور ظلم ڈھائے تا کہ لوگ ان کے مظالم سے بچنے کی خاطر فدیہ ادا کریں۔

اہل خراج پر ایسا بوجھ ڈالنا جس کی ادائیگی ان کے ذمہ واجب نہیں صریح ظلم اور سراسر حرام ہے، اس کی گنجائش کسی طرح نہیں نکل سکتی۔

اس ضمن میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"فلهذا الغالب على أكثر الملوك قصد الدنيا دون الدين، قدّموا في ولايتهم من يعينهم على تلك المقاصد، وكان من يطلب رئاسة نفسه، يؤثر تقديم من يقيم رئاسته "[۲]

جب بادشاہوں اور سلاطین پر دنیا غالب آ گئی اور دین چھوڑ دیا تو ان کی ولایت (یعنی حکومت وسلطنت میں ایسے لوگوں) کو مقدم رکھا گیا جو ان کے مقاصد کو پورا کریں جو شخص اپنی ذات کے لیے ریاست کا طالب تھا اس نے اس کو مقدم رکھا جو اس کی ریاست کو قائم رکھے۔

چنانچہ وہ اپنے اقتدار کی خاطر رعایا پر ظلم و جور کا بازار گرم رکھتے تھے اور ان کے اموال کی تقسیم میں جس طرح چاہتے تصرف کا حق رکھتے تھے۔

مزید برآں رقمطراز ہیں:

وليس لولاة الأموال أن يقسموها بحسب أهوائهم، كما يقسم المالك ملكه، فإنما هم أمناء و

۱۔ مروج الذهب و معادن الجوهر، ۲۷۵/۳

۲۔ السياسة الشرعية، ص ۲۱

نواب و وکلاء لیسو مُلّاً کا۔"[1]

"پس والیانِ مال کو کسی طرح حق نہیں پہنچتا کہ وہ مال کو اپنی خواہشات کے مطابق تقسیم کریں۔ جس طرح کہ مال کے مالک اپنا مال تقسیم کر لیتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں لیتے دیتے ہیں، کیونکہ والیانِ مال اس مال کے مالک نہیں ہیں بلکہ امین، نائب اور وکیل ہیں۔"

امیر المومنین حضرت علیؓ کو ایک مرتبہ اطلاع ہوئی کہ آپ کے بعض نائب رعایا پر ظلم و جور کر رہے ہیں، تو آپؓ نے فرمایا

"اَللّٰهُمَّ اِنِّي لَمْ اٰمُرْهُمْ اَنْ يَّظْلِمُوْا خَلْقَكَ وَلَا يَتْرُكُوْا حَقَّكَ"۔[2]

اے اللہ میں نے اُن کو ظلم و جور کا حکم نہیں کیا اور نہ تیرا حق چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے تو ایسے لوگوں سے قتل کرنے کا حکم دیا ہے جو ریاست کو معاشی طور پر غیر مستحکم کرنے پر آمادہ ہوں، وہ لکھتے ہیں'

"ومن الخلل: أن تجتمع أنفس شريرة، لهم مَنَعَةٌ وشوكة على اتباع الهوى، ورفض السنّة العادلة. إما طمعا في اموال النّاس وهم قُطّاع الطريق أو إضرارٌ الهم بغضب، أو حقد أو رغبة في الملك، فيُحتاج في ذلك إلى جمع رجال، ونصب قتال."[3]

اور خلل (پیدا کرنے والی چیزوں) میں سے یہ بات ہے کہ کچھ شریر لوگ، جن کو قوت و دبدبہ حاصل ہو گیا ہو، خواہشات کی پیروی کرنے اور انصاف کی راہ چھوڑنے پر متفق ہو جائیں یا تو لوگوں کے اموال کے لالچ میں رہزن ہیں، یا کسی غصہ یا کینہ کی وجہ سے لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لیے ملک کی طمع میں ہوتے ہیں۔ پس اس صورت میں لوگوں کو اکٹھا کرنے اور جنگ شروع کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

برصغیر کی تاریخ میں مغل دورِ اقتدار بہت مستحکم اور طویل دور ہے لیکن وہ بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر رہا۔ کیونکہ۔

"Like all other empires of the world, the Mughal empire decayed when it ceased to fulfil the function of uplifting and unifying the people.(4)

دوسری کئی سلطنتوں کی طرح مغلیہ سلطنت بھی اس وقت زوال پذیر ہوئی جب اُس نے عوام کو متحد کرنا اور ان کی بہبود کا کام کرنا چھوڑ دیا۔

جب کوئی حکومت معاشی تعطل کا شکار ہوتی ہے تو وہ اپنا سیاسی جواز کھو دیتی ہے جس سے باہم مخاصمت کی بنیاد پڑتی ہے، شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں

"جب لوگ آپس میں لین دین کرنے لگے تو چونکہ عام طبیعتوں میں بخل اور حسد کے جذبات، غصب حقوق یا انکار حقوق اور ٹال مٹول کرنے کی عادات پائی جاتی ہیں اس لیے باہمی اختلافات پیدا ہوئے اور نزاع و خصومت کی بنیاد پڑی"[5]

معاشی عدم استحکام کی بنا پر اسلامی ریاست پستی اور گراوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ حکمران عیش و عشرت، شاہ خرچیوں اور رنگ رلیوں میں مشغول ہو کر رعیت کے حقوق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے خلاف رعایا کے ذہنوں میں نفرت اور حقارت کے جذبات ابھرتے

---

[1] السیاسۃ الشرعیۃ، ص ۲۸

[2] کتاب الخراج، ص ۱۳۹

[3] حجۃ اللہ البالغۃ ۱/۴۴۳؛ شاہ ولی اللہ گذشتہ شاہان و ملوک اور ان کی رعایا کی حالت بیان کرتے ہوئے سلطنت مغلیہ کے امراء و ارکان کی عیش پسندانہ حالت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں "وما تراہ من ملوک بلادک یغنیک عن حکایاتھم" (حجۃ اللہ البالغۃ ۱/۸۳) اپنے ملک کے ملوک و امراء کی حالت دیکھنے کے بعد ان شاہانہ ماضی کے حالات بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

(4) Siddique, Mazheruddin, Development of Islamic state and society, Publisher Insitute of Islamic culture, Lahore, 1982, P-285.

[5] حجۃ اللہ البالغۃ ۱/۱۰۹۔

ہیں اور داخلی اتحاد مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے۔

معاشی طور پر مستحکم اور ترقی یافتہ ممالک معاشی ناکہ بندی کے ذریعے اکثر ممالک کو عدم استحکام اور مسائل سے دوچار کرتے رہے ہیں۔ موجودہ عہد میں تو تمام عالمی سازشیں، جنگیں اور ملکوں کے درمیان چپقلش سب معاشی بالادستی کے پس منظر میں چل رہی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بجا نہیں ہوگا کہ معاشی طور پر مستحکم طاقتیں کسی ترقی پذیر ملک کو سزا دینا چاہیں تو وہ فوراً اس ملک کی معاشی ناکہ بندی کر دیتی ہیں اور اگر کسی ملک کو سراہنا مقصود ہو یا کسی ملک سے ان کے مفادات وابستہ ہیں تو وہ فوراً اسے معاشی امداد کا لالچ دے کر اپنے مفادات کے حصول کے لیے وہاں ریشہ دوانیوں کا جال بچھا دیتی ہیں جو ممالک مادی وسائل سے مالا مال ہیں۔ عالمی قوتیں ملک ان کے وسائل پر براہ راست کنٹرول حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔

معاشی استحکام کے لیے حکمت عملی

ریاست کی معاشی تعمیر و ترقی، اس کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کی بنیاد اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط ہے۔ معاشی ترقی و خوشحالی کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کا پھیلاؤ معاشرے کے تمام طبقوں اور پیشوں کی طرف ہوتا کہ وہ پسماندہ افراد کی حالت میں مثبت تبدیلی پیدا کرے۔ انہیں حقوق، اعتماد اور خوشحالی فراہم کرے۔ غیر منصفانہ معاشی تفاوت کو کم کرے کیونکہ مراعات یافتہ طبقہ کی تعیشاتی سطح میں بے پناہ اضافہ، ترقی کی بجائے تنزلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ انسانی زندگی میں معاشیات کی حیثیت ہمیشہ مسلمہ رہی ہے اسلام جو ایک فطری مذہب ہے اس نے بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس نے مال کو انسان کے لیے مایۂ زندگی قرار دیا اور فضول ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا﴾[1]

''اور نادانوں کو اپنے مال نہ دے دو جنہیں اللہ نے تمہاری (زندگی کے) لیے سہارا بنایا ہے، اور انہیں اس مال سے کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے بھلائی کی بات کہو''۔

پیر کرم شاہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اسلام اگرچہ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ناجائز استعمال کی اجازت نہیں دیتا اگر کوئی شخص اپنی دولت کو یوں خرچ کرنا شروع کر دے جس سے اس کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور قوم کا نظام اخلاق اس کی بے راہ روی سے داغدار ہو رہا ہو تو حکومت کو حق پہنچتا ہے بلکہ حکومت پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کی مطلق العنانی کو مقید کر دے۔[2]

معاشی خوشحالی اور استحکام خود بخود حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے حکومتی سطح پر مختلف اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں سب سے پہلی چیز مربوط منظم تصورات کا ایسا مجموعہ (Doctrines) فراہم کرتا ہے جو عوام کی فکر و نظر کی رہنمائی کرے۔ ان کا رخ متعین کرے اور ان کے اندر ایک جذبہ اور امنگ پیدا کرے اور ان کے سامنے ایک ایسا معیار رکھے، جس سے وہ اپنی ترقی و تنزلی کی پیمائش کر سکیں۔

حکومت کے وہ اقدامات ہیں جو ترقی کو فروغ دینے اور اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں، اس میں ان عوامل کو تحریک دینا شامل ہے، جو ترقی اور استحکام کا باعث بن سکتے ہیں۔ حسب ضرورت ان میں تبدیلی پیدا کرنا اور نئے نئے مفید عوامل کو بھنا

---

[1] النساء ۴: ۵

[2] ضیاء القرآن، ۱/ ۳۶۹

اور انہیں اختیار کرنا وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً معاشی ذرائع و وسائل کا بھرپور اور بہترین استعمال، انہیں پیداواری کاموں میں لگانا اور نفع بخش بنانا تاکہ قومی آمدنی میں اضافہ ہو۔

معاشی ترقی اس عمل کو واضح کرتی ہے جہاں ایک ملک یا خطے کے لوگ اپنی آمدنی اور خدمات میں فی کس اضافے کے لیے مہیا وسائل کو استعمال میں لائیں۔

لہٰذا عبدالمنان معاشی ترقی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"As a matter of fact, economic development means increase in the percapita income of the people at a given period of time. It views economic organisation of a society as a production unit Economic growth measures the capacity of the economy to increase national income, but both the money cost and real cost remain unaltered, for, if the increase in proportion or the increase in national income, it can not be called economic development in the real sense of the term."(1)

دراصل معاشی ترقی مخصوص مدت میں لوگوں کی فی کس آمدنی میں اضافہ کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ کسی معاشرے کی معاشی تنظیم کو بطور پیداواری یونٹ کے دیکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں قومی آمدنی میں اضافہ، معاشی ترقی ہے۔ لیکن منافع اور اصل قیمت بغیر تبدیلی کے رہتے ہیں کیونکہ اگر تناسب میں اضافہ یا قومی آمدنی میں اضافہ ممکن نہ ہو تو اس کو صحیح معنوں میں معاشی ترقی نہیں کہہ سکتے۔

اس طرح نئے طریق پیدائش اختیار کرنا، تقسیم کار کا نیا عمل اپنانا، پیداوار میں تخصص حاصل کرنا بچتوں کی عادت ڈالنا اور انہیں سرمایہ کاری کے مختلف چینلز میں استعمال کرنے کی ترغیب دینا اور سہولیات مہیا کرنا تاکہ اس کی شرح نمو (Growth Rate) میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

ڈاکٹر منظر لکھتے ہیں۔

"The Islamic government assumes the responsibility of development for three reasons First, it is required to guarantee a minimum standard of living to all its citizens, second, it is obliged to expend a part of its available resources for the world wide, propagation of the message of Islam, and third, it is also bound to build a strong country and a strong society which is capable of sustaining an effective ideological stand in the

---

(1) *M.A Mannan, Islamic Economics Theory and Practice (A Comparative Study) Published by Sh. Shahzad Riaz, 1991, P-338-339.*

international arena "(1)

اسلامی حکومت ترقی کی ذمہ داری تین وجوہات پر قبول کرتی ہے۔ پہلی وجہ تمام شہریوں کو کم سے کم معیار زندگی کی ضمانت دینا ہے، دوسری یہ کہ یہ اپنے دستیاب شدہ وسائل کے ایک حصہ کو اسلام کا پیغام پوری دنیا میں پھیلانے کی ذمہ دار ہے۔ تیسری یہ کہ ایک مضبوط ملک اور مستحکم معاشرہ تعمیر کرنے کی پابند ہے جو بین الاقوامی برادری میں ایک موثر نظریاتی موقف اختیار کرنے کی اہل ہو۔

معاشی استحکام اور ترقی و خوشحالی کے بارے میں خود اسلامی نظریے اور حکمت عملی کا جامع اور واضح تصور بھی آپؐ اور خلفائے راشدین ہی کے عہد مبارک پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ ان کے ادوار میں اسلامی ریاست معاشی ترقی کے بام عروج تک پہنچی اس میں تمام روحانی، اخلاقی، مذہبی، تہذیبی، نفسیاتی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی عوامل و متغیرات نے بھرپور کردار ادا کیا۔

محمد اسد کے معاشی افکار کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ مسلم ممالک میں صدیوں سے رائج جاگیرداری اور زمینداری کے نظام کو ناجائز و باطل گردانتے ہیں۔ (2)

وہ اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

''اسلام اپنے اصول و تعلیمات کے ذریعے جو اجتماعی و معاشی اعتدال و توازن قائم کرنا چاہتا ہے اور جس طرح کے سیاسی اور تمدنی حالات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ موجودہ جاگیرداری اور زمینداری کا نظام نہ صرف یہ کہ اس کی راہ میں مانع ہے بلکہ معاشی ناہمواری، اونچ نیچ اور ظلم و استحصال کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ جس میں ایک جاگیردار و زمیندار دوسروں کی محنت کا پھل بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے گھر میں بیٹھے بیٹھائے کھا جاتا ہے اور بندگان خدا کی ایک بڑی تعداد ظلم و استحصال سے دوچار ہوتی ہے یہ نظام صدیوں سے مسلم ممالک کی اقتصادی بدحالی کا ایک بہت بڑا سبب بھی رہا ہے۔'' (3)

لہٰذا بڑی بڑی جاگیروں کے خاتمہ سے متعلق ان کی تجویز معاشی ظلم و استحصال کے خاتمے اور مفاد عامہ کے تحفظ کے لیے بڑی موزوں معلوم ہوتی ہے۔ اسلام میں معیشت سے مقصود محض نفع کمانا نہیں بلکہ انسانی ہمدردی، باہمی تعاون و توافق اور خدمت خلق ہے۔ مادی منفعت ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے نبی اکرمؐ نے معیشت کی ان تمام صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے جن میں لوگوں کا استحصال ہو یا ان کے ساتھ کسی قسم کی دھوکہ دہی ہو۔

---

(1) Monzer Kahf, Dr The Islamic Economy, Publisher the muslim students association, Canada, 1978, P-45.

(2) متعدد علماء نے پاکستان اور بعض دیگر مسلم ممالک میں رائج جاگیرداری و زمینداری کے نظام کو غیر اسلامی، اسلام کے اصول معاشی و سماجی عدل کے سراسر منافی نیز معاشی ظلم و استحصال کا ایک بڑا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے خاتمے کے حق میں دلائل دیے ہیں۔ ملاحظہ ہو (گیلانی، مناظر احسن، اسلام اور نظام جاگیرداری و زمینداری، طبع محکمہ اوقاف، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۳۷۱-۳۷۷)، نور محمد غفاری، "اسلام میں جاگیرداری اور زراعت، منہاج (لاہور)، ۸:۲، (اپریل ۱۹۹۰ء)

مولانا تقی امینی نے نظام جاگیرداری و زمینداری کے نظام کو غیر اسلامی، اسلام کے اصول معاشی و سماجی عدل کے منافی نیز معاشی ظلم و استحصال کا ایک بڑا ذریعہ قرار دیا ہے، اور اس کے خاتمے کے حق میں دلائل دیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: اسلام کا نظام اراضی، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۶-۱۱۸)۔

پاکستان میں اس نظام کے ہاتھوں غریب کسانوں اور دیگر طبقات پر ڈھائے جانے والے مظالم نیز ملک کی سیاسی و سماجی زندگی پر مرتب ہونے والے اس کے منفی اثرات کا جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو (محمود مرزا، مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟ دارالتذکیر، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۶۳، ۶۷، ۷۶، ۷۹)۔

(3) Islam and Politics, P-4,5.

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشی ترقی اور استحکام کے لیے ایسے اقدامات کرے کہ کوئی بھی فرد معاشی طور پر بدحالی کا شکار نہ ہو۔

اس ضمن میں ایم اے ساکر لکھتے ہیں:

"Considers that the Islam.c state has a positive role in the economic field. Main areas are ideal investment of economic resources, prudent public spending, fight against monopoly and control over prices; control on advertisements, implementation of a just wage policy; equitable distribution of wealth, social security for citizens, planning and economic development, maintenance of monetary and financial stability and integration of muslim economics."(1)

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست معاشی نظام میں مثبت کردار ادا کرتی ہے، جس کے بنیادی عوامل یہ ہیں: معاشی ذرائع کا بہترین استعمال، دانشمندانہ عوامی تصرف، اجارہ داری کے خلاف محاذ آرائی، بڑھتی ہوئی قیمتوں پر قابو پانا، تشہیر پر قابو پانا، منصفانہ معاوضہ کی حکمت عملی کا نفاذ، دولت کی مساوی تقسیم، شہریوں کے لیے سماجی تحفظ، منصوبہ بندی اور معاشی ترقی، نظام زر کی برقراری، مالی استحکام اور مسلم معیشت کی سالمیت۔

عصر حاضر میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی زبوں حالی ہے۔ وہ اپنے معاشی تحفظ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسلام نے انسان کے فقر وفاقہ اور معاشی زبوں حالی کے حل کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ نہایت متوازن اور معتدل ہے وہ معاشرہ اور فرد دونوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھتا ہے۔ لہٰذا معاشی ترقی کے لیے ایک اسلامی ماڈل کی ضرورت ہے جو اپنے بنیادی حلقے اور اسلامی تصور کو اجاگر کرنے میں کردار ادا کرے۔ اس ضمن میں عہد نبوی وخلفائے راشدین کے خیالات، اقدامات اور پالیسیوں سے رہنمائی لینا ہوگی تاکہ اسلامی مملکت کی معیشت کو استحکام حاصل ہو۔

داخلی استحکام کے لیے معاشی استحکام لازمی شرط ہے۔ معاشی نظام مستحکم ہو، وسائل وافر مقدار میں موجود ہوں، افراد معاشرہ کی تمام جائز مادی ضرورتیں پوری ہو رہی ہوں اور سماجی وسیاسی ادارات کی ترقی ممکن ہو رہی ہو، بیروزگاری نہ ہو، ہر فارغ التحصیل کے لیے ملازمت مل جائے تو ایسے میں داخلی استحکام از خود ممکن ہوتا چلا جاتا ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں معاشی نظام کے استحکام یا عدم استحکام یا وسائل کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے داخلی نظام مستحکم یا غیر مستحکم ہوتا ہے۔ دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں سیاسی استحکام اس لیے نظر نہیں آتا ہے کہ وہاں وسائل کی کمی ہوتی ہے اور ترقی یافتہ ممالک کے سیاسی نظام اس لیے مستحکم نظر آتے ہیں کہ وہاں کی معیشت مضبوط ہوتی ہے اور وسائل لامحدود ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کا راز ہی ان کی مضبوط معیشت اور وسائل کی کثرت ہے۔

---

(1) *Sakr, M.A., The Role of the State in the Economics system of Islam (In Islam and a New International Economics order) The social Dimension, I.I.L.S, Geneva, 1980, P-105.*

مالیاتی بدعنوانیوں کا انسداد:

بدعنوانی معاشی ترقی کے لیے مضر ہے۔ معیشت کا انحصار ترقی پر ہو یا تنزلی پر، بدعنوانی ہر حال میں اسے متاثر کرتی ہے۔ جب حکومت عدل پرمبنی ہو تو آزادانہ سرمایہ کاری ترقی کے لیے سودمند ہوتی ہے لیکن اگر اس کا خاصہ بدعنوانی ہو تو غربت وافلاس افراد کا مقدر بن جاتی ہے۔

معاشی برائیوں کا قلع قمع کرنا اور ریاست کو بداعمالیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حاکم ایسے اقدامات کرے کہ سود کی لعنت ختم ہو، رشوت کا کاروبار بند ہو، منافع خوری سے تحفظ مل جائے، ذخیرہ اندوزی سے نجات حاصل ہو اور دیگر معاشرتی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو۔

معاشیات میں مالیاتی بدعنوانیوں پر ایک خاص اصطلاح "Mal Practice" استعمال ہوتی ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

"Dishonest or illegal behaviour especially of people in authority allegations of bribery and corruption."(1)

بالخصوص برسراقتدار لوگوں کا غیر ایماندارانہ یا غیر قانونی رویہ، جیسا کہ بدعنوانی اور رشوت کے الزامات۔

Bribery بھی corruption کا ہم معنی ہے، اس کی تعریف یوں کی گئی ہے

"The act of promising, giving, receiving, or agreeing to receive money or some other item of value with the corrupt aim of influencing a public offical in the discharge of his offical duties."(2)

کسی سرکاری عہدہ دار کے فرائض کی انجام دہی پر اثر انداز ہونے کے غلط مقصد کی خاطر اس کو کوئی رقم یا کسی قیمتی چیز کی پیش کش کا وعدہ، رقم دینا، وصول کرنا یا وصول کرنے پر رضامندی۔

کرپشن ایک طرف ملک کے اندر دولت کی تقسیم کو غیر عادلانہ بناتی ہے اور دوسری طرف سرکاری خزانہ عوام کی بجائے بااثر لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے وہاں پوری قوم اخلاقی طور پر بدعنوانی کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ رشوت کے ذریعے ہر کام ممکن ہو سکتا ہے۔ لوگ رشوت دے کر ہر جائز اور ناجائز کام کروا لیتے ہیں اور سرکاری کارندے رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔

جبکہ مالیات کی وصولی پر مامور عہدہ داروں کے بارے میں نبی کریم کا یہ فرمان منقول ہے

من استعملناہ علی عمل فرزقناہ رزقا فما اخذ بعد ذلک فھو غلول" ۳

ہم نے جسے کسی جگہ کا عامل مقرر کیا اور اس کے کام کا معاوضہ بھی مقرر کر دیا اگر وہ اس معاوضے سے زائد جو حاصل کرتا ہے تو یہ ناجائز آمدنی ہے۔

مالیات ومحاصل کے سلسلہ میں حضورؐ نے باقاعدہ طور پر اصول وضوابط رائج فرمائے۔ ان قواعد سے افسران مالیات کو خصوصاً آگاہ کیا

(1) Hornby, A.S, Oxford Advanced Learner's dictionary of current English oxford university press, 2005, P-931.

(2) Encyclopedia Britannica 2005, Delux Edition CD-ROOM. (Search in Bribery)

۳۔ الجامع الصحیح المسلم، کتاب الامارۃ، باب تحریم ھدایا العمال، رقم الحدیث ۱٤٦۳ تا ۱٤٦٤، ۱۸۳۲، سنن ابی داؤد، کتاب الخراج الامارۃ، باب فی ارزاق العمال، رقم الحدیث: ۱۱۷۳۔

جاتا تھا اور ان پر سختی سے عمل کروایا جاتا۔ باقاعدہ طور پر ان ہدایات پر عمل درآمد کی نگرانی کی جاتی تھی۔[۱]

اس سلسلہ میں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری لکھتے ہیں کہ:

''غزوہ بدر کے موقع پر لوگوں نے مال غنیمت انفرادی طور پر اکٹھا کر لیا نبی کریمؐ نے یہ مال سرکاری خزانے میں جمع کر دیا اور اسے سب لوگوں میں برابر تقسیم کر دیا۔''[۲]

آپ کا یہ محتاط رویہ آپ کا ذاتی جذبہ ایثار ہی نہ تھا بلکہ یہ رہتی دنیا تک کے حکمرانوں کے لیے ایک مثال تھی کہ ملی بے قاعدگیوں کو روکنے کے لیے سب سے پہلے حکمران کو اپنی مثال پیش کرنا ہوگی۔

آپؐ کی اس پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر سرکاری آمدنی حکمران کی آمدنی سمجھ لی جائے تو حکمران کے قریبی لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اگر یہ معلوم ہو کہ یہ دولت حکمران کے لیے حرام ہے تو ماتحت افسروں کو ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ حکمران ان کا محاسبہ کرے گا اس لحاظ سے یہ نہایت اہم بات ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کی کسی اور قوم نے سرکاری آمدنی حکمران کی ذات کے لیے ممنوع قرار نہیں دی یہ خصوصیت بھی صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔''[۳]

اسی بناء پر حضرت عمرؓ کے عمل محصولات کی وصولی کے لیے اموال کی مالیت کا نہایت عادلانہ اندازہ لگاتے تھے اور دیگر لوگوں کو بھی مشاورت میں شامل کرتے تھے تاکہ کسی قسم کی زیادتی نہ ہو۔

اس سلسلہ میں امام غزالی لکھتے ہیں:

"من الاغنياء قليل بالاضافة الى مايخاطربه من نفسه و ماله لو خلت خطة الاسلام (البلاد) عن ذى شكوة بحفظ نظام المرور ويقطع مادة الشرور وكان هذا لايخلوعن شهادة أصول معينة فانّ لولى الطفل عمارة القنوات (اى قنوات الأرض الخاصة بالطفل) واخراج أجرة الفصاد ولمن الأدوية (اى العائدة الى الطفل) وكل ذلك تنجيز خسران لتوقع ماهو اكثرمنه"[۴]

ایسے بہت کم مالدار ہوتے ہیں جو اسلام کی خاطر اپنا روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ اگر وہ یہ کام سرانجام دیں گے تو ملک کا نظام محفوظ ہوگا، فتنہ وفساد ختم ہوگا اور امن وامان قائم ہوگا، یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کوئی اصول نہ ہو۔ جیسے ولی اپنے بچے کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے دوا سے علاج کرتا ہے (یعنی اس پر خوب روپیہ خرچ کرتا ہے)۔ (اسی طرح حاکم کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ نظام کو بچانے کے لیے امور مملکت میں دل کھول کر روپیہ پیسہ خرچ کرے)۔ اور ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے زیادہ مشقت کی ضرورت ہے۔

حضرت عمرؓ کی پالیسی موجودہ حکومتوں کی مالیاتی پالیسی سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ عصر حاضر میں حکومت کو اپنی مترفانہ طرز زندگی کی بناء پر اتنی فراغت حاصل نہیں ہوتی کہ وہ دوراندیشی سے کام لے کر غریب عوام کی قبل از وقت خبر لے سکے۔ جب رعایا پر کوئی بلا یا آفت نازل

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں ''آپؐ نے مسجد نبوی سے متصل یک کمرے کو بیت المال کے طور پر مختص فرما رکھا تھا اس کمرے کی خصوصی نگرانی کی جاتی تھی اس کمرے میں رقم اور اجناس رکھی جاتی تھیں۔ حضرت بلالؓ اس کی نگرانی پر مامور تھے۔ (خطبات بہاولپور، ص ۱۸۳) ڈاکٹر حمید اللہ اس کمرے کو پہلا بیت المال اور حضرت بلالؓ کو پہلے وزیر مال قرار دیتے ہیں۔

۲۔ مبارکپوری، مولانا، صفی الرحمن، الرحیق المختوم، المکتبۃ السلفیۃ، شیش محل روڈ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۱۰

۳۔ خطبات بہاولپور، ص ۳۳۶

۴۔ الغزالی، ابوحامد، محمد بن محمد، المستصفی من علم الأصول، المطبعۃ الامیریۃ بولاق مصر المحمیۃ، ۱۳۲۲ھ، ۱/۳۰۴، ۳۰۵

ہوتی ہے تب وہ اپنے خزانہ کا دہانہ اس کے لیے کھولتی ہے جس سے غریب کم اور امیر زیادہ مستفید ہو جاتے ہیں اور ساتھ قومی خزانہ کا بھی کافی نقصان ہو جاتا ہے۔

موسیٰ بن طریف کہتے ہیں کہ:

''حضرت علیؓ بیت المال میں داخل ہوئے اور انہوں نے اسے بے وقعت سی چیز سمجھتے ہوئے کہا میں شام ہونے سے پہلے پہلے تیرے اندر ایک درہم بھی باقی نہ چھوڑوں گا۔ پھر انہوں نے بنی اسد کے ایک "دی" کو حکم دیا کہ وہ اس کا مال تقسیم کر دے اور اس نے وہ مال تقسیم کر دیا حتیٰ کہ شام ہوگئی۔ ان سے کہا گیا امیر المومنین اگر آپ اسے کچھ معاوضہ دے دیں تو کیسا رہے گا؟ انہوں نے کہا یہ اس کی مرضی پر ہے مگر یہ حرام ہے۔''[۱]

ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام محکمہ جات میں رشوت کے خاتمہ کے لیے تعلیمات نبویؐ اور تعلیمات خلفائے راشدین کو عام کیا جائے تاکہ مدرزمین خوف خدا اور آخرت کی پکڑ سے ڈر کر رشوت لینا دینا چھوڑ دیں۔

مالیاتی بدعنوانیوں کے انسداد کے لیے حضرت علیؓ نے اپنے عمال کو لکھا

أَمَّا بَعْدُ، فَلَا تُطَوِّلَنَّ احْتِجَابَكَ عَنْ رَعِيَّتِكَ، فَإِنَّ احْتِجَابَ الْوُلَاةِ عَنِ الرَّعِيَّةِ شُعْبَةٌ مِنَ الضِّيقِ، وَقِلَّةُ عِلْمٍ بِالْأُمُورِ، وَالِاحْتِجَابُ مِنْهُمْ يَقْطَعُ عَنْهُمْ عِلْمَ مَا احْتَجَبُوا دُونَهُ فَيَصْغُرُ عِنْدَهُمُ الْكَبِيرُ وَيَعْظُمُ الصَّغِيرُ، وَيَقْبُحُ الْحَسَنُ وَيَحْسُنُ الْقَبِيحُ وَيُشَابُ الْحَقُّ بِالْبَاطِلِ.[۲]

پھر آپ اپنی رعیت سے بہت وقت دور اور چھپ کے نہ رہنا اس لیے اگر حکام کو رعیت کی حالت سے خبر نہ ہو تو اس وجہ سے ایک قسم کی تنگی اور تکلیف آتی ہے اور حاکم کو بہت سے کاموں پر علم حاصل نہیں ہوتا اور حاکموں سے وہ چیز غائب ہو جائے گی جو لوگ غائب کرنا چاہتے ہیں تو نتیجہ میں حاکموں کو بڑا کام چھوٹا اور چھوٹا کام بڑا نظر آئے گا۔ نیک کام بدکام اور بدکام نیک کام نظر آئے گا، تو حق باطل کے ساتھ مل جائے گا۔

اس ضمن میں مولانا سعید الرحمٰن علوی لکھتے ہیں کہ:

''اس مقصد کے لیے حکومتی نظام ٹھیک ہونا از بس لازم ہے کہ اسی پر سارا انحصار ہے جب حکومت کے ذمہ دار راشی، بددیانت، سیم وزر کے بندے، اقربا پرور اور حکومتی حاضریوں سے مستثنیٰ ہوں گے، جب ان میں سے ایک ایک رہائش کے لیے ایکڑوں میں پھیلی کوٹھیاں ہوں ایک ایک کے لیے کئی گاڑیوں کا بیڑا ہوگا، ضیافت و مہمان نوازی کے لیے لمبے چوڑے فنڈ ہوں گے اور بغیر کسی حساب و آڈٹ کے ہنگامی ضروریات کے لیے بے پناہ فنڈ ز ایک ایک گورنر اور وزیر اعلیٰ کی ڈسپوزل پر ہوں گے تو معاشرہ میں بربادی نہ ہوگی تو کیا ہوگا۔''[۳]

اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی کے بگاڑ کے اصلاح کے لیے ایسے ذرائع آمدن اور ملکیت کی چھان بین کرے جو شریعت کی خلاف ورزی کر کے حاصل کیے گئے ہوں ایسا ہو سکتا ہے کہ بگڑے ہوئے حکمران کی ملی بھگت یا نا اہلی سے ملک کا ایک طبقہ دوسرے لوگوں کو اپنی معاشی قوت سے نشانہ استحصال بناتا رہے۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے ادوار کی نشان دہی کرنا مشکل نہیں۔ قرون اولیٰ میں خلفائے راشدینؓ کے بعد بنی امیہ کے حکمرانوں نے اقربا پروری، ظلم و غصب اور ناجائز دولت کے بہت سے ذرائع استعمال کر کے بڑی بڑی جاگیریں بنالی تھیں۔ اس بدعنوانی اور خیانت کی بناء پر اسلامی ریاست کی معاشی زندگی میں عدم توازن پیدا ہو گیا۔

۱۔ کتاب الخراج، ص ۱۳۶

۲۔ عبدہ، الشیخ محمد، نہج البلاغۃ، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۰ء، جز ۳/۶۱۲

۳۔ علوی، سعید الرحمٰن، مولانا، اسلامی حکومت کا فنی تصور، ناشر مکتبہ جمال، لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۳ء، ص ۲۹-۳۰۔

اس کے تدارک کے لیے قاضی ابو یوسفؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نقطہ نظر بیان کیا ہے

''ان کی ساری توجہات بس اس پر مرکوز تھیں کہ مغصوبہ املاک واپس لیں اور لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔''[۱]

کسی بھی ریاست کی مضبوط معیشت، مادی وسائل کی فراوانی، بہت سی معاشرتی کمزوریوں کے خاتمے کا باعث ہو کر عمومی معاشرتی خوشحالی، اطمینان اور طرزِ زندگی میں ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے افراد معاشرہ اپنے فرائض منصبی کو ایمانداری اور بدعنوانیوں سے دور ہو کر سرانجام دیتے ہیں۔ اس بناء پر ہر نظام زندگی کا صحت مند ارتقاء و استحکام ممکن ہوتا ہے اور یوں معاشرہ ترقی، خوشحالی اور استحکام سے ہمکنار ہو کر بین الاقوامی سطح پر اپنا تشخص اجاگر کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر مالی وسائل کی ملک میں قلت ہو، معیشت تباہ حال ہو تو افراد کے طرزِ عمل میں ہر طرح کی برائیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ لوگ ایسے حالات میں بدعنوانیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ یوں ملکی فرائض کی بجا آوری موثر طریقے سے نہیں ہو پاتی اور بالآخر ملک و معاشرے میں انحطاط واقع ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال پاکستان کی بھی ہے۔ کمزور ملکی معیشت اور وسائل کی قلت نے ہر شعبۂ زندگی کو نہ صرف انحطاط پذیر کیا بلکہ عوام اور ادارات میں کرپشن، رشوت، لوٹ کھسوٹ اور دیگر کئی طرح کی بدعنوانیوں کو بھی فروغ دیا۔ سیاستدانوں نے سیاست کو منافع بخش کاروبار سمجھ کر اس میں حصہ لیا۔ بدعنوانیوں اور ذاتی ضروریات کی تکمیل کے طرزِ عمل کو اپنے سیاسی کردار کا جزو بنا لیا۔ اس صورت حال کا منطقی نتیجہ بالآخر سیاسی عدم استحکام کی شکل میں سامنے آیا۔

۱۔ کتاب الخراج، ص ۵۹

عمال حکومت کا نگران:

ملی استحکام کے لیے حکومت کے چھوٹے بڑے تمام عہدوں پر انتہائی دیانتدار، اہل، باصلاحیت اور خادم (نہ کہ حاکم) بن کر قوم کی خدمت کرنے والے افراد کا تقرر از بس ضروری ہے۔ بددیانت، کرپٹ اور نااہل لوگ نہ صرف ملک کا وقار بلند نہیں کر سکتے بلکہ ملکی سالمیت و بقا کو بھی خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔

اسلام میں کوئی بھی حکومتی عہدہ، ایک امانت اور انتہائی ذمہ داری کی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں کانٹوں کی سیج ہے نہ کہ پھولوں کی۔ کوئی حکومت اگر کسی نااہل آدمی کو کسی منصب پر فائز کرتی ہے تو قرآن مجید اسے خیانت قرار دیتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾(۱)

اے مومنو! اللہ اور اس کے رسولؐ سے خیانت نہ کرو، نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم خیانت کے وبال سے واقف ہی ہو۔

اس آیت مبارکہ کی تشریح میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

"فان عدل عن الأحق الأصلح الى غيره، لأجل قرابة بينهما، أو ولاء عتاقة أو صداقة، أو موافقة في بلد أو مذهب أو طريقة أو جنس، كالعربية والفارسية والتركية والرومية، أو لرشوة يأخذها منه من مال أو منفعة، أو غير ذلك من الأسباب، أو لضغن في قلبه على الأحق، أو عداوة بينهما، فقد خان الله ورسوله والمؤمنين، ودخل فيما نهى عنه في قوله تعالىٰ (۲)

پس اگر والی (حاکم وقت، گورنر یا کوئی بھی مجاز افسر) جادۂ استقامت سے ہٹ گیا یا زیادہ حقدار اور اصلح کو نظر انداز کر کے کسی قرابت یا ولاء عتاقہ (یعنی کسی شخص کے ساتھ ناراضگی و دشمنی کی وجہ سے اسے محروم رکھنے) یا ولاء صداقت (یعنی کسی شخص کے ساتھ دوستی کی وجہ سے نوازنے) کی وجہ سے یا کسی آبادی میں موافقت اور دوستی ہوگئی ہے اس لیے، یا مذہبی موافقت (یعنی ہم مسلک ہونے) کی وجہ سے، یا کسی اور طریقے سے، یا باہم ایک قومیت ہونے کی وجہ سے مثلاً عربی، ایرانی، ترکی اور رومی ہونے کی وجہ سے یا رشوت کی وجہ سے، یا کسی دوسری سیاسی و سماجی اور معاشرتی منفعت کی وجہ سے، یا اس قسم کے دوسرے اسباب کی وجہ سے، یا زیادہ حقدار اور اصلح (یعنی بہتر منتظم) سے کینہ و عداوت رکھتا ہے، اس لیے مستحق، حقدار اور زیادہ اصلاح کرنے والے کو چھوڑ کر غیر حقدار، غیر مستحق اور غیر اصلاح کو مقرر کیا تو یقیناً وہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ اور عام مسلمانوں کے ساتھ خیانت کر رہا ہے اور ایسا شخص مذکورہ بالا آیت کا مصداق ہے۔

ایک حکومت کے بہترین نظم و نسق کا دارومدار بنیادی طور پر اس بات پر ہے کہ جس عہدہ کے لیے جس شخص کا انتخاب کیا جائے وہ بہمہ وجوہ اس کے لیے موزوں ہو۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ فرماں روائے وقت میں مردم شناسی کا جوہر ہونا چاہیے۔

اس سلسلہ میں علامہ قادری لکھتے ہیں:

"العلم والخبرة بالأمر المسند الى المرء كالبصر الذى لاقدرة له على رؤية الأشياء بدونه، فالذي لاخبرة له ولاعلم بالأمر لا قدرة له على القيام به، وتكليفه القيام بذلك، وإسناده اليه من الظلم له،

۱۔　　الانفال ۸:۲۷

۲۔　　السياسة الشرعية: ص ۱۱

ولكل من له به علاقة لذلک حرص الشارع الحكيم أن يكون من يلى اىّ أمر من الأمور على علم به"[1]

سپردشدہ کام کا علم اوراس کو سمجھنا نظر کی طرح ہے جس کے بغیر انسان چیزیں نہیں دیکھ سکتا تو جس کو متعلقہ کام کا علم اور سمجھ نہ ہو وہ اس کام کے کرنے پر قادر نہیں ہوسکتا اور اس کو اس کام کا مکلف کرنا اور اس کے سپرد کرنا ظلم ہے اور ان لوگوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو اس کام سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے شارع حکیم نے بڑی تاکید کے ساتھ یہ حکم دیا ہے کہ جس کو کام سپرد کیا جاتا ہے چاہیے کہ متعلقہ کام کا علم اور سمجھ اس میں ہو۔

علامہ غالب قرشیؒ لکھتے ہیں:

"و كان يكلف بالأمور الهامة من هولها اهل، ومن يرى بانه لن يقصر فى عمله ولن يعجزعنه أويز ثم نفسه فيه ولايولى غير القادرين على التمام، ولايولى الضعفاء جلائل الاعمال، وعويصها مهما كانت تقواهم، وثقتهم، ولو طلبوا ذلک يرداد التاكيد فى منعهم"[2]

رسول اللہؐ بڑے مناصب پر ان افراد کی تقرری فرماتے تھے کہ جو ان کے لیے اہل تھے اور نہ وہ اپنے منصب میں کوتاہی کرنے والے تھے اور نہ قاصر تھے اور نہ ہی اپنے منصب میں گناہ کے مرتکب ہونے والے تھے۔ رسول اللہؐ ان لوگوں کی تقرری نہیں کرتے تھے جو اپنے منصب کے فرائض سنبھالنے پر قادر نہ ہوتے تھے اور نہ ضعیف لوگوں کو بڑے کام اور پیچیدہ منصوبے حوالہ کرتے اگرچہ زیادہ متقی اور معتمد ہوتے تھے اور اگر وہ اس کام اور منصب کا مطالبہ کرتے تو رسول اللہؐ انہیں بڑی تاکید کے ساتھ منع فرماتے۔

جب امیر کسی کو عہدہ پر مامور کرے تو اسے چاہیے کہ ان (کارکن) کے ماضی پر نظر رکھے، اگر اس کا ماضی بے داغ ہو تو متعلقہ عہدہ سپرد کردے اور اگر اس پر ثبوت تہمت ہو تو عہدے سے دور رکھا جائے۔

جبکہ عصر حاضر میں عہدے محض میرٹ اور ذاتی اہلیت کی بجائے زیادہ تر اقرباء پروری، جماعتی وسیاسی وابستگی، ذاتی پسند وناپسند، سفارش اور رشوت کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں اور ایسے نااہل لوگوں کو دیے جاتے ہیں جن کی نااہلی کی وجہ سے سرکاری ادارے تباہ ہو جاتے ہیں۔

مثلاً:

"مملکت پاکستان میں لوٹ مار اور کرپشن اتنی عروج پر پہنچی کہ پاکستان دنیا کے کرپٹ ممالک میں دوسرے نمبر پر آگیا (اداریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور، مورخہ ۱۹ر جولائی ۱۹۹۶ء) اور یہ دوسرا نمبر بھی کک مکا کر کے کرایا گیا ورنہ پاکستان کرپشن میں پہلے نمبر پر تھا (روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۶ء) مختلف بڑے بڑے حکومتی اداروں میں دو ارب روپے کی روزانہ کرپشن خورد برد اور ان کی زیرو بلکہ نقصان دہ اور خسارہ زدہ کارکردگی کا اعتراف وزیر اعظم پاکستان جیسے باخبر اور ذمہ دار آدمی نے علی الاعلان کیا ہے۔"[3]

لہٰذا ملکی استحکام کے لیے ناگزیر ہے کہ حکومتی عہدوں پر صرف میرٹ کی بنیاد پر اہل اور ایسے بے لوث لوگوں کا تقرر کیا جائے جو "حکمران اور محکوم کی سامراجی ذہنیت کی جگہ "خادم ومخدوم" کی اسلامی سوچ رکھتے ہوں۔"[4]

۱۔ الكفاءة الادارية، ص ۱۹

۲۔ القرشى، غالب بن عبدالكافى، اوليات الفاروق فى الادارة والقضاء، طبع موسسة الكتب الثقافية، قطر، س ن، ۱/ ۳۶

۳۔ ریڈیو، ٹی وی پر قوم سے خطاب، مورخہ ۱۳ر مارچ ۱۹۹۷ء

۴۔ حافظ محمد سعد اللہ، مدیر مسئول، استحکام پاکستان کا حصول (سیرت طیبہ کی روشنی میں) منہاج، طبع دیال سنگھ لائبریری لاہور، ۱۵، ۳ (۱۹۹۷ء)، ص ۱۶۰

اسلامی مملکت میں بالخصوص اور ایک عام مملکت میں بالعموم حکومت کے کارندوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جدید ریاست میں بھی اس اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ حکومت کی کامیابی کا دارومدار اور کسی نظام کی کامیابی کی ضمانت اس میں ہوتی ہے کہ اس نظام کو چلانے والے لوگ کس قسم کے ہیں؟ اسلامی ریاست میں یہ اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایک نظریاتی اور فلاحی ریاست ہوتی ہے۔ چنانچہ اس اہمیت کے پیش نظر اسلام نے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے کہ اہل حل وعقد ایسے ہونے چاہئیں جو اسلامی ریاست کے مقصد تاسیس سے مطابقت رکھتے ہوں۔

عمال حکومت کا احتساب

قیام امن واستحکام اور انسداد مظالم کے لیے نفس قانون کافی نہیں ہے تاوقتیکہ انسانوں کے قلوب واذہان پر خوف مسئولیت موجود نہ ہو۔ کسی مملکت کا قانون و آئین کو کیسا ہی مرتب اور منظم ہو لیکن اگر معاشرے میں احتساب کا نظام موجود نہ ہو یعنی حکام کی نگرانی، ان کی غلط باتوں پر تنقید، نکتہ چینی اور گرفت کا اہتمام نہ ہو، عوام کے اخلاق و کردار کا محاسبہ نہ ہوتا ہو فواحش و منکرات دارو گیر نہ ہوتی ہو تو ایسے معاشرے میں بدانتظامی، قواعد وضوابط کی خلاف ورزی، ناروا کارروائی، حق تلفی، ناانصافی، اقرباء پروری، دوست نوازی، رشوت ستانی اور دیگر مالی، قانونی اور انتظامی بدعنوانیاں پیدا ہو جاتی ہیں ایسی صورت میں امن واستحکام کی تمنا جاگتے میں خواب دیکھنے کے مترادف ہو جاتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ احتساب کا مقصد صرف مملکت ہی کے لیے بہتر نظم ونسق قائم کرنا نہیں، بلکہ اخلاق عامہ کی ترویج واشاعت بھی ہے۔ یہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ سب بلاتفریق وامتیاز اپنے اعمال اور لغزشوں، یہاں تک کہ اپنی نیتوں اور ارادے کے لیے بھی خدا کے حضور جوابدہ ہیں۔ اس لیے ایک اسلامی مملکت میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ انتظامیہ یعنی عمال حکومت کے موثر احتساب کی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کیا گیا اور اس کے لیے باقاعدہ ایک نظام کے قیام سے پہلوتہی نہیں کی گئی۔

عبدالرحمن احمد احتساب کے تعارف میں رقمطراز ہیں کہ:

> "Accountability denotes external control over the person to whom some duties have been assigned. Here, control refers to a constraint on the behavior of that particular person. The individual's behavior is constrained in that the only behavior permitted by the entity exercising control is the one that is essential for discharging his/her duty. When such constraint comes from outside the individual, the control exercised is external. How-ever, constraint can also come from within the person. This is the so-called "inner check", sense of duty, or felt responsibility internalized by individuals.(1)

احتساب اس شخص کی بیرونی طور پر نگرانی کو کہا جاتا ہے جسے کچھ فرائض سونپ دیئے گئے ہوں، یہاں نگرانی مخصوص فرد کے رویے

---

(1) Abdul Rahman Ahmed, Administrative Responsibility: An Islamic Perspective, The American Journal of Islam Social Sciences, 13.4, P-25

پر پابندی کا نام ہے۔ افراد کے رویے پر یہ پابندی اس طرح سے لگائی جاتی ہے کہ اسے صرف وہ رویہ اپنانے کی اجازت دی جاتی ہے جو اس کے فرض کی بجا آوری کے لیے ضروری ہو۔ جب ایسی پابندی کسی باہر کے فرد سے متعلق ہو تو اسے بیرونی نگرانی کا عمل کہتے ہیں۔ تاہم یہ احساس پابندی کسی فرد میں بھی موجود ہو سکتا ہے۔ یہ ''ذاتی محاسبہ'' یعنی فرض کا شعور یا افراد کو ذاتی طور پر ذمہ داری کا احساس ہونا، کہلاتا ہے۔

پروفیسر عبدالحفیظ احتساب کا تعارف اور افادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''احتساب کا عمل اچھی حکومت کی خوبیوں میں سے ایک ہے۔ جس حکمران کو حکومت یا عوام کی فلاح و بہبود میں دلچسپی ہو، وہ اپنے اہل کاروں پر کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اختیارات کا غلط استعمال ایک فطری عمل ہے۔''[1]

اگر اسلامی ریاست میں احتسابی ادارہ مفقود ہو تو اس کے معاشرے میں کثیر الجہتی مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

خواجہ نظام الملک طوسی اس ضمن میں رقمطراز ہیں کہ:

''بدکاری علی الاعلان ہونے لگتی ہے اور وقاتی شریعت کو ٹھیس لگتی ہے۔''[2]

جب کہ احتساب کے نتیجے میں معاشرے پر مرتب ہونے والے خوش گوار اثرات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ماضی میں،

''احتساب کی وجہ سے خاص و عام سبھی خائف رہتے تھے۔ نتیجتاً جملہ امور منصفانہ طے پاتے تھے اور قواعدِ اسلام محکم و محترم رہتے تھے۔''[3]

اسلام ظلم و استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس کے لیے ایک بنیادی تقاضا بے لاگ احتساب ہے تاکہ قانون اپنی ہیبت اور رعب کے ساتھ عدل اجتماعی کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسلام میں دادرسی، عدل گستری، منکرات و فواحش پر سزا و مواخذہ کو اہم ترین انسانی فرائض میں شامل کر کے اسے مملکت اسلامیہ کا اولین فرض قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[4]

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ (جو لوگوں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے لوگ (آخرت میں ثواب سے) پورے کامیاب ہوں گے۔''

آیت کی تفسیر میں مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''قومی اور اجتماعی زندگی کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے بھائیوں کو احکام قرآن و سنت کے مطابق اچھے کاموں کی ہدایت اور برے کاموں سے روکنے کو ہر شخص اپنا فریضہ سمجھے۔ آیت کریمہ میں پوری امت پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔''[5]

۱۔ عبد الحفیظ، وفاقی محتسب، تعارف اور افادیت کا تنقیدی جائزہ، مطبع شوذب پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۵

۲۔ طوسی، نظام الملک، خواجہ ''سیاست نامہ'' اردو ترجمہ محمد منور، مجلس ترقی ادب، نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰

۳۔ ایضاً، ص ۴۹

۴۔ آل عمران ۳:۱۰۴

۵۔ معارف القرآن، ۲/۱۳۶-۱۳۷

اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے بہت سے مراحل ہوتے ہیں۔سب سے پہلا مرحلہ ملامت نفس ہے اور ایک مرحلہ ریاستی اور حکومتی سطح کا ہے۔اس کے تحت سلطنت کا امام،وزراء،عمال اور امراء مسئولیت میں عام مسلمانوں کے برابر قرار دیئے گئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عہد نبویؐ میں رسول اللہؐ نے بحیثیت محتسب اعلیٰ اسلامی ریاست میں عمل احتساب اور محاسبہ نفس کا بندوبست کیا تھا۔رسول اللہ ﷺ کا اپنا طرز عمل مملکتوں کے حکمرانوں اور سربرآوردہ طبقے کے لیے مشعل راہ ہے۔ایک روز آپ ﷺ غنائم تقسیم فرما رہے تھے قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرۃ تھا آیا اور کہا "اعدل یا رسول اللّٰہ" (یا رسول اللہ ﷺ آپ عدل کریں)۔آپ ﷺ نے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ حکمرانوں اور مقتدر طبقوں کے لیے خصوصاً اور عوام کے لیے عموماً نصیحت وعبرت کا سامان ہے۔ویلک من یعدل اذالم اعدل"تم پر افسوس ہے اگر میں عدل نہ کروں گا تو کون کرے گا۔"[1]

صحابہ کرامؓ کے ساتھ رسول اللہ کا احتساب اس وجہ سے نہیں تھا کہ رسول اللہ کو ان پر پورا اعتماد نہیں تھا یا یہ کہ وہ امانت دار نہیں تھے بلکہ ان پر مکمل اعتماد تھا اور یہ لوگ امت کے کامل الایمان وکامل الامانت تھے۔ان کے احتساب کا ہدف یہ تھا کہ امت کو یہ سبق ملے کہ تمہارے حکام جتنے بھی بااعتماد ہوں پھر بھی ان کے ساتھ حساب کیا کرو۔حساب نہ کرنے سے سربراہ کے دل میں غیر اختیاری طور پر شک اور وسوسہ آسکتا ہے کہ کہیں حاکم نے خیانت نہ کی ہو اور یہ شکوک وشبہات امیر اور ماتحتوں کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں اور یہ ادارے کی کمزوری اور اس میں فساد کا سبب بنتے ہیں۔اس لیے ان شکوک وشبہات کو ختم کرنے اور آپس میں مکمل اعتماد کو قائم رکھنے کے لیے حاکموں سے حساب لینا اعدل راستہ ہے۔

عبدالحئی الکتانی نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ:

"اسلامی مملکت جب مدینہ سے باہر تک پھیل گئی تو عمل احتساب کے لیے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس عہدہ پر مستقل تقرریاں عمل میں لائی گئیں۔چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کو مدینہ منورہ اور حضرت سعید بن العاصؓ کو مکہ مکرمہ کا محتسب مقرر کیا گیا۔"[2]

رسول اللہ اپنے حکام کا محاسبہ بھی فرماتے تھے۔اس سلسلہ میں علامہ توفیق الواعی لکھتے ہیں کہ

"وکان النبی ﷺ یستوفی الحساب علی عماله یحاسبهم علی المستخرج وعلی المصروف، وقد ترجم البخاری لهذا بقوله. (باب محاسبة الإمام عماله) وکان الخلفاء بعده علیه السلام علی طریقته فی ذلک"[3]

رسول اللہ اپنے عمال کا مکمل محاسبہ کرتے تھے ان کی آمدنی،محاصل اور مصارف کی تحقیق کیا کرتے تھے۔امام بخاریؒ نے اس کے متعلق ایک مستقل باب قائم کیا ہے کہ امام اپنے عمال کا محاسبہ کرے گا اور رسولؐ کے بعد خلفائے راشدین کا بھی یہی معمول تھا۔

خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دوسالہ دور میں شدید ہنگامی حالات رہے۔آپؓ کا بیشتر وقت بغاوتوں اور شورشوں کو فرو کرنے میں صرف ہوا۔آپؓ اپنی فطری رفق وملاطفت کے باوجود عمال کے حکام کی نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ان میں غفلت یا تساہل دیکھتے تو سختی سے مواخذہ فرماتے۔

المیورے عہد صدیقی کے نظم احتساب کے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ الجامع الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب ماجاء فی قول الرجل ویلک، رقم الحدیث ۶۱۶۳

۲۔ التراتیب الاداریة، ۱/۲۸۷

۳۔ الواعی، توفیق، الدولة الاسلامیة بین التراث والمعاصرة، طبع دار القاهرة، (س-ن)، ص ۱۲۱

"Abu Bakr had designated one of his companions (Abu Ubaidah) to help him in the task of accountability. When one of his governors Muadh ibn jabal came to him from Yemen, Abu Bakr Made him accountable for every item reported to him as income and expense. The caliph handled these matters personally, since the Diwans for such purposes were not established until the administration of the second caliph. Few if any innovations in the realm of administration can be attributed to Abu Bakr, rather, he is viewed by historians as a strict follwer and imitator of the Prophet, not an innovator."(1)

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے رفقاء میں سے ایک رفیق (حضرت ابوعبیدہؓ) کو احتساب کے کام میں اپنی معاونت کے لیے مقرر کیا۔ جب ان کے ایک گورنر حضرت معاذؓ بن جبل یمن سے انھیں ملنے آئے تو ابوبکرؓ نے انہیں آمدنی اور خرچ کی ہر چیز کے لیے قابل احتساب ٹھہرایا۔ چونکہ ان کے دور میں ایسے مقاصد کے لیے دیوان قائم نہیں ہوئے تھے، اس لیے خلیفہ نے ان معاملات کو بذات خود نمٹایا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت کے نظم ونسق میں بہت کم اختراعات ہوئیں جن کو ان کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہو۔ لہٰذا تاریخ دانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سختی سے رسول پاک ﷺ کی پیروی کرتے تھے اور اپنے سے کچھ اختراع کرنے والے نہ تھے۔

حضرت عمرؓ کے انتظامی ڈھانچہ میں اگر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپؓ اپنے سرکاری افسروں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ سرکاری فرائض کی بجا آوری کے حوالے سے تو انہیں سخت احکام تھے ہی، ان کی ذاتی زندگیوں پر سخت پابندیاں عائد تھیں لیکن اس کے برعکس عوام کے کمتر ین شخص کو بھی مکمل پذیرائی حاصل تھی۔ عمال، عوام کے سامنے بچھے جاتے تھے اور یوں لگتا تھا کہ گورنر اور دیگر عمال عوام کے سامنے کم درجہ لوگ ہوں۔ عمال اور خود خلیفہ اپنے آپ کو ہر وقت عوام کے سامنے جوابدہی کے لیے تیار رکھتے تھے۔[۲]

حضرت عمرؓ کا قول ہے، آپ فرماتے ہیں:

"عام لوگ جس قدر مجھ سے ڈرتے ہیں میں اس سے زیادہ ان سے ڈرتا ہوں یعنی میں بطور خلیفہ ان کے حقوق ادا کرنے سے کہیں قاصر یا غافل تو نہیں رہ گیا۔"[۳]

علماء متقدمین میں سے قاضی ابو یوسف نے "کتاب الخراج" میں انفرادی اور اجتماعی معاشی معاملات جیسے عمال خراج، تحصیل مال میں ظلم سے اجتناب جیسے پہلوؤں پر مدلل بحث کی ہے۔ قاضی ابو یوسف سرکاری اہلکاروں کی بدعنوانی کی بیخ کنی اور محتسب کی سعادت مندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عمرؓ بن الخطاب نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا:

"امابعد اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ سعادت مند نگران وہ ہے جس کے سبب اس کی رعایا کو سعادت نصیب ہو اور

(1) Muhammad Al-Buraey, Administrative Development An Islamic Perspective, KPI London, Boston, Sydeny And Henleefy n.d , P.243

۲ اسلام کا نظام حکومت، ص ۱۱۳

۳ عباسی، احمد بن ابی یعقوب، تاریخ یعقوبی، طبع دار صادر، بیروت، لبنان، س ن، ۲، ۲۸-۲۹

سب سے بدبخت نگران وہ ہے جس کے ہاتھوں اس کی رعایا تباہ ہو جائے۔ دیکھو! تم خود راہ راست سے نہ ہٹنا، کیونکہ اس کے نتیجے میں تمہارے اعمال بھی بگڑ جائیں گے۔ ایسا کرو گے تو اللہ کے حضور تمہارا حال اس جانور کا سا ہوگا جس نے زمین پر سبزہ دیکھا تو اس کو چرنے لگا تاکہ موٹا ہو جائے۔ حالانکہ اسی موٹاپے میں اس کی موت مضمر ہے۔"[1]

ابن تیمیہؒ مال کی ضبطی اور تلفی ایسے احتسابی کردار کی بابت بالصراحت لکھتے ہیں کہ:

"کسی عامل پر تلف کر دینا علی الاطلاق واجب نہیں ہے بلکہ اگر کوئی چیز باعث ضرر نہ ہو اس کو باقی رکھنا بھی جائز ہے اس کو یا تو اللہ تعالیٰ کے نام چھوڑ دیا جائے یا صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ یہی ان چیزوں کا اتلاف ہے کیونکہ اس میں ایک تو ملاوٹ کرنے والے کے لیے سزا پائی جاتی ہے اور دوسری طرف اعادہ جرم کے خلاف زجر و توبیخ ہے۔ مزید برآں اس سے فقراء و مساکین کا استفادہ اس کو تلف کر دینے سے زیادہ نفع بخش ہے۔"[2]

سرکاری عمال کی اصلاح کی بابت قاضی ابو یوسفؒ حضرت علیؓ کا ایک اثر ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میں نے ابو حنیفہؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت علیؓ نے ان سے کہا اگر آپ اپنے رفیق تک پہنچنا چاہتے ہو تو اپنی قمیض میں پیوند لگایا کرو، تہہ بند اونچا رکھو، اپنا جوتا خود گانٹھ لیا کرو، موزے میں جوڑ لگا لیا کرو، امیدیں کم کرو اور پیٹ بھر کر نہ کھایا کرو۔"[3]

یہ لوگ خود فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے مگر خلق خدا کی خدمت اور ان کی خوشحالی کے لیے ہر وہ اقدام کرنے کے لیے تیار رہتے تھے جس سے ان کے حقوق کی تلفی ہوتی ہو اور ملکی خزانہ سے ان کی اعانت نہ ہو رہی ہو۔

خلیفہ وقت کا سب سے اہم فرض حکام اور عمال کی نگرانی ہے حضرت عثمانؓ اگر چہ طبعاً نہایت نرم تھے، بات بات پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور ذاتی حیثیت سے تحمل، بردباری، تساہل اور چشم پوشی آپ کا شیوہ تھا، لیکن ملکی معاملات میں انہوں نے سخت احتساب اور نکتہ چینی کو اپنا طرز عمل بنایا۔

"سعد بن ابی وقاصؓ نے بیت المال سے ایک بیش قرار رقم لی جس کو ادا نہ کر سکے۔ حضرت عثمانؓ نے سختی سے باز پرس کی اور معزول کر دیا۔ ولید بن عقبہ نے بادہ نوشی کی، معزول کر کے علانیہ حد جاری کی۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے امیرانہ زندگی اختیار کی تو انہیں بھی ذمہ داری کے عہدہ سے سبکدوش کر دیا۔ اسی طرح عمرو بن العاصؓ والی مصر وہاں کے اخراج میں اضافہ نہ کر سکے تو ان کو علیحدہ کر دیا۔"[4]

طبری اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ آپ نے پورے ملک میں ایک گشتی مراسلہ بھیجا جس میں پبلک سے کہا گیا:

"من ادعی شیئا من ذالک فلیواف الموسم فلیاخذ بحقه حیث کان منی او من عمالی او تصدقوا فان اللّٰہ یجزی المتصدقین."[5]

"جس کو میرے کسی گورنر کے خلاف کسی قسم کی کوئی شکایت ہو وہ حج کے موقع پر آئے وہ مجھ سے یا میرے گورنروں سے اپنا حق لے

1۔ کتاب الخراج، ص ۱۳۳

۲۔ الحسبة فی الاسلام، ص ۹۰

۳۔ کتاب الخراج، ص ۱۳۶

۴۔ تاریخ الامم والملوک، ۳/ ۳۵۰، ابن اثیر، ابوالحسن علی بن ابوالکرم، الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۵ء، ۳/ ۳۷

۵۔ ایضاً، ۳/ ۳۸۰

لے یا معاف کردے۔ بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو بہترین بدلہ دیتا ہے۔"

ملکی نظم ونسق کے سلسلہ میں سب سے اہم کام عمال کی نگرانی ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کا خاص اہتمام فرمایا، وہ جب کسی عامل کو مقرر کرتے تھے تو اس کو نہایت مفید اور گراں بہا نصائح کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً عمال کے طرز عمل کی تحقیقات کرتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت کعبؓ بن مالک کو اس خدمت پر مامور کیا تو یہ ہدایت فرمائی۔

"اخرج في طائفة من اصحابك حتى تمر بارض السواد كورة فتسالهم عن عمالهم وتنظر في سيرتهم" [1]

تم اپنے ساتھیوں کا ایک گروہ لے کر روانہ ہو جاؤ اور عراق کے ہر ضلع میں پھر عمال کی تحقیقات کرو اور ان کی روش پر غائر نظر ڈالو۔

کسی حکومت کا قانون و آئین گو کیسا ہی مرتب و منظم ہو، لیکن اگر ذمہ دار حکام کی نگرانی اور ان پر نکتہ چینی کا اہتمام نہ ہو تو یقیناً تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

نہ صرف نظام احتساب بلکہ ہمارے تمام مسائل خواہ وہ تمدنی سیاسی، علمی واخلاقی یا انفرادی ہوں وہ نبوی تعلیمات پر عمل کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ تاہم احتساب جو معاشرے سے ظلم و جبر، مطلق العنانیت کے خاتمے اور عدل وانصاف اور کمزور کے حقوق کے تحفظ کا ایک مربوط و مستحکم نظام ہے اسی صورت میں ثمر آور اور کامیاب ہو سکتا ہے جب یہاں سیرت سرور عالمؐ اور خلفائے راشدین کے تعامل سے رہنمائی لی جائے۔

آج کی ترقی یافتہ یا ترقی پسند دنیا میں سول سروس کی تشکیل میں حضرت عمرؓ کی حکمت عملی بہت زیادہ بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ آپؓ جب کسی گورنر یا اور بڑے سرکاری افسر کو فرائض سنبھالنے کے لیے روانہ فرماتے تو ایک ہدایت نامہ اسے عوام کے سامنے پڑھ کر سنا دیا جاتا تاکہ دونوں فریق اپنے اپنے حقوق وفرائض سے آگاہ ہو جائیں اس حکم نامے کی خاص باتیں یہ ہوتیں۔

۱۔ وہ رشوت نہیں لیں گے۔

۲۔ رعایا پر ظلم نہیں کریں گے۔

۳۔ عیش پرستانہ لباس استعمال نہیں کریں گے۔

۴۔ کسی بھی شخص پر اپنے دروازے بند نہیں کریں گے۔ [2]

اسلامی ریاست میں نگرانی واحتساب کا ایک ایسا نظام قائم ہو جس میں امیر و مامور بھی ایک دوسرے کے سامنے جواب دہ ہوں۔ یہ عمل اجتماعیت کو مستحکم کرتا ہے۔ یہ عمل جتنا کمزور ہو اجتماعیت اتنی ہی کمزور ہوتی ہے۔ حاکم کو چاہیے کہ وہ اپنے عمال میں احتساب کی فضا کو نہ صرف بحال رکھے بلکہ پروان چڑھائے اور دوسروں کے احتساب سے پہلے اپنا احتساب کرے اور اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے احتساب کے لیے پیش کرے۔ احتساب کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہر فرد خواہ وہ حاکم ہو یا کارکن اپنا سختی سے احتساب کرے کیونکہ ہر کارکن ریاست میں افراد کے لیے ذمہ دار اور ان کا قائد ہوتا ہے اس لیے اسے اپنی ذات اور کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے فکرمند اور کوشاں رہنا چاہیے۔

۱۔ کتاب الخراج، ص ٦٧

۲۔ أسد الغابة، ٤/٧١-٧٨

داخلی استحکام کے موانعات کے استیصال میں حکمت عملی کے مثبت اثرات

عصر حاضر میں دنیا کے جس خطہ پر بھی اسلامی نظام حکمرانی اپنے مقتضیات ولوازمات کے ساتھ قائم ہو۔وہاں بدامنی،لاقانونیت اور بدعنوانی کا خاتمہ،جمہوری اقدار کی بحالی،انسانی حقوق کی ترویج،بین الاقوامی سطح پر اقتصادی آزادی،عوام کی معاشی حالت کی بہتری خادمِ خلق حکمران دنگران اور پاکیزہ ترین معاشرہ وجود میں آتا ہے،جس سے ملک وملت کی ترقی وخوشحالی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوجاتا ہے۔

ایسی حکمت عملی کے اپنانے سے باہمی اختلافات،نزاعات اور قومیت پرستی کا قلع قمع ہوتا ہے اور اسلامی اخوت واتحاد کی فضا قائم ہوجاتی ہے۔جس سے عوام الناس عدم تحفظ کا شکار ہونے سے بچ جاتی ہے۔ہر فرد کو اس کا حق ملتا ہے اور وہ خود کو محفوظ ومامون سمجھتا ہے۔

اسلامی ریاست میں بدامنی اور لاقانونیت کے تدارک میں اسلام کی تجویز کردہ سزائیں بڑا موثر کردار ادا کرتی ہیں۔جن کا مقصد ریاست کو انتشار،دہشت گردی اور خوف وہراس کی فضا سے مبرا کرنا ہوتا ہے۔

معاشی حکمت عملی کے بنیادی مقاصد میں عادلانہ تقسیم دولت،ظلم واستحصال کی تمام صورتوں کا سد باب،رعایا کے لیے مساوی مواقع کی فراہمی غربت وافلاس کا خاتمہ اور تمام افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل وغیرہ ہیں۔

معاشی استحکام کے ذیل میں جو حکمت عملی اختیار کی جائے اس کے اثرات اس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں کہ قابل کاشت رقبہ،معدنی ذخائر،قابل کار افراد اور دوسرے ابتدائی وسائل پیداوار سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا ہے جس سے صنعتوں کو فروغ ملتا ہے۔نئی ٹیکنالوجی متعارف ہوتی ہے اور روزگار کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔

اسلامی ریاست میں مالیاتی امور کے بارے میں خاص طور پر احتیاط سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اگر اس شعبے میں ذرہ برابر بھی بے احتیاطی سے کام لیا جائے تو ایک طرف ملکی خزانہ غلط طور پر خرچ ہوجاتا ہے،دوسری جانب بدعنوانیاں جنم لیتی ہیں اور تقسیم دولت کا سلسلہ غیر متوازن ہوجاتا ہے۔

مالیاتی بدعنوانیوں کے انسداد میں خلفائے راشدین نے جو حکمت عملی اختیار کی کہ سرکاری کارندوں کی تنخواہیں اس قدر زیادہ مقرر کی جائیں کہ وہ کسی صورت میں بھی ناجائز طریقہ اختیار کرکے رعایا کی دولت کو لوٹنا شروع نہ کردیں۔اگر وہ ایسی روش اختیار کریں تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے اور ان کی اخلاقی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کیا جائے۔

اسلامی ریاست میں ''عمال حکومت کی نگرانی واحتساب'' میں حکمت عملی کے مثبت اثرات اس صورت میں مرتب ہوتے ہیں کہ سرکاری ملازم حقیقی معنوں میں عوام کے خادم بن جاتے ہیں۔وہ اپنی پوری زندگی خلق خدا کی خدمت اور ان کی خوشحالی کے لیے وقف کردیتے ہیں۔وہ اپنے فرائض کو اس قدر سرگرمی،مستعدی،دیانت داری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔جس سے عوام الناس کا اعتماد بحال ہوتا ہے اور ملکی معاملات میں حاکم اور رعایا کا باہمی تعلق مضبوط ہوتا ہے۔

سیاسی عدم استحکام کا کسی بھی ملک ومعاشرے میں جو بدترین اثر مرتب ہوتا ہے وہ تشدد،انتشار اور بدنظمی کی شکل میں ہوتا ہے۔اس طرح کی کوئی بھی صورتحال کسی بھی ملک کی قومی یکجہتی،یگانگت،تشخص،ترقی اور خوشحالی کے لیے زہر ہلاہل ثابت ہوتی ہے۔حکومت کی تمام تر توانائیاں اس نوع کی صورتحال سے نپٹنے میں صرف ہوتی ہیں جس کی وجہ سے نہ تو ملک میں ترقیاتی کام ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ وسائل کی تلاش میں کوئی خاطر خواہ کام ہوتا ہے اور نہ بین الاقوامی برادری سے تجارتی،تعلیمی اور معاشرتی تعلقات استوار کرکے بین الاقوامی سطح پر ملک کے لیے حالات سازگار بنائے جاسکتے ہیں۔

باب ششم

عصری مسائل اور داخلہ پالیسی

فصل اول: عصری مسائل وتقاضے اوران کا حل

فصل دوم: سفارشات وتجاویز

عصری مسائل وتقاضے اوران کا حل

عصر حاضر میں عالم اسلام گوناگوں مسائل سے دوچار ہے۔ یہ مسائل نہایت پیچیدہ اور کٹھن ہیں ان کی نوعیت مختلف ہے لیکن یہ باہم مربوط ہیں۔ سیاسی، معاشی اور داخلی مسائل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی ہر ریاست کو درپیش ہیں۔ مسائل، انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ ان کا زندگی سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عصر حاضر میں ان کی نوعیت بدلنے کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت اور ضرورت بھی بڑھ گئی ہے۔

اکثر مسائل مسلم اقوام کو ورثہ میں ملے جب وہ محکوم اور غیر ملکی تسلط کے زیر اثر تھیں۔ غیر ملکی طاقتوں نے نہ صرف ان کے قدرتی وسائل کو لوٹا بلکہ ان کو ایسے سیاسی، معاشی اور داخلی مسائل سے دوچار کر دیا جن کو حل کرنا آسان نہ تھا۔ مسائل ہونا کوئی نئی بات نہیں تاریخ کے ہر عہد میں اقوام وملل ان داخلی اور خارجی مسائل سے دوچار رہے ہیں لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ان باہمی طور پر مربوط اور الجھے ہوئے مسائل کو حل کیسے کیا جائے اور عصری تقاضوں کا کس انداز سے سامنا کیا جائے۔

اکیسویں صدی کے تناظر میں جدید اسلامی فلاحی ریاستوں کا قیام ناگزیر ہے۔ محمد عربیؐ نے ایک قلیل مدت میں اسلامی نظریات کے عین مطابق ایک جدید فلاحی انقلابی ریاست قائم کی اور پورے عرب کو اس کے زیر سایہ لانے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ افراد کی سیرت کی تشکیل معاشرے اور ریاست سے باہر ممکن نہیں۔"[1]

اس وقت تقریباً تمام مسلم ریاستوں میں ملوکیت، جاگیرداری، سرمایہ داری یا مغربی جمہوریت کے ذریعے حکومتیں بنتی اور بدلتی ہیں، جبکہ اسلام کے سیاسی نظام میں ان عوامل کا سرے سے کوئی دخل ہی نہیں بلکہ اسلام کا تو پیغام ہی طبقاتی امتیاز کا خاتمہ تھا۔

اس ضمن میں خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

"کوئی جمہوریت جو اسلامی ہونے کی دعویدار ہو، وہ نہ برطانوی نمونے کی ہوگی اور نہ روسی ان میں پہلی تو دو یا زائد جماعتوں کے تصادم پر مبنی ہے اور دوسری صرف ایک جماعت کے اقتدار کی اجارہ داری ہے جو کسی اختلاف کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی اسلامی حکومت اسلامی اصول پر اسمبلی یا کسی پارلیمنٹ کو تشکیل دے تو اس کے مذہبی پیشواؤں کی انجمن بن جانے کا خطرہ نہیں　سیاسیات میں مال و دولت کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے ورنہ برائے نام جمہوریت اور عملی طور پر اہل ثروت کی ریاست ہوگی۔"[2]

اسلام کا بنیادی نصب العین یہ ہے کہ دنیا میں اسلامی حکومت قائم کی جائے لیکن مسلم حکمرانوں نے مغرب سے درآمد کردہ جمہوری نظام کے اندر رہ کر اقتدار کی منافست کا طریقہ قبول کر لیا اور یوں مغربی جمہوریت کی ساری خرابیاں ان کے اندر بھی پیدا ہو گئیں۔

اس کے نتیجے میں اسلامی فکر کے دیگر شعبوں کو زک پہنچی اور دعوت وتبلیغ، اصلاح وتزکیہ، تعلیم وتربیت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسے اسلامی تصورات اور ادارے بہت پیچھے چلے گئے۔ یوں نہ صرف نظری سطح پر اسلام کا نصب العین اور اس کی بنیادی ترجیحات کا نظام تلپٹ ہو کر رہ گیا بلکہ مسلم معاشرے میں ایمان ویقین کی کمزوری اور فکر آخرت اور اسلام کی روحانی قدروں سے تغافل کی وجہ سے اخلاقی قدریں بھی زوال پذیر ہوئیں اور مغربی اقدار نے تیزی سے ان کی جگہ لینی شروع کر دی۔

ہر آمرانہ نظام کے بعد آنے والے جانشین ہمیشہ جمہوریت کے علم ہی کا سہارا لیتے ہیں اور بہت جلد سابقہ آمریت سے زیادہ ظالمانہ نظام کے کارندے بن جاتے ہیں۔ گو، قرائن بتاتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ایسا کرنا آسان نہ ہوگا اور سیاسی عنان جو امر کی تربیت یافتہ اور

۱۔ الطاف جاوید، جدید اسلامی ریاست، اکیسویں صدی کے تناظر میں، مطبوعہ المعارف، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰

۲۔ خلیفہ عبدالحکیم، (مترجم قطب الدین احمد) اسلام کا نظریہ حیات، طبع ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۹۵

امریکا کے اعتماد کے فوجی سربراہ ہیں، باوجود اپنی امریکا نوازی کے ماحول اور فضا کے پیش نظر، ایسی اصلاحات اور انتخابات کروانے پر آمادہ ہو جائیں گے جن میں عوامی خواہشات کی جھلک ہو۔[1]

اس تناظر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا ہمارا سیاسی ڈھانچہ ایسے خطوط پر استوار ہے جو ہمیں ایسے حکمران دے سکے جو خلفائے راشدین جیسا نصب العین اور روشن فکر رکھتے ہوں۔

لہٰذا داخلی سیاسی مسائل کے ضمن میں درپیش اہم مسئلہ امن وامان کے قیام سے متعلق ہے۔

اسلامی ریاستوں میں ذاتی مفادات کے حصول کے لیے بیرونی طاقتوں نے جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسلامی ممالک کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے ان کے داخلی امن وامان کو پامال کیا جس کی بنا پر معاشرہ تنزلی، انتشار اور انحطاط پذیر ہو کر پستیوں کی گہرائی میں جاچکا ہے۔ مزید برآں قومی خودغرضی اور عصبیت بھی امن وامان کے قیام کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ بدی کی قوتیں (باطل نظام کے حامی) حق کی مخالفت (قرآنی نظام) میں نبرد آزما ہیں، جس سے داخلی استحکام متاثر ہو رہا ہے۔

داخلی عدم استحکام کے نتیجے میں اسلامی مملکتوں نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ عصر حاضر میں ۶۰ سے زائد اسلامی مملکتیں موجود ہیں یہ تمام بے پناہ قدرتی وسائل اور خزانوں سے معمور ہیں لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی صحیح معنوں میں آزاد مملکت ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ان میں سے کوئی مجبور ہے تو کوئی معذور۔ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ غیر مسلم حکمرانوں کی خوشنودی میں ایک دوسرے کی امن و سلامتی سے بھی کھیل جانے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

مملکت خداداد پاکستان جو دنیا کی واحد مسلم ایٹمی قوت ہے اور پوری دنیا کے مسلمان امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہیں، لیکن ہمارے حکمران رفتہ رفتہ اسے امریکی غلامی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ خارجہ و داخلہ اور معاشی و دفاعی پالیسیوں میں امریکا پوری طرح دخیل ہے اور ایوان اقتدار میں بیٹھے لوگ اس کے احکامات پر مکمل طور پر عمل کر رہے ہیں۔ ایک طرف ڈرون حملے جاری ہیں، دوسری طرف فوجی آپریشن کے ذریعے فوج اور عوام کو آپس میں دست و گریباں کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ملک شدید قسم کی بدامنی کا شکار ہے اور حالات انتشار اور تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ بالکل امریکی منصوبے کے عین مطابق ہے کہ خراب حالات کا بہانہ بنا کر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو عالمی تحویل میں لینے کے نام پر امریکا اپنے قبضے میں لے لے۔[2]

بلاشبہ آج کے پاکستان کے حالات میں امریکا کی گرفت ہماری قیادت، ہماری پالیسیوں اور ہمارے سیاسی اور معاشی نظام پر اتنی بڑھ چکی ہے کہ اب ملک کی آزادی ایک نمائشی شے بنتی جا رہی ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں جس طرح امریکا کے مطالبات کے آگے سپر ڈالی گئی اور زرداری گیلانی حکومت نے اس غلامانہ پالیسی کو اور بھی وفاداری کے ساتھ آگے بڑھایا ہے، اس کے نتیجے میں قومی عزت اور غیرت کا تو خون ہوا ہی ہے، اور ملک کی آزادی بری طرح مجروح ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ ملک کا امن وامان تہ و بالا ہو گیا ہے۔ لاقانونیت کا دور دورہ ہے، فوج اور عوام میں تصادم اور ٹکراؤ بڑھ رہا ہے، دہشت گردی کا دائرہ وسیع تر ہو رہا ہے، امریکی ڈرون حملے اور ان کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر معصوم انسان شہید اور وسیع و عریض علاقے تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔[3]

---

1. ڈاکٹر، نعیم احمد، مسلم دنیا میں انقلابی لہر چند زاویے، ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن، زیر طباعت البلاغ ٹرسٹ، لاہور، ۳۰۱ (جولائی ۲۰۱۱) ص ۴۷
2. سید منور حسن، یوم آزادی اور درپیش چیلنج، ماہنامہ ترجمان القرآن، طبع اسلامک ٹرسٹ لاہور، ۱۴۷، ۸ (اگست ۲۰۱۰ء)، ص ۲۸
3. پروفیسر خورشید احمد، اشارات، ماہنامہ ترجمان القرآن، طبع البلاغ ٹرسٹ لاہور، ۳۱۲۸، فروری ۲۰۱۱ء، ص ۹۲

قانون کا اطلاق صحیح معنوں میں عدلیہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہی فیصلوں کی شکل میں انصاف کی فراہمی کو یقینی بناتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک عدالتی نظام موثر کردار ادا کرتا رہا ہے دنیا میں کبھی بھی معاشرتی بدعنوانیاں، برائیاں اور افراط وتفریط فروغ نہیں پاسکی اور جہاں عدالتی نظام ناقص رہا ہے وہ ملک معاشرتی برائیوں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔

عدلیہ پولیس کے ذریعے قانون کے اطلاق کو ممکن بناتی ہے لیکن اکثر ممالک میں پولیس اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا نہیں کرتی۔ وہ آئین کے مطابق قوانین پر عملدرآمد نہیں کرتی اور لوگوں کے جان ومال کے تحفظ میں ناکام رہتی ہے۔ بعض اوقات از خود ایسے جرائم کا ارتکاب کرتی ہے کہ لوگوں کے جان ومال کو ان سے ہی خطرہ رہتا ہے۔ معاشرے میں رشوت ستانی، بے گناہوں کی پکڑ دھکڑ اور مجرموں کی سرپرستی پولیس کا طرز عمل بن جاتی ہے، جس کی وجہ سے ریاست کے استحکام کو خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

عدالتی نظام میں انقلابی اصلاحات ہونی چاہیں تاکہ عدلیہ آزادانہ طور پر سماجی انصاف کو ممکن بنا سکے اور آئینی اصولوں سے انحراف کرنے والوں کو کڑی سے کڑی سزا دے کر آئندہ کے لیے اس طرح کے اقدامات اٹھانے والوں کی راہیں مسدود کر سکے۔

اٹھارھویں ترمیم کے ذریعے عدلیہ کی آزادی کو زیادہ موثر بنانے کی تجاویز دی گئی ہیں، اور اس سلسلے میں دستور کی دفعہ ۲۰۰ اور ۲۰۳ میں جو ترامیم کی گئی ہیں، ان سے انشاء اللہ عدلیہ مستحکم اور آزاد ہوگی اور ججوں کے تبادلوں کے سلسلے میں اگر وہ دو سال سے کم مدت کے لیے ہو تو ان کی مرضی کے خلاف تبادلہ اور تبادلہ قبول نہ کرنے پر ریٹائرمنٹ، عدلیہ کی آزادی کے اصول کے خلاف تھا اور اسے اٹھارھویں ترمیم کے ذریعے ختم کیا گیا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کے ججوں کو جس طرح بے توقیر کیا گیا تھا، ان کا تقرر، تبادلہ، برخاستگی جیسی ذلت آمیزی اور ان کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے، بطور سزا ان کی مرضی کے بغیر ان کو اس عدالت میں بھیجنے کے تمام امکانات کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کے جج اب عدالت عالیہ کے باقی تمام ججوں کے مساوی ہوں گے اور ان کو وہی تحفظ حاصل ہوگا جو دوسروں کو حاصل ہے۔ جس کے بغیر عدلیہ کی آزادی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ یہ تمام پہلو مثبت ہیں اور ان کو نظر انداز کرنا قرین انصاف نہیں ہے[1]

ریاست میں امن وامان اور استحکام کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے عدلیہ کی آزادی کے ساتھ ساتھ صوبوں کی آزادی وخود مختاری بھی اہم حیثیت کی حامل ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان کو ایک ایسا آئین دیا جس پر تمام سیاسی جماعتوں نے اتفاق کیا۔ اس آئین میں وفاق کے سارے صوبوں کو خود مختاری کی نوید دی گئی تاہم گوناگوں مسائل اور ملک کے دولخت ہونے کی وجہ سے صوبوں کی خود مختاری کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ 1977ء کے مارشل لاء نے صوبائی خود مختاری کو مزید ناقابل یقین بنا دیا۔ بعد ازاں 1999 کے مارشل لاء سے صوبائی خود مختاری کو ایک اور بڑا دھچکا لگا۔ اس حقیقت کے بارے میں دو آراء ہو ہی نہیں سکتیں کہ پاکستان کو آج کل جن چیلنجز سے واسطہ ہے خصوصاً بلوچستان میں شورش یا فرقہ واریت وغیرہ ان سب کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے صوبائی خود مختاری کے اجراء کو کافی عرصہ تک زیر التوا رکھا اور ہمیشہ مرکزیت پر زور دیتے رہے۔

اب 18ویں ترمیم کے ذریعے 17 وزارتوں کو بھی صوبوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہے کہ حکمرانوں کی سوچ میں انقلابی تبدیلی آئی ہے۔ صوبوں کو اختیار دینے سے فیڈریشن مضبوط ہوگی اور یہ قائداعظم کے وژن کے عین مطابق ہوگا۔ این ایف سی ایوارڈ بھی اس ضمن میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔ پارلیمنٹ میں موجود تمام سیاسی قوتیں مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے اتفاق رائے اور سیاسی فہم کا مظاہرہ کیا۔ حکومت کا یکم جولائی کو ''یوم صوبائی خود مختاری'' قرار دینا ایک تاریخی قدم ہے تاہم صوبائی خود مختاری کے اجراء

[1] پروفیسر خورشید احمد، اٹھارھویں ترمیم، خوش آئند پیش رفت، ماہنامہ ترجمان القرآن، ۴۲۳۷، (اپریل ۲۰۱۰ء) مطبع البلاغ ٹرسٹ لاہور، ص ۱۸

سے قومی وحدت کو فروغ ہوگا۔[1]

وزارتوں کی صوبوں کو منتقلی سے صوبائی سطح پر عوام کے مسائل حل ہوں گے، عوام کی بہتر خدمت اور روزگار کے نئے مواقع میسر آئیں گے۔ ہر صوبے کو اپنے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہوگا جس سے پاکستان کا ہر صوبہ ترقی کرے گا اور وفاقِ پاکستان مضبوط تر ہوگا۔

عہد جدید میں اسلامی ممالک اور معاصر سیکولر مملکتوں کے درمیان انتظامی امور اور اس کی مشینری مشترک ہے۔ ریاستی ادارے جو اس وقت کی ریاستوں میں قائم ہیں صوبوں اور اضلاع کی حد بندی اور انتظامی مشینری تو دونوں میں مشترک ہیں، لیکن احکام و قوانین دونوں کے علیحدہ علیحدہ ہیں۔

پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات بتا رہے ہیں کہ ایک منظم کوشش ہو رہی ہے کہ پاکستان کے عوام کا اعتماد اس کے اداروں، وسائل اور ان کے استعمال سے ختم کر دیا جائے۔ اس اعتماد کا ختم ہو جانا یا اس میں کمی آ جانا متفرق نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ زندگی کی ضروریات کے لازمی حصول میں ناکامی بے بسی طاری کرنے کی ایک اور حکمت عملی ہے۔ تحفظ اور دفاع سے تہی ہو جانا شکست سے پہلے ہی شکست تسلیم کرنے کا راستہ ہے، دین اور اس کی علامات پر اعتماد متزلزل ہو تو اس ملک کے بنیادی نظریے کو عملی طور پر ناکام ثابت کرنے کا طریقہ ہے۔ گویا عوام کو بتایا جا رہا ہے کہ زندگی کی ضروریات پانا ان کا استحقاق نہیں، کسی کی عطا ہے اس لیے یہ لازمی نہیں کہ ہر کس و ناکس کو ضروریاتِ زندگی مل سکیں۔ دفاع سے محرومی یہ سبق پڑھا رہی ہے کہ اس ملک کے ادارے اس فرض کے اہل نہیں رہے۔ وہ کچھ اور کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ہی شہریوں کو غائب بھی کر رہے ہیں اور قتل بھی کر رہے ہیں۔ اسی بات کا اظہار سپریم کورٹ بار کی صدر عاصمہ جہانگیر نے کیا ہے کہ الزام تو انٹیلی جنس ایجنسیوں پر آ رہا ہے۔ اگر سرکاری اور غیر سرکاری میڈیا کو دیکھیں تو ان کے پروگرام، ڈرامے اور اشتہارات عمومی طور پر دو کام کر رہے ہیں۔ پہلا کام یہ ہو رہا ہے کہ ثابت کیا جائے کہ پاکستان کے جملہ مسائل، دہشت گردی اور جرائم میں اضافہ کی وجہ دین اور اس سے وابستہ علامات ہیں۔ دہشت گرد وہی ہے جس کے پاس دستار ہے، ریش ہے اور محراب و منبر ہے۔[2]

جب تک ریاست کو قوت کے استعمال اور زورِ بازو سے حاصل نہیں کیا جائے گا اللہ کی زمین پر اللہ کی خلافت کا قیام ایک واہمہ ہے۔ موجودہ صورتِ حال اس کے برعکس یہ ثابت کرتی ہے کہ تیونس اور مصر میں ریاست کو عوام کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور فوج بھی ان حالات میں آمریت سے کنارہ کش ہونے پر مجبور ہوئی۔

"تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی روایتی پالیسی مشرقِ وسطیٰ کے لیے بھی کوئی نئی بات نہیں۔ مختلف گروہوں میں تفرقہ پیدا کرنا اور فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دینا استعماری طاقتوں کا شروع سے وطیرہ رہا ہے اور اس خطے میں بھی اس کے ذریعہ سے لوگوں کو منقسم رکھنے اور حکمرانوں کو اس خوف میں مبتلا رکھنے کا کام کیا جاتا رہا ہے کہ علاقائی گروہ اور ریاستیں ان کے لیے خطرہ ہیں۔ خوف اور بے اعتمادی کی ایسی فضا بنا دینے سے استعمار کو اپنی نو آبادیات میں قدم جمانے اور وہاں کے عوام کو قابو میں رکھنے میں بہت سہولت رہتی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں کو منتشر رکھنے کے لیے اب یہی حکمتِ عملی امریکہ نے اختیار کی ہے۔[3] اس وقت مسئلہ فلسطین کے حل اور عرب

---

1. خصوصی اشاعت روزنامہ ایکسپریس، لاہور جمعۃ المبارک یکم جولائی ۲۰۱۱ء
2. اداریہ آخری مہلت سے پہلے ہفت روزہ [illegible] لاہور ۲۰ تا ۲۶ [illegible] ص ۵
3. ایرانی انقلاب اور صدام کی کویت پر چڑھائی، بہت سے واقعات میں سے دو ایسے واقعات ہیں جن کو بنیاد بنا کر امریکہ نے پروپیگنڈے کے ذریعے خطے میں یہ تاثر دیا ہے کہ چھوٹی ریاستیں سخت خطرے میں ہیں اور انہیں اپنے تحفظ کے لیے امریکی طاقت کی ضرورت ہے۔ امریکہ ایک عشرہ پر محیط ایران عراق جنگ میں دونوں ممالک کو اسلحہ مہیا کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ دونوں کو خطے کے لیے خطرہ بھی قرار دیتا رہا۔ اگر خطے کے رہنما یکجا ہو جاتے تو کسی بیرونی طاقت کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ان کو غلط طور پر استعمال کر سکے۔

اسرائیل تنازعے کو طے کرانے کی کوئی قابل ذکر کوششیں نہیں ہورہیں۔ ایران اور عرب ریاستوں کے معاملے میں بھی ،ول الذکر کو خطے کے تحفظ کو درپیش سب سے بڑا خطرہ قرار دیا جارہا ہے اور اس پر جوہری پروگرام ترک کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جارہا ہے۔

یوں تو پورا خطہ ہی امریکی پالیسیوں کا خمیازہ بھگت رہا ہے لیکن عراق کی صورت حال سب سے زیادہ ابتر ہے۔ عراقی المیے کی کچھ جھلک امریکی صدر باراک اوباما کے اس بیان میں دیکھی جاسکتی ہے:

''عراق میں پر تشدد کارروائیاں معمول کا حصہ بنی رہیں گی۔ عراق کے بارے میں بہت سارے بنیادی سیاسی سوالات جواب طلب ہیں۔ تیل کی آمدنی کم ہوتی جارہی ہے، جس کی وجہ سے بنیادی سہولتیں فراہم کرنے میں ناکام حکومت کی مشکلات مزید بڑھ رہی ہے۔ اس وقت عراق کو خطے میں سیاسی یا اقتصادی لحاظ سے کوئی مقام حاصل نہیں۔ لاکھوں بے گھر عراقی ابھی بھی مدد کے منتظر ہیں۔ یہ مرد، عورتیں، اور بچے اس جنگ کے منہ بولتے اثرات اور خطے کے استحکام کے لیے چیلنج ہیں۔'' (۲۷ فروری ۲۰۰۹ء)[۱]

اس گول مول بیان سے بھی یہ بات واضح ہورہی ہے کہ جارحانہ امریکی پالیسی کا اصل مقصد محض اپنے مفادات کا حصول ہے۔ یہ اتحادی جارحیت اب تک دس لاکھ سے زائد افراد کو نگل چکی ہے اور یہ تقریباً تمام ہی افراد عام شہری تھے۔ جارحیت کا یہ بھیانک رخ واحد تو نہیں لیکن اذیت ناک ترین ضرور ہے۔ عراق میں امریکی اقدامات کے انسانی نقصان کا مکمل اندازہ لگانے کے لیے بنیادی معاشرتی ڈھانچے کی تباہی، آبادیوں کا انخلاء، اور نفسیاتی اثرات کے ساتھ ساتھ معاشرتی وسیاسی سانحات، نسلی ولسانی تصادم اور ملک کے مستقبل کے سیاسی منظرنامے میں اہم مقام حاصل کرنے کی غرض سے ہونے والی فرقہ وارانہ کوششوں کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔

مشرق وسطیٰ کو اللہ تعالیٰ نے وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے اس کے باوجود وہ ترقی کی بجائے تنزلی کی طرف جارہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ حکمران طبقہ گلے میں پڑا ہوا امریکی طوق اتارنے کے لیے تیار نہیں اگر حکمران طبقے نے اس روش کو نہ بدلا تو ان ریاستوں کا وجود خطرے میں رہے گا اور ذلت ورسوائی ان کا مقدر بنی رہے گی۔

مسلم ریاستوں کو ایسے واقعات کے حوالے سے اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنی سلامتی کے تحفظ وبقا کے لیے بھی ہمہ وقت پوری طرح چوکس اور تیار رہنا چاہیے اور اپنے مفادات پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ دنیا کی کوئی قوم اپنی آزادی اور سلامتی پر کوئی سمجھوتہ کرانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتی۔

ہمیں غیر مسلم طاقتوں پر یہ واضح کر دینا چاہیے کہ مسلم اقوام پوری طاقت اور قوت سے اپنی جغرافیائی سرحدوں کا دفاع کرنے کا عزم و حوصلہ رکھتی ہے اور وہ اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔

ہمارا سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے متضاد عناصر کے درمیان ہم آہنگی پیدا کریں ہمیں سب سے زیادہ خطرہ داخلی انتشار سے ہے۔ عالمی استعمار مقامی پریس اور الیکٹرانک میڈیا کو استعمال کرتا ہے بالخصوص انگریزی پریس مخالف اسلام اور عالمی استعمار کا حلیف ہے۔ ہمیں اس سے رابطہ بڑھانا چاہیے الا یہ کہ وہ کھلی دشمنی پر اتر آئے تو پھر کوئی اور تدبیر کرنی چاہیے۔ عالمی استعمار قومی حکومتوں کو اسلام کے تہذیبی تشخص کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ ہمیں ریاست سے وفاداری اور حکومتوں سے افہام وتفہیم کی راہ پر چلنا ہوگا تاکہ انہیں مثبت پروگرام پر آمادہ کیا جاسکے۔ بے سبب اور قبل از وقت تصادم نقصان کا باعث بن سکتا ہے اور عالمی استعمار کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بھی۔

داخلہ پالیسی کا ایک اور اہم مسئلہ تعلیم وتربیت کا فقدان اور ناقص نظام تعلیم ہے۔

۱　خالد رحمن، مشرق وسطیٰ سے متعلق امریکی پالیسیاں اوران کے مضمرات، مغرب اور اسلام خصوصی شمارہ جولائی ۲۰۱۰ء، طبع انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص ۶۶-۶۷۔

آج کی دنیا اور انسانی سوسائٹی آسمانی تعلیمات اور اپنے پیدا کرنے والے خدا کے احکام سے بیگانہ بلکہ باغی ہو چکی ہے۔ سوسائٹی کو وحی الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی طرف واپس لانے کے لیے اس وقت دنیا کے پاس اسلامی نظام کے سوا کوئی متبادل راستہ موجود نہیں ہے۔ ؎

تعلیم کا ایک بنیادی فریضہ عمل مقاصد حیات کی سمتوں کا تعین اور ان کا حصول ہے تو دوسری جانب یہ ارتقاء کو ممکن بناتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ افراد معاشرہ کی اس طرح سیاسی تربیت کرتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں عمل سیاسی کے کردار اور اس کے فرائض واجزاء کی عملداری سے روشناس ہو کر اس کے استحکام کے لیے موثر کردار ادا کرتے ہیں، تیسری جانب تعلیم سیاسی اقدار کی بجا آوری کو ممکن بنا کر آئندہ نسلوں کے اذہان میں سماجی اور ثقافتی مثالیات کو منتقل کر کے انہیں آزادی، حقوق، مساوات، آئین، قوانین، حکومت اور اقتدار اعلیٰ کے کردار کی اہمیت سے روشناس کرتی ہے۔ چوتھی جانب سیاسی نظام اپنے ذیلی تعلیمی نظام کے نظریہ اور عمل کو اس طرح منظم کرتا ہے کہ صحیح معنوں میں وہ ایک زندہ عضویہ کے طور پر سماجی زندگی کے لیے لازمہ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

مسلم ممالک میں اسلامی نظام نافذ نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ ان کی رولنگ کلاس اور حکمران طبقات ہیں جن کی تعلیم وتربیت اسلامی تعلیمات اور ماحول میں نہیں ہوئی۔ ان کے مفادات مغرب کے ساتھ وابستہ ہیں، ان کی بود و باش اور طرز زندگی اسلامی نہیں ہے اور اسلامی نظام کے نفاذ کو وہ اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں، اس لیے اسلامی نظام کی مخالفت کا حوصلہ نہ ہونے کے باوجود وہ اس کے نفاذ میں رکاوٹ ہیں۔

مسلم ممالک میں اسلامی نظام کے نافذ نہ ہونے کی دوسری بڑی وجہ موجودہ عالمی ماحول اور سسٹم ہے۔ موجودہ عالمی نظام جو اقوام متحدہ اور اس میں ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک کی پالیسیوں اور خواہشات پر مرتب ہوا ہے اور چلایا جا رہا ہے، اس کی بنیاد ہی خلافت کی نفی اور انسانی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی بے دخلی پر ہے۔ اس لیے موجودہ عالمی نظام انسانی سوسائٹی میں اسلامی نظام کی صورت میں آسمانی تعلیمات کی عملداری دوبارہ قائم ہونے کی مخالفت بلکہ مزاحمت کر رہا ہے اور اس کے لیے اپنے تمام وسائل اور توانائیاں صرف کر رہا ہے۔ ؎

پاکستان میں تعلیم ہر دور میں بے مقصد اور لایعنی سرگرمی ثابت ہوتی رہی ہے۔ یہ قیام پاکستان کے مقاصد کے حصول کا وسیلہ اور قومی ترقی واستحکام کا کسی بھی دور میں ذریعہ نہ بن سکی جس کی وجہ سے اعلیٰ کردار کے حامل افراد اور سیاستدان پیدا نہیں ہو سکے۔ بایں بنیاد ہماری تعلیم بڑی حد تک ملک میں سیاسی عدم استحکام کو پروان چڑھانے کی وجہ بنی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عمومی سیاسی استحکام کے لیے افراد معاشرہ کی سیاسی تربیت ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی ترقی اور ان کے معاشرتی وسیاسی نظاموں کے استحکام کا بنیادی سبب ہی ان کے افراد کی موثر سیاسی تربیت ثابت ہوتی رہی ہے جس کی بنا پر ان کے ہاں بے مثال سیاسی قائدین اور کارکن پیدا ہوتے رہے ہیں سیاسی مفکرین ومصنفین پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنے فکر وعمل سے میدان سیاست کو نئی جہتوں سے ہمکنار اور نئے افق سے روشناس کیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے تعلیم کو شروع دن سے سماجی ترجیحات میں سب سے آخر میں رکھنے کا رجحان عام رہا حکومتوں نے اسی بنا پر تعلیم کے لیے موثر پالیسیاں وضع نہ کیں کم سے کم تعلیمی بجٹ مختص کیا بایں وجہ تعلیم ہر دور میں انحطاط پذیر رہی جس کی بنا پر افراد معاشرہ کی موثر سیاسی اور سماجی تربیت نہ ہو سکی۔ ؎

تعلیم سے متعلق ایک تشویش ناک فیصلہ وہ بھی ہے جو دستور کی حالیہ اٹھارویں ترمیم کے نتیجے میں سامنے آیا ہے کہ تعلیم کو وفاقی دائرے

---

۱ ابو عمار زاہد الراشدی، اسلام کا نظام خلافت اور دور حاضر میں اس کا قیام ضرورت اہمیت اور طریق کار، ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ، ۲۱ شمارہ ۱۲ (دسمبر ۲۰۱۰ء) ص ۲۹-۳۰

۲ خرم، ڈاکٹر محمد اشرف، پاکستان میں سیاسی عدم استحکام کے تعلیم پر اثرات، اطلاع ذکی سنز پرنٹرز کراچی، ۲۰۱۰ء

سے نکال کر صوبوں کے انتظام میں دیدیا گیا ہے، جہاں تک خالص انتظامی معاملات کا تعلق ہے اس حد تک تو زیادہ فکر کی بات نہیں ہے لیکن جہاں تک نصاب اور دیگر بنیادی مقاصد کا معاملہ ہے ایک متحد قوم کے لیے تعلیمی نظام میں یکسانیت نہایت اہم ضرورت کا معاملہ ہے کہ مقاصد اور نصاب کی ہم آہنگی قومی وحدت کی تشکیل کے لیے بنیادی پتھر ہے۔

اگر اس معاملے کو کلی طور پر صوبوں کے حوالے کیا گیا تو قوم جو پہلے ہی سے علاقائی، لسانی اور گروہی تعصبات کی وجہ سے انتشار کا شکار ہے، اس فیصلے کے بعد ہر صوبے کا الگ الگ تعلیمی نظام ونصاب مرکز گریز رجحانات کو مزید بڑھاوادے گا اور متحد قوم کا تصور عنقا ہو کر رہ جائے گا اور پھر ایسا نہ ہو کہ ملک کی موجودہ سلامتی بھی سوالیہ نشان بن جائے، ملک کے ارباب حل وعقد کو پوری بصیرت اور عاقبت اندیشی سے اس پر غور کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر انیس احمد مغربی نظام تعلیم کے مشرق وسطی میں سیاست، تعلیم اور معیشت پر مرتب ہونے والے اثرات کے متعلق لکھتے ہیں:

یورپی تعلیمی سامراجیت نے مشرق وسطی میں سیکولرازم، مادیت اور قوم پرستی کے تصورات کو پھیلانے میں اپنے تمام وسائل کو انتہائی ذہانت کے ساتھ استعمال کیا۔ اس سلسلہ میں ۱۸۲۲ء میں مصر میں پرنٹنگ پریس کے قیام نے عربی زبان میں ایسے سواد کی اشاعت کو بہت آسان بنادیا جولادینیت، عرب قوم پرستی اور "روشن خیالی" کو تقویت دے سکے۔ عرب قوم پرستی کا ایک تقاضہ ترکوں کے اثرات سے نکلنا تھا۔ جس طرح یورپ میں نیشن اسٹیٹ کے تصور نے فروغ حاصل کیا تھا بالکل اسی طرز پر مشرق وسطی میں ترکوں کے اثرات کو زائل کرنے اور امت مسلمہ کو شعوب وقبائل میں بانٹنے کی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے مغربی استعمار نے قومی عصبیتوں کو ابھارنے میں سرگرمی سے حصہ لیا۔[1]

عالمی طاقتیں دنیا میں اپنی سرداری قائم رکھنے کے لیے جو اصول واقدار، جو تہذیب اور جس قسم کے اخلاقی معیارات رائج ہوتے دیکھنا چاہتی ہیں، ان کے آگے سب سے بڑی رکاوٹ اسلامی اقدار، اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاقیات ہی ہیں۔ "اسلامی" حکومتیں ان عالمی طاقتوں کے ایماء پر محض قوت کے بل بوتے پر تو مسلمانوں میں یہ تبدیلی پیدا نہیں کرسکتیں۔ لہٰذا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ لوہے سے لوہا کاٹا جائے۔ یعنی علماء ہی اب لوگوں کو یہ بتائیں کہ اصل میں اسلامی تہذیب اور اس کی اقدار ہیں کیا۔ اور اپنے "علمی رویے" سے یہ ثابت کردیں کہ آئین نو (یعنی ورلڈ آرڈر) سے ڈر کر طرز کہن (جو کہ اصل اسلام ہے!) پہ اڑنا قوموں کے حق میں کس قدر نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایسے "علمی وتحقیقاتی" اداروں کو فروغ دیا جائے جو "فہم اسلام کے جدید خطوط" پر ہی اپنا سارا زور صرف کردیں۔ جبکہ اس فہم کے خال وخط حقوق، آزادی اور مساوات ایسی پرکشش و پرفریب تہذیبی کج رویوں سے جا ملتے ہوں۔[2]

اس چیلنج کی نوعیت ہمہ گیر ہے۔ یہ چیلنج فکری بھی، عملی بھی، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی، معاشی بھی اور معاشرتی بھی، میدان جنگ درسگاہیں اور تعلیمی ادارے اور بڑا اسلحہ تعلیمی نظام اور ذرائع ابلاغ ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ذرائع ابلاغ پر سرمایہ داروں کے ایجنٹوں کا مکمل قبضہ ہے اور اخلاق باختگی اور طوائف کلچر کے فروغ کا عالمی ایجنڈا پوری طرح نافذ ہے۔ سب کا ایک ہی مقصد ہے کہ اس ملک کو عالمی سرمایہ داری کی قدروں سے ہم آہنگ کردیا جائے۔

برطانوی دور کے اسی لادین اور مادہ پرستانہ نظام تعلیم ہی کی یہ نحوستیں ہیں کہ مال وزر کی ہوس ہر فرد کی گھٹی میں پڑ گئی ہے، بدعنوانی اور خیانت نے اداروں کو کھوکھلا کردیا ہے، امانت ودیانت کے ایمانی اوصاف عنقا ہیں، محاسبہ آخرت کا کوئی احساس نہیں ہے، مفاد پرستی اور زر پرستی کا خوفناک اژدہا، انسانی قدروں کو بے رحمی سے نگل رہا ہے، ہر طرف بدامنی، لوٹ مار اور تعصبات کی تباہ کن آگ اسی سیکولر نظام تعلیم ہی کے تو

---

[1] پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، مشرق وسطی اور تعلیمی سامراجیت، خصوصی شمارہ مغرب اور اسلام، ص ۶۰

[2] محمد بن مالک، ... سہ ماہی مجلہ ایقاظ، مطبع ادارہ ایقاظ لاہور، ۳۰۹ء (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۹ء) ص ۹۳-۱۴۴

شناخت نے ہیں۔

دورِ جدید میں ہماری ذہنیت ایسی ہو گئی ہے کہ فن استعداد، علمی قابلیت اور اخلاقی تربیت کے بجائے انگریزی زبان ہی کو علمی قابلیت اور ترقی وکامیابی کی کلید سمجھا جانے لگا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ترقی یافتہ ملک اپنی زبان اور روایات سے اس قدر دل برداشتہ نہیں ہے جس طرح ہم ہیں۔ علم وفن کی گہرائی تک رسائی بھی اپنی ،دری زبان میں ہی زیادہ آسان ہوتی ہے۔ بنسبت اجنبی زبان کے چین، جاپان، جرمنی اور فرانس جیسے ممالک بھی تو اپنے تعلیمی اداروں میں اعلیٰ ترین سطح تک اپنی اپنی زبان پر انحصار کرتے ہیں۔ ہم بھی اگر انگریزی زبان پر فخر کرنے اور اسی لب ولہجے کو قابلیت کا معیار سمجھنے کے بجائے اپنی ہی قومی زبان کو فروغ دیں اور اسی کو ہر سطح پر تعلیم کا ذریعہ بنائیں تو انشاءاللہ کسی خسارے میں نہیں رہیں گے۔

تعلیم کے اسلامی اجزائے ترکیبی یعنی وحدت حقیقت، وحدت علم، وحدت انسانیت، وحدت حیات وغیرہ سے مغربی علوم کے اجزائے ترکیبی یعنی غیر فطری انسانی آزادی، تشکیک، مادیت وغیرہ کو بدل دینا چاہیے۔ علوم کی حقیقت کے ساتھ ساتھ جستجو کا رخ بھی متعین ہونا چاہیے تاکہ اسلامی تہذیبی اور علمی اقدار کا احیاء ہو۔ علوم اسلامی کی بنیاد پر انسانی معاشروں کی بہبود اور خاص طور پر مسلم معاشروں کی فوز وفلاح اور تربیت کا کام ہونا چاہیے۔ انسانی قابلیت اس کی استعداد کی حد تک فائدہ اٹھانے کا موقع ملنا چاہیے۔ سائنسی ترقی اور تخلیق کو اس طرح استعمال کرنا چاہیے کہ زمین پر خدا کی مرضی پوری ہوتی ہوئی معلوم ہو۔ تہذیب وثقافت روبہ ترقی ہوں۔ انسانی علم، عقل، بہادری، نیکی، پاکیزگی اور تقدس کے مزید نادر نمونے سامنے آئیں۔ دنیا ایک بار پھر ان فوائد سے بہرہ ور ہو جس کی ایک جھلک خلافت راشدہ کے دور میں انسانیت دیکھ چکی ہے۔

عصری مسائل میں ایک اہم مسئلہ عدم صحت کی پالیسی ہے۔ جس کو مسلم ریاستیں اپنے وسائل کی کمی کی وجہ سے نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔

علم وصحت افراد کے بناؤ بگاڑ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ علم وسعتِ قلب ونظر کا ذریعہ ہے اور صحت انسان کو عملی زندگی میں اس کے استعمال کے قابل بناتی ہے۔ علم اقدار کو نکھارتا ہے تو صحت ان اقدار کے مطابق زندگی میں عمل کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ اقدار ہی ہیں جو افراد کو بہتری کے اصول پر مستحکم مستقبل فراہم کرتی ہیں۔

اگر ہماری تعلیمی حکمتِ عملی نے ہمیں مسلمان ڈاکٹر، مسلمان سائنسدان اور مسلمان فارماسٹ دیئے ہوتے تو آج ہم ملٹی نیشنل کمپنیوں کے شکنجے میں جکڑے نہ ہوتے اور ملک کے اندر ماحول ومزاج کے مطابق ادویات تیار کی جاتیں جن کے کم از کم نقصانات ہوتے اور زیادہ سے زیادہ فوائد ہوتے۔ غیر مسلم ریاستوں سے ناگزیر ادویات ہی درآمد کی جاتیں اور ان درآمدات پر کڑی نظر رکھی جاتی کہ یہ ملکی ادویہ سازی کی صنعت کو برباد کرنے میں کوئی کردار ادا نہ کریں۔

صحت کی تعلیم وتربیت ہے تو صحت کے لیے علاج معالجہ کی اہمیت بھی ہے اور دونوں محاذوں سے اہم محاذ احتیاطی تدابیر اختیار کرنا بھی ہے مگر عملاً یہ ہوا کہ طبی تعلیم کے لیے کالجوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ تعلیمی اخراجات میں بھی ہوشربا اضافہ ہوا اور یہ تعلیم غریب کی پہنچ سے باہر ہوتی گئی۔ ہسپتال بے شک بڑھے مگر ڈاکٹروں نے اپنے ذاتی ہسپتال آباد کرنے کی خاطر سرکاری ہسپتال کو بے یار ومددگار رکھنے پر توجہ دی۔ احتیاطی تدابیر بھی ذاتی منفعت تلے دب گئیں۔ پاکستان گذشتہ ۶۳ سالوں میں صحت کے حوالے سے کوئی معیاری پالیسی نہیں بنا سکا۔ حکومتیں تیزی سے بدلتی رہیں اور ہر حکومت کے ساتھ پالیسیاں بھی بدلتی رہیں۔

صحت کے لیے علاج ضروری ہے اور علاج کے لیے ادویات ہیں۔ پاکستان میں ادویہ سازی پر غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری ہے۔ مبینہ طور پر "معیاری ادویات" کی قیمت بھی معیاری ہے جو غریب کی پہنچ سے انتہائی دور ہے۔ درمیانہ سفید کالر طبقہ کی پہنچ سے دور ہے۔

اس معیار کا علاج صرف اعلیٰ سرکاری افسران یا دیگر صاحبان ثروت کی دسترس میں ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے نام کو ہی معیار سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اس سے بہتر معیار گنتی کی نیشنل کمپنیوں کے ہاں بھی ہے۔ ادویہ سازی میں محکمہ صحت کے اپنوں نے بھی مقدور بھر حصہ ڈالنا ضروری سمجھا اور یہ اس لیے کہ سرکاری ہسپتالوں میں ان کی تیار کردہ ادویات سپلائی ہوں گی۔ انہیں معیار سے غرض نہیں "مال" سے غرض ہے۔

گنتی کی معیاری نیشنل کمپنیوں سے ہٹ کر بہت سی کمپنیاں غیر معیاری ادویات بناتی ہیں، ادویات فروخت کرتی ہیں۔ پالیسی سازیوں نے کبھی اسے پالیسی کا حصہ نہیں بنایا کہ مختلف فصلوں پر سپرے کی جانے والی زہریلی ادویات انسانی صحت کی دشمن ہیں یہ سپرے کپاس یا چاول پر ہوں، یہ چارے پر ہوں یا یہ سپرے پھلوں اور سبزیوں پر ہوں انسانی صحت کے لیے انتہائی مہلک ہیں۔ یہ سارے زہر سیٹمک یعنی جذب ہونے والے ہوتے ہیں اور ان کے اثرات فوری طور پر اشیاء اور ماحول سے زائل نہیں ہوتے، یوں یہ انسانی زندگی کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ صحت کے حوالے سے ہمارے پالیسی ساز اسے اپنے دائرہ عمل میں سمجھنے کے بجائے اسے محکمہ زراعت کے پالیسی سازوں کی سر دردی قرار دیتے ہیں۔ یہ قومی سطح کا المیہ ہے۔ محکمہ زراعت اس سارے قضیے سے بے نیاز ہے کہ یہ محکمہ صحت کا کام ہے۔

ہماری ساری پالیسیاں یہود ونصاریٰ اپنے مالیاتی اداروں کے قرض سے کنٹرول کرتے ہیں مثلاً ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کا قرض نہیں مل سکتا جب تک سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کے معاہدہ کی رو سے پاکستان خاندانی منصوبہ کی تشہیر نہ کرے، مضر صحت گولیاں اور کنڈوم نہ بیچے۔ یہودی نصاریٰ بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن کی رو سے آبادی میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی، خالق کا منصوبہ تخلیق اٹل ہے۔ قرآن کی حقانیت تسلیم کر لینے کے باوجود وہ امداد کیوں دیتے ہیں صرف اس لیے کہ خاندانی منصوبہ بندی کا ساز وسامان مسلمان قوم میں بیماریوں کو جنم دے گا، اضافہ کرے گا اور جس قوم کی عورتیں بیمار ہوں اس قوم کو صحت مند نسل کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

صحت کے شعبہ میں منصوبہ بندی تقاضا کرتی ہے کہ پہلے اس بات کا تعین کیا جائے کہ آبادی کس قدر ہے جس کی صحت کا تحفظ مقصود ہے، آبادی کی بڑھوتری کی شرح (موت وپیدائش کے اعداد وشمار کو سامنے رکھتے ہوئے) کیا ہے اور اس طرح سال بہ سال یہ ضرورت کس شرح سے بڑھے گی اور اس کی روشنی میں عوام الناس کے لیے طبی سہولتوں میں مطلوبہ بڑھوتری سے عہدہ برا ہونا کیسے ممکن ہوگا۔ تکمیل طلب کے لیے کس قدر وسائل درکار ہوں گے اور یہ وسائل کہاں سے دستیاب ہوں گے۔

عصری اسلامی مملکت جن جدید مسائل سے دوچار ہے وہ جدید اداروں کو قرآن وسنت کے مطابق استوار کرنے اور قرآن وسنت کی حدود میں مالیات کے حصول اور اس کے صرف کے مسائل ہیں۔ آج اداروں کو چلانے کے لیے بڑی مقدار میں مال کی ضرورت ہے، اس کے لیے ٹیکسز لگائے جاتے ہیں۔ بیرونی اور اندرونی سودی قرضے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس سارے نظام کو کم خرچ بنانے اور سودی نظام سے اداروں کو نکال کر غیر سودی نظام کے تحت معاملات چلانے کے مسائل درپیش ہیں۔

ترقی یافتہ مغربی ممالک دنیا بھر کو بالعموم اور عالم اسلام کو بالخصوص اپنی صنعتی پیداوار کی کھپت کے لیے پٹی منڈی بنانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں مگر امت مسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک بے شمار مادی وسائل کے باوجود اندرونی اور بیرونی طور پر ان گنت اقتصادی مسائل کا شکار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی معاشی تعلیمات اسی معاشرے میں روبہ عمل آ سکتی ہیں جو اخلاقی طور پر مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر استوار ہو۔

"وہ مسلم ممالک جہاں زکوٰۃ اور عشر کا مرکزی اور حکومتی نظام قائم ہوا ان کے معاشرے میں اس نظام سے ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس کا نقصان یہ ہوا کہ یہ ادارے بعض حکمرانوں کے سیاسی استحکام میں ایک وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت سے استعمال ہوئے یا سیاسی حکومت کو اخلاقی جواز مہیا کرنے میں۔ اسلام کو خاص طور پر قانون وراثت، نظام زکوٰۃ، آبادی اور ملکیت زمین کے مسائل پر تحقیقی کام کرنا ہوگا۔ خاص طور

پر جاگیردارانہ نظام کے ان پہلوؤں پر جہاں وہ مذہب کے نام پر اپنا جواز پیدا کرتے ہیں۔ل

یہ تو رہی اندرونی صورت حال بیرونی صورت حال بھی خاصی گھمبیر ہے۔ اسلامی ممالک نہ تو کوئی مشترکہ معاشی منڈی رکھتے ہیں، نہ موثر بینکاری نظام، نہ باہمی امداد تعاون کا کوئی موثر نظام ہے نہ ایک دوسرے سے وسائل سے استفادہ کرنے کو کوئی لائحہ عمل، امت مسلمہ کا بیش بہا سرمایہ اور قیمتی وسائل مغربی ممالک کے رحم وکرم پر ہیں۔ اقتصادی مسائل ہی کے حوالے سے امت مسلمہ کا ایک اہم مسئلہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پسماندگی بھی ہے۔

پاکستان کے معاشی حالات بگاڑ کا شکار ہیں۔ قرضوں کی ۶۳ سالہ ایک تاریخ ہے۔ اس وقت ملکی معیشت ۵۸ ارب ڈالر کے بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ لیکن ان قرضوں کے باوجود ملکی ادارے بحران سے دوچار ہیں۔ ملک ترقی کے نام سے ناآشنا ہے۔ ان قرضوں سے قوم کے حالات میں نہ اب تک کوئی بہتری آئی اور نہ ہی آئندہ آنے کی توقع ہے۔ کیونکہ قرضوں کی یہ رقم کرپٹ حکمرانوں کی جیبوں میں چلی جاتی ہے۔ ملک میں قیادت کا ایک خلا ہے۔ دس دس سال ملک سے باہر رہنے والوں کو ملکی مسائل کا ادراک نہیں ہے۔ ان کے پاس کوئی وژن نہیں ہے۔ دیانتدار اور مخلص قیادت ہی ملک کے معاشی مسائل حل کر سکتی ہے اور ان بیرونی قرضوں سے قوم کو نجات دلا سکتی ہے۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب اس کو مخلص قیادت ملی تو ہر شعبہ بحران سے نکلا اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا۔ انہوں نے بیرونی امداد کو لات ماری، غیر ملکی ماہرین سے منہ موڑا، اپنے مادی وسائل پر انحصار اور اپنے ملکی ماہرین پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ ۲

پورے عالم اسلام کی افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ اسلامی نظام معیشت دنیا بھر میں کہیں بھی نافذ العمل نہیں۔ سود، ٹیکس، بینک، جوا اور لاٹری وغیرہ نے دنیا بھر کی معیشت کو جکڑ رکھا ہے۔ اس بھیانک جرم میں جہاں مسلم عوام شریک ہیں، وہاں دراصل مسلم حکومتیں اس ظالمانہ معیشت کو تبدیل نہ کرنے کی اصل مجرم ہیں۔ سود کے خاتمے اور متبادلات کی کتنی ہی سکیمیں پاکستان کے متعدد اداروں اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت اور تحقیقی اداروں کے پاس موجود ہیں لیکن کوئی حکومت بھی اس طرف سنجیدہ جدوجہد کے لیے آمادہ نہیں ان حالات میں اکثر بینک غیر اسلامی سکیموں کے اسلامی نام رکھ کر عوام کے دینی جذبے کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سنجیدہ اور مسلسل جدوجہد کے بغیر غیر اسلامی نظام معیشت سے چھٹکارا نہیں پایا جا سکتا۔ ۳

اسلامی ممالک معدنی دولت سے مالا مال ہیں اور مختلف صنعتی ممالک ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہمارے پاس ایسا اقتصادی منصوبہ کیوں نہیں جو اسلامی ممالک کے ذخائر کو اغیار کی غنیمت بننے سے بچا سکے۔

اس وقت سود کی لعنت عام ہو چکی ہے اور یہ خباثت ہر سو پنپ رہی ہے۔ تم اس کے خاتمے کے لیے سرگرم کیوں نہیں ہوتے؟ تمہیں چاہیے تھا کہ مسلمانوں کا اجتماعی مالی مرکز قائم کرتے، جس سے لوگوں کو سود کے دبال سے چھٹکارا حاصل ہوتا۔

سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کی عالمی کشمکش اور اس کے بعد سود، منافع خوری اور سٹہ پر مبنی اور حلال وحرام سے بے نیاز مارکیٹ اکانومی نے جس خوفناک معاشی، بحران سے دنیا کو دوچار کر دیا ہے، اس کا حل اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ دنیا کو آسمانی تعلیمات کی بنیاد پر حلال وحرام کے دائرے کی طرف واپس لایا جائے اور یکطرفہ منافع کی بجائے دوطرفہ منفعت اور عوامی مفاد پر مبنی معاشی اصولوں کو اختیار کیا جائے جو اس

ل　ڈاکٹر منظور احمد، مستقبل میں اسلام کی تفہیم اور اکیسویں صدی میں ہمارا کردار، معارف لاہور، مجلہ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۷، ۴، ۵، ۶، (اپریل، مئی، جون ۱۹۹۴ء)، ص ۱۲۸

۲　لیاقت بلوچ پاکستان میں تبدیلی کی لہر ہفت روزہ ایشیا، لاہور ۶۰، ۲۶ (جولائی ۲۰۱۱ء)، ص ۲۹

۳　مترجم کامران طاہر، خطبۂ حج، مسلم امہ کی المناک صورتحال اور قرآنی تعلیمات، ماہنامہ محدث، زیر اہتمام مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور، ۳۹ ۲، (فروری ۲۰۰۷ء)، ص

وقت صرف اسلام کے پاس ہیں۔[۱]

صحیح معنوں میں ایک ویلفیئر ریاست کے قیام کے لیے آج بھی دنیا کے سامنے آئیڈیل صرف خلافت راشدہ بالخصوص حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی شخصیات ہیں اور جزوی طور پر کچھ معاملات میں ان کی پیروی بھی کی جا رہی ہے، لیکن کسی نظام کے صرف جزوی پہلوؤں کو اختیار کر کے اس کے ثمرات حاصل نہیں کیے جا سکتے بلکہ اس سے صحیح استفادہ کے لیے پورے سسٹم کو اپنانا ضروری ہوتا ہے۔

معیشت کی بہتری کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ساری توجہ اعداد و شمار پر مرکوز رکھی جائے بلکہ اس میں مساوات کا پہلو مدنظر رکھا جائے، مفتی تقی عثمانی اس ارتکاز دولت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

تقسیم دولت کے نظام کو حقیقی معنی میں منصفانہ بنانے کی کوشش کی جائے، تاکہ ہر طبقہ کی ضروریات کو انصاف کے ساتھ پورا کیا جا سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بازار کے لین دین پر جو نظریاتی پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت ہے، ان پر اب تک کوئی سنجیدہ غور وفکر نہیں ہوا۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ تمام اصول وضوابط کے باوجود بازار کی پیدا کردہ دولت اب تک صرف چند متمول لوگوں کے درمیان گردش کر رہی ہے۔[۲]

معاشی انصاف کے قیام کے لیے سیاسی نظام کی اصلاح بھی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام کے دو اساسی اصول ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت مسلمانوں کے مشورے سے بنے اور ان کے مشورے سے چلے۔ عوام کے معتمد نمائندے حکومت بنائیں اور چلائیں، ہر قسم کی آمریت اور ڈکٹیٹر شپ اسلام میں ممنوع ہے اور دوسرا اصول یہ ہے کہ انتظامیہ دیانتدار اور فرض شناس ہو۔ اگر قوانین صحیح اور متوازن ہوں، لیکن ان قوانین کو نافذ کرنے والی انتظامیہ بگڑی ہوئی ہو اور نظام حکومت شورائی ہونے کی بجائے آمرانہ وشاہانہ اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ اصول پر کام کر رہا ہو تو صرف قوانین کی درستگی سے معیشت درست نہیں ہو سکے گی۔

پیپلز پارٹی کے اقتدار کے اس دور میں معاشی ترقی کی رفتار پاکستان کی تاریخ میں پست ترین رہی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ترقی کی رفتار چھے اور سات فی صد تک رہی۔ ۱۹۵۰ء سے ۲۰۰۶ء تک کے معاشی حالات کا جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ سارے نشیب وفراز اور بار بار کی امریکی پابندیوں کے باوجود اوسط رفتار ترقی سالانہ پانچ فی صد رہی۔ یہ صورت حال پاکستان کی ۶۴ سالہ تاریخ میں پہلی بار رونما ہوئی ہے کہ گذشتہ چار برسوں میں اوسط رفتار ترقی ۲٫۵ فی صد رہی ہے، جو آبادی میں ۲٫۱ فیصد اضافے کے بعد ترقی کے مفقود ہونے اور حقیقی جمود (stagnation) کی غماز ہے۔ اس پر مستزاد مہنگائی اور افراط زر ہے جس کی اوسط شرح ان چار برسوں میں ۱۵ فی صد رہی ہے اور اشیائے خورد ونوش کی مہنگائی کا اوسط سالانہ ۱۸ فی صد رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان چار برسوں میں غربت میں ہوشربا اضافہ ہوا ہے۔ وہ افراد جن کی روزانہ آمدنی ۲٫۲۵ ڈالر (۱۰۰ روپے) یا اس سے کم ہے، ۲۰۰۰ء میں ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ تھی جو ۲۰۱۱ء میں بڑھ کر ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ ہو گئی ہے یعنی مطلق غربت میں ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ کا اضافہ ہوا ہے۔ اگر غربت کی حد (Poverty line) کو دو ڈالر یا ۱۷۰ روپے یومیہ رکھا جائے تو ۱۸ کروڑ کے اس ملک میں ۱۱ کروڑ افراد اس کسمپرسی کے عالم میں مبتلا ہیں۔ ملک میں عدم مساوات میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک طرف امیر طبقہ ہے جو امیر تر ہو رہا ہے۔ آبادی کا ایک فی صد ہر مہینہ اوسطاً پانچ لاکھ یا اس سے زیادہ کما رہا ہے۔ اوپر کا ۱۰ فی صد ۵۰ ہزار ماہانہ یا اس سے زیادہ کما رہا ہے۔ دوسری طرف آبادی کا وہ ۱۰ فی صد ہے جو معیشت کے پست ترین درجے میں ہے، اس کی ماہانہ آمدنی ۲۰۰۷ روپے یا اس سے بھی کم ہے۔

---

۱. ابو عمار زاہد الراشدی، اسلام کا نظام خلافت اور دور حاضر میں اس کا قیام، ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ، (دسمبر ۲۰۱۰ء) ۲۱:۱۲، شمارہ، ص ۲۷-۲۸

۲. مولانا تقی عثمانی، موجودہ عالمی معاشی بحران اور اسلامی تعلیمات، ماہنامہ البلاغ طبع شعبہ البلاغ جامعہ دار العلوم کراچی، ۴۵، ۵، مئی ۲۰۱۰ء، ص ۲۷

جبکہ ایوانِ صدر اور ایوانِ وزیر اعظم کا روزانہ خرچ ۲۵ لاکھ روپے ہے اور صرف صدر اور وزیر اعظم کے بیرونی دوروں پر خرچ ہونے والی رقم ۱۲ارب روپے ہے یعنی روزانہ ۱۵۵ لاکھ روپے۔[1]

پاکستان میں پیداواری، صنعتی بنیاد کے بغیر اور مطلوبہ ماہر افرادی قوت کو تیار کیے بغیر ہر جگہ صارف کی معیشت ہے۔ یہ وہ خامیاں ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں ایک انتہائی اہم قدم یہ ہے کہ معیشت کو رفتہ رفتہ اور جزوی طور پر عالمی نظام سے غیر منسلک کیا جائے۔ جہاں تک عالمی معیشت سے جزوی طور پر غیر منسلک ہونے کا تعلق ہے۔ پاکستان کو مندرجہ ذیل اہم امور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تعلیم، ٹیکنالوجی کا حصول اور غذائی تحفظ کی بروقت ری کی حکمت عملی اور صنعت وٹیکنالوجی کی پیداواری بنیاد میں بتدریج اضافہ جو خود انحصاری کا باعث ہو۔

دنیا میں توانائی یعنی تیل اور گیس کے ۷۰ فیصد ذخائر مسلم دنیا میں ہیں اور مسلم دنیا میں بھی نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ وسط ایشیائی ریاستوں میں بھی موجود ہیں۔ اس معاملے کا ایک انتہائی اہم پہلو یہ ہے کہ امریکہ عراق، افغانستان، وسط ایشیائی ریاستوں اور حتیٰ کہ پاکستان پر سیاسی تسلط کا ارادہ رکھتا ہے اور ان علاقوں سے اس کے معاشی مفادات بھی وابستہ ہیں اس مقصد کے لیے امریکہ اس امر کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ تیل کی پیداوار، تیل نکالنے کی مقدار اور تیل کی مصنوعات کو قابل استعمال بنانے کے کام پر اس کی مضبوط گرفت رہے۔ مشرق وسطیٰ اور مسلم دنیا کا امریکہ، یورپ اور ان کی کثیر القومی کمپنیوں پر انحصار، عالمی سرمایہ داری نظام کا جزو لاینفک ہے۔[2]

مسلم دنیا مجموعی طور پر مغرب کی بہ نسبت کہیں زیادہ وسائل سے مالا مال ہے۔ جس چیز کی کمی ہے وہ قوت ارادی اور باہم مربوط حکمت عملی کا فقدان ہے۔

تیل کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا ایک با بصیرت اور حوصلہ مند قیادت پر منحصر ہوتا ہے، ایک ایسی قیادت جو کہ خود غرضانہ ذاتی مفادات کی بجائے، لوگوں کے مفادات میں دلچسپی رکھتی ہو۔ یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ شاہ فیصل مرحوم کے بعد عرب دنیا کو دوبارہ ویسا مدبر اور حوصلہ مند قائد میسر نہیں آیا۔ قذافی نے ابتدا میں مزاحمت کی کچھ کوشش کی لیکن پھر امریکی دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ہتھیار ڈالنے کا یہ عمل عرب دنیا کے لیے کسی عظیم المیے سے کم نہ تھا اور آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ مشرق وسطیٰ کی ساری کی ساری قیادت مغرب اور اس کے کارندوں کے ہاتھوں ان کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے۔ مغربی کارندے اسلحہ استعمال نہیں کرتے کیونکہ ان کا کام جھکی دیتے رہنا اور پھر اپنی شرائط تسلیم کروا کے ہتھیار ڈلوانا ہے۔ یہ اسی وجہ سے ہوا ہے کہ اسلامی دنیا خود انحصاری کی باعزت حکمت عملی کی بجائے، مغرب پر انحصار اور ان کے مفادات کی بجا آوری کے تباہ کن رویے پر گامزن ہو گئی۔ جب تک ایک بنیادی سیاسی تبدیلی نہیں آتی، عرب اور اسلامی دنیا اپنی طاقت استعمال نہیں کر سکتی، خواہ یہ سیاسی ہو یا توانائی کے ذریعے سے حاصل شدہ۔[3]

ہمارا موجودہ نظام جس کے بارے میں تجربات نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ وہ خامیوں سے پر ہے، اگر ہم اس میں کوئی ہمہ گیر اصلاح لانا چاہتے ہیں، تو پھر ہمیں انقلابی تبدیلی کی کسی تجویز سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے، بشرطیکہ وہ درست اور مضبوط دلائل پر مبنی ہو۔ موجودہ معاشی بحران چونکہ عالمگیر نوعیت کا ہے، اس لیے اس کا تقاضا یہ ہے کہ موجودہ سیاسی نظام میں ہمہ گیر تبدیلیاں لائی جائیں۔ ایسے عالمی بحران کے حل کے لیے محض معمولی رفوگری کارآمد نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہمیں اپنے معاشی نظام کی اوور ہالنگ کی ضرورت ہے، ایسی اوور ہالنگ جو درست

---

1. پروفیسر خورشید احمد، پاکستان کا معاشی بحران اور بجٹ، عالمی ترجمان القرآن، طبع البلاغ فرسٹ لاہور، ۱۳۰، (جولائی ۲۰۱۱ء)، ۶-۷۔

2. پروفیسر خورشید احمد، عالمی سرمایہ داری، توانائی کی سیاست اور مشرق وسطیٰ، خصوصی شمارہ مغرب اور اسلام (۲۰۰۱ء)، ص ۱۳۔

3. ایضاً، ص ۱۹

اقداراور اصولوں کی بنیاد پر اس کی از سر نو تشکیل کرے، جس سے ایک ایسا نظام وجود میں آئے جو ایک طرف منصفانہ ہو، اور دوسری طرف اتنا متوازن ہو کہ وہ آئے دن کے جھٹکوں سے محفوظ رہنے کی ذاتی صلاحیت رکھتا ہو۔

کسی بھی ملک میں سیاسی عدم استحکام ہو تو وہاں کی معاشرتی تنظیم میں اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ معاشرہ عموی معاشرتی تنظیم کے رگی ڈھانچے اور جملہ خدوخال پر منحصر ہوتا ہے اور بذات خود سیاسی نظام اور تمام ادارات کی غایت بھی یہی ہوتی ہے کہ معاشرتی تنظیم کی نہ صرف موثر تشکیل ہو بلکہ اس کے رگی ڈھانچے کو اس انداز میں استحکام ملے کہ وہ معاشرتی ترقی، تمدن کے تشخص کی ضامن دکھائی دے۔ یہ اس وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب سیاسی عمل کے ثمرات سے ہر شعبہ زندگی منظم ہو اور ان کی کارکردگی سے عموی معاشرتی تنظیم مستحکم ہو اور بالآخر وہ اس معاشرے کے افراد کے تمدن کا مظہر دکھائی دے۔ ویسے بھی موجودہ عہد تنظیمی عہد ہے معاشرہ ہو یا اس کا کوئی ذیلی شعبہ زندگی اس طرح تنظیمی حرارکی میں جڑے ہوئے ہیں کہ ان کی عموی فعالیت سے معاشرے کی وحدت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہر نظام زندگی کا اولین مقصد اس تنظیمی تمدن کے ارتقا کو ممکن بنانا ہوتا ہے بالخصوص سیاسی عملداری کی تو غایت ہی یہی ہے کہ وہ معاشرے کو اس طرح منظم کرے کہ وہ ایک تنظیمی وحدت دکھائی دے لیکن جہاں سیاسی نظام کو استحکام نہ ملے، تو عدم استحکامی کیفیات معاشرتی تنظیم کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیتی ہیں۔

سیاسی اقتدار کے حصول کی جدوجہد کرنے والوں کے مابین تنازعہ پیدا ہونا لازم ہے۔ باہمی تنازعات افراد اور کمیونٹی کو کمزور کرتے ہیں اور سماجی ترقی کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو باہمی تنازعات سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمانوں کے مابین پیدا ہونے والے باہمی تنازعات اور اختلافات کے پس پشت سیاسی اقتدار کے حصول کی خواہش تھی۔ حضور کی وفات کے بعد سب سے بڑا سوال ہی یہ تھا کہ سیاسی اقتدار کس کے پاس ہو اور حق حکمرانی کس کو حاصل ہے۔ چنانچہ سیاسی اقتدار کے سوال پر مسلمانوں کی تقسیم کے عمل کا آغاز ہو گیا[1]

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ ایک سماج کا تصور تو موجود ہے لیکن ریاست اور اس کے اداروں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ قرآن عدل اور احسان پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنی اصولوں کے مطابق تشکیل پانے والے سماج کی بنیادیں انہی اصولوں پر استوار ہونا چاہئیں۔ اسی طرح قرآن ظلم اور ناانصافی کو سختی سے مسترد کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا سماج جو ظلم وزیادتی پر قائم ہو، وہ کسی طور پر بھی اسلامی سماج نہیں کہلا سکتا۔ سماجی تشکیل میں قرآنی اقدار بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ پس یہ امر بحث طلب ہے کہ کیا ظلم وزیادتی کی بنیادوں پر قائم اور عدل و احسان پر مبنی قرآنی اقدار سے ماورا ریاست کو جائز طور پر اسلامی ریاست کہا جا سکتا ہے۔

اسلامی قوانین کو عموی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک تو وہ قوانین ہیں جو ہم خود اپنے اوپر لاگو کرنے کی استعداد رکھتے ہیں، جیسے چوری نہ کرو، ظلم نہ کرو، دوسروں کے خلاف جھوٹے مقدمات نہ بناؤ، عورتوں کو ان کے جائز حقوق دو، یتیموں سے حسن سلوک سے پیش آؤ۔ ایسے اور بہت سے اسلامی احکامات ہیں جن پر انفرادی طور پر عمل پیرا ہو کر معاشرے میں اصلاح باہمی اخوت اور محبت کی اقدار کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ دوسرے وہ قوانین ہیں جو حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں جیسے شراب خوری، جوا، قتل، چوری وغیرہ پر سزائیں، ظلم و فسق اور قانون کا نفاذ وغیرہ، اگر ہم اپنی اصلاح کریں اور حکومت اپنا کردار ادا کرے۔ جس کے لیے اسلامی قوانین اور سیرت مطہرہ سے رہنمائی حاصل کی جائے تو معاشرہ ترقی کر سکتا ہے۔

معاشرہ میں تنظیم اور آپس میں مل جل کر مشترکہ مسائل حل کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے محکمہ امداد باہمی کا کردار بے حد اہم ہے۔

---

1. اصغر علی انجینئر، اسلامی ریاست کا تصور، ص ۵۵

ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ امداد باہمی کی انجمنیں تشکیل دی جائیں جن کے ذریعہ انھیں قرضہ حاصل کرنے، اشیا خرید و فروخت مجموعی طور پر پیداوار بڑھانے، تعلیم اور حفظانِ صحت کے لیے سہولیات میسر آسکیں، اسی علاقہ میں موجود تمام تر وسائل کو بروئے کار لا کر منصوبہ جات کی تکمیل بھی کرتی ہیں پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں ایسی امداد باہمی کی انجمنوں کے فروغ کی اشد ضرورت ہے تا کہ علاقائی مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں مدد مل سکے اور حکومت کو بھی زیادہ مالی بوجھ برداشت نہ کرنا پڑے۔

سماجی میدان میں ترقی کے لیے ہر پاکستان کے لیے بلاامتیاز شہری سہولیات اور مساوی مواقع کی فراہمی، تعلیم، صحت، صفائی جیسی بنیادی سہولیات کی فراہمی کے ذریعے انسانی استعداد کار میں اضافے، نادار اور ضرورت مند خواتین و حضرات کے لیے سوشل سیکورٹی کے شفاف اور ہمہ گیر نظام اور پاکیزہ ماحول کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ ہر سطح پر سادگی پر مبنی طرزِ زندگی کے فروغ کے ساتھ ساتھ کنزیومر کلچر کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔ اس سب کے ساتھ ساتھ ایسے انسانی رویے پروان چڑھانے کی کوشش کی جائے جن پر عمل کرتے ہوئے معاشرے میں انسانوں کے درمیان امتیازات کو کم سے کم کیا جا سکے۔

سماجی شعبے میں اگلے ۱۰ برسوں میں مذکورہ بالا اہداف حاصل کرنے کے لیے پرائیویٹ سیکٹر کے تعاون سے سرکاری طور پر سوشل انفراسٹرکچر پروان چڑھایا جائے جس کے ذریعے تمام شہری کو بنیادی سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکے۔ خصوصی توجہ کے محتاج افراد اور علاقوں کے لیے پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے ایسے منصوبے تیار کیے جائیں جنکی مدد سے ان افراد اور علاقوں کو قومی زندگی میں زیادہ نمایاں کردار ادا کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔[۱]

ہمارے معاشرے کو جو مسائل آج درپیش ہیں اور جنھوں نے گھمبیر صورت اختیار کر کے زندگی کو بدصورت اور ناقابل برداشت بنا دیا ہے اور معاشرہ رہنے کے قابل نہیں رہا، یہ شدید مسائل حل ہو سکتے ہیں یا کم از کم ان میں معتدبہ کمی ہو سکتی ہے اگر ہمیں احساس ہو جائے کہ جن امور کا ہمیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور جن سے سماجی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور جن سے ہمارے مسائل حل ہو سکتے ہیں، ہم ان پر عمل ہی نہیں کر رہے اور ہم اس کے لیے منظم و متحرک ہی نہیں ہیں۔ ہمارے مسائل کیا ہیں؟ اتنی غربت کہ لوگ بھوک کے مارے خودکشیاں کر رہے ہیں (معیشت)۔ انصاف کا نہ ملنا کہ برسوں تک عدالتوں میں مقدمے چلتے رہتے ہیں (عدل و انصاف)، شہری سہولتوں کی نایابی جیسے سٹریٹ لائٹ کا نہ ہونا، ابلتے ہوئے گٹر یا پارکوں میں لاابالی نوجوانوں کی غیر صحت مند سرگرمیاں (معاشرت)۔[۲]

ہم میں سے ہر ایک اپنے فرائض کی ادائیگی اور معاشرے کی بہتری اور خرابی کو دور کرنے کے لیے خدا کے ہاں جواب دہ ہے، لہٰذا تبدیلی کا آغاز اپنی ذات سے کیجیے۔ انفرادی اصلاح اور منظم جدوجہد کے ذریعے بتدریج اصلاح کا دائرہ بڑھتا چلا جائے گا۔ ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے بھی ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ معاشرے کی بہتری اور سماجی بگاڑ کو روکنے کے لیے ہم میں سے ہر ایک کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اگر سماجی و سیاسی انتشار کو نہ روکا گیا تو معاشرتی بگاڑ کے نتیجے میں بالآخر قومی انحطاط اور زوال کا سامنا کرنا ہوگا۔ مسئلے کی نزاکت کا احساس کرنے اور اس جدوجہد کی ہمیں آج ضرورت ہے جو ہماری آج کی اس پریشان حال زندگی کو خوش حالی میں تبدیل کر سکے۔[۳]

لوگوں کو معاشرے کے بالادست طبقوں یا جن کے پاس فیصلوں کی طاقت ہے، ان پر منظم ہو کر دباؤ ڈالنے کی پالیسی اختیار کرنا ہوگی، اور اپنی عوامی طاقت اور اجتماعیت کے پہلو کو مضبوط بناتے ہوئے ایک نئے سیاسی و سماجی سفر کا آغاز کرنا ہوگا، جو مشکل اور کٹھن ضرور ہے مگر ناممکن

۱۔ سید منور حسن، معاشی حکمت عملی، ماہنامہ ترجمان القرآن، طبع ابلاغ ٹرسٹ لاہور، ۴/۱۴۳، (اپریل ۲۰۱۰ء)، ص ۵۷

۲۔ ڈاکٹر محمد امین، سماجی تبدیلی۔ وقت کی اہم ضرورت، ماہنامہ البرہان، طبع تحریک اصلاح تعلیم، فیصل ٹاؤن، لاہور، ۲۲، ۲۰، جون ۲۰۱۱ء، ص ۴

۳۔ سلمان عابد، سیاسی و سماجی انتشار، تبدیلی کیسے؟ ماہنامہ ترجمان القرآن، طبع ابلاغ ٹرسٹ لاہور، ۱۴۳۶/۱۱، (نومبر ۲۰۰۹ء)، ص ۸۷

نہیں۔ عوام الناس کی بہتری اور بھلائی چاہنے والے افراد، جماعتیں اور سماجی ادارے اگر لوگوں کی فکری و ذہنی تربیت اور ان کے سیاسی و سماجی شعور کی بیداری میں آگے بڑھیں اور اپنے کام کو ایک نئی جہت دیں تو وہ ایک نئے کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔

قرآن و سنت کے نصوص میں جس معاشرے کو اللہ کا مطلوب معاشرہ قرار دیا گیا ہے، اس کا سب سے بنیادی وصف یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں مسلم و غیر مسلم اور مرد و زن کے حقوق کو یکسانیت حاصل ہو۔

اسلام میں عورت کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو مرد کو ہیں البتہ اس کی صنفی اور معاشرتی ذمہ داریوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے حقوق و فرائض کا مرد سے امتیاز رکھا گیا ہے جو فطری طور پر ناگزیر ہے اور سوسائٹی میں خاندان کے یونٹ کو برقرار رکھنے اور اسے استحکام دینے کے لیے خاندانی سسٹم میں مرد کی فوقیت اور سیادت کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی ادارہ برابر کے اختیارات کے حامل دو افراد کی سربراہی میں نہیں چل سکتا اور خاندانی نظام میں مرد کی سربراہی کی نفی کر کے مغربی دنیا اس کا خمیازہ خاندانی نظام کے بکھر جانے کی صورت میں بھگت رہی ہے، چنانچہ صنفی اور معاشرتی ذمہ داریوں کے حوالہ سے ناگزیر فرق و امتیاز سے ہٹ کر باقی تمام معاملات میں مرد اور عورت برابر ہیں اور دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔

ماضی قریب میں پاکستان میں مرد و زن کے آزادانہ اختلاط اور بے حیائی کو راہ دینے کے لیے کئی خلاف اسلام قانون سازیاں ہوتی رہی ہیں، خاص طور پر ۲۰۰۶ء کا سال اس لحاظ سے بدتر رہا کہ اس سال نومبر کے مہینے میں پاکستانی پارلیمنٹ نے قرآن و سنت سے صریح متصادم اور نام نہاد ویمن پروٹیکشن بل ۲۰۰۶ء منظور کر کے نافذ کر دیا۔ اس قانون کے خلاف اسلام ہونے پر پاکستان بھر کے تمام دینی حلقے یک آواز تھے۔ یہ ظالمانہ قانون اس اسمبلی سے پاس ہوا جس کی عمارت پر نمایاں الفاظ میں کلمہ طیبہ درج ہے۔ اس کے اراکین اور جملہ عہدے داران اسلام کے تحفظ کا حلف بھی اٹھاتے ہیں۔ یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اس کے آئین میں خلاف اسلام قانون سازی کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اس متنازع فیہ ایکٹ کی منظوری سے قبل میڈیا (اور بالخصوص ایک بڑے اخباری ادارے اور ٹی وی چینل) پر اس معاملے کی اس طرح پرزور تشہیر کی گئی اور گلی کوچوں میں اس کو یوں زیر بحث لایا گیا، جیسے یہ پاکستان کا اہم ترین مسئلہ ہو۔[1]

مسلمانان پاکستان کو چاہیے اس نام نہاد تحفظ حقوق نسواں ایکٹ ۲۰۰۶ء کے ان باقی حصوں کے خلاف اسلام ہونے پر بھی وفاقی شرعی عدالت میں درخواست دائر کریں، تا کہ اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ ہدایت سے بغاوت اور طاغوت کی غلامی کے طوق سے نجات ملے اور معاشرہ امن و سکون کی راہوں پر چل نکلے۔

اسلامی نظام میں مسلمان ریاست کے غیر مسلم باشندوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو ان کے مسلمان ریاست کا شہری قرار پانے کے لیے باہمی معاہدہ کی صورت میں طے ہو جائیں گے۔ مثلاً اس وقت پاکستان میں جو دستور نافذ ہے، وہ غیر مسلم باشندوں کی رضامندی کے ساتھ طے پایا تھا اور ان کی شراکت کے ساتھ نافذ ہوا تھا۔ اس دستور کی حیثیت معاہدہ کی ہے۔ پاکستان میں بسنے والی غیر مسلم سوسائٹیاں معاہد ہیں اور انہیں اس طرز پر دستور میں طے شدہ تمام حقوق حاصل ہیں۔[2]

کسی بھی مسلم ریاست کے غیر مسلم شہری ان تمام ریاستی حقوق کے مستحق ہیں جو عام حالات میں مسلمانوں کو ملتے ہیں۔ اس حیثیت سے اسلام وہ واحد دین ہے جو اپنی حقانیت، کاملیت اور جامعیت کے باوجود دیگر مذاہب کے ساتھ ایک مسلسل مکالمے کی شکل اختیار کرتا ہے اور ان پر اسلام کو زبردستی نافذ نہیں کرتا۔

۱۔ ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، حقوق نسواں ایکٹ کے خلاف عدالتی فیصلہ، عالمی ترجمان القرآن، مجمع ابلاغ ٹرسٹ لاہور، جلد: ۳۰ شمارہ (جولائی ۲۰۱۱ء) ص ۴۱

۲۔ ابو عمار زاہد الراشدی، اسلام کا نظام خلافت اور دور حاضر میں اس کا قیام، ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ، زیر اہتمام الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، شمارہ ۲۱:۱۲ (دسمبر ۲۰۱۰ء) ص ۲۹

اسلام نام نہاد دنیوی افعال کو اس بناء پر تقدیس عطا کرتا ہے کہ اس میں ان کی نیک نیتی شامل ہوتی ہے اور جن کو مشترکہ طور پر ایک نیکی ہی سمجھ جاتا ہے اور ایک معنی میں ان انسانی افعال کو بے تقدیس قرار دیتا ہے جن کو عام حالات میں اکثر خالص مذہبی سمجھا جاتا ہے۔ تمام مذہبی رسم و رواج کا مقصد سماجی بہبود کا حصول ہی بتایا جاتا ہے تاکہ انسانی زندگی کے معیار کو بہتر کیا جاسکے اور معاشرے کی فلاح کی صورت گری ہو[1]

اسلام اس کرۂ ارض پر خلافت کا وہ ہمہ گیر نظام ہے جس میں انسانوں کی بہبود و خیر خواہی، راحت رسانی کو عبادت کا درجہ حاصل ہے، اسلام کا کوئی حکم معاشی و معاشرتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے، اسلامی تعلیمات کی رو سے سیاسی و انتظامی معاملات، خود غرضی اور مفاد پرستی کے تابع نہیں ہوتے، بلکہ خلق خدا کی وسیع تر مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، اسلام فرد کی ذاتی اصلاح کی تاکید کرتا ہے کہ لازمی طور پر متقی و صالح انسان بحیثیت مجموعی معاشرے کے لیے بھی نہ صرف کارآمد بلکہ نافع و مفید اور باعث خیر قرار پاتا ہے۔[2]

اسلام معاشرے میں کمزور طبقات کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور ایسی معاشی سرگرمیوں کا سد باب کرتا ہے جو معاشرے کی اجتماعی بہبود اور اقتصادی توازن میں رخنہ انداز ہوں۔

ایسے ہی ہمیں معاشرتی، سیاسی اور بین الاقوامی معاملات میں اپنی الگ پالیسی وضع کرنے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا ہے لیکن ان مسائل اور بیرونی اثرات کے باوصف اسلام کے بنیادی قوانین اور سیرت کے درخشاں پہلو ہمیں ایسے بنیادی خطوط مہیا کرتے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنی راہ متعین کر سکتے ہیں اور اقوام عالم میں اپنا مقام بلند کر سکتے ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو ان حالات میں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اجتہاد بھی کیا جاسکتا ہے۔

دنیا کے ہر معاشرے میں کئی کئی سیاسی جماعتیں کئی طرح کے پریشر گروپس اور کئی طرح کے مذہبی گروہ اور کئی طرح کے سماجی طبقات ہوتے ہیں۔ ان تمام گروہوں کے درمیان بھائی چارہ کی فضا قائم ہو، یگانگت ہو، افہام و تفہیم ہو اور آپس میں اشتراک عمل ہو ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کی خو ہو تو ایسے میں استحکام لازمی ہو جاتا ہے۔ عمومی معاشرے میں ضبط رہتا ہے ویسے بھی دنیا کا ہر معاشرہ گوناں گوں مسائل کا شکار نظر آتا ہے اور اس مسئل کا حل صرف برسر اقتدار طبقہ تلاش نہیں کر سکتا جب تک کہ معاشرے کے دیگر گروہوں کا حکومت کو تعاون نہ ملے۔ ایک مثالی معاشرے کی یہی بنیادی خوبی ہوتی ہے کہ وہاں تمام اجزاء کا اشتراک عمل اس طرح معاشرتی تنظیم کے خدوخال ابھارتا ہے کہ وہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

---

1. مولانا عزیز الرحمن، ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ماہنامہ البلاغ، شعبہ البلاغ جامعہ دار العلوم کراچی، ۸۵:۴۶، (جون ۲۰۱۱ء) ص ۷
2. منظور احمد، ڈاکٹر، اسلام چند فکری مسائل، ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۹

سفارشات وتجاویز

جدید اسلامی مملکتوں میں اعلیٰ جمہوری اقدار کی عملداری نہ ہونے کی بناء پر افرادِ معاشرہ کی موثر سماجی وسیاسی تربیت نہیں ہو پاتی جس کی وجہ سے ان میں اعلیٰ سیاسی اقدار کی پاسداری، سیاسی شعور کی پختگی، مفاہمت، رواداری، یگانگت اور بھائی چارہ جیسے سیاسی وسماجی رویے پروان نہیں چڑھتے۔ اس وجہ سے ان کی سیاسی وابستگیاں مشکوک اور ذاتی اغراض پرمبنی ہو جاتی ہیں اور سیاسی عدم استحکام کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ بالخصوص تیسری دنیا کے ممالک میں کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے کبھی بھی اعلیٰ روایات کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس لیے وہاں رشوت، اقرباء پروری، ذاتی مفادات کے حصول کا لالچ، سیاسی دھوکہ دہی جیسے گھمبیر جرائم عام رواج بن رہے ہیں۔

ایک ریاست کی بہتر کارکردگی، اس کے عمدہ ارتقاء اور اسے ہر لحاظ سے مثالی فلاحی اور دینی بنانے میں انسان نے جو تدبیر اختیار کی ہیں ان کا اعتراف کرنا پڑے گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانیت کے طویل تجربہ کے بعد بھی اس ادارہ میں کمال پیدا نہیں ہوا۔ ریاست کے لیے کہیں اختتام نہیں اور نہ ہی اس کا اکمال واتمام ہوا ہے۔

ریاست ایک سماجی ادارہ ہے اس میں ضرورت وزمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ، ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ اب تک ایک ریاست کی اچھی نشوونما اور ارتقاء کے سلسلے میں جو شرائط ضروری رکھی گئی ہیں۔ انہیں اعضائے حکومت میں اتحاد وہم آہنگی اور ان کی آزادی، عوام کی سیاسی بیداری اور ان کی بامقصد جدوجہد، وسیع علاقوں کی کثیر آبادی کو عمدہ ذرائع مواصلات کے ذریعہ قریب تر کرنا، معاشی خوشحالی، اختیارات خود انتظامی کے ادارے اور تادیبی تصیبات، ریاست میں تعلیم، حفظانِ صحت اور دوسرے رفاہی اور فلاحی کاموں کی فراوانی اور سب سے اہم آمر و مامور کے مابین توازن برقرار رکھنا ہیں۔

ریاست کی معراج یہ ہے کہ وہاں جبر وطاغوت اور زور وقوت کا نام ونشان باقی نہ رہے کیونکہ ایک مملکت کے اندر تمام عناصر میں اور تمام مملکتوں کے درمیان بھی اتحاد کے لیے یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ریاست کی اندرونی زندگی سے اگر یہ خطرناک صورت دور کردی جاتی ہے اور اندرونی وبیرونی طور پر اس میں توازن اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اسی صورت میں یہ انسانیت کی کوئی خدمت کرسکتی ہے جو ابھی تک ایک امید موہوم ہے۔

لہٰذا ریاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ افراد کے بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دے تاکہ وہ سیاستدانوں کی ریشہ دوانیوں اور ظلم و تشدد سے آزاد اور بے خوف وخطر ہو کر اپنی ترقی وخوشحالی کے لیے مساوی مواقع سے فائدہ اٹھاسکیں۔

اس ضمن میں کس طرح کے اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہوگی اس مقصد کے لیے ذیل میں چند سفارشات وتجاویز پیش کی جارہی ہیں اگر اربابِ اقتدار و اختیار ان سفارشات کو مدنظر رکھ کر اقدامات کریں تو مملکت میں ایک دائمی سیاسی استحکام ممکن ہوسکتا ہے

- ☆ عصری اسلامی مملکت قرآن وسنت کے قوانین واحکام کے مطابق نظام کو چلائے گی اور سیکولر ریاستیں اپنے وضع کردہ قوانین کے مطابق نظام قائم کریں گی۔
- ☆ قرآن وسنت کے منصوص احکام میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا، البتہ اجتہادی احکام جو زمانے کے عرف کے لحاظ سے فقہاء نے مستنبط کیے ہوں وہ عرف کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں۔
- ☆ اسلامی مملکت کی پالیسیاں جو اجتہاد کی متقاضی ہیں وہ وہ ہیں جن کے بارے میں نصوص خاموش ہوں اور جو پالیسیاں قرآن وسنت میں طے کردی گئی ہیں ان میں اجتہاد ممکن نہیں ہے۔
- ☆ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پرمبنی نہیں، بلکہ ان اصول ومقاصد پرمبنی ہوگی، جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ

حیات ہے۔

☆ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن وسنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو رفع کرے، شعائر اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مسلک کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

☆ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتہ اتحاد واخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیاد پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ واستحکام کا انتظام کرے۔

☆ مملکت بلا امتیاز مذہب ونسل تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، علاج معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہو، جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں، یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

☆ اسلامی مملکت میں معیشت کا استحکام اور مالیاتی نظام کی کامیابی کا انحصار معاشرے میں عدل، مساوات، دیانتداری اور فرد کی ذاتی اخلاقیات کی بنیاد پر ہوتا ہے، ان محرکات کے بغیر قانونی اور رسمی اقدامات بے سود ثابت ہوں گے۔ اسلامی مالیاتی نظام کے شعور و آگہی کو فروغ دینے کے لیے مختلف سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں اسلامی بینکاری وکاروبار کی تربیت کا انتظام والصرام کیا جائے۔

☆ اسلامی ریاست غربت، معاشی ابتری اور بے روزگاری کے عملی اور حقیقی حل کے لیے خود روزگار اسکیم کے تحت مستحق افراد کو روزگار اور کاروبار کے ذرائع فراہم کرے گی۔ اگر فی الحقیقت نظام زکوٰۃ کا اسلام کی حقیقی روح ''نظم معیشت وکفالتِ عامہ'' کے فلاحی اور رفاہی جذبے کے تحت بروئے کار لایا جائے تو اس کے معاشی اور کفالتی مقاصد حاصل ہوں گے بشرطیکہ زکوٰۃ کے حقیقی فلسفہ نظم معیشت وکفالت عامہ کو پیش نظر رکھا جائے۔

☆ افراد ریاست کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدود وقانون کے اندر تحفظ جان ومال و آبرو، آزادیٔ مذہب ومسلک، آزادیٔ اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارت سے استفادہ کا حق۔

☆ غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدود وقانون کے اندر مذہب وعبادت، تہذیب وثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم ورواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

☆ اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلم اکثریت اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے، اپنی نئی نسل کو مذہبی تعلیم دینے اور اپنے مذہبی تشخص کے تحفظ کا پورا حق حاصل ہے۔ البتہ وہ ملک کے ریاستی نظریے کے خلاف کام کرنے کے مجاز نہیں ہیں اور انہیں ملک کے نظریاتی تشخص کی نفی کرنے اور اس کو نقصان پہنچانے کی اجازت بھی نہیں دی جاسکتی۔

☆ اسلامی مملکت میں عورت کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مرد کو حاصل ہیں۔ البتہ اسکی صنفی اور معاشرتی ذمہ داریوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے حقوق وفرائض کا مرد سے امتیاز رکھا جائے گا جو فطری طور پر ناگزیر ہے۔

☆ عورت پر ''سیاست البیت'' کے ساتھ ساتھ ''سیاست المدن'' کی ذمہ داری نہیں ڈالی جائے گی، یعنی گھر سنبھالنے اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داری کے ساتھ سربراہِ مملکت اور دیگر عہدوں کی بھاری ذمہ داری عورت پر نہ ڈالی جائے ورنہ دونوں کو ایک ساتھ نبھانا مشکل ہو جائے گا، جس سے خاندانی نظام میں بگاڑ پیدا ہوگا اور معاشرہ حیوانی معاشرے کا نمونہ بن جائے گا۔

☆ رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے۔ جس کے تدین، صلاحیت اور اصابتِ رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

☆ رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا، البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جز و کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے کیونکہ کسی بھی نظم کی کامیابی، استحکام اور افادیت وفعالیت کا انحصار اس کے منتظم اعلیٰ کی صلاحیتوں پر ہوتا ہے اور وہی فیصلہ سازی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

☆ رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

☆ رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں، بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

☆ رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلیتاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

☆ خلیفہ کا انتخاب حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرح عوام کی اجتماعی رائے سے ہوگا۔ عوام کا اعتماد و انتخاب ہی اس کے حق حکمرانی کی بنیاد ہے۔

☆ وہ اپنی معاونت و مشاورت کے لیے اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے افراد کا انتخاب کرے گا اور ان کے مشورہ سے حکومتی نظام چلائے گا۔

☆ اسلامی ریاست عامہ کے وہ تمام شہری جو اسلام کے فطری قوانین کے پابند ہوں بشرطیکہ اوسط علم و عقل سے بہرہ مند ہوں۔ امت کے تمام افراد شوریٰ میں شرکت کر سکیں گے جو اجتماعی نظم کے بہی خواہ ہوں، ذاتی غرض اور شخصی نفع اندوزی کے تصور سے خالی ہوں یعنی امین ہوں اور اس درجہ سلامتی فکر کے مالک ہوں کہ صحیح رائے پیش کر سکیں۔ اشتراک کا طریقہ حالات کے مطابق بدل سکتا ہے۔

☆ ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اسے نافذ کریں گی۔

☆ محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تا کہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

☆ عدلیہ غیر جانبدار ہو، جج قابل، باصلاحیت اور کردار مشکوک یا غدار نہ ہوں، انصاف جلد، سستا اور مستقل و پائیدار ہو، عدالتی طریقہ کار سادہ، آسان اور براہ راست ہو۔

☆ اسلامی تصور عدل میں انتظامیہ کو معروف عدالتی کاروائی کے بغیر اختیارات استعمال کرنے کا حق حاصل نہ ہو اور جو ریاست اپنی انتظامیہ کو من مانے اختیارات دیتی ہو وہ اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہو سکتی۔

☆ اسلامی مملکت کے نظم ونسق کی بہتری کے لیے عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ تینوں میں توازن ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر ان تینوں اداروں میں سے کوئی بھی افراط و تفریط کا شکار ہو تو اس کا نتیجہ ملکی عدم استحکام کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ عدالتی فیصلوں کا متعلقہ معاشرے پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ جس ملک کی عدلیہ قانون کی پاسداری کرتی ہے اور فریقین کو عدالت سے انصاف مل سکتا ہے وہ مشکل سے مشکل بحران سے نکل سکتی ہے۔

☆ مملکت کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزا انتظامی طور پر ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں، بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی، جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی، اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا، مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

☆ اگر علاقائی وحدتوں کو انتظامی امور میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے تو اس میں شرعی اعتبار سے نہ صرف یہ کہ کوئی حرج ہے، بلکہ اس سے علاقائی تعصبات کو دور کر کے ملت کا شیرازہ مجتمع رکھنے میں بہت مدد ملے گی اور کاموں میں آسانیاں پیدا ہوں گی۔

☆ وہ علاقے جو کسی ریاست میں داخل ہو جائیں وہ ایک وفاق بناتے ہیں جس کے صوبوں کو مقررہ اختیارات واقتدار کی حد تک خود مختاری حاصل ہونی چاہیے۔ وفاق کے علاقوں کی صیانت، آزادی اور جملہ حقوق بشمول خشکی وتری اور فضا پر صیانت کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

☆ ایسے افکار ونظریات کی تبلیغ واشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول ومبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

☆ اسلامی فلاحی مملکت کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ نظام احتساب قائم کیا جائے حضورؐ نے اس کا کوئی الگ محکمہ تو قائم نہیں فرمایا البتہ آپ ملکی معاملات واخلاقیات کی بذات خود نگرانی فرماتے تھے۔ اسی طرح خلفائے راشدین نے خود کو عوام کے سامنے احتساب کے لیے نہ صرف پیش کیا بلکہ ہر وقت اپنے آپ کو عوامی احتساب کے دائرے میں رکھا اور ہر شہری کو یہ حق دیا کہ وہ ان کی کسی بات پر کسی وقت اور کسی جگہ بھی ٹوک سکتا ہے اور وہ اس کا جواب دینے کے پابند ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نظام احتساب قائم کیا جائے جس میں ایک معمولی افسر سے لے کر حاکم اعلیٰ تک اپنی ذمہ داریوں کے سلسلے میں جوابدہ ہوں۔

☆ اسلامی مملکت کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ پورے معاشرے میں امن وامان کی خوگر ہو ورنہ فلاحی مملکت کا تصور بیکار نظر آئے گا۔ داخلی حکمت عملی میں حضورؐ نے حدود اللہ کو سختی سے نافذ فرمایا۔ اسوہ رسول کی روشنی میں آج کی مملکت میں امن وامان کے قیام کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز دی جاتی ہیں:

i) اسلامی حدود وتعزیرات کو نافذ کیا جائے۔

ii) مقدمات کا جلد فیصلہ کرنے کے لیے عدالتوں کو بااختیار بنایا جائے۔

iii) ملک دشمن عناصر پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔

iv) داخلی طور پر لوگوں کے مابین اخوت وہمدردی اور مذہبی رواداری کو یقینی بنایا جائے۔

☆ قوانین کا صحیح اطلاق اور ان کی بالادستی بھی اسلامی مملکت کے استحکام کے لیے لازم وملزوم ہے۔ اگر ملک میں قوانین کی اصل روح کے مطابق قانون سازی نہ ہو اور معینہ اصولوں اور ضابطوں کے مطابق ان کا صحیح اطلاق نہ ہو تو مستحکم سے مستحکم معاشرہ بھی عدم استحکام کا شکار ہو جاتا ہے۔ قوانین درحقیقت ایسے اصول وضوابط پر دلالت کرتے ہیں جن کی نسبت سے حکومت ملک میں امن وامان برقرار رکھتی ہے، لوگوں کے حقوق کو تحفظ ملتا ہے۔ کبھی ریاست میں بدنظمی، انتشار، تشدد اور مختلف گروہوں کا باہمی تصادم ہو تو قوانین کے ذریعے ہی ان کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔

☆ اسلامی مملکت کی حیثیت سے لازم ہے کہ ریاست میں یکساں نظام تعلیم ہو یہ قومی یکجہتی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس لیے تعلیمی پالیسی اور نصاب کی یکسانی ضروری ہے۔ کسی نظام کے یہ وظائف ہوتے ہیں کہ وہ مملکتی مقاصد اور قومی فلسفہ حیات اور شایات کے مطابق افراد معاشرہ کے لیے ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے کہ وہ کارآمد شہری بن کر مملکتی مقاصد کے حصول میں عملاً موثر کردار ادا کر سکیں۔ اس لیے تعلیمی نظام کو ہمیشہ سیاسی نظام کے بنیادی نظریے کے علاوہ اس کے رسمی ڈھانچہ اور اجزاء وعناصر اور مثالیات واقدار کی نسبت سے متشکل ہونا چاہیے تب ہی وہ صحیح معنوں میں معاشرتی ترقی اور افراد معاشرہ کی تربیت کا ضامن بن سکتا ہے۔

☆ اسلامی ریاست کو چاہیے کہ وہ سکولوں، یونیورسٹیوں کے علاوہ، جو فرد علم کے مختلف شعبہ جات جیسے فقہ، حدیث، قرآن کی تفسیر، طب، انجینئرنگ، کیمیا، تحقیق اور دوسرے شعبوں میں اپنی تعلیم کو جاری رکھنا چاہے۔ اسے قابل بنانے کے لیے لیبارٹری اور دوسری تعلیمی سہولتیں فراہم کرے۔ یہ تحریک عوام الناس میں اعلیٰ موجد، مخترع اور تحقیقی مفکر پیدا کرے گی۔

☆ اسلامی فلاحی مملکت کے استحکام کے لیے، انسانی زندگی میں صحت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ صحت کے بغیر دنیا کی نعمتیں بے کار ہیں کیونکہ انسان عملاً ان سے متمتع نہیں ہوسکتا۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر فرد کو طبی سہولتیں فراہم کرے۔ طبی سہولتوں کی فراہم کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری ہسپتالوں میں علاج معالجہ کے آلات وادویات کا بھرپور انتظام کیا جائے تاکہ ہر شہری کو صحت کے مساوی مواقع میسر ہوسکیں اور پرائیویٹ ہسپتالوں کی دل شکنی ہو۔

☆ اسلامی ریاست کا نظم ونسق آٹھ اداروں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ خلیفہ، معاون تفویض (قائم مقام نائب) معاون تنفید (انتظامی نائب)، عسکری سالار (فوجی کمانڈر)، القضاء (عدلیہ)، ولاء (گورنر)، انتظامیہ، مقننہ (مجلس شوریٰ)

خلیفہ ریاست کی داخلی اور خارجی پالیسیوں کا ذمہ دار ہوتا ہے وہ عسکری اور فوج کا چیف کمانڈر ہوتا ہے۔

☆ ریاستی معاملات اور عوامی حقوق انتظامیہ، دفاتر اور شعبہ جات کے ذریعہ ادا کیے جانے چاہیں۔ یہ ادارے حکومت کے فرائض ادا کرتے ہیں اور عوام الناس کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ انتظامی پالیسی عوام کے معاملات کی دیکھ بھال میں سادگی، تیزی اور آمادگی پر مبنی ہونی چاہیے۔

☆ سرکاری اہلکار، غیر سرکاری اہلکار اور اعلیٰ افسران کا تقرر، تبدیلی، معطلی، محاسبہ، نظم یا برخاست کرنے کا عمل ان کی انتظامیہ کے ڈائریکٹر کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

☆ خواتین سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کام کرتی ہیں۔ سرکاری اداروں میں عورتوں کو عورتوں اور محرم مردوں کے ساتھ کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے اور دوسرے مردوں کے سامنے عورتوں کو اپنے ہاتھوں اور چہرے کے سوا جسم کے کسی عضو کو عریاں کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں غیر مہذب طور طریقے اور عریاں لباس کی بھی اجازت نہیں ہوگی اور انہیں تمام شرعی قوانین کا پابند ہونا چاہیے۔

مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست مذکورہ سفارشات کی عملی تفسیر تھی۔ خلافت راشدہ کا روشن دور اس کی ایک تاریخی تعبیر تھی اور آج بھی پندرہ صدی گزرنے کے باوجود یہ آفاقی اخلاقی اصول ایسے ہی تابندہ ہیں جیسے پہلے تھے۔ آج بھی اس کی عملیت ویسی ہی ہے صرف انہیں سنجیدگی کے ساتھ نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں ارباب حل وعقد اور اسلامی ریاست کے ہر فرد سے استدعا ہے کہ وہ مندرجہ بالا سفارشات پر عمل پیرا ہو کر ملکی قیادت صالح ہاتھوں میں دے دیں تو انشاءاللہ بہت جلد اسلام کی برکات ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہوگئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقت کو استعمال کرکے افراد معاشرہ میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت زیادہ آسان ہو جائے گا پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اس نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی اور بلاشبہ عنقریب وہ اپنے ارتقاء کی بلندیوں اور نقطۂ کمال تک پہنچ جائے گی۔

خلاصۂ کلام

زیر نظر مقالہ کا ماحصل مندرجہ ذیل نکات میں محصور ہے:

۱۔ عصری اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی (حکمت عملی) اور اس کے دائرہ عمل کا تعین شریعت اسلامیہ کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اسلامی اور مغربی پالیسی کا موازنہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ عصری اسلامی مملکتوں کو مغربی اقوام کی طرف سے ریاستی جبر و تشدد، بغض وعناد، معاشی ظلم اور سیکولر نظام تعلیم کی ترویج جیسے مظالم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہاں تک کہ صحت جیسے نازک شعبہ میں بھی مغرب اپنی مفاداتی پالیسیوں کے ساتھ امداد کو مشروط کرتا ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ ان اسلامی ریاستوں کو ہمیشہ سیاسی عدم استحکام کا شکار رکھ کر اتحاد امت مسلمہ کی راہیں مسدود کی جاتی ہیں۔ ان تمام مشکلات کے حل کیلئے اس حکمت عملی کو اپنانے کی سفارش کی گئی ہے کہ اسلامی ریاستیں مغرب کے معاشی احتیاج سے چھٹکارا پانے کی کوشش کریں۔ دریں صورت یہ اسلامی ریاستیں تعلیم، صحت، سماجی بہبود اور دفاع کے شعبوں میں عوام دوست پالیسیوں کو وضع کر سکتی ہیں۔

۲۔ اسلامی ریاست کی نوعیت اور اغراض ومقاصد میں ریاست کا مفہوم، اصطلاحات، آغاز وارتقاء کو واضح کرتے ہوئے اسلامی ریاست کے تصور کو اجاگر کیا گیا ہے بعد ازاں ایجابی، فلاحی اور دینی ریاست کے خدوخال کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اسلام اس مقصد کی خاطر ریاست پر متعدد ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جن کی غرض وغایت فلاحی معاشرے کا قیام ہے۔ ''اسلامی ریاست'' درحقیقت اسلامی نظریہ سیاسی کی جدید تعبیر کا نام ہے۔

۳۔ اعضائے ریاست کے حدود عمل اور ان کے باہمی تعلق کے قانون کے تحت Organs of State انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کی اسدی اشکال، اسلامی ریاست میں ان کی ذمہ داریوں اور ان کے باہمی تعلق پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کو اپنے اپنے دائرہ اختیار میں رہ کر ایسے طریقے سے ریاست کی خدمت کرنی چاہیے کہ ایک دوسرے کے دائرہ عمل میں مداخلت نہ ہو، ہر ادارہ آزادانہ طور پر اپنے فرائض سرانجام دے۔ عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ کو آئین میں محفوظ شدہ اپنے جداگانہ اختیارات سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے لیکن ہم آہنگی سے زیادہ سے زیادہ عوام بھلائی کیلئے کام کرنا چاہیے۔ ملکی نظم ونسق کی بحالی کے لیے مرکز سے صوبوں کو اختیارات منتقل کیے جانے چاہیں تاکہ باہمی منافرت کا خاتمہ ہو اور عوام الناس کی فلاح وبہبود کے لیے سعی وکاوش کی جا سکے۔ اگر اس حکمت عملی پر صحیح معنوں میں عمل ہو تو صوبے کے انتظام وانصرام میں استحکام پیدا ہوگا۔ اس طرح سیاسی نظام کی بنیادیں مضبوط ہوں گی جس سے ملک میں خوشحالی اور امن وامان کا دور دورہ ہوگا۔

۴۔ داخلہ پالیسی کے حوالے سے اعضائے ریاست کی مباحث ذکر کرنے کے بعد داخلی پالیسی کے ایجابی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے اس ضمن میں اسلامی مملکت، قیام عدل، بنیادی حقوق، حقوق نسواں، مستحقین کی فلاح وبہبود اور ترقی وخوشحالی کو بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی سماجی حیثیت، ان کے حقوق وفرائض کا تعین اور معاہدات کی پاسداری کے ضمن میں مثبت پالیسی اختیار کی جانی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ داخلہ پالیسی کے اثرات اسی صورت میں مرتب ہوں گے جب اس کے ایجابی پہلوؤں پر توجہ دی

جائے گی اس سے ایک ایسی فلاحی اور ایسی مثالی ریاست پروان چڑھے گی جو انسانی مساوات، احترام آدمیت اور امن وسلامتی کی علمبردار ہوگی۔ اس طرح ایک متوازن، روشن ضمیر اور جمہوری معاشرہ قائم ہوگا۔

۵۔ اسلامی ریاست میں امن وامان کی بحالی، اسلامی قانون کے نفاذ، معاشی استحکام اور مالیاتی بدعنوانیوں کے انسداد کے لیے ایسی ٹھوس حکمت عملی ذکر کی گئی ہے جس سے بدامنی اور لاقانونیت کا خاتمہ ہوگا۔ اس کا واضح نتیجہ جمہوری اقدار کی بحالی، انسانی حقوق کی ترویج اور عوام الناس کی معاشی حالت کی بہتری کی صورت میں سامنے آئے گا یقیناً اس سے ایک پاکیزہ ترین معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ اس حکمت عملی کے نفاذ کیلئے عمال حکومت پر کڑی نگاہ رکھی جانی چاہیے تاکہ وہ اپنے فرائض کو مستعدی، دیانت داری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دیں۔ اگر ان فرائض کی ادائیگی میں غفلت اور سستی برت رہے ہوں تو ان کا احتساب کیا جائے اور ان پر نگرانی سخت کی جائے تاکہ وہ اپنے فرائض میں چاک وچوبند اور ہوشیار ہوجائیں۔

۶۔ اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی کے عصری مسائل کو عالمی تناظر میں سامنے رکھتے ہوئے ممکنہ پیش آمدہ مشکلات کا حل پیش کیا گیا ہے اور ان کی اصلاح کیلئے جامع اور ٹھوس سفارشات وتجاویز دی گئی ہیں تاکہ ایک مثالی اور فلاحی ریاست کا قیام ممکن ہوسکے۔ (سفارشات وتجاویز کیلئے مقالہ ہذا کے صفحات ۲۸۹ تا ۲۹۳ تک ملاحظہ ہوں)

نبی اکرم کا اسوہ حسنہ نہ صرف آج کے جدید سائنسی دور میں کامیابی کے دروازے کھولتا ہے، بلکہ تا ابد آنے والے جدید ترین سائنسی ادوار میں بھی کامیابی وکامرانی کے دروازے کھولتا رہے گا۔

عصر حاضر کے مسلم حکمرانوں میں اگر عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین جیسی طرز حکمرانی پیدا ہوجائے تو دیگر تمام نظام ہائے حیات مثلاً معاشرت، معیشت، عدل واحتساب، دفاعی وخارجی امور اور تعلیمی معاملات میں انقلاب آفرین مثبت تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ اسلامی نظام حکومت (خلافت) ایک منفرد اور مکمل نظام ہے جو اشتراکیت اور جمہوریت دونوں کی ضد ہے۔ اسلام میں جمہوریت یا اشتراکیت کا پیوند لگانا اسلامی نظام حکومت کو ناقص قرار دینے کے مترادف ہے۔

اسلامی نظام حکومت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے شخصی حکومت کے طریق کار کو ختم کرکے دستوری حکومت قائم کی جس کا نقطۂ آغاز حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے یہ اعلانات ہیں کہ ہم اگر کتاب وسنت کے مطابق چلیں تو لوگوں پر ہماری اطاعت واجب ہے اور اگر قرآن وسنت سے انحراف کریں تو عوام کو ہماری اصلاح کا نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ یہ ان کی دینی ذمہ داری ہے۔ خلفائے راشدینؓ نے حکمرانوں اور حکام کو سادہ زندگی، قناعت اور غریب عوام کے ساتھ ان کی سطح پر رہنے کا خوگر بنایا اور صحیح معنوں میں ایک عوامی حکومت کا تصور پیش کیا۔

عصر حاضر میں اگر اسلامی ریاست کی تعمیر وتشکیل، نبوت وخلافت راشدہ کے طریق پر کرنا ہو تو کتاب وسنت سے تعلق اسی طرح استوار کرنا ہوگا جیسا کہ انہوں نے قائم کیا۔ اس کے لیے تعلیمی، تربیتی، انتظامی، عدالتی، قانونی اور ابلاغی امور کو ان کے نمونے پر قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں عوام الناس کی فلاح وبہبود کے لیے جو انہوں نے بھرپور جدوجہد کی اسی طرح کی سعی وکاوش مختلف اداروں کے ذریعے وسیع پیمانہ پر کرنا، اسلامی حکومت کا اہم فریضہ ہے۔

عصر حاضر کے سارے مسائل کو حل کرنے کے لیے جہاں مذکورہ اوصاف کو اپنانا ضروری ہے، وہاں ایک ایسا نظام کار وضع کرنے کی

ضرورت ہے، جو ان خطوط پر استوار ہو، جنہیں اس مقالے میں مختلف مباحث کے تحت اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کام صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب حکمران اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کرلیں کہ ہم نے نہ صرف اسلامی مملکتوں کو بلکہ پوری دنیا کو اسلام کے نظامِ امن و آشتی سے ہمکنار کرنا ہے جس پر تمام انسانوں کی دنیوی اور اخروی بھلائی کا دارومدار ہے۔

دنیا کے سامنے مثالی اسلامی مملکت کی حقیقی تصویر پیش کرنا ازحد ضروری ہے اور بین الاقوامی ممالک کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات میں مسلم دنیا کے پاس حقیقی اسلامی ریاست کا وجود ہی مستقبل میں ان کے تحفظ اور بقا کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر، گلوبلائزیشن اور ریجنل ریاستی بلاک کے قیام کے جدید تصور کے مقابلے میں حقیقی اسلامی ریاست، امت مسلمہ کی وحدت کے قیام میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے گراں قدر علمی ورثہ بھی موجود ہے۔

اسلامی مملکت کا حکمران اسلام کی روح، مزاج اور مقاصد و مصالح کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کو مسائل کے ادراک اور معاملہ فہمی میں کمال حاصل ہوتا کہ وہ ہر انفرادی اور اجتماعی مسئلے کی تہہ تک پہنچ کر اس کا کوئی حل تلاش کرسکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی ہر رائے اور فکر کو عوام الناس کے سامنے پیش کرے، حق و صداقت میں دلائل سنے اور دلائل دے پھر کسی حتمی فیصلے تک پہنچے، اور اپنی منفرد رائے کو حرفِ آخر سمجھ کر عوام پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ہر مسئلہ میں مشاورت سے کام لے اور پھر اسی کے مطابق پالیسیاں وضع کرے۔

اس تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ عصری اسلامی مملکت کی داخلہ پالیسی خالص اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر مرتب کی جانی چاہیے۔ اسلام کی آفاقی تعلیمات اس مقصد کیلئے بھرپور مواد فراہم کرتی ہیں۔ ان تعلیمات کے اپنانے سے مستقبل میں قومی عصبیت، مذہبی اختلافات اور سیاسی تعصبات کی جگہ بین الاقوامی امن و امان، حرمت انسانی اور صلحانہ تعلقات کو فروغ حاصل ہوگا اور اکثریت و اقلیت کے مابین سیاسی و مذہبی ہم آہنگی پیدا ہوگی۔ لہٰذا ملی تشخص، نظریاتی و جغرافیائی سرحدوں کا احترام اور ریاستی استحکام کے لیے ایک آزاد، خود مختار اور فلاحی، خادمِ خلق ریاست کا وجود ناگزیر ہے۔

اشاریہ

اشاریہ آیات مبارکہ

اشاریہ احادیث مبارکہ

اشاریہ اعلام

اشاریہ اماکن

امریکہ	۴۳، ۵۱، ۱۳۲، ۱۳۹، ۱۶۳، ۱۷۲، ۲۳۹، ۲۷۳، ۲۷۶، ۲۷۹، ۲۸۳
یمن	۷۳
حضرموت	۷۳
ترکی	۱۲۸
بھارت	۲۳۹
شام	۱۲۹
برطانیہ	۲۵، ۲۸، ۲۹، ۱۲۷، ۱۳۲، ۱۷۱، ۲۷۹
فلسطین	۱۷۸
مدینہ منورہ	۸، ۱۵، ۱۸، ۷۴، ۷۷، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۹۰، ۲۳۳، ۲۶۷
پاکستان	۲۳۲، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۶۴، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۷، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۶، ۲۸۷
سندھ	۲۳۳
روس	۲۳۹
افغانستان	۲۳۹، ۲۸۳
عراق	۲۷۶، ۲۸۳
کوفہ	۱۳۹، ۱۶۳، ۱۷۸
ایران	۹۰
روم	۲۳۹
اٹلی	۳۳
یونان	۳۳
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۱، ۳۳، ۳۰، ۳۳

جاپان	۲۹، ۳۱
یورپ	۲۹، ۳۲، ۳۳
کینیڈا	۳۰
سوئزرلینڈ	۳۳
جرمنی	۳۳، ۱۸۲
ترکی	۳۳
فرانس	۳۳، ۵۱
شام	۳۳، ۱۶۲، ۱۷۸
انگلستان	۳۲، ۵۳
مصر	۱۲۹، ۱۷۸
لبنان	۱۲۹
مراکش	۱۲۹
عراق	۱۲۹
پاکستان	۱۳۳، ۱۳۶، ۱۳۲، ۱۷۵، ۱۸۲، ۱۷۶، ۱۸۳، ۱۹۱
بصرہ	۱۷۸، ۱۶۳
طائف	۱۷۸، ۱۹۰
خولان	۱۷۸
زبید	۱۷۸
رمع	۱۷۸
الجند	۱۷۸
نجران	۱۷۸
جرش	۱۷۸

مصادر و مراجع

عربی کتب

☆ القرآن الحکیم

☆ ابن ابی شیبة، عبداللہ بن محمد، الکتاب المصنف فی الأحادیث والآثار، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵م

☆ ابن اثیر، الجزری، ابوالسعادات، مبارک بن محمد، النہایة فی غریب الحدیث والأثر، طبع حسن عنیان، ایران، ۱۲۸۵م

☆ ابن اثیر، علی بن محمد، أسد الغابة فی معرفة الصحابة، دار المعرفة، بیروت، ۱۹۹۷م

☆ ابن الحاج، مذکور، محمدسلام، المدخل لفقه الاسلامی، دار الاحیاء التراث، القاهرة، ۱۹۶۰

☆ ابن الطقطقی، محمد بن محمد، الفخری والآداب السلطانیة والدول الاسلامیة، مطبعة الرحمانیة، مصر، ۱۹۲۷ء

☆ ابن الهمام، کمال الدین، محمد، فتح القدیر، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۸۶م

☆ ابن تیمیة، تقی الدین، ابوالعباس، احمد، السیاسة فی اصلاح الراعی والرعیة، مطبع دار المعرفة، لبنان، ۱۹۹۸م

☆ ابن تیمیه، تقی الدین، احمد، التفسیر الکبیر، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۸۸ء

☆ ابن تیمیه، تقی الدین، احمد، الحسبة فی الاسلام، جمعیة احیاء التراث الاسلامی، الصاحیة، الکویت، الطبعة الثالثة، ۱۹۹۸م

☆ ابن تیمیه، تقی الدین، احمد، منهاج السنة، طبع مکتبة خیاط، لبنان، ۱۹۶۲ء

☆ ابن جماعة، بدرالدین، تحریر الاحکام فی تدبیر اهل الاسلام، طبعة دار الثقافة، قطر، س-ن

☆ ابن جوزی، عبد الرحمن، سیرت عمر، مکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۶۴ء

☆ ابن حجر، عسقلانی، احمد بن علی، الأصابة فی تمیز الصحابة، مطبعة مصطفی محمد، قاهره، ۱۳۲۳ھ

☆ ابن حجر، عسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۸ء

☆ ابن حجر، عسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۳ء

☆ ابن حزم، علی بن احمد، المحلیٰ، دار الجیل، بیروت، س-ن

☆ ابن حنبل، احمد بن محمد، المسند، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۶م

☆ ابن خلدون، عبدالرحمن، مقدمة ابن خلدون، مطبعة لجنة البیان العربی، مصر، ۱۹۶۵

☆ ابن سعد، محمد بن منیع، الطبقات الکبریٰ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۶م

☆ ابن عابدین، محمد امین، حاشیة ردالمحتار علی الدرالمختار، المکتبة التجاریة مصطفی احمد الباز، مکة المکرمة، ۱۳۸۲ھ

☆ ابن عبدالبر، ابوعمر، یوسف، الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، طبع دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان، ۱۹۹۵م

☆ بن عربی، ابوبکر، محمد، **احکام القرآن**، ناشر دار الکتاب العربی، بیروت، ۲۰۰۰ء

☆ ابن قیم، الجوزیہ، ابوعبداللہ، محمد بن ابی بکر، **الطرق الحکمیۃ فی السیاسیۃ الشرعیۃ**، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ القاهرة، ۱۹۵۳ء

☆ ابن القیم، الجوزیہ، شمس الدین، محمد، **اعلام الموقعین عن رب العالمین**، داراحیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن

☆ ابن القیم، الجوزیہ، محمد بن ابی بکر، **احکام اهل الذمة**، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۳م

☆ ابن قیم، الجوزیۃ، **زادالمعاد فی هدی خیرالعباد**، مطبعۃ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۹ء

☆ ابن قیم، شمس الدین، محمد، **تفسیر القیم**، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، س۔ن

☆ ابن کثیر، عمادالدین، اسماعیل بن عمر، **تفسیر القرآن العظیم**، دارالسلام لنشر والتوزیع، الریاض، ۱۹۹۸م

☆ ابن نجیم، زین الدین، ابراهیم، **البحر الرائق**، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۷ء

☆ ابن هشام، ابومحمد، عبدالملک، **السیرة النبویۃ**، دارالجیل، بیروت، س۔ن

☆ ابوعبید، القاسم بن سلام، **کتاب الاموال**، دارالفکر الطباعۃ والنشر، قاهرہ، ۱۹۸۱ء

☆ ابوعبید، القاسم بن سلام، **کتاب الاموال**، ناشر المکتبۃ الاثریۃ، سانگلہ هل، ضلع شیخوپورہ، س۔ن۔

☆ ابوفارس، محمد عبدالقادر، **حکم الشوریٰ فی الاسلام و نتیجتها**، دارالفرقان، اردن، عمان، ۱۹۸۸ء

☆ ابویوسف، یعقوب بن ابراهیم، **کتاب الخراج**، المطبعۃ السمیۃ القاهرة، ۱۳۸۲ھ

☆ اثیر، ابوالحسن، علی بن ابوالکرم، **الکامل فی التاریخ**، دارصادر، بیروت، ۱۹۶۵ء

☆ ارسلان، محمد شهیر، **القضاء والقضاة**، دارالارشاد، بیروت، ۱۳۸۹ھ

☆ اصبهانی، ابونعیم، احمد بن عبداللہ، **حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء**، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱٤۰۰ھ

☆ اصفهانی، ابونعیم، احمد بن عبد اللہ، **الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ**، طبع دار الکتب العلمیۃ، س۔ن

☆ الشوکانی، محمد بن علی، **نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار من احادیث سید الأخیار**، ادارۃ القرآن والعلوم السلامیۃ، کراچی، ۱٤۰۷ھ

☆ آمدی، عبدالواحد، **غررالحکم**، طبع دارالندوة، بیروت، س۔ن

☆ بخاری، ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل، **الجامع الصحیح البخاری** موسوعۃ الحدیث، طبع دارالسلام، سعودی عرب، ۲۰۰۰م

☆ بدوی، ڈاکٹر، ثروت، **النظم السیاسیۃ**، طبع دار النهضۃ العربیۃ، س۔ن

☆ بغدادی، الخطیب، ابوبکر احمدبن علی، **تاریخ بغدادو مدینۃ الاسلام**، مطبعۃ السعادة مصر، ۱۹۱۲ء

☆ بهوتی، منصور بن یونس، **کشاف القناع عن متن الاقناع**، مکتبہ النصر الحدیثۃ، الریاض، س۔ن

☆ بیهقی، ابوبکر، احمد بن الحسین، **السنن الکبریٰ**، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۶م

☆ تبریزی، الخطیب، محمد بن عبداللہ، مشکوۃ المصابیح، دار الفکر للطباعۃ والنشر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۱م

☆ ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی، جامع الترمذی موسوعۃ الحدیث، دار السلام، سعودی عرب، ۲۰۰۰ء

☆ تفتازانی، سعد الدین، شرح العقائد النسفیۃ، ادارہ احیاء التراث، قطر، س-ن

☆ تفتازانی، علامہ، سعدالدین، شرح العقائد النسفیۃ، مکتبہ امدادیہ، ملتان روڈ، س-ن

☆ جصاص، ابوبکر، احمد بن علی، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۵ء

☆ جمال الدین، صلاح الدین، نظام الجنسیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ، دراسۃ مقرنۃ القاھرۃ، ۲۰۰۱ء

☆ جوینی، امام الحرمین، الغیاثی، غیاث الامم فی التیاث الظلم، ادارہ احیاء التراث، قطر، ۱۴۰۱ھ

☆ حسن، کسروی، ابو عبداللہ، موسوعۃ آثار الصحابۃ، طبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، س-ن

☆ حصکفی، محمد بن علی، الدر المختار، مکتبہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۹۶م

☆ خضری، بك، محمد، محاضرات فی تاریخ الامم الاسلامیۃ، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ۱۳۷۶ھ

☆ خلاف، شیخ، عبدالوھاب، السلطات الثلاث فی الاسلام، طبع در آفاق الفجر، القاھرۃ، ۱۴۰۰ھ

☆ دار الھجرۃ، مالك بن انس، الموطا، طبع دار الغد الجدید، المنصورۃ مصر، الطبعۃ الاولی، ۲۰۰۵م

☆ دربنی، فتحی، محمد عثمان، من اصول الفکر السیاسی الاسلامی، طبع موسسۃ الرسالۃ، بیروت، س-ن-

☆ رازی، محمد عمر، مفاتیح الغیب، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵م

☆ رشید، رضا محمد، تفسیر القرآن الکریم، بتفسیر المنار، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۹م

☆ رفیق عظیم، اشھر مشاھیر الاسلام فی الحرب و السیاسۃ، مطبعۃ جامعۃ دمشق، س-ن

☆ رئیس، علامہ، ضیاء الدین، النظریات السیاسیۃ فی الاسلام، مطبوعہ قاھرہ، ۱۹۷۶ء

☆ سامرائی، نعمان، النظام السیاسی فی الإسلام، طبع دار الفرقان، بیروت، س-ن

☆ سجستانی، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، موسوعۃ الحدیث، دار السلام، سعودی عرب، ۲۰۰۰ء

☆ سرخسی، شمس الدین، محمد بن احمد، المبسوط، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۷۸م

☆ سرخسی، شمس الدین، محمد بن احمد، شرح السیر الکبیر، طبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد، ۱۳۳۵ھ

☆ سرخسی، محمد بن احمد، شرح السیر الکبیر، مطبعۃ مصر شرکۃ مساھمۃ مصریۃ، ۱۹۵۷ء

☆ سمھودی، نور الدین، علی بن احمد، وفاء الوفاء، احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۹۲ھ

☆ سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمن، الدر المنثور فی التفسیر المأثور، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۰م

☆ سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمن، تاریخ الخلفاء، الناشر- انتشارات الشریف الرضی، ۱۴۱۱ھ

☆ شاطبی، ابو اسحق، ابراھیم، الموافقات فی اصول الشریعۃ، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۷۵ء

☆ شافعی، ابو عبداللہ، محمد بن ادریس، المسند، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، س-ن

☆ شافعی، محمد بن ادریس، الأم، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، س-ن

- شاہ ولی اللہ، احمد، **ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء**، مطبع صدیقی بریلی، ۱۲۸۶ھ
- شاہ ولی اللہ، دھلوی، احمد، **حجۃ اللہ البالغۃ**، دار الکتب الحدیثۃ، بالقاھرۃ، مصر، س-ن
- شربینی، الخطیب، محمد، **مغنی المحتاج**، دار احیاء التراث العربیۃ، بیروت، لبنان، س-ن
- شیرزی، عبدالرحمن، **المنھج المسلوک فی سیاسۃ الملوک**، طبع مکتبۃ المنار، اردن، س-ن
- صالح، ڈاکٹر، صبحی، **النظم الاسلامیۃ نشاتھا وتطورھا**، طبع دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۸م
- صحیان، عبدالرحمن ابراھیم، **الادارۃ فی الاسلام الفکر والطبیعۃ**، دار الشرق جدۃ، ۱۹۸۶ء
- طاھر، محمد بن العاشور، **مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ**، مطبع فی تونس، ۱۳۶۶ھ
- طبرانی، ابوالقاسم، سلیمان، **المعجم الأوسط**، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، عمان، اردن، ۱۹۹۹ء
- طبرانی، سلیمان بن احمد، **المعجم الکبیر**، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷ء
- طبری، محمد ابن جریر، **تاریخ الامم والملوک**، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷م
- طبری، محمد بن جریر، **جامع البیان عن تاویل آی القرآن**، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۱م
- طرطوشی، ابوبکر، محمد بن محمد، **سراج الملوک**، طبع المکتبۃ المحمودیۃ التجاریۃ، الجامعۃ الازھر، القاھرۃ، مصر، ۱۹۳۵
- طوسی، ابو جعفر، نصیرالدین، محمد بن محمد، **اخلاق ناصری**، لکھنؤ، ۱۳۴۳ھ
- عالیہ سمیر، **نظام الدولۃ والقضاء والعرف فی الاسلام**، دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۹م
- عامری، محمد بن یوسف، **السعادۃ والإسعاد**، طبع دار النھضۃ، بیروت، س-ن
- عباسی، احمد بن ابی یعقوب، **تاریخ یعقوبی**، طبع دار صادر، بیروت، لبنان، س-ن
- عبداللہ، عبدالعزیز بن ادریس، **المجتمع المدینۃ فی عھد الرسول**، طبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۲ء
- عبدہ، الشیخ محمد، **نھج البلاغۃ**، الناشر دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۵ء
- عجلانی، دکتور، منیر، **عبقریۃ الاسلام فی عھد الحکم**، جامعۃ دمشق، س-ن
- عجلانی، ڈاکٹر، منیر، **عبقریۃ الاسلام فی عھد الحکم**، مطبعۃ جامعۃ دمشق، س-ن
- عرنوس، محمود بن محمد، **تاریخ القضاء فی الاسلام**، المطبعۃ المصریۃ الاھلیۃ الحدیثۃ بالقاھرۃ، ۱۹۳۴م
- عزالدین، ابن عبدالسلام، **قواعد الاحکام فی مصالح الانام**، مطبعۃ حسینیہ قاھرہ، ۱۹۳۴ء
- عودہ، عبدالقادر، **التشریع الجنائی الاسلامی**، دار الکاتب العربی، بیروت، س-ن
- عودہ، عبدالقادر، **المال والحکم فی الاسلام**، دار النفائس، بیروت، س-ن
- عیاض، قاضی، شھاب الدین، احمد، **الشفاء**، الناشر المکتبۃ السلفیۃ، س-ن
- عینی، محمود بن احمد، **البنایۃ شرح الھدایۃ**، المکتبۃ التجاریۃ، مکۃ المکرمۃ، ۱۴۱۱ھ
- غزالی، ابوحامد، محمد بن محمد، **المستصفی من علم الاصول**، المطبعۃ الامیریۃ ببولاق، مصر المحمیۃ، ۱۳۲۲ھ

☆ غزالی، ابوحامد، محمد بن محمد، تبر المسبوک، طبع مکتبۃ الکلیات الازہریۃ القاہرۃ، س-ن-

☆ غزالی، ابو، محمد بن محمد، احیاء علوم الدین، مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۳۹ء

☆ فارابی، ابونصر، محمد بن محمد، السیاسیات المدینۃ، دائرۃ المعارف العثمانیۃ حیدر آباد دکن، ۱۳۴۶ھ

☆ فارابی، ابونصر، محمد بن محمد، آراء اهل المدینۃ الفاضلۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۵۹

☆ قادری، عبداللہ بن احمد، الکفارۃ الاداریۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، دار احیاء التراث العربیۃ، بیروت، س-ن

☆ قاسمی، ظافر، نظام الحکم فی الشریعۃ والتاریخ، دار النفائس، بیروت، س-ن

☆ قاضی، عبدالنبی، دستور العلماء أو جامع العلوم فی اصطلاحات الفنون، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۰م

☆ قرافی، شہاب الدین، احمد بن ادریس، الفروق، دار احیاء الکتب العربیۃ القاہرۃ، ۱۳۴۴ھ

☆ قرشی، غالب بن عبدالکافی، اولیات الفاروق فی الادارۃ والقضاء، طبع مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ، قطر، س-ن

☆ قرطبی، ابوعبداللہ، محمد بن احمد، الجامع لأحکام القرآن، دار الکتب المصریۃ، قاہرہ، ۱۳۵۳ھ

☆ قزوینی، ابوعبداللہ، محمد بن یزید، سنن ابن ماجۃ، موسوعۃ الحدیث، دار السلام، سعودی عرب، ۲۰۰۰ء

☆ قشیری، محمد بن مسلم، صحیح مسلم، موسوعۃ الحدیث، طبع دار السلام، سعودی عرب، ۲۰۰۰ء

☆ قلعہ جی، محمد رواس، موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب، دار النفائس، بیروت، لبنان، ۱۹۸۹م

☆ کاسانی، علاؤالدین، ابوبکر، بدائع الصنائع، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۹م

☆ کتانی، عبدالحئی، التراتیب الاداریۃ، الطبعۃ الاہلیۃ بدرب الفاسی بالرباط، ۱۳۴۶ھ

☆ ماوردی، ابوالحسن، علی بن محمد، نصیحۃ الملوک، طبع دار النہضۃ، بیروت، س-ن

☆ ماوردی، ابوالحسن، علی، الاحکام السلطانیہ فی الولایات الدینیۃ، ادارۃ مصطفی الحلبی، مصر، ۱۹۷۳م

☆ ماوردی، ابو الحسن علی، ادب الدنیا والدین، دار احیاء التراث العربی، س-ن

☆ ماوردی، ابوالحسن، علی، الاحکام السلطانیہ فی الولایات الدینیۃ، شرکۃ دار الارقم بن ابی الارقم، بیروت، لبنان، س-ن-

☆ مبارک، علامہ، محمد، نظام الاسلام الحکم والدولۃ، دار النفائس بیروت، س-ن-

☆ محفوظ، عبدالمنعم، ڈاکٹر، الخطیب، نعمان احمد، ڈاکٹر، مبادی فی النظم السیاسۃ، دار الفرقان، للنشر والتوزیع، عمان، س-ن

☆ محمصانی، صبحی، فلسفۃ التشریع الاسلامی، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۱ء

☆ مراغی، احمد مصطفی، تفسیر المراغی، مطبعۃ البابی الحلبی، مصر، قاہرہ، ۱۹۵۳ء

☆ مسعودی، ابوالحسن، علی بن حسن، مروج الذہب ومعدن الجواہر، مطبعۃ البہیۃ المصریۃ، الجامعۃ الازہر، مصر، ۱۳۴۶ھ

☆ مسکویہ، أبوعلی، احمد بن محمد، تجارب الامم و تعاقب الہمم، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۳

☆ موحی، صالح، نضرة النعیم فی مکارم أخلاق الرسول الکریم، دار الفکر، بیروت، لبنان ۲۰۰۰م

☆ موصلی، محمد بن محمد، حسن السلوك الحافظ لدولة الملوك، طبع دار الوطن، اردن، ١٩٤٦

☆ نسائی، ابوعبدالرحمن، احمد بن شعیب، سنن النسائی، موسوعة الحدیث، دار السلام، سعودی عرب، ۲۰۰۰ء

☆ نظام، شیخ، مولانا، جماعة من علماء الهند الأعلام، الفتاوی الهندیة، الطبعة دار الکتب العلمیة، بیروت، ۲۰۰۰

☆ نووی، ابوزکریا، یحیی بن شرف، تهذیب الاسماء واللغات، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، س-ن

☆ نووی، محی الدین، ابوزکریا، یحیی، شرح صحیح مسلم، مطبعة السعادة بجوار محافظه، مصر، ١٣٢٨ھ

☆ واعی، توفیق، الدولة الاسلامیة بین التراث والمعاصرة، طبع دار القاهرة، س-ن

☆ واقدی، محمد بن عمر، کتاب المغازی، مطبعة جامعة اکسفورد، ١٩٦٦ء

☆ هندی، علامه، علاء الدین، علی، کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال، منشورات دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ١٩٩٨م

☆ هیکل، محمد حسین، الفاروق عمر، مطبعة مصر شرکة مساهمة القاهرة، ١٣٦٤ھ

☆ هیکل، محمد حسین، الصدیق ابی بکر، مطبعة مصر شرکة مساهمة القاهرة، ١٣٦٤ھ

☆ هیثمی، نورالدین، علی بن ابوبکر، مجمع الزوائد و منبع الفوائد، دار الفکر، بیروت، لبنان، ١٩٩٤م

☆ یوسف کرم، تاریخ الفلسفة الیونانیة، مکتبة النهضة المصریة القاهرة، ١٩٦٦ء

اردو کتب

☆ اسرار احمد، ڈاکٹر، خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، ۲۰۰۶ء

☆ اصلاحی، امین احسن، اسلامی قانون کی تدوین، طبع فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء

☆ اصلاحی، امین احسن، دعوت دین اور اس کا طریق کار، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، ۱۹۵۱ء

☆ اصلاحی، امین احسن، مولانا، اسلامی ریاست، مطبع گنج پرنٹرز لاہور، ۲۰۰۶ء

☆ الازہری، محمد کرم شاہ، تعمیر اخلاق اور سیرت نبویؐ، ناشر ضیاء القرآن، پبلی کیشنز، س۔ن

☆ الانصاری، مولانا، حامد، اسلام کا نظام حکومت، الفیصل ناشران، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۸

☆ القاضی، ڈاکٹر، مختار، اصول قانون، دار الکتب العلمیہ، بیروت، س۔ن

☆ القرضاوی، یوسف، اسلام اور معاشی تحفظ (ترجمہ عبدالحمید صدیقی) طبع شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۰ھ

☆ انصاری، مولانا ظفر احمد، (مرتب) نظام حکومت کے بارے میں انصاری کمیشن کی رپورٹ، اسلام آباد، حکومت پاکستان، ۱۹۸۳ء

☆ پانی پتی، ثناء اللہ، عثمانی، تفسیر مظہری، ناشر، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۸۰ء

☆ جاوید، الطاف، جدید اسلامی ریاست اکیسویں صدی کے تناظر میں، مطبوعہ المعارف لاہور، ۱۹۹۵ء

☆ جلال الدین، سید، عمر، اسلام میں خدمت خلق کا تصور، طبع ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ، س۔ن

☆ حسن، ابراہیم حسن، ڈاکٹر، النظم الاسلامیہ (ترجمہ مولوی علیم اللہ صدیقی) ادارۃ المعارف کراچی، جولائی ۱۹۵۸ء

☆ حمید اللہ، ڈاکٹر، محمد، اسلامی ریاست، الفیصل ناشران، اردو بازار لاہور، جنوری ۲۰۰۵ء

- ☆ حمید اللہ، ڈاکٹر محمد، خطبات بہاولپور، طابع و ناشر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۳
- ☆ حمید اللہ، ڈاکٹر محمد، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء
- ☆ خرم، ڈاکٹر محمد اشرف، پاکستان میں سیاسی عدم استحکام کے تعلیم پر اثرات، طابع زکی سنز پرنٹرز، کراچی، ۲۰۱۰ء
- ☆ سباعی، ڈاکٹر، مصطفیٰ، (مترجم سید معروف شاہ شیرازی)، اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو، ناشر اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء
- ☆ سندیلوی، محمد اسحٰق، اسلام کا سیاسی نظام، دور مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع گردند، ۱۹۵۷ء
- ☆ سواتی، صوفی، عبدالحمید، معالم العرفان فی دروس القرآن، ناشر مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج، گوجرانوالہ، ۱۴۲۰ھ
- ☆ طوسی، نظام الملک، ابوعلی، حسن، سیاست نامہ (مترجم محمد منور) مجلس ترقی ادب، سنگھ داس گارڈن لاہور، ۱۹۶۱ء
- ☆ سیال، طالب حسین، مسلمانوں کا نظام شوریٰ، طابع و ناشر بک سنٹر راولپنڈی، اگست ۱۹۸۳ء
- ☆ سید، قطب شہید، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ناشر الحراب کمن آباد لاہور، ۱۹۶۹ء
- ☆ سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، مولانا، اسلام کا اقتصادی نظام، ناشر ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۹۸۱ء
- ☆ شاہ ولی اللہ، احمد، البدور البازغہ، ادارۃ النشر، اکادمیۃ الشاہ ولی اللہ الدهلوی، صدر حیدر آباد السندھ، ۱۹۷۰ء
- ☆ شبلی، مولانا نعمانی، الفاروق، ناشر اسلام بک ڈپو، لاہور، بار اول، ۱۹۹۷ء
- ☆ شفیع، محمد، مفتی، دستور قرآنی، ادارۃ المعارف کراچی، ۲۰۰۳ء
- ☆ صدیقی، صاحبزادہ، ساجد الرحمٰن، اسلامی معاشرہ کی تاسیس و تشکیل، مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء
- ☆ صدیقی، مظہر الدین، اسلام اینڈ تھیوکریسی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء
- ☆ طوسی، نظام الملک، ابوعلی، حسن، سیاست نامہ (سیر الملوک) پریس Ernest Leroux، ۱۸۹۱ء
- ☆ عبدالحفیظ، پروفیسر، وفاقی محتسب، تعارف اور افادیت کا تنقیدی جائزہ، مطبع شوزب، پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۰
- ☆ علوی، ڈاکٹر خالد، انسان کامل، الفیصل ناشران، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۰ء
- ☆ علوی، سعید الرحمٰن، مولانا، اسلامی حکومت کا فلاحی تصور، ناشر مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۳ء
- ☆ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، محاضرات سیرت، الفیصل ناشران کتب، غزنی سٹریٹ، لاہور، ۲۰۰۷
- ☆ غزالی، امام محمد، کیمیائے سعادت، ترجمہ پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ، الفیصل ناشران، اردو بازار لاہور جون ۲۰۰۳ء
- ☆ قاضی، ڈاکٹر محی الدین، محمد، محسن کائنات اسلام و جدید مسائل، مطبع قاضی اینڈ قاضی دفاتر قانون، ٹرنر روڈ، لاہور، س۔ن
- ☆ گوہر الرحمٰن، مولانا، اسلامی سیاست، مطبع ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، مئی ۲۰۰۶ء
- ☆ مبارکپوری، مولانا صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۱۹۸۷
- ☆ محسنی، شمس الرحمٰن، شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے، طبع پنجاب آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۶۸ء
- ☆ محمصانی، فلسفہ شریعت (مترجم مولوی محمد احمد رضوی) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۹ء
- ☆ مفتی، محمد شفیع، معارف القرآن، ناشر ادارۃ المعارف کراچی، ۱۳۹۳ھ
- ☆ منظور احمد، ڈاکٹر، اسلام چند فکری مسائل، ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، اپریل ۲۰۰۳ء

☆ مودودی، سید، ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، ناشر اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ستمبر ۲۰۰۸ء
☆ مودودی، سید، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۱ء
☆ مودودی، سید، ابوالاعلیٰ، خلافت وملوکیت، ناشر ادارہ ترجمان القرآن، رحمٰن مارکیٹ، لاہور، ۲۰۰۵ء
☆ ندوی، سید، سلیمان، ارض القرآن، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء
☆ ندوی، سید، سلیمان، سیرت النبیؐ، پبلشرز، ادارہ اسلامیات، لاہور، ستمبر ۲۰۰۲ء
☆ نیازی، ڈاکٹر، لیاقت علی، اسلام کا انتظامی قانون، شعبۂ مطبوعات دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ۲۰۰۱ء

عربی لغات

☆ ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان، ۱۹۹۵م
☆ کیرانوی، مولانا، وحیدالزمان، القاموس الجدید، ناشر ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۰ء
☆ اصفہانی، راغب، امام، المفردات القرآن، ناشر اہل حدیث اکادمی، لاہور، ۱۹۷۱ء
☆ الزبیدی، ابوفیض، محمد مرتضی، تاج العروس من جواہر القاموس، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۹۴م

اُردو رسائل وجرائد

☆ سہ ماہی منہاج، ناشر ڈائریکٹر دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور، ۱۵، ۳، ۱۹۹۷ء
☆ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک پبلشر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، پشاور، ۷، ۸، ۱۹۸۲ء
☆ عالمی ماہنامہ ترجمان القرآن، زیر طباعت البلاغ ٹرسٹ لاہور، ۳۱، ۲۰۱۱ء
☆ ماہنامہ ترجمان القرآن طبع ابلاغ ٹرسٹ لاہور، ۲۰۰۸، ۲۰۰۹، ۲۰۱۰ء
☆ ہفت روزہ ایشیا (لاہور) مقام اشاعت 42 چمبرلین روڈ چوک نسبت روڈ، لاہور، ۶۰، ۲، ۳(جولائی ۲۰۱۰ء)
☆ خصوصی شمارہ، مغرب اور اسلام طبع انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، 1 جولائی ۲۰۱۱ء
☆ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ زیر اہتمام الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، ۲۰۱۰ء
☆ سہ ماہی ایقاظ لاہور، طبع ادارہ ایقاظ، سبزہ زار سکیم، لاہور، ۹، ۳، ۲۰۰۹ء
☆ معارف (لاہور) ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۷، ۴، ۵، ۶، (اپریل، مئی، جون ۱۹۹۴ء)
☆ ماہنامہ محدث، زیر طباعت مجلس التحقیق الاسلامی، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور، ۳۹، ۳، ۲۰۰۷ء
☆ ماہنامہ البلاغ طبع شعبہ البلاغ جامعہ دارالعلوم کراچی، ۴۶، ۵، ۸، ۲۰۱۱ء
☆ ماہنامہ البرھان، طبع تحریک اصلاح تعلیم فیصل ٹاؤن لاہور، ۲۲، ۱۰، ۶، ۲۰۱۱ء
☆ سہ ماہی فکر و نظر، شعبۂ مطبوعات ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۴۵، ۳، ۴، ۲۰۰۸ء
☆ ہفت روزہ مجلہ تکبیر، کراچی، ۵، ۱۶، س۔ن
☆ ہفت روزہ کہکشاں، ۱۵ تا ۲۲ جون ۱۹۹۷ء

اردو اخبارات

- روزنامہ جنگ، لاہور، فروری ۲۰۱۱ء
- خصوصی اشاعت روزنامہ ایکسپریس، لاہور، یکم جولائی ۲۰۱۱ء
- جنگ جمعہ میگزین، لاہور، ۸ مارچ ۱۹۹۶ء
- نوائے وقت، لاہور، ۲ فروری، ۱۹۹۳ء
- نوائے وقت میگزین، لاہور، ۲۶ اگست ۱۹۸۳ء
- اسلامی نظریاتی کونسل، سالانہ رپورٹ، ۸۲۔۱۹۸۱ء، اسلام آباد، اسلامی نظریاتی کونسل، ۱۹۸۳ء۔

English Books

- Abdul, Ghaffor, Mian, **The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan,** 1973, Publisher Imran Law Book House Lahore.
- Ahmad, Manzooruddin, **Islamic Political System in the Modern Age,** Royal Book Company, Karachi, 1991.
- Ahmad, Sh Shafi, **Modern States,** Publisher: Sh. M Ashraf Sons, Lahore, 1986.
- Akhtar Majeed, **Hand Book of Federal Countries,** Publisher McGill Queens, University Canada, 2005.
- Al-Buracy, A Muhammad, **Administrative Development An Islamic Perspective,** Publisher KPI Limited 14 leicester Square, London.
- Almond, G.A and G B, Powel, **Comparitive Politics,** Toronte, World Book, Inc, A Scott Fetzer Company London, 1978.
- Ameer, Syed, Ali, **A short History of the Saracens,** Alfareed Printers, 25, Darbar Market, Lahore, 1927
- Andrew, Vincent, **Theories of the State,** Clarendon Press, Oxford, 1976.
- Ansari, Fazlur Rehman, Doctor, **The Quranic Foundations and Structure of Muslim Society,** Publisher, World Federation of Islamic Missions, Islamic Center North, Nazimabad, Karachi, 1977.
- Appadorai, A, **The Substance of Politics,** Oxford University Press London, 1954.
- Arnold, Sir, Thomas, **The Preaching of Islam,** Frances Printer, Publisher, London, 1961.
- Asad, Muhammad, **Islam at the Crossroads,** Publisher Sh. Muhammad Ashraf

Lahore, 6th Ed. 1975.

☆ Asad, Muhammad, **The Principles of State and Government in Islam,** Published by the University of California Press, Berkeley, 1961.

☆ Asad, Muhammad, **The Road to Mecca,** Publisher: Max Reinhardt, London, 1954.

☆ Austin, Ranney, Governing: **An Introduction to Political Science,** USA: Prentice Hall, Inc. Asimon and Schustee Company, 1993.

☆ Barnett, Hilaire, **Under Standing Public Law,** Publisher Cavendish Tayler and Francis Group London, 2010.

☆ Birkland, Thomas, **An Introduction to the Policy Process Theories,** Concepts and models of Public Policy making, Publisher M E. Sharpe, Inc, Armonk, Newyork, 1984.

☆ Bray, Jermy, **Decision in Government,** Victor Gollancz (Ltd) London, 1970.

☆ Brohi, A.K, **Fundamental Law of Pakistan Ist Edition,** Din, Muhammadi Press Karachi, 1958.

☆ Bruce, Maurice, **The comming of the Welfare State,** Great Britian by Willaim Clowes and Sons Ltd, London, 1968.

☆ Choudhury, G W , **Constitutional Development,** Longman Group (Ltd) Lahore, 1962

☆ **Criminal Law** (Amendment) Act, 1998.

☆ Deniel, J Elazar, **Exploring Federation,** The University of Alabama Press, 1987.

☆ Dicey, Albert, V, **An Introduction to the Study of the Constitution,** Press MacMillan and Co Ltd, London, 1965.

☆ Dimock, Marshall Edward, **American Government in Action,** Rinebart and Company Inc, Newyork, 1949.

☆ Dunning, William, Archibald, **A History of Political Theories,** Ancient, Mediaeval, Macmillan Company London, 1930.

☆ El-Awa, Muhammad Selim, **On the political System of the Islamic State,** American Trust Publications, Indianapolis, Indiana, 1977.

☆ Engineer, Asghar Ali, **Theory and Practise of the Islamic State,** Publisher,

Vanguard Books Ltd, Lahore, 1985.

☆ Fahad, Dr. Abaidullah, **Islamic Shura Religion,** State and democracy, Serials Publications, New Delhi, India, 1987.

☆ Fink, Arther, **The Field of Social Work,** fifth edition, Longman Press, London, 1968.

☆ Fitz Gerald, P J , **Salmond on Jurisprudence,** Published Sweetand Maxwell, London, 1961.

☆ Ghazi, Mahmood, Ahmad, **State and Ligislation in Islam,** Published by Shariah Academy International Islamic University, Islamabad 2006.

☆ Gian Franco Poggi, **The Development of the modern state,** California, Stanford University Press, 1978

☆ Gladden, E N, **The Essential of Public Administration,** Staples Press Limited, London, 1966.

☆ Goel, S.L, **Advanced Public Administration,** Sterling Publishers, New Delhi,1974.

☆ Gordon, Startheran, **Our Parliament,** Mill Bank (Ltd.) London, 1952.

☆ Griffiths, E Daniel, **Administrative Theory,** Publisher Appletn Century Crofts, Inc, 1959.

☆ Haider, S.M , **Administrative Responsibility,** Publisher West Pakistan Academy for Village Development, Peshawar, 1961.

☆ Hakeem, Yousaf, **Transitional Justice,** Judicial Accountability and the Rule of Law, Published in the USA and Canada by Routledge, 270 Madison Avenue, Newyork, 2010.

☆ Harman, M. Judd, **Political Thought from Plato to present,** Megraw hill book Company, London, 1964.

☆ Hasnat, Dr. Farooq, **The System of Federation in Pakistan,** Constitutional Provisions for Decentralization, South Asia Study, July 1989.

☆ Heeger, Gerald, **The Politicds of under Development,** Publishers, Mcmillon, London, 1974

☆ Hegel, G W.F., **Lectures on the Philosophy of History,** Publisher George Bell and Sons, London, 1902.

☆ Herman Beukema, William M. Geer, **Contemporary Foreign Governments,** Rine hardt and company, ING Publisher, 1940.

☆ Hill, Dave, Neo-Liberalism, **Global Capitalism and Educational Change,** MC Millan Press, Inc New York, 1953.

☆ Ibn Taimiyya, Taqiud din, Ahmad, **Al-Hisba,** Darul Arqam, Kuwait, 1983.

☆ Ilbert, Sir, Courtenay, **Parliament Its History Constitution and Practice,** Publisher Williams and Norgate, New York, 1952.

☆ Iqbal, Allama, Muhammad, **The Reconstruction of Religious Thought in Islam,** Publisher Institute of Islamic Culture Club Road, Lahore, 1986.

☆ Iqbal, Munawar, **Islamic Economic Institution and the Elimination of Poverty,** Published The Islamic Foundation Book, Leicester, UK, 2002.

☆ J.N.D. Anderson, **Islamic Law in the Modern World,** Steven & Sons, London, 1959

☆ James, Macgregor, Jack Walter, **Government by the People,** McMillan Press Inc, Newyork, 1953.

☆ Jowett, Benjamine, **Aristotle's Politics,** Press Clarendon Oxford Unversity, London, 1948.

☆ Kazi, Faizul Haq, **Law of Politics in Pakistan,** Royal Book Company, 1976.

☆ Kennetch, Clinton Wheare, **Federal Government,** Oxford University Press, 1947

☆ Khalid, B. Sayeed, **Politics in Pakistan,** "The Nature and Direction of Change" Publisher Series Centre, Karachi, 1980.

☆ Laski, Harold, H.J, **A Grammer of Politics,** George Allen and Unwin Ltd, London, 1967.

☆ M.A. Mannan, **Islamic Economics Theory and Practice (A Comparative Study)** Published by Sh. Shahzad Riaz, Lahore, 1991.

☆ Maududi, Sayyid, Abul A'la, **Islamic Lawand Constitution,** trans Khurshid Ahmed, Islamic Publications Limited Lahore, 1960.

☆ Masudal Hassan, Professor, **Hadrat Abu Bukr,** Published: Islamic Publications Ltd. Lahore, 1984.

☆ Mazher ul Haq, **Theory and Practice,** Publisher Book Land, Lahore, 2003.

☆ Michael Stwert, **Modern Forms of Goverament,** Longman Press London, 1959.

☆ Michael, Hudson, **Legitimacy in Arab Politics,** Press Oxford University London, 1977.

☆ Monzer Khaf, Dr, **The Islamic Economy,** Publisher The Muslim Students Association Canada, 1978.

☆ Muslehuddin, Dr. Muhammed, **Islam and its Political System,** Islamic Trust International Islamic University Islamabad, 1988.

☆ Nabhani, Taqiuddin, **The Islamic State,** Al-Khilafah Publications, 56 Gloucester Road, London, 1998.

☆ Nasir, Syed, Mohammad, **Islam its concept and History,** Publisher Mansoor Book, Lahore, 1985.

☆ Niyazi, Berkes, **The Development of Secularism in Turkey,** Montreal: McGill University, 1964.

☆ Pakistan Prison Rules (Jail (Manual)(U)s 59 of Prison, Act 1894) Rules for the superintendence and Management of Prison of Pakistan) R.No. 421 and Regulation III of 1818, for the Confinement of State Prisoners.

☆ R.K. Pruthi, **Principles of Political Science,** New Delhi, Mohit Publications, 2006.

☆ Rahman, H, **Introduction to Pakistan Constitution** (East Pakistan) Narayan Machive Press, London, 1958.

☆ Raskin, G. Marcus, **The state and democracy,** Published in Great Britain by Routledge, London, 1988.

☆ Rizvi, Syed, Shabbir Raza, **Fundamental Rights and Judicial Review in Pakistan,** Vanguard Books (Pvt) Lahore, 2000.

☆ Rod Hague, Martin Hurrop, **Comparative Government and Politics,** An Introduction, Macmillan Press Ltd, London, 1998.

☆ Rogers, Dr. C. Rolland, **Our Federal Constitution,** Prentice Hall, Inc, Englewood

Cliffs, N.J, 1965.

☆ Sabine, G.H, **A History of Political Theory,** Published Constable Company, London, 1964.

☆ Sakr, M.A., **The Role of the State in the Economic System of Islam** (In Islam and a New International Economic Order) The Social Dimension, I.I.L.S. Geneva, 1980.

☆ Siddiqi, M. Nejatullah, **Role of the State in the Economy An Islamic Perspective,** Published The Islamic Foundation, Leicester, UK 1996.

☆ Soltau, Roger, H, **An Introduction to Politics,** Longman Press, London, 1968.

☆ Von Kremer's, **The Orient under the Caliphs,** Published by the University of Culcutta, 1920.

☆ Wade, E.C.S, Godfrey Phillips, **Constitutional and Administrative Law,** The Chaucer Press Limited, Great Britain, 1977.

☆ Watt, Montgomery, **The Formative Period of Islamic Thought,** Edinburgh University Press, 1973.

☆ Wheare, K.C. **Federal Government,** Oxford University Press London, 1963.

☆ White, L.D, **Introduction to the Study of Public Administration,** The Macmillan Company Newyork, 1954.

☆ **Year Book of the Muslim World,** World 1996, New Delhi, India, 1996.

English Dictionaries

☆ Hornby, As, **Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English,** Oxford University Press, 2005.

☆ Simpson, J.A, Weiner, E.S.C., **The Oxford English Dictionary,** Clarendon Press Oxford.

☆ Geffrey, K, Robert, **A Dictionary of political Analysis,** Great Britian: Hazell waston and Viney Ltd, 1971

☆ **The Oxford American Dictionary of Current English,** Published Oxford University Press, Inc Newyork, 1999.

Journals & Newspapers (English)

☆ Daley, J.W and Puligundia, R, **Islam and the Concept of Progress,** Islamic Review, London, (58:2), February 1970.

☆ **The American Journal of Islamic Social Sciences,** Published The International Institute of Islamic Thoughts in Kualalumpur, Malaysia, 1996.

☆ **Perspective Shariah,** Shariah academy International Islamic University Islamabad, I: IV June 2003.

☆ Sutscliffe, Claud R, **Is Islam on Obstacle to Development?** The Journal of Developing Areas, Illinois University 10:11 October, 1975.

☆ **The Nation,** Lahore, 1997

Encyclopedia

☆ Kohli, A.S. Sharma, S.R., **Encyclopaedia of Social Welfare and Administration,** Published J.L. Kumar for Anmol Publication Pvt. Ltd. New Delhi, 1996.

☆ **Lexicon Universal Encyclopedia,** Lexicon Publications, Newyork, 1987.

☆ **Encyclopedia of Public Administration and Public Policy,** CRC Press Taylor and Francis Group, Printed in USA, 2008.

☆ Helen, Hemingway, benton, **Encyclopedia Britannica,** London, 1986.

☆ **International Encyclopedia of Social Sciences,** Cromwellaltier and McMillan, Inc, Newyork, 1968.

☆ Sius, L, David, **International Encyclopedia of the Social Sciences,** The Macmillan Company and the Free Press America, 1968.

☆ Rahman, Afzalur, Muhammad, **Encyclopedia of Seerah,** Published by The Muslim Schools Trust London, 1981.

☆ Robert G. Dixon, JK, **The World Book Encyclopedia,** World Book Inc, A Scott Fetzer Company London, 1985.

Websites

- ☆ http://en.wikipedia.org/wiki/domesticpolicy
- ☆ http://alaskapublicrecordsearch.org/511
- ☆ www.americanprogressaction.org
- ☆ http://www.solidarity-us.org/obamaworkingpaper3
- ☆ http://www.labour.org.uk
- ☆ www.mod.go.jp/e/d-act/d-policy/dpo/.htnel
- ☆ www.deepdure.com
- ☆ http://www.islamic-world.net/islamic-stateconstimuslimstate.html
- ☆ www.egyankosh.ac.in
- ☆ america.gov-engagingtheworld
- ☆ http://www.historyonthenet.com/history.dictionary.html
- ☆ www.yqyq.net
- ☆ www.wikibin.org
- ☆ www.theyworkforyou.com/lords
- ☆ en.wikipedia.com,politicsofpakistan
- ☆ www.adbi.org/research
- ☆ www.tamilcanadian.com
- ☆ http://www.thecanadianencyclopedia.com
- ☆ http://www.jstor.org/stable/3232383
- ☆ http://tribune.com.pak/story/11832/judiciary-and-executive-to-stay-with-limits